مرزا محمد رفیع سودا





مرزا محمد رفیع سودا

فہرست

تصویریں

نسخۂ رچرڈ جونسن میں سودا کی تصویر بھی شامل ہے۔ میں نے اِنلارج کرا کے اس کا پورٹریٹ رشید آرٹسٹ سے دوبارہ بنوایا ہے۔ کوشش یہی کی گئی ہے کہ تصویر اصل سے قریب تر رہے۔

یہ طرز مسٹر برڈ نے بنائی تھی۔ جس کا عکس گل کرسٹ نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔

اپنی آپا

طلعت سعید

کے نام

پرادبی

پیش لفظ

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو میں تحقیق و تنقید کا معیار گر رہا ہے انھیں خلیق انجم کی اس تصنیف کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ سودا کی عظمت تو شروع سے مسلّم رہی ہے لیکن سودا کی یہ بدقسمتی اور اُردو کے محققوں اور نقّادوں کی یہ بدتوفیقی ہے کہ نہ تو اُن کے کلیات کا کوئی صحیح ایڈیشن اب تک شائع ہوا ہے اور نہ شیخ چاند اور حال میں محمد حسن کے علاوہ کسی نے سودا کی حیات، شخصیت اور کلام کے سیر حاصل جایزے کی ضرورت سمجھی۔ شیخ چاند کی کتاب قابل قدر ہے مگر اب خاصی پرانی ہو گئی ہے۔ اس لیے جدید تحقیق کے معیار سے سودا پر ایک نئی اور سیر حاصل کتاب کی اشد ضرورت تھی۔ خلیق انجم نے اس ضرورت کو بڑی خوبی سے پورا کیا ہے۔

پہلے حصے میں جو سماجی پس منظر ہے اس میں بادشاہوں کے جشن و جلوس کی طویل داستان نہیں۔ اس زمانے کے سیاسی تغیرات، اقتصادی مسائل، علمی رجحانات پر واضح اشارے ہیں۔ اس فراریت کا بھی بہت دلچسپ تذکرہ ہے جس کا ایک پہلو تصوف تھا اور دوسرا جنسی بے راہ روی۔ سودا کے آبا و اجداد کے وطن، ان کی ننھیال، ان کے سنِ ولادت، فرخ آباد کے قیام، اودھ میں ورود اور سالِ وفات کے متعلق جدید ترین تحقیق نے کتاب کی اہمیت بڑھا دی ہے۔

دوسرے حصے میں تنقید ہے جس میں سودا کی قادر الکلامی، اُن کی ہمہ گیری اور ماحول کی عکاسی کو خاص طور سے اُبھارا گیا ہے۔ ماحول کی ہر گردش اور وقت کی ہر کروٹ کا جس طرح سودا کے یہاں احساس ہوتا ہے اور جس طرح اس کی ذہنی تصویر بنتی ہے اس طرح ان کے کسی معاصر کے یہاں نہیں ملتی۔ سودا کے قصائد کی عظمت کو عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے لیکن ان قصائد کی سماجی اور تہذیبی اہمیت پر اور زور دینے کی ضرورت تھی۔ ان کے ہجویات پر گو کہیں کہیں آنکھ نیچی ہو جاتی ہو، مگر انھوں نے جس طرح ان میں اپنے دور کا سارا درد و غم محفوظ کر دیا ہے، اس پر بھی نظر رہنی چاہیے۔ یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ شہر آشوب کے پھلنے پھولنے کا یہی دور ہے اور سودا کے شہر آشوب دوسروں پر ادبی

رتبے کے لحاظ سے فوقیت رکھتے ہیں۔ سودا کی غزلوں کے ساتھ اب تک انصاف نہیں ہوا ہے۔ وہ میر کے پائے کے غزل گو نہ سہی، مگر غزل کی کسی تاریخ میں ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے مراثی کی ادبیت کا بھی اور گہرا اعتراف ہونا چاہیے، گو اُن کی مثنویاں چنداں اہمیت نہیں رکھتیں۔ مگر ان میں بھی فن کی بہت سی اصطلاحات محفوظ ہو گئی ہیں۔ خلیق انجم نے سودا کے کلام کا جس طرح جایزہ لیا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس سے سودا کی عظمت کا نقش گہرا ہوگا اور ان کے کلام کے مطالعے کا ذوق بڑھے گا۔ اٹھارویں صدی کے آخری نصف کی تہذیب کی دھوپ چھاؤں کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ تذکرہ نگاروں اور نقّادوں کی رایوں کے اقتباسات کی وجہ سے یہ حصّہ اور وقیع ہو گیا ہے۔

سودا کی تصانیف کے سلسلے میں کلیات کے قلمی نسخوں کا جایزہ اور خصوصاً حبیب گنج اور رچرڈ جونسن کے نسخوں کی اہمیت کا تذکرہ، مصنف کی عرق ریزی کا بیّن ثبوت ہے۔ ان نسخوں کے اشاریے سے کلیات کا صحیح ایڈیشن مرتب کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ سودا کے یہاں الحاقی کلام بہت ہے۔ خلیق انجم نے سوز کی ایک سو سترہ غزلوں کی نشاندہی کی ہے اور دوسرے ہم عصر شعرا کے کلام کی بھی۔ سودا کے چھبیس شاگردوں کا تذکرہ کتاب کی اہمیت کو اور بڑھاتا ہے۔ گل کرسٹ نے اپنی ہندوستانی گرامر میں سودا کے جو اشعار مثالوں کے سلسلے میں مع انگریزی ترجمے کے دیے تھے، خلیق انجم نے انھیں بھی ڈھونڈھ نکالا ہے اور ایک جامع فہرست حوالوں کی کتابوں کی بھی دی ہے۔

اس علمی و تحقیقی کارنامے پر خلیق انجم مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یہ جدید ترین تحقیقی معیاروں پر پورا اُترتا ہے اور سودا کے مطالعے کے سلسلے میں اس سے استفادہ ضروری ہے۔ سودا کے فکر و فن کی عظمت کا احساس جتنا گہرا ہوگا اتنا ہی روایت کا وہ تسلسل بھی میسّر آئے گا جو ادب کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ
۸ رفروری ۱۹۶۶ء

آلِ احمد سرور

شیخ چاند کی کتاب "سودا" ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ اُردو میں پہلا تحقیقی مقالہ ہے. جو اتنے سائنٹیفک انداز میں لکھا گیا۔ اس مقالے کو شائع ہوئے لگ بھگ تیس برس ہو چکے ہیں۔ ان تیس برسوں میں اُردو تحقیق میں غیر معمولی انقلاب رونما ہوا ہے۔ اسی زمانے میں ہمارے ہاں صحیح تحقیقی شعور پیدا ہوا۔ ہندوستان اور غیر ممالک کی لائبریریوں سے ایسے مخطوطے نکالے گئے۔ جن سے قدیم ادب پر نئی روشنی پڑی۔ اُردو شاعروں کے قدیم تذکرے شائع ہوئے اور نئے نئے مآخذ کی نشان دہی کی گئی۔ سوداؔ کی زندگی اور فن سے متعلق بھی بہت سا نیا مواد سامنے آیا۔ اس لیے شیخ چاند کی "سوداؔ" کی افادیت پہلے جیسی نہیں رہی۔ لیکن میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ اگر شیخ مرحوم کی کتاب ۱۹۶۵ء میں شائع ہوتی تو یقیناً وہ میری کتاب سے بدرجہا بہتر ہوتی۔

جب میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا تو میرے محسن اور مشفق استاد ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے سب سے پہلی بار مجھے تحقیقی کام کی طرف متوجہ کیا اس زمانے سے لے کر آج تک جب کبھی میں اُن کے پاس سے آیا ایک نئی اُمنگ اور نیا حوصلہ لے کر۔ اگر خواجہ صاحب مجھ میں ذاتی دل چسپی نہ لیتے، کبھی پیار اور کبھی غصّے سے مجھے نہ سمجھاتے رہتے تو میرے لیے اِس کتاب کا مولف ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔

محترمی پروفیسر آلِ احمد سرور کی ذاتی دل چسپیوں کا نتیجہ ہے کہ آج یہ

کتاب انجمن ترقی اُردو سے شائع ہو رہی ہے۔ ورنہ شاید یہ ابھی برسوں تک نہ چھپتی۔ میں سرور صاحب کی ان عنایتوں کا ممنون ہوں۔

مخدومی مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے بے انتہا مصروفیات کے باوجود مسودے پر نظر ثانی کی۔ "سودا کی تصانیف" اور اس کے بعد کے ابواب میں نے بعد میں لکھے تھے۔ اس لیے ان کی نظر سے نہیں گزر سکے۔ اگر عرشی صاحب میرے حال پر کرم نہ فرماتے تو اس کتاب میں بہت سی غلطیاں رہ جاتیں۔ میں ان کی اس مہربانی کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

سودا پر قاضی عبدالودود صاحب کے بعض مضامین سے میں نے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ کئی مقامات پر مجھے ان کے نتائج سے اختلاف ہے۔ جس کا اظہار مودبانہ طریقے سے کیا گیا ہے۔

مجھے فخر ہے کہ ادبی مشاغل میں مجھے اپنے دوستوں سے ہمیشہ مدد اور رہنمائی ملتی رہی ہے۔ صدیق الرحمٰن قدوائی، رشید حسن خاں اور اسلم پرویز کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ خدا ان لوگوں کو ہمیشہ سلامت رکھے۔

میں ایم۔ اے فائنل کے اپنے دو طالب علموں خورشید عالم فاروقی اور مس عائشہ بیگم کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کا اشاریہ تیار کیا۔

انجم لاج۔ کلاں محل

دہلی

خلیق انجم

جنوری ۱۹۶۶ء

سیاسی اور سماجی حالات

دورِ ساغر تھا ابھی یا ہے ابھی چشمِ پُر آب
دیکھ سوداؔ گردشِ افلاک سے کیا کیا ہوا

مرزا محمد رفیع کی ولادت ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء - ۱۷۰۷ء) میں ہوئی اس وقت تک مغل حکومت کے زوال کے اثرات کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ ابھی تقریباً دو صدیوں کی محنت سے حاصل کی ہوئی دولت و طاقت اور عزت و شوکت باقی تھی. مغل خزانے بے شمار دولت سے بھرے ہوئے تھے۔ ابھی تختِ طاؤس اور کوہِ نور جیسی بیش قیمت اشیاء ظالم اور جابر نادر شاہ کے ہاتھوں سے محفوظ تھیں. لیکن مرزا کے دیکھتے ہی دیکھتے خزانے خالی ہو گئے. عظیم مغل بادشاہ جن کا جاہ و جلال تاریخ میں ضرب المثل ہے۔ اُن کے وارث بے بسی کی مکمل تصویر بن گئے۔ مرزا نے اُن بادشاہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھرتے دیکھیں جن کی "خاکِ پا" کو "کحلِ جواہر" سمجھا جاتا تھا۔ نازو نعم میں پلے ہوئے شہزادے ایک ایک روٹی کو ترستے۔ پھولوں میں تُلنے والی شہزادیاں جنھیں کبھی سورج کی کرن نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ حملہ آوروں کے ہاتھوں بے آبرو ہوئیں۔ اور نہ جانے کتنی بار "عالم میں انتخاب دلّی" جس پر آسمان کو بھی رشک آتا تھا' انسان کی وحشیانہ اور بہیمانہ مظالم کا شکار ہوئی۔

جن طاقتوں نے ڈیڑھ سو سال کی لگاتار جد و جہد سے مغل حکومت کی بنیادوں کو ہلایا۔ اور آخر کار ۱۸۵۷ء میں اس عظیم الشان عمارت کو ڈھا دیا ان میں مرہٹے' جاٹ، سکھ اور انگریز سب ہی شامل تھے. مسلمانوں میں رُوہیلے

مغلوں دربار کے ایرانی و تورانی گروہ اور خود مختار ریاستوں نے بھی زوال کی رفتار کو تیز کیا۔ انگریزوں کے علاوہ باقی تمام طاقتیں خود مغلوں کی سیاسی اور اقتصادی پالیسی کی پیدا کی ہوئی تھیں۔ یہ طاقتیں اور فرقے کس طرح پیدا ہوئے؟ کیوں بغاوت پر آمادہ ہوئے؟ اور کس طرح انھوں نے ہندوستان سے مغلوں کا نام و نشان تک مٹا کر رکھ دیا؟ اس کا جواب صرف یہ ہی نہیں ہے کہ اورنگ زیب کے بعد مغل تخت کے تمام وارثین نااہل تھے۔ ڈاکٹر کالیکنکر Dr. Kalikinker جیسے مورخ کی طرح یہ کہہ دینا بھی کافی نہیں کہ

"حکمرانوں اور امیروں میں کردار، قابلیت اور رہنمائی کی کمی، دربار میں ہونے والی بدتر سازشیں اور گٹھ جوڑ، نادرشاہ کا حملہ اور احمد شاہ ابدالی کی لگاتار یورشوں اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں فتح و کامیابی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے مرہٹوں نے ہندوستان کی اقتصادی حالت کو متاثر کرنا شروع کر دیا"[1] (انگریزی سے ترجمہ)

ہندوستان کی اقتصادی حالت اس لیے خراب نہیں ہوئی تھی کہ یہ تمام واقعات رونما ہوئے تھے۔ بلکہ اقتصادی نظام خراب ہونے کی وجہ سے ایسے واقعات ہوئے۔ اس کی تفصیل کے لیے ضروری ہوگا کہ ہم سیاست کے ساتھ اس دور کے زرعی[2] اور تجارتی نظام کا بھی مطالعہ کریں۔

1. K. Datt, Survey of India's Social life etc., Calcutta. 1961. P. 113

۲۔ میں نے ڈاکٹر عرفان حبیب کی The Agrarain System of Mughal India- سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔

مغل حکومت کے جاہ وحشم کا دارومدار لگان کی صورت میں حاصل ہونے والی کثیر دولت پر تھا۔ اسی لیے جب اکبر کی وفات کے بعد اُس سے کم صلاحیتوں کا مالک جہانگیر[1] تخت نشین ہوا تو مغل دربار کے شان وشکوہ میں ذرا بھی فرق نہ آیا بلکہ اور بھی ترقی کی۔ جہانگیر اور شاہجہاں پر تبصرہ کرتے ہوئے شیلوانکر نے لکھا ہے۔

"اُس (اکبر) کے جانشین کم درجے کے تھے۔ جہانگیر شراب پینے کا پورا سلیقہ رکھتا تھا اور شاہجہاں نے اپنا دربار ایسے عظیم الشان طریقے سے سجا رکھا تھا کہ اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ پھر بھی ان دونوں کے عہد میں حکومت برابر ظاہری طاقت اور شان وشکوہ میں ترقی کرتی رہی۔ انھوں نے دل کھول کر فنونِ لطیفہ اور خاص طور پر موسیقی، مصوری، شاعری اور فن تعمیر کی سرپرستی کی جس کی وجہ سے ہماری تہذیب کا نشاۃ ثانیہ ہوا۔ اور یہ عہد ہندوستان کی تاریخ کا روشن ترین باب بنا۔"[2] (انگریزی سے ترجمہ)

۱۔ جہانگیر کے متعلق تھامس رو نے لکھا تھا۔

"جہانگیر کی عظمت خود اس کی ذات میں نہیں تھی بلکہ پڑوسیوں (ریاستوں) کی کمزوری میں تھی۔ جہانگیر کی حیثیت ایک بڑی مچھلی کی تھی اور وہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تھیں جنھیں بڑی مچھلی کھا جاتی ہے۔"
(انگریزی سے ترجمہ)

بحوالہ

Thompson & Garratt, Rise and Fulfilment of British Rule in India, Allahabad, 1962, p. 12

جہانگیر اور شاہجہاں کے دربار کو رونق بخشنے والے غریب کاشتکار تھے۔ اُن سے اتنا لگان وصول کیا جاتا تھا کہ وہ بہ مشکل تمام پیٹ بھر سکتے تھے امراؤ رؤسا کو تنخواہ کی بجائے اکثر جاگیریں ملتیں۔ بادشاہوں کی یہ بنیادی پالیسی تھی کہ کوئی علاقہ کسی جاگیردار کے پاس زیادہ عرصے نہ رہے۔ اس لیے وہ اُس علاقے کی فلاح اور بہبودی کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتے۔ بقول برنیئر اُن کے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ "ہمیں ایک لمحے میں (اس علاقے سے) محروم کیا جاسکتا ہے۔ پھر ہماری محنتوں کا پھل ہمیں ملے گا اور نہ ہماری اولاد کو۔ ہمیں چاہیے کہ اس زمین سے جتنی دولت کھینچ سکتے ہیں، کھینچ لیں۔ چاہے کاشتکار فاقے مریں یا فرار ہوجائیں۔ اور جب ہمیں اس علاقے کو چھوڑنے کا حکم ملے تو ہم اسے ایک اجاڑ جنگل کی حالت میں چھوڑیں[1]۔" (انگریزی سے ترجمہ) جاگیردار کے علاوہ عامل، قانون گو، چودھری اور دوسرے سرکاری ملازمین غیر قانونی طریقے سے اپنا اپنا حصّہ لیتے تھے۔ ظلم اور تشدّد کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاشتکار زمینیں چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ اس کی ابتدا عہدِ اکبر ہی میں ہوگئی تھی۔ عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں "کروڑیوں کے ظلم کی وجہ سے اکثر علاقے ویران ہو گئے اور کاشتکار (رعایا) بیوی بچّوں کو فروخت کر کے مختلف اطراف میں چلے گئے[2]۔" (فارسی سے ترجمہ)

عہدِ جہانگیر کے ایک سیاح مینر یک نے لکھا ہے کہ کاشتکاروں کے پیروں میں بھاری بیڑیاں ڈال کر مختلف میلوں اور بازاروں سے لے جایا جاتا تھا۔ ان کی بد نصیب بیویاں گود میں بچوں کو لیے روتی پیٹتی پیچھے پیچھے

۲۔ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، کلکتہ، ۱۸۶۴ء، ۲، ص ۱۸۹

چلتی تھیں۔" (انگریزی سے ترجمہ)[1]

برنیئر عہدِ شاہجہاں کے آخر میں (۱۶۵۶ء) ہندوستان آیا تھا اور ۱۶۶۵ء تک وہ یہیں رہا۔ غریب کاشتکاروں پر ظلم وستم کا ذکر اُس نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:"..... قابلِ کاشت زمینوں کا اچھا خاصا حصّہ کاشت نہ ہونے کی وجہ سے بیکار پڑا ہے۔ ان کاشتکاروں میں بہت سے لوگ گورنروں کے ظلم کا شکار ہوکر برباد ہوگئے۔ جب یہ غریب لوگ اپنے لالچی آقاؤں کے تقاضے پورے نہ کرسکے تو انھیں نہ صرف بنیادی ضرورتوں کے سامان سے محروم کر دیا گیا بلکہ ان کے بچّے بھی چھین لیے گئے جنھیں غلام بنا کر لے جایا گیا۔ اس لیے ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے کاشتکار اتنے شدید ظلم سے تنگ آکر گاؤں سے چلے جاتے ہیں اور شہروں اور کیمپوں میں زندہ رہنے کے قابلِ برداشت ذرائع ڈھونڈھتے ہیں۔ یہ لوگ وہاں قلی، سقّے یا سائیس بن جاتے ہیں[2]۔"

اورنگ زیب کے زمانے میں اس قسم کے واقعات زیادہ ہونے لگے۔ ایک دیوان محمد ہاشم کاشتکاروں پر بہت زیادہ ظلم کرتا تھا۔ خانِ دوراں نے اس کی شکایت کرتے ہوئے بادشاہ کو لکھا:" خالصہ کے علاقے ویران ہو گئے ہیں اور حالات بہت خراب ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ محمد ہاشم نے بہت لگان مقرر کر دیا ہے[3]۔" (انگریزی سے ترجمہ) خانِ دوراں نے آگے چل کر لکھا ہے "کاشتکاروں کے مصائب لکھنا ناممکن ہے۔ اُن میں کچھ لوگ لگان نہ دے سکے

1. F.S. Manrique, Travels, 1629-43, vol. 11, London, 1927, p. 272.
2. Bernier, p. 205

تو انھیں اتنا مارا پیٹا کہ وہ مر گئے۔ بہت سے کاشتکار قید میں ہیں۔ ان کی بیویوں اور بچوں کو فروخت کر دیا گیا ہے[1]۔" (انگریزی سے ترجمہ)

حکمرانوں کے اس ظلم اور ستم سے تنگ آکر کاشتکاروں نے بغاوتیں شروع کر دیں۔ وہ لگان دینے سے انکار کر دیتے۔ شاہی فوجیں باغیوں کی سرکوبی کو جاتیں۔ چونکہ یہ بغاوتیں بہت چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھیں۔ اس لیے باغیوں پر قابو پانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ عہدِ اورنگ زیب کے بارے میں منوچی نے لکھا ہے: "گاؤں والوں کو شکست ہونے پر جو کوئی ہاتھ آتا ہے اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ ان کی بیویاں، لڑکے، لڑکیاں اور مویشیوں کو لے جایا جاتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ خوب صورت لڑکیوں کو باغی کی حیثیت سے بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ کچھ وہ (جاگیردار) اپنے لیے رکھتے ہیں اور باقی فروخت کر دی جاتی ہیں[2]۔" (انگریزی سے ترجمہ) اس پر تحقیق کی ضرورت ہے کہ خوبصورت لڑکیاں اورنگ زیب کی خدمت میں پیش کر دی جاتی تھیں۔

زمینداروں کو اپنی زمینداری بڑھانے کا موقع چاہیے تھا۔ کاشتکاروں کی بغاوت سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ کاشتکاروں کو فنِ سپہ گری کی تربیت دی۔ اور انھیں ضروری ہتھیاروں سے مسلح کیا۔

یوں تو بغاوتیں جہانگیر کے زمانے سے ہو رہی تھیں۔ لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں ان کی تعداد بڑھ گئی۔ نیز پہلے سے کہیں زیادہ منظم ہونے لگیں۔ جاٹ، مرہٹے اور سکھ اسی قسم کے زمیندار اور کاشتکار تھے۔ جنھوں نے

1. J.N. Sarkar, Studies in Aurangzib's Reign, Calcutta, pp. 243-44
2. N. Manucci, Storia Do Mogor, vol. 11, London, 1907, p. 451

ابتدا میں لگان دینے سے انکار کیا۔ حکومت کے خلاف بغاوتیں کیں اور آخر کار اتنی طاقت حاصل کر لی کہ ان سب کی آزاد حکومتیں قائم ہو گئیں۔

عہد مغلیہ کے صوبہ آگرہ میں وسطی دو آبہ کا علاقہ بھی شامل تھا۔ اس کے بارے میں ابوالفضل نے لکھا ہے: "آب و ہوا کی خصوصیت کی وجہ سے اس علاقے کے لوگ سرکشی، مردانگی اور جانبازی کے لیے تمام ہندوستان میں مشہور ہیں[1]۔" (فارسی سے ترجمہ)

اس سرکشی کے پیش نظر بقول شاہ ولی اللہ "زمانہ شاہجہاں میں اس قوم کو حکم تھا کہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں، بندوق اپنے پاس نہ رکھیں اور اپنے لیے گڑھی نہ بنائیں[2]۔"

سکھ پنجاب کے جاٹ تھے۔ ان کا پیشہ بھی کاشتکاری تھا۔ مغل حکمرانوں کے ظلم و ستم نے انھیں بھی بغاوت پر مجبور کیا اور یہ کاشتکار ایک بڑی فوج کی صورت اختیار کر گئے۔ حکومت پوری کوشش کے باوجود ان کی سرکوبی نہ کر سکی۔ مرہٹے بھی دکن کے کاشتکار تھے۔ شیواجی احمد نگر کے ایک امیر کا لڑکا تھا۔ ابتدا میں اس کا مقصد صرف اپنی زمیں داری کو بڑھانا تھا۔ جاگیرداروں نے دکن میں ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ اکثر کاشتکار شیواجی کے ساتھ ہو گئے۔ مغل شہنشاہ کے پاس جب یہ شکایت آئی کہ شاہی علاقے کے کاشتکار مرہٹوں کے ساتھ مل گئے ہیں، تو حکم دیا گیا کہ تمام گاؤں کے ہتھیار اور گھوڑے وغیرہ ضبط کر لیے جائیں۔ اور ایسا ہی کیا گیا۔ بعد میں جن کسانوں کو ہتھیار مل

۱۔ ابوالفضل، اکبرنامہ، کلکتہ، ۱۸۸۶ء، ۳، ص ۲۳۱

۲۔ شاہ ولی اللہ، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات مترجمہ خلیق احمد نظامی، دہلی، ۱۹۵۰ء، ص ۱۰۱

سکے وہ مرہٹوں کے ساتھ ہو گئے۔ ابھیم سین دکن کے زمیں داروں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ فوجداروں کے ایجنٹ، دیش مکھ اور زمیں داروں کا ظلم حد سے بڑھ گیا تھا۔ یہ لوگ ہر ممکن بہانے سے ان غریب کاشتکاروں سے پیسہ وصول کرتے تھے۔ زمیں داروں پر "پیشکش بادشاہی" مقرر تھی۔ یہ لوگ اپنی جیب سے ایک پیسہ نہیں دیتے بلکہ انھوں نے آدمی مقرر کر رکھے تھے۔ جو کاشتکاروں سے روپیہ وصول کرتے تھے۔ ان غریب انسانوں پر ظلم کی کوئی حد نہیں تھی۔ پھر ان پر جزیہ لگایا گیا اور جزیہ وصول کرنے والے مقرر کیے گئے۔ ان زمیں داروں کے ظلم وستم کے متعلق کوئی کیا لکھ سکتا ہے؟[2] اسی لیے بیشتر کاشتکار باغی مرہٹہ زمیں داروں کے ساتھ ہو گئے۔

روہیلوں نے مغل حکومت کی بربادی میں نمایاں حصہ لیا۔ روہ کے ایک بزرگ شاہ عالم خاں کا غلام داؤد خاں اٹھارویں صدی کے اوائل میں گھوڑوں کی خرید و فرخت کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ اس وقت مغل حکومت کی شکست و ریخت ہو رہی تھی۔ ہر طرف لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔ داؤد خاں نے یہ حالات دیکھ کر واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور بہت جلد کٹھیر کے مقام پر اچھی خاصی جمعیت اکٹھا کر لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس جمعیت نے اتنی طاقت حاصل کر لی کہ شاہ آباد، مراد آباد، سنبھل اور دوسرے پرگنوں پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ نواب علی محمد خاں اور حافظ رحمت خاں بہت نڈر اور بہادر روہیلہ سردار تھے۔ شجاع الدولہ نے ۱۷۷۴ء میں کڑا ل میرپور کے قریب ایک جنگ میں حافظ رحمت خاں کو قتل کر کے روہیلہ طاقت کو ختم کر دیا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

۱۔ دلکشا، بھیم سین (قلمی) ورق ۱۳۸ ب - ۱۴۰ الف۔

۲۔ دلکشا، ورق ۱۳۸ ب - ۱۴۰ الف۔

سب سے بڑی طاقت انگریز تھے۔ جنھوں نے آخر کار مغل حکومت پر قبضہ کرلیا۔

مغل بادشاہوں میں غالباً اکبر پہلا بادشاہ ہے جس نے نقد کی صورت میں لگان وصول کرنا شروع کیا۔ جب کاشتکار کو پیداوار فروخت کرکے لگان ادا کرنا پڑا۔ تو پھر اُس نے ایسی چیزوں کی کاشت شروع کی۔ جس سے زیادہ فائدہ ہو سکے۔ ایسی کاشت کے لیے خود حکومت بھی ہمّت افزائی کرتی تھی جس میں زیادہ فائدہ ہو۔

سری رام شرما لکھتے ہیں کہ شیر شاہ اور اکبر کے زمانے میں "حکومت ایسی کاشت کرنے والوں کی ہمّت افزائی کرتی تھی۔ جس سے اچھی آمدنی ہو۔ اور اس سلسلے میں وہ کاشتکاروں کو کچھ روپیہ بھی قرض دیتی جس کی ادائیگی ایک سال میں کرنی ہوتی[1]۔ جمنا کے پاس اور وسطِ ہند میں نیل کی بہت زیادہ کاشت کی جاتی۔ روئی اور سلک کے کارخانوں کی مانگ پوری کرنے کے لیے یہ دونوں اشیاء ہندوستان کے بعض علاقوں میں بہت زیادہ مقدار میں پیدا کی جاتیں[2]۔ تجارت کے فائدے نے حکمراں طبقے کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ نیل کے پورے کاروبار پر شاہجہاں کا قبضہ تھا۔ اس نے منوہر داس نامی ایک شخص کو اس کی اجازت دی تھی کہ وہ شاہی خزانے سے روپیہ قرض لے کر نیل کا کاروبار کرے۔ اور نفع میں سے اپنا حصہ لے کر باقی خزانے میں داخل کردے[3]۔

1. S.R. Sharma, Mughal Government and Administration, Bombay, 1951, pp. 83-84
2. R.C. Majumdar, An Advance History of India, London, 1960, p. 571
3. The Commercial Policy of Mughals. p. 195

نور جہاں نے بھی نیل اور زردوزی کے کپڑوں کی تجارت میں حصہ لیا تھا۔[1]
شاہجہاں کا خسر آصف الدولہ بہت بڑا تاجر تھا۔ شاہجہاں کی لڑکی جہاں آرا
بھی تجارت کرتی تھی۔[2]

اس قسم کی چیزوں کی پیداوار اتنی بڑھ گئی کہ ہندوستان کے امراء و روسا
اور تاجروں کی مانگ پوری کرنے کے بعد بھی بہت مال بچ رہتا۔ اس لیے اُن
تاجروں کو بھی مال دیا جانے لگا۔ جو ایشیا کے مختلف ممالک اور یورپ سے
ہندوستان آتے تھے۔ باہر کے تاجروں کی مانگ بہت بڑھ گئی۔" اس زمانے
میں کپڑے کی صنعت نے بہت زیادہ ترقی کی۔ کپڑا بنانے کے بڑے بڑے
مرکز تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے..... اوڑیسہ سے لے کر مشرقی
بنگال تک تمام ملک کپڑا بنانے کا بہت بڑا کارخانہ معلوم ہوتا تھا۔ بہت
باریک ململ بنانے میں ڈھاکہ بہت مشہور تھا۔ جہانگیر کے زمانے میں پلیسیرٹ
Pelseart لکھتا ہے کہ مشرقی بنگال (چھپرا اور سونار گاؤں) میں سب
لوگ کپڑا بنتے ہیں اور بہت اچھا مال تیار کرتے ہیں۔ سلک تیار کرنے کا سب سے
بڑا مرکز بنگال تھا اور یہیں سے ہندوستان کے دوسرے علاقوں اور یورپ
کے تاجروں کو مال سپلائی ہوتا تھا۔[3]"

ہندوستان نے دستکاری میں بھی بہت ترقی کی تھی۔ روئی اور سلک
سے تیار کیے ہوئے مال کے علاوہ بہت سی چیزیں ہندوستان سے باہر بھیجی
جاتی تھیں۔ مغلوں کے پاس جہاز رانی کے وہ ذرائع نہیں تھے جن سے انہیں

1. The Commercial Policy of Mughals, p. 195
2. Ibid. p. 165
3. An Advance History of India, pp. 572-574

دوسرے ملکوں سے تجارت کرنے میں سہولت ہوتی۔ اس وقت بحرِ اوقیانوس بہت خطرناک راستہ تھا۔ اکثر تجارتی جہاز لوٹ لیے جاتے تھے اور تاجروں کو بڑے بڑے لڑنے والے جہازوں سے آمدورفت کرنی ہوتی تھی۔ ہندوستان نے جہاز رانی کے فن میں بالکل ترقی نہیں کی تھی۔ اس لیے ہندوستانی تاجر باہر سے آنے والے تاجروں کو غنیمت جانتے تھے[1]۔ ابتدا میں یہ تاجر عام طور پر عرب تھے اور پھر سولھویں صدی کی ابتدا میں پرتگالی آئے۔ سترھویں صدی کے آغاز میں ڈچ تاجر آئے اور ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان آئی۔ شروع میں اس کمپنی کا مقصد صرف تجارت رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ ملک گیری کی ہوس نے انھیں سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا اور تقریباً ایک صدی میں بنگال کا بہت بڑا حصہ اُن کے قبضے میں آگیا۔ ۱۷۵۷ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیانی زمانے میں بنگال، شمالی ہند، پنجاب اور کرناٹک میں ان کی فتوحات بڑھتی ہی گئیں۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد دلی دربار میں ایرانی اور تورانی گروہوں کی آویزش سیاسی اقتدار کی جنگ ہے۔ ان امرا کی آمدنی کا ذریعہ زمینوں سے حاصل کیا ہوا لگان ہوتا جو بہت کم رہ گیا تھا۔ اس لیے اب ان کی نظریں خالصہ کی زمین اور شاہی خزانے پر تھیں۔

۱۔ بال کرشن نے اس عہد کی جہاز رانی کے متعلق لکھا ہے: "یورپین سمندر کے بادشاہ تھے۔ وہ کسی بھی بندرگاہ کا راستہ بند کر سکتے تھے۔ کسی بھی جہاز پر قبضہ کر سکتے تھے۔ وہ ایسا بھی کر سکتے تھے کہ ایشیا کے سوداگر اپنی بندرگاہ سے باہر نہ آسکیں۔ اس لیے انھوں نے آہستہ آہستہ ہندوستانیوں کے ہاتھ سے غیر ملکی اور سمندری تجارت چھین لی۔
(انگریزی سے ترجمہ)

Bal Krishan, Commercial Relations Between India and England, London, 1924, pp. 86-87

یہ بجا ہے کہ اورنگ زیب کے بعد جتنے بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ وہ اورنگ زیب سے کم صلاحتیں رکھتے تھے۔ لیکن یہ کہنا ٹھیک نہ ہوگا کہ وہ سب نااہل اور شاہی کاروبار سے بالکل بے بہرہ تھے۔ اُن میں ملکی انتظام کی صلاحیتیں نہیں تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مغل بادشاہوں کی زرعی اور اقتصادی پالیسی نے جن طاقتوں کو جنم دیا تھا انھوں نے اورنگ زیب کی زندگی ہی میں ایوانِ حکومت کی بنیادیں کھوکھلی کرنی شروع کر دی تھیں۔ اورنگ زیب کی زندگی ہی میں مرہٹوں نے اتنی طاقت حاصل کر لی تھی کہ تقریباً چالیس سال تک وہ دکن میں اُن سے نبرد آزما رہا۔ ادھر شمالی ہند میں اورنگ زیب کی عدم موجودگی کا سب سے بڑا فائدہ جاٹوں نے اُٹھایا۔" انھوں نے جاٹ کاشتکار کو تلوار چلانا سکھائی اور بندوقیں فراہم کیں۔[1] بقول جادو ناتھ سرکار مغل حکومت کا زوال اورنگ زیب کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔[2] لیکن اس نے حکمت عملی اور تدبّر سے کام لے کر نمایاں نہیں ہونے دیا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد دس سال کے عرصے میں تخت کی وراثت پر سات بار لڑائی ہوئی۔ جس سے زوال کی رفتار تیز ہو گئی۔

سادات بارہہ کے دو بھائی سید عبداللہ خاں اور سید حسین علی خاں نے اتنا اقتدار حاصل کیا کہ بادشاہ گر کہلائے جانے

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔

1. J.N. Sarkar, History of Aurangzib, vol. V. Calcutta, p. 240
2. Sarkar, Fall of Mughal Empire, vol. I, Calcutta, p. 1,

لگے۔ مغل دربار میں ایرانی اور تورانی گروہوں کی اقتدار کی جنگ بھی زوال کی رفتار کو تیز کرنے کی ذمہ دار ہے۔ ایک طرف مغل حکومت کی دشمن طاقتیں کام کر رہی تھیں اور دوسری طرف خود حکومت میں اندرونی انتشار تھا جس کی وجہ سے مغل حکومت بالکل بے بس اور لاچار ہو گئی۔

عوام کو مغل حکومت کی مجبوری کا مکمل احساس نادر شاہ کے حملے کے وقت ہوا۔ نادر شاہ نے دہلی آکر جو قتل و غارت گری، لوٹ مار اور انسانیت سوز بہیمانہ حرکتیں کی ہیں، وہ ناقابل بیان ہیں۔ رضا لائبریری، رام پور میں ایک قلمی کتاب "قصہ حقیقت بر آمدنِ نادر شاہ بہ شاہجہاں آباد" ہے۔ اندرونی شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ کتاب کا مولف اس طوفانِ حشر خیز میں خود موجود تھا۔ افسوس ہے کہ نسخے کے ناقص الطرفین ہونے کی وجہ سے مولف کا نام معلوم نہیں سکا۔ دہلی پر نادر شاہ کے حملے کا ذکر کرتے ہوئے مولف لکھتا ہے:

"گھڑی دن باقی تھا۔ شہر کے لوگوں نے مشہور کر دیا کہ نادر شاہ کا انتقال

۱۔ اگرچہ ان دونوں کے اقتدار کا زمانہ (۱۷۱۳ء - ۱۷۲۵ء) تک بہت مختصر ہے لیکن اسی زمانے میں انھوں نے جہاندار شاہ کو شکست دے کر فرخ سیر کو تخت نشین کیا۔ فرخ سیر کو گرفتار کر کے اندھا کیا اور کچھ دن بعد قتل کر دیا اور رفیع الدرجات کو تخت پر بٹھایا۔ رفیع الدرجات کا ایک مہینہ کچھ دن میں انتقال ہو گیا تو ان بھائیوں نے رفیع الدولہ کو تخت کا وارث مقرر کیا۔ یہ بادشاہ بھی دو ڈھائی مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ محمد شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اسی بادشاہ کے عہد میں بعض امرا نے سازش کر کے سید حسین علی خاں کو قتل کرا دیا اور دوسرا بھائی شاہی فوج کے مقابلے میں شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ گویا سات سال کی مدت میں ان بھائیوں نے چار بادشاہوں کو تخت نشین کیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔

ہوگیا۔ تمام غارت گر اور حرام زادے جمع ہوگئے۔ پندرہ تاریخ کو ہر طرف یورش کردی۔ بندوق اور جزائل سے تمام رات قتل و غارت گری کی ایرانی (نادر شاہ کے سپاہی) کوچوں اور گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے اور امان مانگتے تھے۔ آخر الامر صبح ہوئی۔ اس خبر سے بادشاہ غصے میں دیوانہ ہوگیا۔ نادر شاہ نے بیرونِ شہر سے اپنی فوجیں طلب کیں اور خود قلعہ سے باہر آکر مسجد روشن الدولہ چاندنی چوک میں بیٹھ گیا۔ قتلِ عام اور اہل شہر کے گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ قزلباشوں نے شریفوں کی حویلیوں پر یورش کردی۔ وہاں کے رہنے والوں کو قتل کیا.... چوک سعد اللہ خاں، چاندنی چوک، دیبہ گڑھ اور نئے شاہجہاں آباد کو غارت اور برباد کردیا۔ اور شہر کے بہت سے لوگوں کو قتل کر دیا۔ سات آٹھ ہزار انسانوں کا خون ہوا۔ اور شاہجہاں آباد اس طرح برباد ہوا کہ دھلی دروازے سے نخاس تک ویران ہوگیا اور کوئی عمارت نظر نہ آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں برسوں سے آبادی نہیں ہے.....
پردہ نشین عورتوں نے ناموس کی خاطر کنوؤں میں چھلانگ لگادی اور بہت سی عورتیں مرگئیں! (فارسی سے ترجمہ)

۱۔ (ا) قصہ حقیقت برآمدن نادر شاہ بہ شاہ جہان آباد (قلمی) رام پور

(ب) اس حملے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ۔ دولت یار جنگ، داستانِ ترک تازانِ ہند، بمبئی، ۱۳۱۰ھ، ۴، ص ص ۲۹ - ۱۲۱ ۔ غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، لکھنؤ، ۱۸۹۷ء، ۲، ص ص ۴۷۹ - ۴۸۹ ۔ مغل حکومت کا زوال، ۱، ص ص ۱ - ۳ (انگریزی) نادر شاہ کی تاریخ (انگریزی)

(ج) جیمز فریزر کا بیان ہے کہ تقریباً دس ہزار عورتوں نے کنوؤں میں چھلانگ لگادی۔ جن میں سے کچھ دو تین بعد زندہ نکال لی گئیں۔ نادر شاہ کی تاریخ، ص ۱۸۱ (انگریزی)

مرزا رفیع نے دہلی کی بربادی اور تباہی کا مرثیہ بڑی دردمندی کے ساتھ کہا ہے۔ ایسے ہی کسی واقعے سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ اشعار کہے ہوں گے۔

باغِ دلّی میں جو اک روز ہوا میرا گزر
نہ وہ گل ہی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار
نخل بے بار پڑے، سوکھی پڑی ہیں روشیں
خاک اُڑتی ہے ہر اک طرف پڑے ہیں خس و خار
دیکھتا کیا ہوں مگر سوکھی سی اک شاخ اوپر
عندلیب ایک ہے بے بال و پر و دل افگار
بدمِ سرد و بصد حسرت و صد سوزِ جگر
دیکھ کر سوئے چمن کہتی ہے بہ نالۂ زار
حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

نادر شاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اپنے پانچویں حملے میں نادر شاہ کی تاریخ دہرا دی۔ دہلی کے گلی کوچوں میں ایک بار پھر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے اور ساری دہلی خاک و خوں میں نہا گئی۔ خوب چند ذکا لکھتے ہیں کہ "اس ہنگامۂ قتل و غارت گری میں میرے بزرگوں نے عاقبت اندیشی سے کام لیتے ہوئے مستورات کو جان سے مار دیا اور خوف و ہراس کی وجہ سے خود کنوؤں میں چھلانگ لگا دی۔[۱] (فارسی سے ترجمہ)

۱۔ خوب چند ذکا، عیار الشعرا، ص ۱۳۶۔۱۳۷ (مائیکرو فلم دلی یونی ورسٹی لائبریری)

بیرونی حملہ آوروں کے علاوہ خود ہندوستان میں ایسی طاقتیں اُبھر رہی تھیں جو مغل حکومت کے لیے مستقل خطرہ تھیں۔ مرہٹے وسطِ ہند سے پھیل کر مغرب میں سندھ اور مشرق میں بہار اور اڑیسہ تک قابض ہو چکے تھے۔ شمالی ہند میں روہیلوں کی طاقت زور پکڑ گئی تھی۔ آگرہ جاٹوں کے قبضے میں آ چکا تھا اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ لوٹ مار کرتے ہوئے دلی تک آ جاتے تھے۔ ایک دفعہ لال قلعہ میں داخل ہو کر بیشتر قیمتی پتھر اکھاڑ کر لے گئے اور شاہی فوج کچھ نہیں کر سکی۔

زوال کے اثرات

کسی شخصی حکومت کے بدلنے کا عوام پر بہت کم اثر ہوتا ہے لیکن مغل حکومت کا زوال عوام کا زوال تھا۔ زوال کی مسموم ہواؤں نے نہ صرف اس ہرے بھرے درخت کے سبز پتوں کا منہ زرد کر دیا تھا بلکہ اس کی جڑوں تک میں زہریلے اثرات پھیلا دیئے تھے۔ جو مصیبت مغل بادشاہوں پر آئی تھی اس کا امراؤ روسا سے لے کر عوام تک سب پر برابر اثر پڑا تھا۔

چنانچہ اس کا اثر ہندوستان کے تہذیب و تمدن کے تمام شعبوں پر بالواسطہ طور پر بھی پڑا اور بلاواسطہ طور پر بھی۔ شاعر جو کہ ملک کے فکری اور جذباتی رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے، ان حالات میں چوٹ کھائے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ اس سیاسی و سماجی اور معاشی طوائف الملوکی نے اس کا روزگار ہی نہیں چھینا، اس کے قلب و ذہن کو بھی جھنجھوڑ دیا۔ دراصل سوداؔ کی زندگی کے واقعات اور ان کا کلام پڑھتے ہوئے اس مادی و روحانی خلفشار کو ہمارے سامنے عیاں کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سوداؔ

سے کلام کا جائزہ دل چسپ بھی ہوگا اور مفید بھی۔

اقتصادی بدحالی

مرہٹے، جاٹ، سکھ اور روہیلے اچھے خاصے علاقوں پر قابض ہو گئے دکن اور بعض دوسرے صوبے خود مختار ہو گئے۔ خالصہ کی زمین بہت کم رہ گئی!۔ اور اس کی آمدنی کا بھی بہت بڑا حصّہ وزیر اور دوسرے امرا کی نذر ہو جاتا۔ قلعہ کا خزانہ بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں بالکل خالی ہو گیا۔ بقول مرزا

نہ صرفِ خاص میں آمد نہ خالصہ جاری
سپاہی تا متصدی سبھوں کو بیکاری
اب آگے دفتر تن کی میں کیا کہوں خواری
سوال دستخطی پھاڑ کر کے بنساری
کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کٹوّل

۱۔ صاحب تاریخ عالم گیر ثانی نے ان حالات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:
"صوبہ دہلی کے پرگنے اور چند دیگر صوبوں کے پرگنے جو خالصہ میں شامل تھے اور جن سے بادشاہ کے ذاتی ملازمین کی تنخواہیں ادا ہوتی تھیں۔ اب ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ سہارن پور جس کے محاصل جاگیرداروں کے حوالے کر دیے گئے تھے اب نجیب خاں روہیلہ کے قبضے میں تھا۔ آگرہ کے قریب کے علاقے جاٹوں کے پاس تھے۔ جے پور کے مادھو سنگھ نے نارنول وغیرہ کے علاقوں پر تسلط کر لیا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ایک محل بھی خالصہ میں نہ تھا۔۔۔۔ نوبت بانیجارسید کہ بادشاہ کے دسترخوان کے لیے بھی روپیہ نہ رہا۔ بیگمات بہت سے اخراجات اپنی جیب خاص سے کرتی تھیں۔ تاریخ عالم گیر ثانی ص ۲۹۔ ۲۸۔ ۲۲۔ بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔

نادر شاہ کی لوٹ مار تاریخ میں یادگار ہے۔ کروڑوں روپے کی مالیت کے سونے چاندی کے برتن، جواہرات اور دوسرا سامان اس کے ہاتھ آیا تختِ طاؤس اور کوہِ نور جیسی نادر اور بیش بہا اشیاء بھی اس کے خزانے میں منتقل ہو گئیں۔ اس کی لوٹ مار صرف شاہی خزانے تک محدود نہیں تھی بلکہ اس نے امرا و روسا کی حویلیوں کو بھی خالی کر دیا۔ سر ہنری[1] ٹارنس اور جیمز فریزر[2] نے پورے سامان کی تفصیل دی ہے۔

اس واقعے کے تقریباً دس سال بعد احمد شاہ ابدالی نے دہلی کے گلی کوچوں میں پھر نادر شاہ کی تاریخ دہرائی۔ ایک بار پھر شاہی خزانہ خالی ہو گیا اور امرا و روسا کی ذاتی دولت چھن گئی۔

دلّی بارہا ان حملہ آوروں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئی۔ میر نے ایک دفعہ دلّی کے ویران ہونے کا نقشہ ان درد انگیز الفاظ میں کھینچا ہے۔

"ایک روز میں شہر کے تازہ ویرانے کی سیر کو گیا۔ ہر قدم پہ روتا اور عبرت پکڑتا تھا۔ جتنا آگے گیا۔ اتنی ہی ویرانی بڑھی۔ میں مکانوں کو نہ پہچان پایا۔ شہر نہ نظر آیا۔ عمارتوں کے آثار نہ دکھائی دیے۔ (وہاں) رہنے والوں کی کچھ خبر نہ ملی

از ہر کہ سخن کردم، گفتند کہ این جا نیست
از ہر کہ نشان جستم، گفتند کہ پیدا نیست

مکان گر گئے۔ دیواریں ٹوٹ گئیں۔ خانقاہوں میں صوفی رہے اور نہ

۱۔ تاریخ نادری (فارسی) ص ص ۲۵۴۔ ۲۵۵

۲۔ نادر شاہ کی تاریخ (انگریزی) ص ص ۲۲۰۔ ۲۲۱

خرابات میں سے خوار۔ دور تک ویرانہ ہی ویرانہ تھا۔

ہر کجا افتادہ دیدم خشت در ویرانۂ
بود فردِ دفترِ احوالِ صاحب خانۂ"[1]
(فارسی سے ترجمہ)

مرزا دلّی کی بربادی پر اس طرح ماتم کرتے ہیں:

جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا
مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں اٹھا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا
عجب طرح کا یہ بحرِ جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

لوگ در بدر مارے مارے پھرتے تھے لیکن ایسی کوئی صورت نہیں نکلتی تھی جس سے پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کیا جا سکے۔ اگر گھوڑا لے کر کسی کی نوکری کرو تو تنخواہ غائب اور بقول مرزا ؎

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے
گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر
شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یہاں ہے

مرزا اس اقتصادی بحران کے اسباب سے بخوبی واقف تھے۔

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند
سو آمد ان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند

۱۔ میر تقی میر، ذکرِ میر، مرتبہ عبدالحق۔ اورنگ آباد، ۱۹۲۸ء، ص ۹۹

کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند
جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

میرؔ نے بھی بادشاہ و وزیر کے قلاش ہونے کا ماتم کیا ہے۔

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش
آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش
ہے لب نان پہ سو جگہ پرخاش
نے دم آب ہے نہ چمچۂ آش
زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال
کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

عوام کی مالی حالت کتنی خراب تھی۔ اس کا اندازہ بہت مشکل ہے۔ خود بادشاہ مفلسی کا شکار تھا۔ شاہ ولی اللہ نے شاہی ملازمین کے متعلق لکھا ہے: "جب خزانۂ بادشاہ نہیں رہا نقدی بھی موقوف ہوگئی۔ آخر کار سب ملازمین تتر بتر ہوگئے اور کاسۂ گدائی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سلطنت کا بجز نام اور کچھ باقی نہیں رہا[۱]۔" سلطنت سے متعلق تقریباً یہی الفاظ سید غلام حسین خاں طباطبائی کے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "محمد شاہ کی وفات کے بعد سلطنت کا صرف

۱۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۱۰۴

نام باقی رہ گیا ہے اور کچھ نہیں[۱]"۔

فوجی کمزوری

اس اقتصادی بدحالی کا اثر براہِ راست فوج پر پڑا۔ ایران، خراسان ترکستان اور افغانستان سے آنے والے سپاہیوں کی بھرتی بند ہو چکی تھی۔ راجپوت اور مرہٹے جو کبھی مغل فوج کی طاقت کا بہت بڑا حصّہ تھے۔ اب مغلوں کے سب سے بڑے دشمن بن چکے تھے۔ شاہی خزانے میں روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے رہی سہی فوج بھی بے بس لاچار ہو گئی تھی۔ "مہینوں اور بعض اوقات برسوں تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے سپاہیوں کے ولولے سرد پڑ گئے تھے بادشاہ اپنے افلاس کی وجہ سے تنخواہیں دینے سے معذور تھا"۔ احمد شاہ کے زمانے میں محلاتِ شاہی کے ساز و سامان کی فہرست بنا کر دکان داروں کو دے دی گئی تھی تاکہ اس کو فروخت کر کے سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کر دی جائیں[۲]"۔ بقول صاحبِ تاریخ عالم گیر ثانی فوجیوں نے تنگ آکر اپنے گھوڑے بیچ دیئے تھے۔ پیدل فوج کے پاس وردیاں نہ رہی تھیں۔ جانوروں کو چارہ نہ ملتا تھا اس وجہ سے وہ مرنے لگے تھے۔ فوجی اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے تھے۔ بعض اوقات وہ شاہی سواری کی ہمراہی میں بھی نہ ہوتے[۳]۔

ایسے واقعات بھی ہوتے تھے کہ تنخواہ نہ ملنے پر سپاہی اپنے آقا کو سرِ بازار بے عزّت کر دیتے۔ عماد الملک کے سپاہی پانی پت کی سڑکوں پر

۱۔ سیر المتاخرین، ۳، ۸۷۰

۲۔ شاکر خاں پانی پتی، تذکرہ شاکر خاں (قلمی)، ص ۳۴ بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۱۶۲

۳۔ تاریخ عالم گیر ثانی (قلمی) ص ص ۱۵-۲۳ بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ص ۱۶۲-۱۶۳

اُسے گھسیٹتے پھرے اور ذلیل و خوار کیا۔ ہمارے شہر آشوبوں میں اس فوجی کمزوری کا طرح طرح سے مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ شہزادے بھوک سے تنگ آکر گھر سے باہر نکل آتے تھے۔ بقول مرزا ؎

مچا رکھی ہے سلاطینوں نے یہ توبہ دھاڑ
کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریبان پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آ دے دے مارتا ہے کواڑ
کوئی کہے جو ہم ایسے ہیں چھائے ہیگی پہاڑ
تو چاہیے کہ ہمیں سب کو زہر دیجیے گھول

نجیب زادیاں جنھوں نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا، در در بھیک مانگتی پھرتی تھیں۔ مرزا نے اس دردناک حقیقت کو بھی شہر آشوب میں بیان کیا ہے۔

نجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ان کی گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول
اور ان کے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجیے مول

اٹھارویں صدی میں ہندوستان کی معاشی بدحالی، سیاسی ابتری اور بدنظمی پر جتنے شہر آشوب کہے گئے ہیں، اتنے کبھی کسی دور میں نہیں کہے گئے۔ مرزا کے استاد شاہ حاتم نے اپنے شہر آشوب میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شرفا ننگے اور بھوکے ہیں اور رزالے خوب عیش کر رہے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

جہاں میں صاحبِ خسخانہ گھاس والے ہیں
جنھوں کے محل تھے ان کو کھنڈر کے لالے ہیں
کئی جو ہم نے (کہ) ٹکڑے کھلا کے پالے ہیں
سواب دماغ میں وہ رانی خاں کے سالے ہیں
وہ ہیں سلام طلب ہم سے جب ہوئے دوچار

شاکرناجی کہتے ہیں:

لڑے ہوئے نہ برس میں اون کو بیتے تھے
دعا کے زور سے دائی دووں کی جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے
نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے
گلے میں ہیکلیں بازو اوپر طلا کی نال

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا
کہ میں نشان کے ہاتھی اوپر نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا
ملے تھی داہان جو لشکر تمام چھانا تھا
نہ ظرف و مطبخ و دوکاں نہ غلّہ و بقّال

وہ لوگ جن کی تلواریں لاکھوں قسمتوں کا فیصلہ کرتی تھیں۔ مجبور اور لاچار تھے۔ مفلسی نے یہ حال کر دیا تھا کہ اُن کے پاس پورے ہتھیار بھی نہیں تھے۔ بقول مرزا ؎

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار
تلاش کر کے ڈھلتے انھوں نے ہو ناچار

ندان قرض میں بنیوں کے دی سپر تلوار
گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لیکے وہ ہتھیار
بغل کے بیچ تو سوتا ہے ہاتھ میں کچکول

یہ تو اُن لوگوں کا حال تھا جو کبھی صاحبِ اقتدار تھے۔ بقول مرزا عام سپاہی کی حالت اور بُری تھی۔ حالات نے انھیں اتنا بزدل بنا دیا تھا کہ لڑائی کے نام سے کانپتے تھے۔

پڑے جو کام انھیں تب نکل کے کھائی سے
رکھیں وہ فوج جو موتے بھری لڑائی سے
پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے
سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے الول

اس فوجی کمزوری نے بادشاہ کی عزّت و ناموس کو خاک میں ملا دیا۔ قائمؔ نے ایک شہر آشوب میں عالم گیر ثانی اور اس کے دادا جہاندار شاہ کو کھلم کھلا گالیاں دیں۔ اور عالم گیر ثانی اس کا کچھ نہ کر سکا[1]۔

شاہ عالم بے بسی اور لاچاری کی مکمل تصویر تھا۔ جب امیر کا اقتدار ہوتا وہ اپنی من مانی کرتا اور بادشاہ محض کٹھ پتلی کی طرح اس کے ہاتھوں میں ناچتا

۱۔ شہر آشوب کا ایک بند ملاحظہ ہو

دادا ترا جو لال کنور کا تھا مبتلا — کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو بر ملا
اس خانداں میں حمق کا جاری تھا سلسلا — دوں دوش کس طرح سے میں تیرے تئیں بھلا
آخر گدھا پن ان کا ترا عذر خواہ ہے

کنور پریم کشور فراقی کا بیان ہے کہ قلعہ میں بادشاہ کے روبرو "تو تو" "میں میں" کی نوبت پہنچ جاتی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ چوکیدار اور فراش تک، بادشاہ کی پروا نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ انند راؤ نے بادشاہ سے اجازت لیے بغیر مرہٹہ سردار پٹیل پر کچھ نقدی نچھاور کر دی۔ تمام فراش چوکیدار نقدی لوٹنے پر ٹوٹ پڑے۔ انھیں بادشاہ کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔[۱] بادشاہ سرِ دربار خود بھی گالیاں دیتا اور اس کے جواب میں فحش اور واہیات کلمات سنتا۔ فراقی نے ایک ایسا واقعہ بھی لکھا ہے۔[۲]

اہلِ ہنر کا ترکِ وطن

جاگیر داری دور میں اہلِ ہنر کی سرپرستی جاگیر دار طبقہ کرتا ہے۔ مگر اس عہد میں یہ طبقہ بہت زبوں حال تھا۔ اس لیے اہلِ ہنر دربدر مارے مارے پھرتے تھے۔ عرضِ ہنر میں فائدہ خاک نہیں تھا۔ بقول مرزا شاعر جو مستغنی الاحوال کہلاتے تھے وہ بھی فکر و تردد میں گھر گئے۔ ؎

شاعر جو سُنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
مشاقِ ملاقات انھوں کا کس و ناکس
مانا انھیں ان سے جو فلاں ابن فلاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھے جا کے دوگانہ
نیت قطعۂ تہنیتِ خانِ زماں ہے

۱۔ کنور پریم کشور فراقی، وقائع عالم شاہی، رامپور، ۱۹۴۹ء، ص ۱۴۲
۲۔ ایضاً، ص ۱۴۱

تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر
گر رحم میں بیگم کے سنے نطفہ خاں ہے
اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکیں کہاں ہے

اہلِ دول کے در پہ جبہ سائی کے باوجود دولت حاصل کرنے میں شاعر ناکام رہتے تھے۔ جب بے زری انتہا کو پہنچ گئی تو بقول مرزا

غرض مآل ہے اس گفتگو سے یہ میرا
کہ بے زری نے جب ایسا گھر آن کر گھیرا
تو کوئی قصد کرے نوکری کا بہتیرا
نہیں یہ فائدہ کچھ تا وہ چھوڑ کر ڈیرا
کرے نہ عزم سوئے اصفہان و استنبول

ہندوستان میں دکن، فرخ آباد اور اودھ وہ علاقے تھے جہاں شاعروں کا استقبال ہوتا تھا۔ یہاں دولت کی فراوانی تھی۔ بقول شاہ ولی اللہ سعادت خاں ایرانی اور اس کے بعد اس کا داماد صفدر جنگ صوبہ اودھ پہ قابض تھے۔ دو کروڑ اس صوبے سے وصول کرتے تھے۔ ایک کروڑ خرچ کرتے تھے اور ایک کروڑ جمع کرتے تھے![1] "منتخبِ روزگار" ترکِ وطن کر کے ان مقامات پر چلے گئے۔ جہاں متاعِ ہنر کی قیمت سونے چاندی کے سکوں میں ملتی تھی۔ خان آرزو، عارف علی خاں عاجز، قیام الدین قائم، احسن اللہ خاں بیان، محمد فقیہہ صاحب درد مند، ہدایت اللہ ہدایت، قلندر بخش جرأت، مصحفی میر، قمر الدین منت، ہیبت قلی خاں حسرت وغیرہ وہ شاعر ہیں جنھیں حالات سے

۱۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۱۰۴

مجبور ہو کر دلی کو خیر باد کہنا پڑا[1]۔
مرزا رفیع در بدر مارے پھرنے کو بُرا سمجھتے تھے۔ ان کی ایک رباعی ہے۔

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ بہ آں کو کب تک
حاصل یہی اس سے ہے کہ دنیا ہوئے
بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

لیکن دلی کے ناگفتہ بہ حالات میں ان کے لیے بھی ترکِ وطن کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا اور انھیں بھی "آوارہ ازیں کوچہ بہ آں کو" ہونا پڑا۔

زندگی سے فرار

دَورِ زوال میں مغل حکومت کی حالت ایک ایسے مریض کی تھی جو جانکنی کے عالم میں ہو۔ مگر جسے موت نہ آتی ہو۔ یہ تکلیف بادشاہ۔ امراء اور عوام تک سب ہی کی زندگی کو اجیرن بنائے ہوئے تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی گردن پر ایک ننگی تلوار لٹکی ہوئی ہے۔ جو کسی وقت بھی ان کے سر کو جسم سے علیحدہ کر سکتی ہے۔ عظمتِ ماضی کا احساس ان کے زخموں پر نمک تو چھڑک سکتا تھا۔ سکون نہیں پہنچا سکتا تھا۔ جاگیردار طبقہ کے دست و بازو شل ہو چکے تھے۔ اس

۱۔ دلی سے جانے والے شاعروں کی یہ فہرست قطعی نامکمل ہے۔ نیز ان کے زمانۂ رخصت کے تقدیم و تاخیر کا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔ مرزا مظہر جانجاناں جیسے صوفی منش انسان بھی روز روز کی قتل و غارت گری سے تنگ آکر ترکِ وطن کا ارادہ کر چکے تھے۔ مگر کچھ خانگی مجبوریوں نے باز رکھا۔ ملاحظہ ہو
مرزا مظہر جانجاناں، مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط، مرتبہ و مترجمہ خلیق انجم، دہلی، ۱۹۶۲ء، ص ۱۳۹

لیے سماج کے تمام افراد کے سامنے ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا "فرار" زندگی اور اس کے تلخ حقائق سے فرار۔

فرار کی دو نمایاں صورتیں تھیں۔ مذہب کا سہارا لے کر انفرادی نجات کی کوشش کی جائے۔ مادّی دنیا کی ناکامی کے احساس کو مٹانے کے لیے عالم آخرت کے لیے جدوجہد کی جائے اور دوسرا راستہ تھا دین و دنیا سے بے نیاز ہو کر رامش و رنگ و بو میں ڈوب جانا۔ ؎

انچہ در جملۂ آفاق دریں جا حاضر
شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود

اس دور میں فرار کی یہ دونوں صورتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس موضوع پر اسلم پرویز کا ایک شعر ہے۔ ؎

عبادت ہو کہ میخواری فرارِ زندگانی ہے
یہ وہ کرتے ہیں اسلم جن سے غم کھایا نہیں جاتا

تصوف کو اس عہد میں جتنی مقبولیت رہی ہے۔ شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔

سعادت یار خاں رنگین کے شہر آشوب کا ابتدائیہ اس ذہنی فرار پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے۔

سنو بیان ایک میرا یارو　　منصف ہو تو سُن کر رو دو
ایک دن مجھ کو سوچ یہ آیا　　یعنی زمانے نے ہے ستایا
اس دنیا میں آئے ہیں جب سے　　چین نہیں ہے مطلق تب سے
دولت اپنے پاس نہیں ہے　　کچھ آمد کی آس نہیں ہے
فکر معیشت نے ہے مارا　　کیجیے کس صورت سے گزارا

ہوا بہت سا جب میں مضطر — تب یہ کہا دل نے گھگھیا کر
کیوں رے دل کیا مرضی ہے تیری — فکر تجھے کچھ ہے بھی میری
چیز بڑی دنیا میں ہے دولت — بن اس کے ہوتی ہے ذلّت
کھیتی کر یا کر تو تجارت — نوکری کر یا باندھ کے ہمّت
سن کر دل نے یوں کہا مجھ کو — خاص میں کہتا ہوں تجھ کو
ہو وے اگر امدادِ الٰہی — سب سے بہتر یادِ الٰہی
صبر کی داد خدا ہی دے گا — دل کو مراد خدا ہی دے گا[1]

یہ اشعار بتا رہے ہیں کہ عوام تلاش معاش میں سرگرداں رہتے تھے اور جب ناکامی ہوتی تھی تو تجارت، کھیتی اور نوکری کا خیال چھوڑ کر یادِ الٰہی میں مصروف ہو جاتے۔ خانقاہوں میں صبر و قناعت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انھیں سمجھایا جاتا تھا کہ دنیا قحبہ خانہ ہے جس سے ہر انسان کو دامن بچا کر نکل جانا چاہیے اردو شاعری تصوف کی مقبولیت سے بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ تصوف کے فلسفیانہ مسائل، مذہبی روا داری، پاکیزگیٔ خیال، عشقِ حقیقی اور افلاطونی عشق کا تصور، خودداری، عظمتِ انسانی کا احساس، بے ثباتیٔ دنیا اور صبر و قناعت اسی راستے سے اردو شاعری میں آئے ہیں۔ جس کا اثر مرزا کی شاعری پر بھی بہت نمایاں ہے۔

اس دور میں مرزا مظہر جانجاناں، شاہ ولی اللہ، مولانا فخر الدین اور خواجہ میر درد جیسی قابلِ احترام ہستیاں بھی تھیں۔ یہ تمام حضرات اس زوال کو روکنے کی پوری جد و جہد کر رہے تھے۔ ان کے اندازِ فکر سے اختلاف ممکن ہے

۱۔ ڈاکٹر صابر علی خاں، سعادت یار خاں رنگین، کراچی، ۱۹۵۶ء، ص ۱۹۵

لیکن ان کے خلوص، ایمان داری اور صداقت پر شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

فرار کا دوسرا راستہ عیش و عشرت تھا۔ مادی مشکلات میں جنسی آسودگی کچھ دیر کے لیے انسان کو سب کچھ فراموش کرا دیتی ہے۔ جب مغل بادشاہ حالات کی تاب نہ لا سکے تو غرقِ مے ناب ہو گئے۔

جہاندار شاہ کی تفریح اور عیاشی کے لیے مہینے میں تین دفعہ سارے شہر میں چراغاں ہوتا تھا۔ لال کنور جیسی بازاری عورتوں کو قلعہ اور ملک کی سیاست میں پورا پورا دخل تھا۔ صرف اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جہاندار شاہ نے جمنا میں آدمیوں سے بھری ہوئی ایک کشتی کو ڈبونے کا حکم دیا! قائمؔ نے جس کا اپنے شہر آشوب میں ذکر کیا ہے۔ محمد شاہ کے زمانے میں یہ عیاشی انتہا کو پہنچ گئی۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے کتب خانے میں ایک ناقص الاول بیاض ہے۔ اس کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اس کی تصنیف غالباً عہدِ محمد شاہ ہی میں ہوئی ہے۔ مصنف نے محمد شاہ کی عیاشی کے بارے میں لکھا ہے:

"حضرت سبحانی (محمد شاہ) مقدماتِ سلطانی سے بے خبر قلعہ دارالخلافہ شاہجہاں آباد کو نوذِ عظیم سمجھتے ہیں۔ سمت برج اور انگوری باغ وغیرہ کی سیر کو غنیمت جانتے ہیں۔ ہمیشہ شراب خوری، بچہ بازی اور زناکاری میں مشغول رہتے۔ اپنے ساتھ برہنہ ہونے کی حد تک چست اور تنگ لباس سے آراستہ عورتیں رکھتے (کذا)، شہر کے لوگوں نے خدا کو فراموش کر دیا ہے۔ خواص و عوام نے عورتوں کا لباس اختیار کر لیا ہے۔ روزے نماز

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔

کے بدلے حرام کاری، شراب خوری اور اغلام میں مطلق العنان ہو گئے ہیں[1]۔"
محمد شاہ نے بھی ایک بازاری رقاصہ اودھم بائی کو ملکہ بنا لیا تھا جس نے بہت جلد اتنا اقتدار حاصل کر لیا کہ ہر فرمان پر اس کی مہر لگنے لگی۔ بقول سرکار جس زمانے میں سپاہی اپنی تنخواہوں کے لیے روز بغاوت کرتے تھے اور حکومت قلعہ کے سونے چاندی کے برتن فروخت کرنے کے بعد بھی اس قابل نہیں تھی کہ دو لاکھ روپے ہی ادا کر دیتی۔ اودھم بائی نے جنوری ۱۷۵۴ء میں اپنا یوم پیدائش منایا اور اس پر دو کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔
نواب درگاہ قلی خاں ۱۷۵۱ء میں دہلی آئے تھے اور تین سال تک ان کا یہاں قیام رہا۔ انھوں نے اس زمانے کے حالات لکھے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیرزادوں نے عیش و عشرت کو بحیثیت فن ترقی دی تھی۔ ان کے دن رات شراب، امردوں اور عورتوں میں گزرتے تھے۔ فدوی خاں کے لڑکے اعظم خاں کا ذکر کرتے ہوئے نواب صاحب نے لکھا ہے:

"عظیم الشان امرا میں سے ہے۔ رنگینیٔ مزاج اور مہارت راگ کی وجہ سے ہندوستان کے مطربوں کا ممدوح ہے۔ اس کی طبیعت امارد پسند ہے اور مزاج میں سادہ رویوں کی محبت ہے۔ اس کی جاگیر کی آمدنی اس فرقے پر خرچ ہوتی ہے اور جو کچھ وہ کماتا ہے اس طبقے کے قدموں پر نچھاور ہو جاتا ہے۔ جہاں کہیں سے بھی کسی رنگین امرد کی خبر پاتا ہے ..... اس پر رفاقت کی کمند ڈال دیتا ہے ..... اس گروہ میں سے بہت سے لوگوں نے اس کے حسنِ سعی کی وجہ سے مناسب منصب پر

[1] قلمی وقدیم بیاض۔ بحوالہ دلّی نمبر، دلّی کالج میگزین، ص ۲۹۵

امتیاز پا لیا ہے اور اس کی محفل میں رہتے ہیں .... غرض جہاں کہیں کوئی سبزہ رنگ نظر آئے. وہ اعظم خاں سے منسوب ہوتا ہے اور جہاں کہیں کوئی نوخط جلوہ دکھائے اس عظیم الشان سے وابستہ ہوتا ہے[1]۔"
(فارسی سے ترجمہ)

مرزا منو کا ذکر کرتے ہوئے نواب صاحب نے لکھا ہے:

"..... اس فن سحر کاری (امرد پرستی) میں یگانہ ہے۔ اکثر امیرزادے اس علم کے احکام ضروری اس سے سیکھتے ہیں اور اس کے شاگرد ہونے پر فخر کرتے ہیں ..... اس کا گھر حسین پریزادوں کا گھر ہے۔ ہر وہ نوخطِ رنگین جو اس محفل سے تعلق نہیں رکھتا فردِ باطل ہے اور ہر ملیح جو اس مجمع سے مربوط نہیں حلیۂ اعتبار سے عاطل ہے۔ اس کی بزم ہی حسینوں کی ٹکسال ہے اور اس کی محفل گلرخوں کی کسوٹی ہے[2]۔"

کسل سنگھ نامی ایک امیر ہزاریوں میں تھا۔ اس نے مادّی عیش و عشرت کے جو سامان فراہم کیے تھے۔ نواب صاحب ان کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کسل سنگھ بادشاہی ہزاریوں میں ہے۔ ثروت و دولت کے اعتبار سے اپنے عہد کے لوگوں میں بڑا افتخار اور مباہی ہے۔ اس نے (کسل) پورہ بڑے تزک و اہتمام سے بنایا ہے۔ ہر طرح کی طوائفیں اور بازاری عورتیں یعنی مال زادیوں کو اکٹھا کیا ہے۔ اربابِ مناہی و مسکرات کو اپنی سرپرستی میں جگہ دی ہے۔ کثرتِ جمعیت کے باوجود محتسب اس کے پاس نہیں

۱۔ نواب درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، حیدرآباد، ص ۲۷

۲۔ مرقع دہلی، ص ص ۲۷۔ ۲۸

پھٹک سکتا۔۔۔۔۔۔۔ اس کے (کسل پورہ) ہر راستے میں وہ (عورتیں)
رنگا رنگ لباس پہنے خود کو مردوں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ اور ہر کوچے
میں دلالوں کی وساطت کے بغیر لوگوں کو بلاتی ہیں۔ وہاں کی ہوا شہوت آمیز
اور فضا بادہ انگیز ہے۔ خاص طور پر شام کو عجب طرح کا مجمع ہوتا ہے۔۔۔۔۔
ہر گھر میں رقص اور ہر جگہ سرود۔"[1]

سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ "فرار" کے یہ دونوں راستے ایک دوسرے میں ضم ہوگئے۔ اس عہد میں تصوف کے جس فلسفے کو مقبولیت تھی۔ وہ وحدت الوجود کا فلسفہ تھا۔ یعنی ہر چیز خدا ہے۔ یہ فلسفہ مذہب کی ظاہری رسوم، دیر و حرم کی تفریق وغیرہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ سماج پر اس فلسفے کے مثبت اثرات یہ ہوئے کہ عوام میں مذہبی رواداری پیدا ہوگئی۔ مندر اور مسجد کا فرق ختم ہوگیا لیکن نقصان یہ ہوا کہ عام سماجی زندگی میں بے اعتدالیاں پیدا ہوگئیں۔ جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان بھی خدا ہے تو پھر یہ مضحکہ خیز بات ہے کہ خدا خدا کی عبادت کرے۔ ایسی صورت میں کوئی گناہ گناہ نہیں رہتا۔ کیونکہ گناہ کا مرتکب خود خدا ہے۔ جب خدا ہی مرتکب ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ خدا خود اپنی ذات کو سزا دے۔

اسی فلسفے نے حرم اور میکدے کی سرحد ختم کر دی۔ لوگ خدا اور اپنے نفس دونوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ صوفی انفرادی نجات حاصل کرنے میں کوشاں ہوگئے۔ عوام ان کی خدمت میں نجات کا راستہ دیکھنے لگے۔ بادشاہ اور امرا و روسا جو دنیا بھر کی عیاشیاں کرتے۔ صوفیوں کی بہت عزت کرتے۔ اس طرح ایک طرف تو عوام میں تصوف کی مقبولیت بڑھتی گئی اور

۱۔ مرقع دہلی، ص ص ۳۸۔۳۹

دوسری طرف خود بادشاہ کو ذہنی قرار حاصل ہوتا۔ بادشاہ دعاگوئی کے صلے میں مددِ معاش کے طور پر جاگیریں عنایت کرتے۔ اور مختلف انعام و اکرام سے نوازتے۔ اس لیے بعض عیار و مکار لوگوں نے تصوف کو ذریعہ معاش بنالیا۔ عالم گیر ثانی کو صوفیوں سے بڑی عقیدت تھی۔ احمد علی سندیلوی نے لکھا ہے کہ عالم گیر ثانی مرزا مظہر سے ملاقات کے لیے گیا تھا![1]

سعادت خاں ناصر کا بیان ہے کہ شاہ عالم خواجہ میر درد کے ہاں حاضر ہوا تھا۔[2] عالم گیر ثانی کا قتل بھی اس بہانے سے کیا گیا تھا۔ اس سے کہا گیا کہ فیروز شاہ کوٹلہ میں کوئی برگزیدہ بزرگ آئے ہوئے ہیں۔ جب بادشاہ وہاں پہنچا تو دشمنوں نے قتل کر دیا۔ صاحبِ سیر المتاخرین لکھتے ہیں: "آخری عمر میں (محمد شاہ) فقیروں کی صحبت میں خوش رہتے اور انھیں کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے[3]"۔ درویشوں اور فقیروں سے محمد شاہ کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ اس نے شاہ مبارک کو برہان الطریقت، شاہ بدا کو برہان الحقیقت اور شاہ رمز کو فصیح اللبیان کے خطابات دیے تھے۔[4] محمد شاہ نے قمر الدین خاں وزیر کی معرفت مرزا مظہر سے کہلوایا تھا کہ "اللہ تعالیٰ نے ہم کو ملک عطا کیا ہے جو کچھ آپ کو پسند آئے بطورِ ہدیہ قبول فرمائیے"[5]۔ مرزا مظہر نے اس پیش کش کو

۱۔ احمد علی سندیلوی، مخزن الغرائب (قلمی)، ورق ۴۲۰ ب

۲۔ سعادت خاں ناصر لکھنوی، تذکرہ خوش معرکۂ زیبا (قلمی)۔ نیز ملاحظہ ہو، قدرت اللہ شوق رام پوری، تکملۃ الشعرا (قلمی)، ص ۲۲۷

۳۔ سیر المتاخرین، ۳، ص ۸۷۰

۵۔ شاہ غلام علی، مقاماتِ مظہری، دہلی، ۱۳۰۹ھ، ص ص ۳۸۔۳۹

قبول نہیں کیا۔

چونکہ اُس سماج میں صوفیاء کی بہت عزّت ہوتی تھی۔ اس لیے تصوف سماجی عزّت و وقار حاصل کرنے کا بھی بہترین ذریعہ بن گیا اور بد سے بدکردار لوگوں نے اس مسلک کو اختیار کر کے پیسہ کمانے کا ایک بڑا موثّر ذریعہ بنا لیا۔ انھیں علماء سو نے المجاز قنطرۃ الحقیقت کے فلسفے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر "امرد پرستی" جیسے غیر فطری فعل کو جنسی آسودگی کا ذریعہ بنا لیا۔ انھیں حرم اور میکدہ دونوں سے خلوص تھا۔ ان کی راتیں میخانوں اور دن خانقاہوں میں گزرتے تھے۔ بزرگوں کے مزاروں کو باقاعدہ دکانیں بنا لیا گیا۔

شاید آج بھی پیرس کے نائیٹ کلبوں میں وہ شرمناک جنسی مناظر نظر نہ آتے ہوں گے جو اس دور کے عرسوں میں عام تھے۔ نواب درگاہ قلی خاں نے ایسے بہت سے عرسوں کا ذکر کیا ہے۔ دلی میں سرائے خواجہ بسنت اسد خانی کے قریب کسی ناگل نامی بزرگ کا مزار تھا۔ اس پر ہر مہینہ عرس ہوتا تھا۔ نواب صاحب اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ہر مہینے کی ساتویں تاریخ کو عاشق مزاج بدکردار عورتیں پوری سج دھج کے ساتھ جوق در جوق زیارت کے لیے آتی ہیں۔ دراصل ان کے آنے کا مقصد کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ یہاں آکر لطف اٹھاتی ہیں۔ اُن مردوں کے ساتھ داد عیش دیتی ہیں۔ جن سے ان کا تعلق ہوتا ہے۔ اکثر اہل تجرید اور غریب پیشگاں اس امید میں کہ شاید اُن پر بھی کسی کی نگاہِ انتخاب پڑ جائے اور انھیں بھی کوئی قبول کر لے۔ خوب بن ٹھن کر وہاں آتے ہیں۔ اُس جگہ کے خواص کا بیان ہے کہ اگر کوئی پردیسی یہاں آئے تو اسے فوراً اپنا جوڑا مل جاتا ہے۔"[1]

۱۔ مرقع دہلی، ص ۳۹

مذہب اور جنسی لذّتوں کی بگڑی ہوئی مکمل شکل خلد منزل (بہادر شاہ اوّل) کے عرس میں ملتی ہے۔

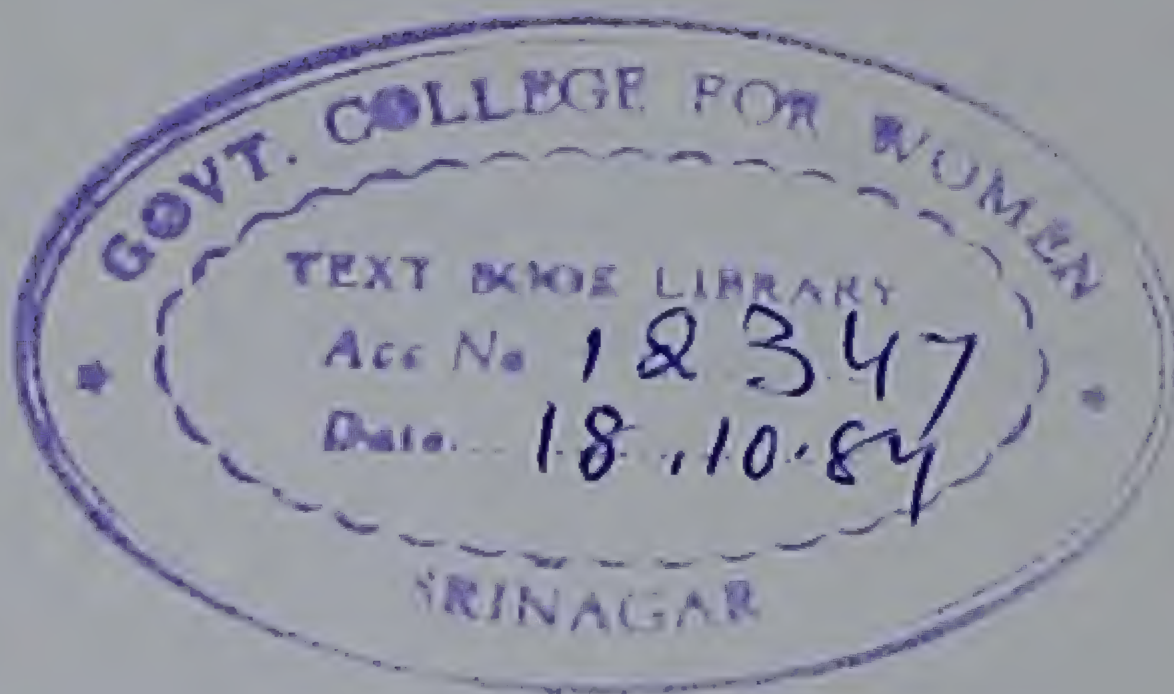
۲۲ر ماہ محرم کو خلد منزل کا عرس ہوتا ہے۔ ان کی قبر حضرت قطب الاقطاب کے جوار میں ہے۔ مہر پرور جو خلد منزل کی زوجہ ہیں حیات خاں ناظر کی مدد سے ایک ماہ پہلے ہی چراغاں بندی کی تزئین و ترتیب کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں، چراغاں طرح طرح سے اور عجیب عجیب شکلوں میں ہوتا ہے۔۔۔۔ ہر گوشہ و کنار میں تجلی آگیں بنگلے وادئ ایمن سے سبقت لے جاتے ہیں۔ عاشق (معاشران) ہر گوشہ و کنار میں اپنے محبوبوں کو بغل میں لیے، عیاش لوگ نفسانی خواہشات میں ڈوبے ہوئے کوچہ و بازار میں رقص کرتے ہوئے، مے خوار محتسب سے بے خوف سیہ مستوں کی تلاش میں، شہوت طلب کسی بھی مزاحمت سے بے خوف شاہد پرستی میں مصروف، زاہدوں کی توبہ توڑنے والے نوخط امردوں کے ہجوم (نظر آتے ہیں)![1]

ان تمام سماجی حالات سے اُردو شاعری بھی متاثر ہوئی۔ میرؔ، مرزا اور حد تو یہ ہے کہ مرزا مظہر جیسے ثقہ بزرگوں کے کلام میں امردوں کے نام ملتے ہیں۔ میرؔ کے ذہن پر تصوف کی گرفت مضبوط تھی۔ غالباً اس لیے کہ ان کی پرورش متصوفانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ مرزا تصوف سے صرف ایک حد تک متاثر ہیں۔ اُن پر ان سماجی حالات کا اثر نسبتاً زیادہ ہے اور شاید اسی لیے اُردو شاعری میں خارجیت کی ابتدا ان ہی سے ہوتی ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے سماجی حالات

۱۔ مرقعِ دہلی، ص ص ۱۱-۱۲

تقریباً ایک ہی تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ لکھنؤ والوں پر تصوف کا کوئی نمایاں اثر نہیں تھا۔ دبستانِ دلّی کے لب و لہجہ میں جو شائستگی ہے وہ تصوف کی دین ہے۔ اگرچہ اکثر وہ شائستگی کی حدوں سے باہر بھی آجاتے ہیں۔ دبستانِ لکھنؤ کی شاعری مبتذل سہی۔ مگر حقیقی زندگی کی آئینہ دار ہے۔ تصوف کے فلسفوں سے خلط ملط نہیں ہے۔

ان سیاسی اور سماجی حالات کی روشنی میں مرزا کی زندگی اور ان کے فن کو بہتر سمجھا جاسکتا ہے۔ مرزا ایسے با اقتدار لوگوں سے متوسل رہے تھے۔ جو صاحب حلّ و عقد تھے جس کی وجہ سے انھیں اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کو زیادہ بہتر سمجھنے کا موقع ملا۔ ان کے شہر آشوب اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ان میں بھرپور سیاسی شعور تھا۔ انھوں نے امراء و رؤسا اور مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا مضحکہ اڑایا ہے۔ ان شہر آشوبوں میں وہ ہنسی ہے، جو انتہائے غم پہ آجانے کا نام ہے۔



سوانح

سیر کی یوں کوچۂ ہستی کی ہم
نَے میں سے جوں نالہ گزر کر گیا

آبا و اجداد

اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مرزا کے آبا و اجداد کابل سے ہندوستان آئے تھے![1] لیکن یہ درست نہیں۔ کیونکہ نقش علی نے ان کا وطنِ اصلی بخارا بتایا ہے۔[2] نقش علی کے مرزا سے ذاتی تعلقات تھے۔ اس لیے ان کا بیان زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ بھگوان داس ہندی نے بھی یہی لکھا ہے کہ اُن کے اجداد بخارا سے ہندوستان آئے اور دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی۔[3] بعض معاصرین کے بیانات کے علاوہ خود مرزا کے کلام میں بھی اس کی شہادت موجود ہے کہ وہ بخارا کے تھے۔ نیز یہ کہ وہ کابل کے مغلوں کو بُری نظر سے دیکھتے تھے۔

۱۔ ان میں چند قابلِ ذکر تذکروں کے نام یہ ہیں۔ حکیم قدرت اللہ قاسم، مجموعۂ نغز، مرتبہ محمود شیرانی لاہور، ۱۹۳۳ء، جلد ۱، ص ۳۰۴ — نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، گلشنِ بے خار، لکھنؤ، ۱۸۷۴ء، ص ۹۹ — ایف فیلن و مولوی کریم الدین، طبقات شعرائے ہند، دہلی، ۱۸۴۸ء، ص ۱۰۳۔ مولوی عبدالغفور نساخ، سخن شعرا، لکھنؤ، ۱۸۷۴ء، ص ۲۲۳ — شیخ چاند، سودا، اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء، ص ۳۵ — لالہ سری رام، خم خانۂ جاوید، جلد ۴، دہلی، ۱۹۲۷ء، ص ۳۱۷ — مفتی صدرالدین آزردہ، تذکرہ آزردہ (قلمی)، کیمبرج انگلینڈ، ص ۲۸

۲۔ نقش علی، باغ معانی (قلمی)، خدا بخش، ورق ۹۲ ب

۳۔ بھگوان داس ہندی، سفینۂ ہندی، مرتبہ محمد عطاء الرحمٰن کاکوی، پٹنہ، ۱۹۵۸ء، ص ۱۰۵۔

میر علی ہاتف نے حکیم آفتاب کی ہجو کہی تھی۔ مرزا نے حکیم صاحب کی فرمائش پر اس ہجو کا جواب دیا۔ جو کلیاتِ سودا میں موجود ہے اور جس کا ایک بند یہ بھی ہے ؎

شیرازی تھا نہ باپ ترا اور نہ آملی
وہ خرس گر مغل کوئی ہوگا تو کابلی
کو نان کو کو نون کہنے پہ تیری زباں جھکی
ہرگز کسے نگوید ت آغا علی قلی
زیں گفتگو عبث دلِ خود شاد کردہٗ

اگر مرزا خود کابل کے ہوتے تو کابل کے مغلوں کو اس انداز میں ہرگز بُرا بھلا نہ کہتے۔ اس لیے ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کے آبا و اجداد بخارا ہی سے آئے تھے![1]

مرزا کے چچا ان کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔ تذکرۂ قائمؔ سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ بہادر شاہ اوّل کی فوج کے ساتھ دکن گئے تھے اور اُن کے ساتھ مرزا ابوطالب نامی فارسی شاعر دہلی آئے

۱۔ شاید آزاد پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے لکھا ہے کہ "بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا۔ مرزا شفیع (والدِ مرزا) بطریقِ تجارت، واردِ ہندوستان ہوئے۔ محمد حسین آزاد، آبِ حیات، لاہور، ۱۹۱۳ء ص ۱۴۸۔ ممکن ہے آزاد سے پہلے بھی کسی اور نے لکھا ہو مگر وہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ "یکے از اجدادش (مرزا شفیع نہیں) بہ ہندوستان آمدہ" بعد کے تذکرہ نگاروں نے آزاد کا بیان دہرایا ہے۔ مثلاً سودا، ص ۳۵۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، دلّی کا دبستانِ شاعری، علی گڑھ، ۱۹۴۹ء، ص ۱۵۰۔ آثر کاکوروی، نیرنگِ سودا، ص ۲۱

تھے[1]۔ البتہ مرزا کے ننھیال سے متعلق دو اہم نام ملتے ہیں۔

نعمت خاں عالی — غالباً شاہ کمال پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے مرزا کو "پسرِ دخترِ نعمت خاں عالی" لکھا ہے[2]۔ گویا کمال کے بیان کے مطابق نعمت خاں عالی مرزا کے سگے نانا تھے۔ دتاسی کو نہ جانے کیا غلط فہمی ہوئی، اس نے کمال کے حوالے ہی سے لکھا ہے کہ مرزا کی والدہ نعمت خاں عالی کی بہن تھیں[3]۔ قصائد سودا کے ایک قلمی نسخے کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ قصائدِ مرزا محمد رفیع سودا۔ دختر زادۂ نعمت خاں عالی[4]۔ سعادت خاں ناصر لکھنوی نے لکھا ہے کہ "مادرِ گرامی ان کی دخترِ خجستہ اخترِ خاندانِ نعمت خاں عالی سے ہے[5]۔" ہمارے خیال سے یہ درست نہیں کہ سودا کی والدہ عالی کی بہن یا بیٹی تھیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اکثر تذکرہ نگار اس کا ذکر ضرور

۱۔ شیخ محمد قیام الدین قائم، مخزنِ نکات، مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۲۹ء، ص ۱
۲۔ شاہ کمال الدین کمال، مجمع الانتخاب (قلمی)، انجمن، ورق ۳۶۲ ب — شیخ چاند نے بھی کمال کے بیان کو تسلیم کیا ہے۔ سودا، ص ۳۵
۳۔ گارساں دتاسی، تاریخِ ادبیات، ۳، ص ۶۷، بحوالہ معاصر، حصہ ۲
۴۔ قصائد سودا (قلمی) آصفیہ، نمبر ۱۱۸
۵۔ نعمت خاں عالی کا اصل نام مرزا محمد تھا۔ ان کے اسلاف شیراز میں پیشۂ طبابت میں شہرت رکھتے تھے۔ خود ان کے والد فتح الدین بھی حکیم تھے۔ حکیم فتح الدین کے بھتیجے حکیم محسن خاں شاہ عالم اوّل کی شہزادگی کے زمانے میں اُن کے مصاحب تھے۔ حکیم محسن خاں کے لڑکے اور عالی کے چچا زاد بھائی حکیم حاذق کو عہدِ عالمگیری کے سالِ آخر میں حکیم الملک کا خطاب ملا۔ اور محمد شاہ کے عہد میں پنج ہزاری منصب پر فائز ہوئے اور حکیم الملوک خطاب پایا۔

کرتے۔ خاص طور پر میرؔ، قائمؔ اور گردیزی۔ کیونکہ یہ سب لوگ سوداؔ کو بہت قریب سے جانتے تھے اور نعمت خاں عالیؔ کا بھانجا یا نواسہ ہونا سوداؔ کے لیے باعثِ عزت تھا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ سوداؔ کی والدہ خاندانِ عالیؔ سے ہوں۔ یعنی اُن کا عالیؔ سے کوئی دور کا رشتہ ہو۔

مرشد قلی خاں خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ذکر مغنیانِ ہندوستان بہشت نشان کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ اس کے مصنف

آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ عالیؔ ہندوستان میں پیدا ہوئے لیکن صغر سنی میں اپنے والد کے ساتھ شیراز چلے گئے تھے۔ جہاں کسبِ کمال کیا تھا اور پھر عہد اورنگ زیب کے وسط میں ہندوستان آئے اور اورنگ زیب کی ملازمت اختیار کر لی۔ اورنگ زیب نے پانصدی منصب، نعمت خاں خطاب اور خدمت خان سالاری عنایت کی۔ اورنگ زیب کے دورِ آخر میں جواہر کی داروغگی اور مقرب خاں خطاب ملا۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد جب محمد اعظم شاہ، شاہ عالم کے مقابلے کے لیے آیا تو یہ شاہ عالم کے ہمرکاب تھے۔ محمد اعظم شاہ کے مارے جانے پر انھوں نے شاہ عالم کی ملازمت کر لی۔ اسی کے عہد میں سہ ہزاری منصب پایا۔ اور دانش مند خاں کے خطاب سے نوازے گئے۔

ہجو گوئی میں کمال رکھتے تھے اور حج بھی کیا تھا۔ اس لیے بقول خوش گو فارسی کے مشہور شاعر بیدلؔ انھیں حاجی ہجوی کہا کرتے تھے۔ خوش گو کا بیان یہ بھی ہے کہ عالیؔ کے علم و فضل اور قوتِ گویائی کا یہ عالم تھا کہ پورے ہندوستان میں کسی کو ان سے بحث کرنے کی مجال نہیں تھی۔

بقول خوش گو ۱۱۲۳ھ میں اور بقول آزاد بلگرامی ۱۱۲۱ھ میں انتقال کیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ بندرابن داس خوش گو، سفینۂ خوش گو، مرتبہ شاہ محمد عطاء الرحمٰن عطا کاکوی پٹنہ ۱۹۵۹ء، ص ۵۹-۶۱۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی، سروِ آزاد، مرتبہ عبداللہ خاں، حیدرآباد ۱۹۱۳، ص ص ۱۳۶-۱۳۹۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی، خزانۂ عامرہ، کانپور، ۱۸۷۱، ص ص ۳۴۳-۳۴۷

مرزا کے ایک ہم عصر لطف علی خاں صادق کے لڑکے عنایت خاں راسخ ہیں۔ یہ کتاب غالباً واحد ذریعہ ہے جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے نانا مرشد قلی خاں خراسانی تھے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اس فارسی کتاب کا ایک اقتباس دیا ہے۔ یہ اقتباس کافی طویل ہے۔ لیکن چونکہ اس سے مرشد قلی خاں کے حالاتِ زندگی اور بعض دلچسپ واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے یہاں مکمل اقتباس کا اُردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

ایک دن اعلیٰ حضرت (شاہجہاں) نے امیر الامرا علی مردان خاں سے پوچھا کہ اے یار وفادار ہم تمھاری رائے کو مستقیم جانتے ہیں۔ ہمارے بعد تمھارے خیال سے کس شہزادے کو حکومت کا وارث ہونا چاہیے۔ انھوں نے دیکھا کہ بادشاہ کی خاطرِ اقدس دارا شکوہ کی کامیابی چاہتی ہے۔ اگر موافق مزاج بات کہوں تو خلافِ واقعہ ہوگا۔ اور جب دوسرے شہزادے سنیں گے تو ناخوش ہوں گے اور اگر کسی دوسرے (شہزادے) کا نام زبان پر آگیا تو سوائے اس شہزادے کے جس کا نام لوں۔ بادشاہ، دارا شکوہ اور باقی تمام شہزادوں کی ناراضگی کا سبب ہوگا۔ (علی مردان خاں نے) عرض کیا۔ جس شہزادے کے ساتھ بھی مرشد قلی خاں ہو (اُسے حکومت ملنی چاہیے) ..... خانِ مذکور (مرشد قلی خاں) کمال جوہرِ شجاعت رکھتا تھا۔ وہ شاہ عباس ثانی کے امرا کے رشتہ داروں میں تھا۔ اور ان سرداروں میں ممتاز تھا جو علی مردان خاں کے ساتھ صاحب قران (شاہ جہاں) کے ملازم ہوئے تھے آنحضرت (شاہ جہاں) کو امیر الامرا کی فہم و ادراک پر بڑا اعتماد تھا۔ بادشاہ نے نصیحت فرمائی کہ مرشد قلی خاں کی دلجوئی کی جائے اور انھیں دارا شکوہ کے ہمراہان میں منسلک کر دیا۔ لیکن چونکہ وہ شہزادہ نازپرور آنحضرت کی قدر

نہیں جانتا تھا اور اپنے باپ ...... کے ملازموں کے ساتھ تفقد و دلداری کی بجائے تحکمانہ انداز سے پیش آتا تھا۔ اس لیے تھوڑے ہی زمانے میں انھوں نے شہزادے سے قطع تعلق کرلیا اور امیر الامرا کے پاس دوبارہ گئے۔ اسی دوران میں جب شاہزادۂ اورنگ زیب (کرم خوردہ ... کذا) کو صوبجات دکن کی نظامت ملی تو وہ امیر الامرا کے گھر ان کی عیادت کو گیا اور خلوت میں کہا میں آپ سے ایک تحفے کا طلب گار ہوں۔ اگر آپ قبول فرمائیں تو میں آپ سے عرض کروں۔ امیر الامرا نے عرض کیا۔ آپ پر سے میرے جان و مال نثار ہیں۔ اورنگ زیب نے کہا۔ مرشد قلی خاں کو ہمیں دے دیجیے۔ یار وفادار نے جواب دیا۔ اگر حضور (شاہ جہاں) رخصت دے دیں تو وہ جان و مال سے حاضر ہیں۔ انھوں (اورنگ زیب) نے فیہ مافیہ پر نظر کرتے ہوئے کہا کہ اس سلسلے میں ہمارا عرض کرنا درست نہیں .... جس طرح بھی ہو حضور سے رخصت دلانے کی ذمہ داری آپ اپنے سر لیں۔ اورنگ زیب کا اصرار اس حد تک پہنچا کہ امیر الامرا نے ہر ممکن کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ کچھ عرصے بعد جب وہ تندرست ہوئے تو دربار آئے۔ کئی دفعہ تمہید اٹھانے کے بعد مدعا عرض کیا۔ مگر بادشاہ نے یہ بات سن کر ٹال دی۔ اس سے یار وفادار کو سخت پریشانی ہوئی ساتھ بیٹھنے والوں میں سے کسی نے پریشانی کی وجہ دریافت کی۔ امیر الامرا نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ وہ سوال کرنے والا خوشحال کلاونت کا ہم سایہ تھا اور اس سے بڑے اچھے تعلقات رکھتا تھا۔ دربار کا ذکر کرتے ہوئے اس شخص نے (کلاونت کو) یہ واقعہ بھی سنایا۔ خوشحال خاں نے کہا کہ اگر امیر الامرا مجھے ایک لاکھ روپیہ عنایت فرمائیں تو شاید

مرشد قلی خاں کی رخصت کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس عزیز .... نے دوسرے دن خوشحال خاں کا یہ مقولہ انھیں (امیر الامرا) کو سنایا انھوں نے کہا کہ ایک لاکھ روپیہ دینا معمولی بات ہے مگر میں اسے عار سمجھتا ہوں کہ میری درخواست تو منظور نہ ہو اور کلاونت کے ذریعہ میں اپنا کام نکالوں۔ اس شخص نے امیر الامرا کی یہ بات خوشحال خاں سے کہی۔ اس نے جواب دیا کہ لطف تو یہی ہے کہ درخواست خود امیر الامرا کریں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ (درخواست اس وقت پیش کی جائے) جب یہ کمینہ اشارہ کرے۔

چند روز بعد نوروز کی تقریب میں جشن ہوا اور مغنیانِ مذکور ..... نے راگنی ٹوڈی تان سین سے گانے کی ابتدا کی اور طبع مبارک کے پسندیدہ دھرپد اس انداز میں گائے کہ مزاجِ مقدس پوری طرح متاثر ہو گئے .... اس وقت خوشحال خاں نے امیر الامرا کو اشارہ کیا اور انھوں نے مرشد قلی خاں کے رخصت کی درخواست پیش کر دی ...... عرضی پر دستخط کر دیے گئے اور امیر الامرا نے سیاہہ خلعت خانے کو بھیج دیا۔ دوسرے دن دیوان میں مرشد قلی خاں کو خلعت خانہ سیاہہ کے ساتھ دو داروغاؤں نے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ تاکہ خلعتِ رخصت عنایت ہو .... بادشاہ نے کہا ہم نے مرشد قلی خاں کو رخصت کی ہرگز اجازت نہیں دی۔ یار وفادار نے .... عرضی .... پیش کی .... اس وقت آنحضرت نے کہا کہ دستخط کرتے وقت درخواست پر ہماری توجہ نہیں تھی چونکہ اظہارِ غفلت مناسب نہیں تھا اس لیے بہر حال خلعت رخصت کا حکم ہو گیا۔ اورنگ زیب خانِ مذکور کی رفاقت کو فوزِ عظیم جانتا تھا اور بہت بڑی عنایت سمجھتا تھا یہاں تک کہ دوسری لڑائی (۱۰۶۸ھ میں جسونت سنگھ نے داراشکوہ کی

حمایت میں اورنگ زیب سے جنگ کی تھی) میں داراشکوہ نے انھیں
جان سے مار دیا۔ اکثر اوقات شاہجہاں یارِ وفادار (مرشد قلی خاں)
کی تعریف کرتے تھے اور ان کے قتل پر اظہار افسوس کرتے۔ اسمٰعیل
قلی خاں صاحب جو ۱۱۰۷ھ میں عظیم آباد میں مقیم ہیں۔ وہ مرشد قلی خاں
کے پوتے ہیں۔ اور مرزا ..... رفیع ان کے نواسے[1]۔

بقول قاضی عبدالودود[2] صاحب ان میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کی دوسرے ذرائع سے تصدیق نہیں ہوتی۔ اور بعض تو صریحاً غلط ہیں۔ خان راسخ نے مرشد قلی خاں کے حالات اسمٰعیل قلی خاں سے سنے ہوں گے۔ ضروری نہیں کہ راسخ نے اسمٰعیل قلی خاں اور سودا کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ غلط ہو۔ ممکن ہے خان راسخ کے خود سودا سے بھی تعلقات رہے ہوں۔

مرشد قلی خاں اپنے زمانے کے مشہور اور نامور امیروں میں تھے۔ وہ ابتدا میں علی مردان خاں زیک حاکم قندھار کے ملازم تھے۔ جب علی مردان خاں نے قندھار کا قلعہ شاہجہاں کے حوالے کرکے اپنی فوج کے ساتھ اس کی ملازمت اختیار کی تو مرشد قلی خاں بھی اس کے ہمراہ تھے۔ یہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے بہت جلد بادشاہ کو عزیز ہو گئے۔ جلوسِ شاہجہانی کے انیسویں سال خنجر خاں کی جگہ پر کانگڑہ کی فوجداری پر مقرر کیے گئے جب اورنگ زیب بلخ اور بدخشاں کی صوبہ داری پر نامزد ہوا تو مرشد قلی خاں کو بخشی گیری فوج پر متعین کیا گیا۔ جلوس کے بائیسویں سال میں جاں نثار خاں

۱- عنایت خاں راسخ، ذکر مغنیانِ ہندوستان بہشت نشان (قلمی)، پٹنہ، بحوالہ معاصر، حصہ ۲، ص ص ۱۱۱ - ۱۱۴

۲- معاصر، حصہ ۲، ص ۱۱۴

کی جگہ آختہ بیگی کا عہدہ ملا۔ اور چوبیسویں سال میں لاہور کے صوبہ دار مقرر ہوئے
جلوس کے چھبیسویں سال میں جب شہزادہ اورنگ زیب نے صوبۂ دکن
کے انتظام کی طرف توجہ کی اور ہزار و پانصدی اور پانصد سوار کے منصب
پر فائز ہوا۔ اور بالا گھاٹ کی خدمتِ دیوانی ملی تو مرشد قلی خاں بھی ساتھ تھے
اور دستوری کے عہدے پر سرفراز تھے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں
اورنگ زیب کی سفارش پر پانصدی منصب اور خطاب خانی ملا ۔ انتیسویں
سال میں منصب میں پانصد سوار کی افزونی ہوئی۔ اور ملتفت خاں کے بدلے
انھیں پایاں گھاٹ کی خدمتِ دیوان پر سرفراز کیا گیا۔ جب داراشکوہ نے
شاہ جہاں پر اتنا قابو پالیا کہ کاروبارِ حکومت میں صرف اس کا نام باقی رہ
گیا۔ تو اورنگ زیب اس طرف متوجہ ہوا۔ بہت کم وقت میں اس نے ایک
شاندار لشکر تیار کر لیا۔ اور ایک اچھے قسم کا توپ خانہ ترتیب دیا۔ اس صوبہ
میں شاہ جہاں کے جتنے ملازم تھے۔ سب اورنگ زیب کے ساتھ ہو گئے مرشد
قلی خاں بھی اورنگ زیب کے ملازم ہو گئے۔

یہاں مرشد قلی خاں کی وفاداری کا وہ واقعہ نقل کرنا بے موقع نہ ہوگا
جو حمید الدین خاں نے بیان کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرشد قلی خاں
کو اورنگ زیب کے مزاج میں کتنا دخل تھا۔ جب اورنگ زیب کو دکن کی
صوبہ داری ملی اور وہ اورنگ آباد کے لیے روانہ ہوا تو راستے میں برہان پور
میں قیام کیا۔ یہاں اتفاقاً اس کی نظر اپنے خالو سیف خاں کی ایک حرم
زین آبادی (جس کا اصل نام ہیرا بائی تھا) پر پڑ گئی۔ جس نے اورنگ زیب
کے ہوش و حواس چھین لیے۔ اورنگ زیب نے مرشد قلی خاں سے (جن سے
محرمیتِ خاص حاصل تھی) دل کا حال بیان کیا۔ مرشد قلی خاں نے عرض کیا کہ

میں سیف خاں کو قتل کر دیتا ہوں۔ میدان صاف ہو جائے گا۔ میرا جو حشر ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔ اورنگ زیب نے جواب دیا کہ تمھاری جاں نثاری کا میں قائل ہوں۔ مگر میں خالو کو قتل کرنا نہیں چاہتا۔ تم جا کر اُن سے سارا واقعہ کہہ دو۔ جب سیف خاں نے یہ بات سُنی تو اپنی بیوی کی معرفت کہلا بھیجا کہ اورنگ زیب اپنی حرم چتر بائی میرے پاس بھیج دیں۔ میں زین آبادی کو دے دوں گا۔ اورنگ زیب نے شرط منظور کر لی اور وہ حرم اورنگ زیب کے پاس آگئی۱۔

مرشد قلی خاں نے اورنگ زیب کی وفاداری ہی میں جان دی۔ ۱۰ رجب ۱۰۶۸ھ کو جب رایات پادشاہی نے آب نربدا پار کیا تو دارا شکوہ کے حامی مہاراجہ جسونت سنگھ سے لڑائی کرنی پڑی۔ اس وقت مکند سنگھ ہادہ، رتن راٹھور، دیال داس جھالہ جیسے بہادر اور دلیر راجپوت مہاراجہ جسونت کے ساتھ تھے۔ مہاراجہ نے پہلے اورنگ زیب کے توپ خانے پر حملہ کیا جو مرشد قلی خاں کے اہتمام میں تھا۔ انھوں نے جان پر کھیل کر دشمنوں کا مقابلہ کیا، اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ اور مقابلہ کرتے ہوئے جان دیدی۔ مولفِ ماثرالامرا اُن کے بہت مداح ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مرشد قلی خاں جوشش بہادری اور نشۂ سپہ گری کے وصف کے باوجود اعلیٰ درجہ کی انتظامی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ بڑے دیانت دار اور خدا ترس تھے۔ دیوانی دکن کے زمانے میں عوام کی فلاح و بہبودی کے لیے بہت کوشاں رہے۔ زمین کاشتکاروں

۱۔ حمید الدین خاں نیمچۂ عالم گیری، احکام عالمگیری، مرتبہ جادو ناتھ سرکار، کلکتہ ۱۹۱۲ء، ص ص ۶-۸

میں تقسیم کر دی تھی۔ جس میں کاشتکار کو پیداوار کا چوتھا حصہ داخلِ سرکار کرنا ہوتا تھا۔ انھوں نے زمین سے متعلق ایک دستور العمل بنایا جس پر مدتوں عمل ہوا۔[۱]

مرزا شفیع

مرزا کے والد مرزا شفیع کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ چونکہ مرزا کے اجداد ہندوستان آ کر دہلی میں آباد ہوئے تھے۔ اس لیے قیاس ہے کہ مرزا شفیع بھی دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہ بتانا بھی بہت مشکل ہے کہ مرزا کے اجداد ہندوستان سپاہی کی حیثیت سے آئے تھے یا تاجر کی؟ اور مرزا شفیع کے والد کا پیشہ کیا تھا؟ بہر حال مرزا شفیع ایک تاجر تھے۔ قائمؔ نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ عملِ تجارت میں مشہور تھے۔ اور یہ بھی قائمؔ کا بیان ہے کہ انھوں نے جو ترکہ چھوڑا تھا۔ مرزا نے بہت جلد دوست نوازی میں اسے ختم کر دیا۔[۲] جس کا مطلب یہ ہے کہ مرزا شفیع کی مالی حالت اچھی خاصی تھی۔

مرزا کا نام

میرؔ نے مرزا کا نام مرزا رفیع لکھا ہے۔[۳] لیکن اشپرنگر نے گردیزی کے حوالے سے مرزا رفیع الدین بتایا ہے۔[۴] جبکہ گردیزی خود مرزا محمد رفیع لکھتے ہیں۔[۵] لیکن عبرت الغافلین کے دیباچے میں

۱۔ مرشد قلی خاں کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہوں۔ محمد ہاشم خافی خاں، منتخب اللباب، مرتبہ مولوی کبیر الدین احمد، کلکتہ، ۱۸۷۴ء، ص ص ۷۳۱۔۷۴۳ ـــ نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں، مآثر الامرا، ۳، مرتبہ مولوی مرزا اشرف علی، کلکتہ، ۱۸۹۱ء، ص ص ۷۹۳۔ ۷۹۶ ـــ منشی محمد کاظم، عالمگیر نامہ، مرتبہ مولوی خادم حسین و مولوی عبد الحیٔ، کلکتہ، ۱۸۶۸ء ص ص ۴۴۔ ۵۴ ـــ ۲۔ مخزنِ نکات، ص ۳۵۔ ۳۔ میر تقی میرؔ، نکات الشعرا، مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء، ص ۳۱۔ ۴۔ اشپرنگر، یادگارِ شعرا، ترجمہ طفیل احمد، الہ آباد، ۱۹۴۳ء، ص ۱۱۱۔ ۵۔ سید فتح علی حسینی گردیزی، تذکرۂ ریختہ گویان، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء، ص ۶۷۔

سودا اپنا نام صرف محمد رفیع لکھتے ہیں[1]۔ ان کا نام وہی ہے جو گردیزی نے لکھا ہے یعنی "مرزا محمد رفیع"۔

مرزا کی ولادت

مرزا کے سنِ ولادت کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔ ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں جس سے اس امر پہ براہِ راست روشنی پڑتی ہو۔ اس لیے تذکرہ نگاروں نے محض قیاس سے کام لیا ہے۔ جو بیشتر غلط ہے۔ مثلاً مولانا محمد حسین آزاد نے اُن کا سنِ پیدائش ۱۱۲۵ھ لکھا ہے[2]۔ یہ سنِ پیدائش قرار دینے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ میر اور سودا ہم عصر اور ایک دوسرے کے حریف تھے۔ آزاد نے اُن کی ادبی چشمکوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ چونکہ آزاد کے نزدیک میر کا سن پیدائش ۱۱۲۵ھ ہے اس لیے ممکن ہے کہ انھوں نے میر کے حریف سودا کو ہم عمر ثابت کرنے کے لیے یہ سنِ ولادت قرار دے دیا ہو[3]۔ ناصر لکھنوی نے لکھا ہے کہ ایک فقیر نے پیشین گوئی کی تھی کہ

"انشاء اللہ تعالیٰ شہرت تیری چہار دانگ ہندوستان میں بے حد وحساب اور عمر تخلص کے ہم عدد ہوگی[4]"۔

۱۔ کلیاتِ سودا، مرتبہ آسی، ص ۳۷

۲۔ آبِ حیات، ص ۱۴۸

۳۔ بہت سے تذکرہ نگاروں نے مرزا کا سنِ ولادت ۱۱۲۵ھ لکھا ہے۔ مثلاً دتی کا دبستان شاعری ص ۱۵۰۔ حکیم سید عبدالحی، گل رعنا، اعظم گڑھ، ۱۳۴۱ھ، ص ۱۳۳۔ جگن ناتھ پرشاد، گلزارِ سخن لکھنؤ، ۱۳۲۶ھ، ص ۲۱۲ — ان کا ماخذ آبِ حیات ہی معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ تذکرہ خوش معرکۂ زیبا (قلمی) لکھنؤ۔

مرزا کے تخلص "سودا" سے ۱۱۷ برآمد ہوتا ہے۔ اس طرح ان کا سنِ ولادت ۱۱۲۴ھ قرار پاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آزادؔ کا ماخذ یہ تذکرہ رہا ہو۔

شیخ چاند نے مرزا کا سنِ ولادت ۱۱۰۶ھ قرار دیا ہے۔ وہ قیام الدین قائمؔ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"قائمؔ نے لکھا ہے کہ بہادر شاہ کے زمانے (۱۱۱۹ھ تا ۱۱۲۴ھ) میں مرزا رفیع، بہادر شاہ کی فوج کے ساتھ دکن گئے تھے۔ اگر اس بیان کو صحیح تسلیم کریں تو اس زمانے میں اس کی عمر فوجی ملازمت کے لیے کم از کم ۱۸ سال ہو گی اور اس لحاظ سے سنِ ولادت ۱۱۰۶ھ سے قبل ہو سکتا ہے[۱]۔"

شیخ چاند کے اس معروضے کی بنیاد قائمؔ کے اس بیان پر ہے کہ

"مرزا ابو طالب المتخلص بہ طالب مردے بود ہفتاد سالہ از متوطنانِ قبضۂ بلنڈہ کہ در نواح اورنگ آباد است۔ در لشکرِ بہادر شاہ سابقۂ آشنائے باعموے بزرگوار حضرتم مرزا رفیع صاحب بہم رساند، ہمراہ لشکر ظفر اثر بہ رفاقت ایشاں برائے کارِ جاگیرِ خود بہ دارالخلافت شاہجہاں آباد رسیدہ تا مدتے کہ اقامت نمود ہم خانۂ ایشاں بود[۲]۔"

شیخ چاند نے اس عبارت کا مطلب یہ لیا ہے کہ مرزا ابو طالب قائمؔ کے چچا یعنی مرزا رفیع کے آشنا تھے۔ اور جب مرزا بہادر شاہ اول کی فوج کے ساتھ دہلی آئے تو ابو طالب بھی ساتھ تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قائمؔ کی مراد مرزا کے چچا سے ہے خود مرزا سے نہیں۔ کیونکہ پورے تذکرے میں

۱۔ سودا، ص ۳۵

۲۔ مخزنِ نکات، ص ۹

قائم نے کہیں بھی مرزا کو چچا نہیں لکھا۔ مرزا ابو طالب ہی کے ذکر میں قائم نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"بعضے ازیں احوال و اشعار کہ سابق مرقوم شدہ، زبانی مرزا ابو طالب مسطور بہ مرزا صاحب رسیدہ بود از ایشاں علی سبیل ذکر و مذکور بہ فقیر معلوم گردیدہ"[1]

امکان اس بات کا ہے کہ ابو طالب، مرزا کے سنِ شعور تک دہلی میں رہے ہوں کیونکہ اگر ہم قائم کے بیانات کا مطلب وہی لیں جو شیخ چاند نے لیا ہے تو مرزا کا سنِ پیدائش ۱۱۰۶ھ قرار پاتا ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مرزا کی ولادت ۱۱۰۰ھ سے قبل ہوئی۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ آزاد لائبریری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں کلیاتِ سودا کا ایک نادر قلمی نسخہ ہے اور اس پہ کسی لچھمی نرائن کی مہر اور (۱۱۱۶ھ / ۱۷۰۴ء) لکھا ہوا ہے۔ گویا یہ کلیات ۱۱۱۶ھ کے قریبی زمانے میں لکھا گیا۔ اگر شیخ چاند کا بتایا ہوا سنِ ولادت یعنی ۱۱۰۶ھ تسلیم کر لیا جائے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک دس سال کا بچہ اتنا بڑا شاعر ہو جائے کہ اس کا کلیات مرتب ہو جائے۔ ہاں ایک سولہ سال کے لڑکے سے یہ توقع کی جا سکتی ہے۔[2]

۱۔ مخزنِ نکات، ص ۱۰

۲۔ صدیقی صاحب کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"ہمارا خیال ہے کہ ولادت ۱۱۰۰ھ / ۱۶۸۸ء سے قبل ہوئی ہوگی اور اگر یہ بھی مان لیں کہ دیوان ۱۱۱۶ھ / ۱۷۰۴ء میں ہی لچھمی نرائن کے قبضہ میں آیا تو اس وقت سودا کی عمر پندرہ سولہ سال کی ہو چکی ہوگی اور اس مدت میں سودا جیسے قادر الکلام شاعر کا صاحبِ دیوان ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔"

ڈاکٹر محمد ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، علی گڑھ، ۱۹۴۴ء، ص ۸۸

شیخ چاند اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے قرار دیے ہوئے سنین کا مطلب یہ ہوگا کہ مرزا اپنے استاد شیخ حاتم (سنِ ولادت ۱۱۱۱ھ[1]) مرزا مظہر (سنِ ولادت ۱۱۱۰ھ[2]) سے عمر میں بڑے تھے اور خانِ آرزو (سنِ ولادت ۱۰۹۹ھ) کے ہم عمر تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو تذکرہ نگار اس کا ضرور ذکر کرتے۔ اس کے برعکس خانِ آرزو، مرزا مظہر اور حاتم وغیرہ کے مقابلے میں مرزا کے ساتھ اُن کا جو رویّہ ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سب لوگ مرزا کو ان تمام لوگوں کا نہ صرف خورد بلکہ عقیدت مند سمجھتے تھے۔

اگر ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا یہ بیان کہ مرزا کا کلیات ۱۱۱۶ھ سے قبل مرتب ہو چکا تھا، تسلیم کر لیں تو ہمیں شمالی ہند کی تاریخ ادب اُردو میں بہت سی بنیادی تبدیلیاں کرنی ہوں گی اور بہت سے نظریات کو بدلنا ہوگا ــــ امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے مجھے بتایا تھا کہ اگر خوردبین کی مدد سے کلیاتِ سودا کا نسخہ پڑھا جائے تو یہ مہر صاف پڑھی جاتی ہے۔ اور وہ ۱۱۱۶ھ نہیں بلکہ ۱۱۷۶ھ ہے۔ میں نے خود بھی اس امر کی تصدیق کی ہے اس لیے صدیقی صاحب کا قرار دیا ہوا سنِ ولادت بھی درست نہیں۔

قاضی عبدالودود نے اس سلسلے میں بہت سے مقالے لکھے ہیں اور سب سے آخری مقالے میں مرزا کا سنِ ولادت ۱۱۲۸ھ تسلیم کیا ہے[3]۔ قاضی صاحب کی دلیل یہ ہے کہ میر سوزا اپنے ایک معاصر شاہ کمال الدین کمال سے کہا

۱۔ سید محی الدین قادری زور، سرگزشت حاتم، حیدر آباد، ۱۹۴۴ء، ص ۲۱

۲۔ مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط، ص ۱۳

۳۔ سب رس، نومبر ۱۹۶۰ء، ص ۸

کرتے تھے کہ مرزا مجھ سے عمر میں ایک سال چھوٹے ہیں۔ میر سوز کی وفات ۱۲۱۳ھ میں ہوئی تھی۔ جرأت نے مادہ تاریخ یہ نکالا تھا۔ ع

داغ اب سوز کا لگا دل کو

۱۲۱۳ھ

اور ایک یا اس سے زیادہ تذکروں میں مرقوم ہے کہ وفات کے وقت میر سوز کی عمر اسّی سے متجاوز تھی۔ اگر اس وقت میر سوز کی عمر بچیاسی سال مان لی جائے تو زمانۂ ولادت ۱۱۲۷ھ کے لگ بھگ قرار پاتا ہے۔ اس طرح مرزا کا سنِ ولادت ۱۱۲۸ھ ہوگا۔

لیکن اس سن کو تسلیم کرنے میں دقّت یہ ہے کہ ہمیں یہ مفروضہ قائم کرنا پڑتا ہے کہ وفات کے وقت میر سوز کی عمر بچیاسی سال ہوگی۔ اگر کسی تذکرہ نگار نے یہ لکھا ہے کہ میر سوز اسّی سے تجاوز کر گئے تھے تو ہم یہ کیوں نہ فرض کریں کہ میر سوز کی عمر اکیاسی یا بیاسی سال ہوگی جو زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ اس طرح مرزا کا سنِ ولادت ۱۱۳۱ھ کے قریب ہوگا۔ یہاں سودا کے ایک شاگرد شیدا کا ایک شعر قابلِ غور ہے جو میر تقی میر کی ہجو میں کہا گیا تھا۔

جن روزوں یہ حاصل تھا سخن کا اسے کمال
تھی میر کی تب مبتدیانہ بھی نہ تقریر

اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا عمر میں میر سے کافی بڑے تھے میر کی ولادت ۱۱۳۵ھ میں ہوئی[1]۔ اس شعر میں عمر کے جس تفاوت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ صرف چار سال یا قاضی صاحب کے بتائے ہوئے

۱۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، میر تقی میر، علی گڑھ، ۱۹۵۴ء، ص ۶۱

سنِ ولادت کے مطابق صرف آٹھ سال قرینِ قیاس نہیں۔

اس سلسلے میں دو تذکرے بہت اہم ہیں جو مرزا کی ولادت پر روشنی ڈالتے ہیں اور سنِ ولادت کے تعین میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ ایک تو نقش علی کا "باغِ معانی" اور دوسرا میر حسن کا تذکرہ شعرائے اُردو"۔ نقش علی مرزا سے براہِ راست تعلقات کے مدعی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"با مولفِ ایں اجزا (نقش علی) اشفاقِ بسیار ظاہر می نماید"۔[۱]

اس بیان کی روشنی میں کوئی وجہ نہیں کہ ہم نقش علی کے بیان پر شبہ کریں وہ لکھتے ہیں کہ مرزا کی عمر پچپن سال کو پہنچ چکی ہے[۲]۔ نقش علی نے بقول قاضی عبدالودود مرزا کا ترجمہ ۱۱۷۴ھ کے لگ بھگ لکھا ہے[۳] جس سے مرزا کا سنِ ولادت ۱۱۱۸ھ نکلتا ہے۔ اس کی تصدیق میر حسن کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ مرزا ۱۱۸۵ھ میں فرخ آباد سے فیض آباد گئے تھے۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ مرزا آج کل نواب شجاع الدولہ بہادر کی سرکار میں وسیلۂ فنِ شاعری سے سرفراز ہیں[۴]۔ نواب شجاع الدولہ کا انتقال آخر ذیعقدہ ۱۱۸۸ھ میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ میر حسن نے مرزا کا ترجمہ ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان لکھا ہے۔ جب مرزا فیض آباد آئے تھے میر حسن اکثر ان سے ملاقات کرتے تھے۔ جس کا ذکر انھوں نے خود تذکرے میں کیا ہے۔

۱۔ باغِ معانی (قلمی)، ورق ۶۲ ب

۲۔ ایضاً

۳۔ سب رس، نومبر ۱۹۶۰ء، ص ۷

۴۔ میر حسن، تذکرہ شعرائے اُردو، مرتبہ مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، دہلی، ۱۹۴۰ء، ص ۸۳

اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ مرزا کا ترجمہ لکھتے ہوئے انھوں نے مرزا سے ان کی عمر دریافت نہ کی ہو۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مرزا کا سنِ شریف ستر سال کو پہنچ گیا ہے۔ چونکہ یہ عبارت ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان لکھی گئی ہے اس لیے مرزا کا سنِ ولادت ۱۱۱۵ھ[1] اور ۱۱۱۸ھ کے درمیان قرار پاتا ہے۔ اگر ہم ۱۱۱۸ھ تسلیم کریں تو نقش علی کے بیان کی بھی تصدیق ہوجاتی ہے۔ اس لیے ۱۱۱۸ھ ہی قرار دینا مناسب ہے۔

مرزا کی ابتدائی زندگی

مرزا کے بچپن کے حالات کا ہمیں کچھ علم نہیں۔ اُن کا کلام دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے مروّجہ علوم ضرور حاصل کیے تھے۔ فارسی زبان پر انھیں اچھی خاصی قدرت تھی۔ بعض تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق انھوں نے ادبی زندگی کا آغاز ہی فارسی شعر گوئی سے کیا تھا۔

۱۔ (ل) کلب علی خاں فائق نے مرزا کا سنِ ولادت ۱۱۱۸ھ — ۱۱۲۰ھ کے درمیان بتایا ہے
سوؔدا کی صحیح عمر، معارف جولائی ۱۹۵۲ء، ص ص ۶۴-۷۵

(ب) پہلے خود قاضی صاحب بھی مرزا کے سنِ ولادت کو ۱۱۱۵ھ۔ اور ۱۱۱۸ھ کے درمیان قرار دیتے تھے۔ سب رس، نومبر ۱۹۶۰ء، ص ۷

(ج) بعض تذکرہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا نے ۶۰ سال کی عمر میں دہلی چھوڑی۔ یہ صحیح نہیں۔ اُس وقت مرزا کی عمر لگ بھگ ۵۵ سال تھی۔ ان تذکروں میں قابلِ ذکر یہ ہیں :۔
مردان علی خاں مبتلا، گلشنِ سخن (قلمی)، رام پور، ورق ۵۶ ب
مرزا علی لطف، گلشنِ ہند، مرتبہ مولوی شبلی اور مولوی عبدالحق، لاہور، ۱۹۰۶ء، ص ۱۰۳۔

مرزا کی والدہ کے بارے میں تو کچھ پتا نہیں چلتا۔ البتہ قائم کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے والد کا جب انتقال ہوا ہے تو وہ سنِ شعور کو پہنچ چکے تھے۔ قائم نے لکھا ہے۔

"آں (مرزا) کے والد مرزا شفیع نام مغل زاد عمل تجارت میں مشہور تھے۔ ان کی وفات کے بعد ترکہ میں جو کچھ دولت مرزا کے ہاتھ آئی۔ اسے شاعر مزاجی کی وجہ سے قلیل مدت میں دوستوں میں اڑا دیا اور مصاحبت اختیار کر لی!"[1]

(فارسی سے ترجمہ)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کو جو کچھ ترکہ میں ملا تھا۔ انھوں نے دوستوں میں اڑا دیا۔ اور مصاحب ہو گئے۔ میر نے نوکر پیشہ لکھا ہے[2] جس سے بظاہر مراد مصاحبت ہی ہے اور کم از کم سپہ گری تو ہرگز نہیں[3]۔ مرزا کے ہمعصر تذکرہ نگاروں میں صرف گردیزی نے انھیں سپاہی پیشہ لکھا ہے[4] جس کا کوئی اور ثبوت نہیں ملتا۔

۱۔ مخزنِ نکات ص ۳۵

۲۔ نکات الشعرا، ص ۳۱

۳۔ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی نے انھیں منصب دار لکھا ہے۔ جو کسی طرح درست نہیں۔ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی، گلشنِ گفتار، مرتبہ، سید محمد، حیدرآباد، ۱۳۲۹، ص ۳۷

۴۔ سید فتح علی حسینی گردیزی "تذکرہ ریختہ گویان، مرتبہ مولوی عبدالحق، ص ۶۷

بعد کے تذکروں میں شاہ محمد حمزہ نے بھی انھیں سپاہی پیشہ لکھا ہے۔ فص الکلمات (قلمی) رامپور، ورق ۲۱۷ ب — دراصل فص الکلمات میں جو شعرا کا ذکر ہے وہ گردیزی کے تذکرے کی نقل ہے۔ کہیں کہیں شاہ حمزہ نے اضافہ کیا ہے۔ (خ۔ا)

شیخ چاند نے گردیزی کے بیان کو صحیح تسلیم کیا ہے اور مزید ثبوت کے طور پر مرزا کے یہ دو اشعار بھی نقل کیے ہیں۔

کہی جاتی نہیں وہ مجھ سے جو اس ظالم نے
جس طرح کی میری اوقات میں ڈالی ہل چل
لا بٹھایا ہے مجھے گھر بار چھڑا لشکر میں
پال بے چوب تلے اپنے بغیر از پر تل

یہ اشعار ایک قصیدے کے ہیں۔ جو مرزا نے حضرت علیؑ کی شان میں کہا تھا۔ شیخ چاند کا خیال ہے کہ مرزا نے اوائل جوانی ہی میں پیشہ سپہ گری ترک کر کے مصاحبت اختیار کر لی تھی۔ ان کے خیال سے یہ قصیدہ نو عمری اور نومشقی کے زمانے کا ہے۔ لیکن اس قصیدے میں جو فنی مہارت، زبان و بیان پر قدرت اور پختگی نظر آتی ہے۔ اسے دیکھ کر ہرگز یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مرزا کا ابتدائی کلام ہے۔ مزید برآں قصیدے میں مرزا نے جو تعلی کی ہے وہ بھی ایک خاص عمر پہ پہنچ کر اور ایک ادبی مقام حاصل کرنے کے بعد ہی ممکن ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

اور میرا سخن آفاق میں تا یوم قیام
رہے گا سبز بہر مجمع و ہر ایک دنگل
تا ابد طرزِ سخن کی ہے مری رنگینی
جلوۂ رنگ چمن جاویگا اک آن میں ڈھل
ہو جہاں کے شعرا کا مرے آگے سرسبز
نہ قصیدہ نہ مخمس نہ رباعی نہ غزل

میرے خیال سے یہ قصیدہ اُس وقت کہا گیا ہے جب مرزا عماد الملک

کے ساتھ ترکِ وطن کرکے دہلی سے نکلے تھے۔ جس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

تعلیم و تربیت

مرزا کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ صرف ان کے کلام سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے مروّجہ علوم اور خاص طور پر فارسی کا اچھا مطالعہ کیا تھا۔ سری رام کا بیان ہے کہ مرزا کو ترکی، فارسی اور عربی ہر علم میں دستگاہ تھی[1]۔ اوّل تو سری رام کے بیان کی تصدیق کسی اور ذریعے سے نہیں ہوتی۔ اور دوسرے مرزا کے کلام سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ انھیں ترکی اور عربی میں بھی مہارت تھی۔

مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں: "(مرزا نے) دہلی میں پرورش پائی۔ کابلی دروازہ کے علاقہ میں ان کا گھر تھا۔ ایک بڑے پھاٹک میں نشست رہتی تھی۔ وہ دروازہ تباہئ دہلی میں تباہ ہوا۔ شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمۃ اکثر ادھر ٹہلتے ہوئے جا نکلتے تھے۔ میں (آزاد) ہم رکاب ہوتا تھا۔ مرزا کے وقت کے حالات اور مقالات کے ذکر کرکے قدرتِ خدا کو یاد کیا کرتے تھے[2]۔"

ریختہ گوئی کی ابتدا

مرزا کو ریختہ گو شاعر کی حیثیت سے ۱۱۵۴ھ کے لگ بھگ مقبولیت حاصل ہونی شروع ہوئی۔ رسالہ عبرت الغافلین اور سبیلِ ہدایت ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۵ھ کے درمیانی زمانے کی تصنیفات ہیں۔ عبرت الغافلین میں مرزا نے لکھا ہے کہ بندے نے بنتالیس[45]

۱۔ خم خانہ جاوید، ۴، ص ۳۶۴

۲۔ آبِ حیات، ص ۱۴۸

سال فنِ ریختہ میں ضائع کیے ہیں[1]۔ سبیلِ ہدایت میں مرزا لکھتے ہیں کہ "مخفی نہ رہے کہ عرصہ چالیس برس کا بسر ہوا ہے کہ گوہرِ سخن عاصی زیب گوش اہلِ ہنر ہوا ہے[2]۔" مرزا کے بیانات سے صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۱۴۰ھ اور ۱۱۵۰ھ کے درمیان ریختہ گوئی کا آغاز کیا اور قابلِ ذکر شاعروں میں وہ ۱۱۵۴ھ کے قریب شمار ہونے لگے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حاتم نے جس شاعر کی زمین میں غزل کہی ہے۔ اس کا نام بھی لکھ دیا ہے۔ دیوان زادہ حاتم میں ۱۱۳۱ھ سے ۱۱۶۹ھ تک کی غزلیں موجود ہیں۔ حاتم نے مرزا کی سات زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ پہلی تین غزلیں ۱۱۵۴ھ، ۱۱۵۹ھ، اور ۱۱۶۱ھ کی ہیں[3]۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ مرزا ۱۱۵۴ھ کے لگ بھگ نمایاں ہونے شروع ہوئے تھے۔

اس سے پہلے وہ فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ صاحبِ نشترِ عشق کا بیان ہے: "ابتدا میں موزونیت طبع کی وجہ سے فارسی گوئی شروع کی اور سراج الدین علی خاں آرزو سے اصلاح لی۔ خانِ آرزو نے کہا کہ کلامِ فارسی کا درجہ بہت بلند ہے اور ہماری تمھاری زبان ہندی ہے۔ ہر چند اہلِ ہند نے فارسی دانی کو مدارجِ ارتفاع تک پہنچا دیا۔ لیکن استادانِ سلف و ایران (کہ یہ ان کی زبان ہے) کے سامنے وہی حیثیت ہے جو چراغ کی آفتاب

۱۔ مرزا کے اصل الفاظ یہ ہیں .... چنانچہ بندہ ہم از چہل و پنج سال اوقات خود را در فنِ ریختہ ضائع ساختہ است۔ کلیاتِ سودا، مرتبہ آسی، ص ۴۲۴

۲۔ کلیاتِ سودا، آسی، ص ۴۳۴

۳۔ سرگزشت حاتم، ص ۱۱۷

کے سامنے ہوتی ہے۔ ابھی تک ریختہ گوئی میں کسی نے شہرت نہیں پائی۔ لہٰذا اگر تم اس زمانے میں مشقِ سخن کرو تو فیضِ طبیعت سے شاید اس فن کے امام ہو جاؤ چونکہ استاد سخن شورہ تھا۔ ان کو (مرزا) پسند آیا۔ اور اس دن سے ریختہ میں شعر گوئی کی ابتدا کی۔ اور تھوڑے زمانے میں مشقِ سخن کے بعد ریختہ گو شعرا کے اُستاد ہو گئے۔ زباں دانیٔ ریختہ کے بانی مبانی قرار پائے اور ہندوستان کے تمام ریختہ گو شعرا انھیں اس فن کا امام اور پیغمبر سمجھتے تھے۔"[1] (فارسی سے ترجمہ)

مرزا کا ایک قطعہ ہے۔ جس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ابتدا میں وہ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ لیکن بعد میں کسی فارسی داں نے ریختہ گوئی کا مشورہ دیا۔ قطعہ میں فارسی داں کا نام نہیں لیا گیا۔[2] لیکن صاحب نشترِ عشق کے بیان اور مرزا اور خانِ آرزو کے تعلقات، نیز خان آرزو کی ریختہ گو شعرا

۱۔ (ا) حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی، نشترِ عشق (قلمی)، رام پور، ص ۶۶۵

(ب) محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ (مرزا) خان آرزو کے شاگرد نہ تھے۔ مگر ان کی صحبت سے بہت فائدے حاصل کیے۔ چنانچہ پہلے فارسی شعر کہا کرتے تھے۔ خان آرزو نے کہا مرزا فارسی اب تمھاری زبان مادری نہیں۔ اس میں ایسے نہیں ہو سکتے کہ تمھارا کلام اہلِ زبان کے مقابل میں قابلِ تعریف ہو۔ طبع موزوں ہے شعر سے نہایت مناسبت رکھتی ہے۔ تم اُردو کہا کرو تو یکتائے زمانہ ہوگے۔ مرزا بھی سمجھ گئے اور دیرینہ سال استاد کی نصیحت پر عمل کیا۔ آبِ حیات، ص ۱۴۹۔

۲۔ کلیاتِ سودا مرتبہ آسی میں اس قطعہ کا عنوان "قطعہ ہجو مرزا فاخر مکیں" ہے۔ جو درست نہیں۔ لیکن بہت سے غیر مطبوعہ نسخوں میں اس قطعہ کا کوئی عنوان نہیں دیا گیا۔

کی سرپرستی کے پیشِ نظر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فارسی داں خان آرزو ہی تھے۔ شیخ چاند اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ اس قطعہ میں مرزا نے خسروؔ، فیضیؔ، آرزوؔ اور فقیرؔ جیسے فارسی شاعروں کے نام لیے ہیں۔ شیخ چاند کی دلیل یہ ہے کہ "خان آرزو کا مشورہ نہیں تھا۔ اگر وہ مشورہ دیتے تو اس طرح فخریہ مسلم الثبوت اساتذہ میں اپنا شمار نہ کرتے!" ہمارے خیال سے یہ دلیل مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ یہ قطعہ مرزا کا کہا ہوا ہے۔ آرزو کا نہیں۔ دوسرے یہ قطعی ناممکن ہے کہ جو کچھ مرزا اور اس فارسی داں کے درمیان گفتگو ہوئی۔ اسے مرزا نے ہو بہو نظم کر دیا ہو۔ کیوں کہ شعری ضرورتوں کی وجہ سے یہ ممکن نہیں۔ چونکہ وہ فارسی داں خانِ آرزو ہیں اور آرزو کا نام قطعہ میں بحیثیت استادِ فن آ گیا تھا۔ اس لیے مرزا کو آرزو کا نام پوشیدہ رکھنا پڑا۔ ورنہ بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ مرزا عنوان ہی میں فارسی داں کا نام نہ بتاتے۔ اب وہ قطعہ ملاحظہ فرمایئے۔

میں ایک فارسی داں سے کہا کہ اب مجھ کو
ہوئی ہے بندشِ اشعارِ فرس ذہن نشیں
جو آپ کیجیے اصلاح شعر کی میرے
نہ پایئے غلطی تو محاورہ میں کہیں
ہے اور زیرِ فلک ذاتِ میرزا فاخر
سلامت ان کو رکھے حق سدا برُوئے زمیں
سو کب انھوں کو ہے اصلاح کا کسو کی دماغ
قبول کب کرے ان کی متانتِ رنگیں

(سودا، ص ۱۴۱)

کہا یہ بعد تامل کہ دوں جواب تجھے
جو میری بات کا اے یار تجھکو ہووے یقیں
جو چاہے یہ کہ کہے ہند کا زباں داں شعر
تو بہتر اس کے لیے ریختے کا ہے آئیں
وگرنہ کہہ کے وہ کیوں شعر فارسی ناحق
ہمیشہ فارسی داں کا ہو موردِ نفریں
کوئی زبان ہو لازم ہے خوبیٔ مضموں
زبان فرس پہ کچھ منحصر سخن تو نہیں
اگر فہیم ہے تو چشمِ دل سے کر کے نظر
زباں کا مرتبہ سعدی سے لیکے تا بہ حزیں
کہاں تک اُن کی زباں تو درست بولے گا
زبان اپنی میں تو باندھ معنیٔ رنگیں
دیار ہند میں دو چار ایسے ہو گزرے
جنھوں نے باز رکھا مضحکے سے اپنے تئیں
چنانچہ خسرو و فیضی و آرزو و فقیر
سخن انھوں کا مثل کے لیے ہر قابلِ تحسیں
سوائے ان کے کوئی اور بھی ہو پر شاعر
سوادِ ہند میں وہ ہی ہیں بامزہ نمکیں

ایسے مشوروں اور ریختہ گوئی کی مقبولیت نے مرزا کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔

مرزا کا تخلص اشپرنگر نے قائم کے حوالے سے لکھا ہے کہ مرزا

نے تخلص سودا اپنے والد کے پیشے کے اعتبار سے رکھا تھا[1] لیکن قائم نے کہیں اس قسم کا ذکر نہیں کیا۔ آرزو لکھتے ہیں: "بعض کا قول ہے کہ باپ کی سوداگری سودا کے لیے وجہ تخلص ہوئی. لیکن بات یہ ہے کہ ایشیا کے شاعر ہر ملک میں عشق کا دم بھرتے ہیں اور سودا اور دیوانگی عشق کے ہم زاد ہیں۔ اس لیے وہ بھی ان لوگوں کے لیے باعث فخر ہے چنانچہ اس لحاظ سے سودا تخلص کیا[2]" سعادت خاں ناصر نے اس سلسلے میں ایک قصہ بیان کیا ہے کہ "ایک فقیر روشن ضمیر نظر توجہ کی مرزا موصوف کے حال پر مبذول رکھتے تھے۔ بعد وفات اُن کے پدر بزرگوار اس گوہر یتیم سے فرمانے لگے یہ وقت ہے کہ استدعا حاجت مندی کی درگاہ قاضی حاجات میں مقبول اور مستجاب ہو جو چاہو سو مانگو اس نے عرض کی آپ کی دولت سے استغنا تمام رکھتا ہوں اور اگر آپ بہ ضد ہیں تو دولتِ سخن کہ عبارت اس سے شعر گوئی ہے عنایت فرمایئے۔ اس مستجاب الدعوات نے تبسم فرمایا۔ اور دیوانہ لاؤبالی کے تخلص کے واسطے صرف سودا زبان پر لایا بعد اس عنایتِ بے غایت کے کہا: انشاء اللہ تعالیٰ شہرت تیری چہار دانگ ہندوستان میں بیحد و حساب اور عمر تخلص کے ہم عدد ہوگی[3]" ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں جس سے ناصر کے بیان کی تصدیق ہو سکے۔

۱۔ یادگار شعرا، ص ۱۱۱

۲۔ آب حیات، ص ۱۴۹

۳۔ تذکرۂ خوش معرکہ زیبا (قلمی)

سوداؔ کا تلمّذ شیخ چاند مرحوم نے سوداؔ کے صرف ایک اُستاد شاہ حاتمؔ کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ ان کے ہم عصر تذکرہ نگاروں کے بیانات سے چار استادوں کے نام ملتے ہیں۔ سب سے پہلا نام خانِ آرزوؔ کا ہے۔ قاسمؔ نے لکھا ہے کہ سوداؔ خانِ آرزو[1] کے شاگرد تھے۔ لیکن اپنے کچھ اشعار شاہ حاتمؔ کو بھی سناتے تھے[2]۔ کریم الدین نے بھی انھیں شاگردِ خان آرزوؔ لکھا ہے[3]۔ ہمارے خیال سے سوداؔ کو خان آرزوؔ سے باقاعدہ تلمّذ تو نہیں تھا۔ البتہ ان کی صحبت سے فیض ضرور اٹھایا تھا۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ میر تقی میرؔ اپنے تذکرے نکات الشعرا میں اس کا ذکر نہیں کرتے۔ جبکہ انھیں آرزوؔ کے شاگردوں کی فہرست بڑھانی منظور تھی۔ اس کے ثبوت موجود ہیں کہ سوداؔ خان آرزوؔ کے مشاعروں میں شریک

۱۔ سراج الدین علی خاں آرزوؔ کا سلسلۂ نسب شیخ کمال الدین خواہرزادہ شیخ نصیر الدین تک پہنچتا ہے اور والدہ کی طرف سے شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری عطاری پر منتہی ہوتا ہے۔ آرزوؔ ۱۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے (سرو آزاد ص ۲۲۰) عہدِ محمد فرخ سیر کے اوائل میں گوالیار میں کسی خدمت پر مامور ہوئے۔ ۱۱۳۲ھ میں دہلی آئے۔ دہلی میں آنند رام مخلصؔ کے توسط سے دربارِ شاہی میں رسائی ہوئی اور منصب و جاگیر عنایت ہوئے۔ اسحاق خاں شوستری بھی اُن کے مربّی تھے۔ اسحاق خاں کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نجم الدولہ ان کا خیال رکھتے۔ ڈیڑھ سو روپے ماہوار وظیفہ باندھ دیا۔ نجم الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سالار جنگ کے ساتھ آرزوؔ پورب چلے گئے۔ جہاں شجاع الدولہ کے دربار سے منسلک ہوگئے۔ نواب نے تین سو روپے ماہوار کا وظیفہ باندھ دیا۔ ۲۳، ربیع الاول ۱۱۶۹ھ کو انتقال ہوا۔ لاش دہلی لاکر مدفون کی گئی۔ آرزوؔ فارسی کے زبردست عالم اور شاعر تھے۔ عربی اور ہندی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ سنسکرت کے بھی ماہر تھے۔ فارسی میں ان کی متعدد تصنیفات ہیں۔ بقول قاسمؔ انھوں نے بابا فغانی اور کمال خجند کے دواوین کے جواب کہے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا ضخیم کلیات موجود ہے۔ نثر میں سراج اللغات، چراغ ہدایت، نوادر الالفاظ، موہبتِ عظمیٰ، عطیہ کبریٰ دادِ سخن، مجمع النفائس، تنبیہ الغافلین اور خیابان تصنیفات ملتی ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:۔
سرو آزاد، ص ص ۲۲۷ - ۲۳۱ — خزانۂ عامرہ، ص ص ۱۱۶ - ۱۱۹ — نکات الشعرا، ص ص ۳-۴۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۵ — اورنٹیل کالج میگزین، نومبر ۱۹۴۳، ص ص ۳ - ۲۵

۲۔ مجموعۂ نغز، ۱، ص ۳۰۴

۳۔ طبقات شعرائے ہند، ص ۱۰۴

ہوتے تھے۔ قدرت اللہ قاسم نے خان آرزو کے ترجمے میں لکھا ہے کہ ایک دن خان آرزو کے گھر پر مجلسِ مشاعرہ منعقد تھی۔ سودا نے حاجی محمد جان قدسی کی غزل کا ترجمہ کیا تھا اور بڑے شد و مد سے پڑھ رہے تھے۔ اتفاق سے اہلِ محفل میں کسی کو اندازہ نہ ہوا کہ قدسی کی غزل کا ترجمہ ہے۔ یا شاید اس خیال سے خاموش رہے کہ مترجم (سودا) معمولی سی بات پہ ہجو گوئی پر اُتر آتے تھے۔ خانِ آرزو نے البتہ بہت تعریف کی۔ اور دورانِ توصیف انھوں نے فی البدیہہ ایک شعر کہا۔

شعرِ سودا حدیثِ قدسی ہے
لکھ رکھیں چاہیے فلک پہ ملک[1]

۱۔ مجموعہ نغز، ۱، ص ص ۲۵-۲۶ ـــ

آزاد نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے لیکن قدرے ترمیم کے ساتھ۔ بظاہر ان کا ماخذ مجموعہ نغز ہی ہے۔ انھوں نے فارسی شعر اور اس کا ترجمہ بھی دیا ہے۔ فارسی کا شعر ہے۔

آلودۂ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را — اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را

سودا نے اس کا ترجمہ کیا تھا۔

آلودۂ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو — اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

آبِ حیات، ص ص ۱۷۲-۱۷۳

فارسی شعر دیوانِ قدسی میں نہیں ہے۔ البتہ مجالسِ رنگیں میں ہے۔ رنگین نے دو ایسے فارسی شعر نقل کیے ہیں۔ جن کا سودا نے اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ آزاد نے بھی وہی دونوں شعر اور ان کے تراجم نقل کیے ہیں قیاس یہ ہے کہ آزاد نے یہ دونوں شعر مجالسِ رنگین سے لیے ہیں۔

(سعادت یار خاں رنگین، مجالسِ رنگین، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب، لکھنؤ، ۱۹۲۹، ص ص ۸-۹) اور پہلا شعر خواہ مخواہ قدسی سے منسوب کر دیا ہے۔

سودا نے فارسی داں سے متعلق جو قطعہ لکھا ہے۔ اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خان آرزو کے باقاعدہ شاگرد نہیں تھے۔

سودا کے استادوں میں دوسرا نام سلمان قلی خاں وداد[1] کا ہے۔ خود وداد

۱۔ مصحفی اور قدرت اللہ قاسم نے ان کا نام سلیمان قلی خاں لکھا ہے، لیکن ان کے لڑکے مظہر علی خاں ولا سلمان لکھتے ہیں۔ اس لیے یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ ولا نے ڈاکٹر ولیم ہنٹر کی فرمائش پر ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء میں اقبال نامہ جہانگیری کا اُردو ترجمہ "جہاں گیر شاہی" کے نام سے کیا تھا۔ اس کتاب کی ابتدا میں انھوں نے اپنے خاندانی حالات بھی لکھے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں میں سلمان قلی خاں وداد کا چھوٹا بیٹا اور آقا محمد حسین اصفہانی کا پوتا ہوں۔ سید آقا محمد حسین اصفہان سے ہندوستان آئے تھے اور نواب سعید الدین خاں بہادر میر آتش کی وساطت سے محمد شاہ کے ملازم ہوئے۔ اپنی لیاقت اور قابلیت کی وجہ سے بادشاہ کے مزاج میں اتنا دخل پایا کہ بہت جلد بائیس خدمتوں پر مامور ہو گئے۔ علی قلی خاں کا خطاب محمد شاہ نے دیا تھا۔ اُن کی وفات کے بعد محمد شاہ نے سلمان قلی خاں وداد کو منگل باشی کے عہدے پر سرفراز کیا۔ شاہ عالم کے دور میں وداد نے نواب موسیٰ خاں کی ملازمت اختیار کر لی۔ بقول مصحفی انھیں تین سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ قاضی عبدالودود نے کلیاتِ ولا کے حوالے سے لکھا ہے کہ وداد کا انتقال ۱۱۸۱ھ میں ہوا۔ تاریخِ وفات اس شعر سے نکلتی ہے ؎

سالِ تاریخ ہاتف از سر — آہ
گفت ماوائے او ریاضِ جناں

(معاصر، حصہ ۲، ص ۲۲)

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں:۔ محمد عتیق صدیقی، گلکرسٹ اور اس کا عہد، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص ص ۳۰۶ — ۳۰۸ — غلام ہمدانی مصحفی، عقدِ ثریا، مرتبہ مولانا عبدالحق، دہلی ۱۹۳۴ء، ص ص ۵۹-۶۰ — مجموعۂ نغز، ۲، ص ۳۱۲

کے لڑکے مظہر علی خاں ولاؔ نے سوداؔ کو شاگردِ ودادؔ لکھا ہے[1]!

غالباً ریختہ گوئی کے ابتدائی زمانے میں سوداؔ کو سلیمان قلی خاں ودادؔ سے تلمذ تھا۔ بعد میں شاہ حاتمؔ سے رجوع کیا۔ مولانا محمد حسین آزادؔ[2] اور مولانا عبدالحی نے بھی ودادؔ سے سوداؔ کے تلمذ کا ذکر کیا ہے[3]!

سوداؔ کے تیسرے استاد شاہ حاتمؔ تھے۔ یہ واحد استاد ہیں۔ جن سے سوداؔ کے تلمذ میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ اکثر معاصر تذکرہ نگاروں کے بیانات سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے

قدرت اللہ قاسمؔ نے لکھا ہے کہ حاتمؔ کو سوداؔ کی استادی پر بہت ناز تھا۔ انھوں نے ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اکثر شاہ حاتمؔ یہ مصرع پڑھا کرتے تھے۔ ع

رتبہ شاگردی من نیست استاد مرا

اور کہا کرتے تھے کہ یہ مصرع میری استادی اور مرزا کی شاگردی کے متعلق کہا گیا ہے[4]!

قدرت اللہ قاسم نے اس سلسلے میں نظام الدین احمد

۱۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۳۰۷

۲۔ آبِ حیات، ص ۱۴۹

۳۔ گلِ رعنا، ص ۱۳۳

۴۔ مجموعہ نغز، ۱، ص ۱۸۰

صائغ[1] کا بھی نام لیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ جن دنوں سودا کو فارسی گوئی کا شوق تھا۔ وہ صائغ سے اصلاح لیتے تھے۔ علی ابراہیم خاں نے صرف اتنا لکھا ہے کہ صائغ محبانِ سودا میں ہیں[2]۔

سودا کے تلمذ سے متعلق دو دلچسپ لطیفے بھی سُن لیجیے۔ عنایت اللہ فتوت نے انھیں محمد میر تیبر کا شاگرد لکھا ہے۔ اور ثبوت کے طور پر مرزا کا

۱۔ نظام الدین احمد صائغ بلگرام کے رہنے والے تھے۔ شاہ حمزہ اور آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ نام سے سنِ ولادت نکلتا ہے۔ جو ۱۱۳۹ھ ہے۔ کریم الدین نے لکھا ہے کہ نام سے سنِ ولادت نکلتا ہے۔ جو ۱۱۰۸ھ ہے۔ اگر نظام دین احمد پڑھا جائے تو ۱۱۰۸ھ ورنہ ۱۱۳۹ھ نکلتا ہے۔ غالباً کریم الدین کا بیان درست ہے کیونکہ اگر وہ ۱۱۳۹ھ میں پیدا ہوتے۔ تو شاید سودا ان کا تلمذ اختیار نہ کرتے۔ صائغ نے میر نوازش علی سے تعلیم و تربیت پائی۔ اور انھیں سے مشقِ سخن کی۔ مصحفی کہتے ہیں میں نے انھیں لکھنؤ میں دیکھا ہے۔ بعد میں وہ کلکتہ چلے گئے تھے۔ علی ابراہیم خاں نے لکھا ہے آج کل کہ جلوس شاہ عالم کا بائیسواں سال ہے (۱۱۹۶ھ) مرشد آباد اور کلکتہ میں بسر کرتے ہیں۔ فارسی دیوان مرتب ہو چکا تھا۔ غالباً مرشد آباد یا کلکتہ میں انتقال کیا۔ صاحبِ معدن الجواہر ان کا سنِ وفات " اوائل مالۃ ثالثہ عشر " بتاتے ہیں۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں :- علی ابراہیم خاں خلیل، تذکرۂ ابراہیم، مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، علی گڑھ، ۳۴ ۱۹ء، ص ۱۶۹ ۔ خوب چند ذکا، عیار الشعرا (مائیکروفلم)، دلی یونی ورسٹی لائبریری، ورق ۱۲۲ ب ۔ عقدِ ثریا، ص ۳۸ ۔ سروِ آزاد، ص ص ۳۴۸ - ۳۴۹ ۔ نص الکلمات (قلمی)، ورق ۱۸۴ ب ۔ محمد مہدی واصف، معدن الجواہر، قلمی، آصفیہ، ورق ۱۰۸ الف ۔ مجموعۂ نغز، ۱، ص ۳۵۷

۲۔ گلزارِ ابراہیم، ص ۱۶۹

یہ شعر نقل کیا ہے۔

سوداؔ تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ
ہونا ہے تجھے میرؔ سے استاد کی طرف[1]

ناصر نذیر فراقؔ جو دردؔ کے خاندان سے ہیں۔ اپنے بزرگوں کی عظمت میں اضافہ کرنے کے لیے لکھتے ہیں: "مشاعرے آپ (دردؔ) کی بارہ دری میں طرنہ شان وشوکت سے ہوتے تھے ۔۔۔۔ سوداؔ، میرؔ اور میر سوزؔ وغیرہ استاد آتے اور بڑے ادب کے ساتھ غزل پڑھتے۔ اب مشاعرہ ختم ہو جاتا۔ اور آپ اور یہ تینوں باکمال اور لائق شاگرد رہ جاتے تو اُردو زبان کی درستی اور اصلاح کے دفتر کھولے جاتے[2]"

ملک الشعرا کا خطاب

ضیغم[3]، عبدالغفور نساخ[4] اور جگ ناتھ پرشاد[5] وغیرہ کا بیان ہے کہ سوداؔ کو نواب آصف الدولہ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ مگر یہ صریحاً غلط ہے کیونکہ میر تقی میر اور قیام الدین قائمؔ نے بہت پہلے انھیں ملک الشعرا لکھا تھا

محمد انوار حسین تسلیم سہوانی نے کلیاتِ سوداؔ مطبوعہ نول کشور ۱۲۸۹ھ کے اختتام پر ایک روایت بیان کی ہے کہ ایک دفعہ سوداؔ شیخ علی حزیںؔ سے ملنے

۱۔ عنایت اللہ فتوحؔ، ریاض حسنی (قلمی)، سینٹرل، ص ۱۲۳

۲۔ سید ناصر نذیر فراقؔ، میخانۂ دردؔ، دہلی، ۱۳۴۴، ص ۱۵۳

۳۔ محمد عبداللہ خاں ضیغمؔ، یادگارِ ضیغم (قلمی) ادارۂ ادبیاتِ اُردو، ص ۳۲۵

۴۔ سخنِ شعرا، ص ۲۲۳

۵۔ گلزارِ سخن، ص ۲۱۲

گئے اور حزیں کو اپنا کلام سنایا۔ اُس میں یہ شعر بھی تھا ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپھے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

شیخ حزیں نے دریافت کیا کہ تڑپھے ہے کیا معنی ہیں ؟ سودا نے بتایا "می تپد"۔ شیخ جھوم اُٹھے۔ پھر شعر پڑھوایا۔ اور کہا مرزا رفیع قیامت کردی ' یک مرغ قبلہ نما باقی بود آنرا ہم نہ گزاشتی کھڑے ہوکر حزیں نے سودا کو گلے سے لگایا۔ اور "ملک الشعرا" کے خطاب سے نوازا۔ شیخ چاند نے اس روایت کو تسلیم کیا ہے۔ حالانکہ شیخ حزیں جیسے بد دماغ اور متعصب ایرانی سے اس انعام واکرام کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ پھر سودا کا یہ شعر اتنا معمولی ہے کہ ہرگز حزیں جیسے عالم و فاضل شخص کو اتنا متاثر نہیں کرسکتا۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ "بعض اشخاص کی روایت ہے کہ شیخ نے کہا۔ در پوچ گویانِ ہند بدنیستی[1]"۔ صاحبِ بوستانِ اودھ کا بیان ذرا اور مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں "شیخ بیتاب شد و گفت کہ مرزا در پوچ گوئی بہ از خاقانی است[2]"۔ ان مختلف روایات کی روشنی میں یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ حزیں نے انھیں ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا۔

ابتدائی تذکرہ نگاروں میں صرف میر تقی میر اور قیام الدین قائم نے انھیں ملک الشعرا لکھا ہے۔ میر نے تو صرف اتنا لکھا ہے کہ سودا ملک الشعرائی کے لائق ہیں[3]۔ جس کا سیدھا سادہ مطلب یہی نکلتا ہے کہ

۱۔ آبِ حیات ، ص ۱۷۲
۲۔ بوستانِ اودھ ، ص ۹۵
۳۔ نکات الشعرا ، ص ۳۱

سودا ہم عصر شعرا میں سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ خطاب میر کی ادبی سازش کا ایک حصہ ہو۔ یعنی جس وقت میر نکات الشعرا تالیف کر رہے تھے۔ مرزا مظہر گروہ شمالی ہند کی اردو شاعری پر چھایا ہوا تھا۔ اور آرزو گروہ کو ایہام گوئی کی وجہ سے شکست ہو رہی تھی۔ مرزا مظہر گروہ میں انعام اللہ خاں یقین خاص طور پر بہت نمایاں تھے۔ تقریباً دس برس تک شمالی ہند سے لے کر جنوبی ہند تک جو مقبولیت اور شہرت یقین کو ملی وہ میر اور سودا کو کافی بعد میں نصیب ہوئی۔ تذکرے کی تالیف کے وقت نوجوان شعرا میں یقین ملک الشعرائی کے مستحق ہو سکتے تھے۔ چونکہ میر نے یقین کے خلاف ہر ممکن حربہ استعمال کیا ہے[1]۔ اس لیے سودا کو ملک الشعرا کہہ کر بالواسطہ یقین سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لچھمی نرائن شفیق نے کسی کی دو رباعیاں نقل کی ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کافی عرصے تک بعض اہلِ ذوق صرف سودا اور یقین کو اردو کے بہترین شاعر سمجھتے تھے اور بعض کا تو یہ خیال تھا کہ سودا بھی یقین کے گردِ پا کو نہیں پہنچتے۔ پہلی رباعی ہے۔

جس طرح سے لاتے ہیں مضامین متین
اشعار میں ریختہ کے سودا و یقین
ایسا کوئی نہیں ہند میں، ہر چند کہ ہیں
سجاد و کلیم و میر و درد و تمکین

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:
خلیق انجم، معارضہ مظہر و آرزو، نقوش (لاہور) مئی ۱۹۶۱ء

دوسری رباعی ملاحظہ ہو :

اگر ہزار برس تک یہ میرزا سودا
کرے جو فکرِ تتبع یقین کا از دل وجاں
کہے گا معنی باریک و خوب شیریں تر
و لے نزاکت و یہ لطف و یہ قبول کہاں[1]

بہرحال سودا کو یقین پر ترجیح دینے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ رہے قائم تو چونکہ انھیں سودا سے تلمذ تھا۔ اس لیے انھوں نے استادسے عقیدت اور محبت کی وجہ سے لکھ دیا کہ " بالفعل بخطاب ملک الشعراے کہ مہین پایۂ سخنوراں است اعزاز و امتیاز دارد[2]۔" لیکن قائم نے بھی یہ نہیں بتایا کہ یہ خطاب کس نے دیا تھا۔ صاحبِ تذکرہ مسرت افزا[1] نے لکھا ہے کہ " زباں آوران کامل اورا بہ استادی یاد می کنند و شعراے ہند بہ آئینِ خود ملک الشعرا قرار دادہ اند[3]۔" گویا سودا کو کسی نے باقاعدہ یہ خطاب نہیں دیا تھا۔ صرف ہندوستان کے شاعروں نے اپنے قاعدے کے مطابق انھیں ملک الشعرا قرار دے دیا تھا۔ مصحفی کا بیان بھی قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں: " بعضے اورا دریں فن بہ ملک الشعرائی پرستش می کنند، بعضے بہ سببِ دریافت اغلاط صریح و توارد صاف در بعضے

۱۔ لچھمی نرائن شفیق، چمنستانِ شعرا، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۲۸ء، ص ۱۶۲

۲۔ مخزنِ نکات، ص ۳۵

۳۔ ابوالحسن امیرالدین، تذکرہ مسرت افزا (قلمی)، پٹنہ، ورق ۶۱ الف

اشعارش بہ جہل و سرقہ اش نیز نسبت می دہند[۱]۔ مصحفی کے بیان کے مطابق کچھ لوگ انھیں ملک الشعرا تسلیم کرتے تھے اور بعض کے نزدیک وہ جاہل اور سارق تھے۔ غرض یہ ہے کہ مصحفی کے بیان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ خطاب کسی کا دیا ہوا نہیں تھا۔ مزید ثبوت یہ ہے کہ ۱۱۶۶ھ میں تذکرہ گردیزی تالیف ہوا۔ اس میں ملک الشعرائی کا کوئی ذکر نہیں۔ قدرت اللہ قاسم، مردان علی خاں مبتلا، ابراہیم علی خاں اور میر حسن وغیرہ نے بھی اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اگر یہ حقیقت ہوتی تو یہ خطاب اتنا بڑا اعزاز تھا کہ ہر تذکرہ نگار اور خاص طور پر میر حسن اور قاسم ضرور اس کا ذکر کرتے۔ کیونکہ یہ دونوں سودا کے بہت مدّاح ہیں۔

ان تمام دلیلوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ سودا کو کسی بادشاہ نے خطاب نہیں دیا۔ یہ صرف میر کا ایک ہتھیار تھا۔ جو انعام اللہ خاں یقین کے خلاف استعمال کیا گیا۔

میر غلام حیدر مجذوب

بعض تذکرہ نگاروں نے انھیں سودا کا بیٹا لکھا ہے اور بعض نے متبنیٰ بتایا ہے۔ قیام الدین قائم کی غالباً قدیم ترین روایت ہے۔ چونکہ وہ سودا کے شاگرد رہے تھے اس لیے انھیں ایک عرصے تک سودا سے قریب رہنے کا اتفاق

۱۔ ا۔ غلام ہمدانی مصحفی، تذکرہ ہندی، دہلی ۱۹۳۳ء، ص ۱۲۵

ب۔ شورش لکھتے ہیں۔ اگر ملک الشعرائے ریختہ گویاں خیال کنم روا است وگر پہلوان الشعرا گویم بجاست۔ دو تذکرے (شورش)، ص ۳۰۹

اس عبارت میں "خیال کنم" قابلِ غور ہے۔

ہوا تھا۔ انھوں نے ان کا پورا نام غلام حیدر اور حیدر[1] تخلص لکھا ہے۔ اور انھیں سودا کا لڑکا بتایا ہے[2]۔ میر حسن جو مدعی ہیں کہ لکھنؤ میں (تذکرہ شعرائے اردو لکھنے سے قبل) وہ سودا کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ انھوں نے بھی مجذوب کو خلفِ سودا بتایا ہے[3]۔ ابوالحسن امیر الدین تذکرہ مسرت افزا[4] میں اور علی لطف گلشنِ ہند[5] میں انھیں "خلفِ سودا" اور "سودا کا بیٹا" لکھتے ہیں جس سے قائم[6] کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ مگر اس کے برعکس مردان علی خاں مبتلا، مصحفی[7] اور شاہ کمال[8] انھیں "پسر خواندہ" لکھتے ہیں بلکہ قدرت اللہ شوق تو یہ بھی اضافہ کرتے ہیں کہ "مجذوب دہلی کے رہنے والے خوبصورت اور وجیہہ نوجوان ہیں۔ مرزا رفیع کے منظورِ نظر اور تربیت کردہ ہیں۔ سودا نے انھیں بچپن ہی سے اپنے لڑکے کی طرح پالا ہے۔"[9]

۱۔ غالباً بعد میں انھوں نے مجذوب تخلص اختیار کیا۔

۲۔ مخزنِ نکات، ص ۱۷

۳۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۷۰

۴۔ تذکرہ مسرت افزا، (قلمی) ورق ۶۱ الف

۵۔ گلشنِ ہند، ص ۲۲۶

۶۔ گلشنِ سخن (قلمی) ورق ۹۳ الف

۷۔ تذکرہ ہندی، ص ۲۰۲

۸۔ مجمع الانتخاب (قلمی) ورق ۳۴۷ ب

۹۔ قدرت اللہ شوق، طبقات الشعرا (قلمی)، آصفیہ، ورق ۱۶۶ ب

خود مجذوب کا دعویٰ ہے۔

خاطر میں کون لائے میرا سخن کہ مجھ کو
سودا کا سن کے بیٹا مجذوب جانتے ہیں

میر کے ایک شعر سے بھی مجذوب کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ ؎

اے میر سمجھو مت مجذوب کو اوروں سا
ہے وہ خلفِ سودا اور اہلِ ہنر بھی ہے

ان مختلف بیانات کی روشنی میں کوئی قطعی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ البتہ قیاس یہی ہے کہ وہ سودا کے لڑکے تھے اور بعد کے کچھ تذکرہ نگاروں کو غلط فہمی ہوئی۔

مجذوب غالباً سودا کے ساتھ ہی دہلی سے گئے۔ لکھنؤ میں ان کے قیام کی شہادتیں موجود ہیں۔ لیکن فرخ آباد کے متعلق کوئی شہادت نہیں ملتی۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ "مجذوب خوش خلق اور باحیا انسان ہیں۔ میں نے انھیں لکھنؤ میں دیکھا تھا۔ بڑے تپاک سے ملے[1]"۔

میر حسن نے ان کی دیر آشنائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "اگرچہ مجذوب دیر آشنا ہیں لیکن جس سے ملتے ہیں خوب ملتے ہیں۔ سخن دانی کے باوجود فطرتاً خاموش طبیعت ہیں اور بہت کم گو ہیں[2]"۔

گلشنِ ہند میں علی لطف نے مجذوب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ "آشنا پرستی اور یک رنگی کے ساتھ موصوف دردِ دل اور گدازِ طبیعت میں

۱۔ تذکرہ ہندی، ص ۲۲

۲۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۷۰

مشہور و معروف، نظم ریختہ میں صاحب دیوان ہیں۔ دو دیوان جواب میں میر تقی میر کے انھوں نے کہے اور مقدور بھر سرانجام جواب سے غافل نہیں رہے۔ غرض بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ ہیں ساتھ عسرت معاش کے لکھنؤ میں بیٹھے ہیں[۱]۔"

مجذوب کو اپنے والد سودا ہی سے تلمذ تھا۔ جس کا ذکر کئی تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ ان کا دیوان دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا۔ اور شاید اب اس کا کوئی نسخہ دنیا میں موجود نہیں۔

سودا کا نواسہ مولانا محمد حسین آزاد غالباً واحد تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے سودا کے ایک نواسے کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "اُن (سودا) کے بعد کمال بھی خاندان سے نیست و نابود ہو گیا۔ راقم آثم ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ گیا۔ بڑی تلاش کے بعد ایک شخص ملے کہ ان کے نواسے کہلاتے تھے۔ پڑھے لکھے بھی نہ تھے اور نہایت آشفتہ حال تھے[۲]۔"

اخلاق سودا کے عہد میں علم مجلسی باقاعدہ ایک فن تھا۔ مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ اس فن پر بھی پوری توجہ دی جاتی اور شعر و شاعری علم مجلسی کا ایک حصّہ تھی۔ لوگ اپنے بچوں کی تربیت کے لیے گھر پر استاد رکھتے تھے۔ جو انھیں آداب مجلس سے واقف کرتے اور اُن کی طبیعتوں میں شعر و شاعری سے ایک لگاؤ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

شگفتہ مزاجی، برجستگی، شعر و شاعری سے لگاؤ، محفل میں نشست و برخاست

۱۔ گلشن ہند، ص ۲۲۶

۲۔ آب حیات، ص ۱۵۲۔ ذکا نے سلمان نامی ایک شاعر کو "پسر خواندہ سودا" لکھا ہے (عیار الشعرا ص ۲۱۰)

کے آداب وسلیقہ اور بڑوں کا ادب و احترام وغیرہ وہ خصوصیات تھیں جو ہر مہذب انسان کے لیے ضروری تھیں۔

معاصر تذکرہ نگار شاہد ہیں کہ سودا ان تمام خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ میر کو ان سے بہت قریب رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"جوانے است خوش خلق، خوش خوے، گرم جوش، یار باش، شگفتہ روے ۔[۱]"

"باغِ معانی" کے مولف نقش علی نے سودا کے اخلاق و کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

"(سودا) شاعری سے قطع نظر اکثر خوبیوں سے آراستہ ہیں اور بہت سے اوصاف حمیدہ سے متصف ہیں۔ حسنِ اخلاق اور تازہ روئی میں طاق اور شیوۂ کوچکدلی اور تواضع میں شہرۂ آفاق ہیں اور دوستی کا لحاظ کرنے میں عدیم المثال ہیں اگرچہ ان کی عمر پچپن سال کو پہنچ چکی ہے لیکن ان کی طبعِ جواں رشکِ نوبہار اختلاط پھول سے زیادہ شگفتہ[۲]" (فارسی سے ترجمہ)

حکیم احد علی خاں یکتا کے بیان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ سودا کو آدابِ مجلس پر پوری دسترس تھی۔ وہ تالیفِ قلوب کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ بادشاہوں اور سلاطین کی صحبتوں میں رہنے کا انھیں قرینہ آتا تھا۔ یکتا لکھتے ہیں :

"…. ان کمالات اور اوصاف کے متعلق کیا کہوں جو وہ بے بدل (سودا)

۱۔ نکات الشعرا، ص ۳۱

۲۔ باغِ معانی (قلمی) ورق ۶۲ ب

اپنی ذات میں رکھتے تھے۔ ملوک و سلاطین کی صحبت کے آداب ......
تہذیب و اخلاق، "تالیفِ قلوب اور علم مجلس وغیرہ، کیا ہنر تھا جو اس
ذاتِ کامل الصفات میں نہیں تھا۔[۱]" (فارسی سے ترجمہ)

میر حسن نے بھی ان کی خوش اخلاقی اور یار باشی کا ذکر کیا ہے۔ وہ
لکھتے ہیں :-

"مردے ست از مغتنماتِ روزگار، خوش خلق و نیک خو و یار باش..[۲]"

سودا کثیر الاحباب تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی بہت کافی تھی۔
میر اور میر حسن دونوں نے لکھا ہے کہ وہ "یار باش" تھے۔ خان آرزو،
خواجہ میر درد اور میر تقی میر کے مشاعروں میں وہ شریک ہوتے تھے۔ چونکہ
شوخ مزاج تھے۔ طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس
لیے محفلوں کی جان ہو گئے۔ اگرچہ سودا صاحبِ کمال تھے اور بہت کم
خوش نصیب فنکاروں کو اتنی شہرت اور مقبولیت ملی تھی جتنی قسامِ ازل نے
سودا کو دی تھی۔ لیکن اس غیر معمولی مقبولیت سے سودا میں خود پرستی اور "میں"
نہیں پیدا ہوئی۔ جن لوگوں کو سودا سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ ان
کی خوش اخلاقی کے مداح اور ان کی کرم فرمائی کے شکر گزار ہیں۔ میر حسن
لکھتے ہیں :-

"اکثر فقیر در خدمتِ آں بزرگوار می رسد، بسیار کرم می فرماید[۳]"

۱۔ دستور الفصاحت (متن)، ص ۱۷

۲۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۸۳

۳۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۸۳

نقش علی کو سودا کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ وہ سودا کے کردار کی بے انتہا تعریف کر کے لکھتے ہیں۔

"بامؤلف ایں اجزا اشفاق بسیار بظاہر می نماید[۱]"

سودا مردم بیزار اور گوشہ نشین نہیں تھے۔ ان کی آمد و رفت صرف دولتمندوں کی محفلوں تک محدود نہیں تھی۔ بلکہ وہ اپنے چھوٹوں سے بھی ملنے جاتے تھے۔ لالہ کھیم نرائن رند نے چہار باغ کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

"مرزا محمد رفیع متخلص بہ سودا، میر محمد تقی صاحب رفقائے جدِ مرحوم نے بھی اس خاکسار کے کلبۂ احزاں کو نورِ قدم سے منوّر کیا[۲]"

سودا ان دوستوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ جو اُن سے سینکڑوں میل دُور تھے۔ لچھمی نرائن شفیق نے لکھا ہے کہ سودا نے فرخ آباد سے غرۂ ربیع الآخر ۱۱۸۳ھ میں اولاد محمد خاں ذکا کے نام ایک خط لکھا تھا۔ جس میں اپنے ہاتھ سے کچھ فارسی اور ریختہ اشعار بھی نقل کیے تھے[۳]

سودا کو اپنے شاگردوں سے کتنی محبت تھی۔ اس کا اندازہ ان ہجوؤں سے ہوتا ہے جو سودا کے شاگردوں نے اپنے استاد کے حریفوں کی کہی ہیں۔

سودا نے ہجو گوئی کو ایک فن کی صورت دی۔ یہی فن ان کے کردار کی سب سے بڑی کمزوری بن گیا۔ لیکن اس کے شواہد موجود ہیں کہ وہ تمام اختلافات کے باوجود بزرگ شاعروں کا ادب کرتے تھے۔ ان میں خاکساری اور انکسار

۱۔ باغِ معانی (قلمی) ورق ۶۲ ب

۲۔ نیا دَور (لکھنؤ) نومبر ۱۹۶۱ء، ص ۱۱

۳۔ گل رعنا (قلمی)، ص ۶۱۲

بھی تھا۔ "عبرۃ الغافلین" کے دیباچے میں انھوں نے مرزا فاخر مکیں کا بڑے احترام سے ذکر کیا ہے بلکہ اپنی خاکساری کا بھی اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

" ایک دن اُن (اشرف علی خاں صاحبِ تذکرہ) کے دل میں یہ آیا کہ وہ قلم خوردہ اشعار (جنھیں فاخر مکیں نے قلم زد کر دیا تھا یا ان پر اصلاح دی) انصاف کے لیے اس ضعف البلاد کے پاس لائیں۔ بندہ خاکسار محمد رفیع متخلص بہ سوداؔ نے التماس کیا کہ یہ احقر زبان فارسی کے امور سے زیادہ تعلق نہیں رکھتا...... میرے ریختہ کے کچھ قصیدوں اور غزلوں کو جو حسنِ قبول ملا ہے۔ یہ صرف خدا کی قدرت ہے...... مرزا فاخر نے البتہ یہ کام سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ ان کے کمالات میں ہرگز شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر آپ کا مزاج ایسا ہی انصاف طلب ہے تو یہ نسخہ فنِ فارسی کے سخنوران کے پاس لے جایئے اور انصاف طلب کیجیے [۱]۔" (فارسی سے ترجمہ)

اشرف علی خاں کے اصرار پر سوداؔ کو مرزا فاخر کی ان اصلاحوں اور قطع و برید کا جواب دینا پڑا۔ مگر عبرۃ الغافلین کے دیباچے اور پورے رسالے میں کہیں ایک مقام پر بھی سوداؔ نے تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اکثر تذکرہ نگار شہادت دیتے ہیں کہ سوداؔ ہجو گوئی میں بہت کم پہل کرتے تھے لیکن جب ایک دفعہ شروع ہو جاتے تھے تو پھر شرم و حیا کی آنکھیں بند ہو جاتی تھیں اور غالباً یہ ہجو گوئی محض شعر و شاعری تک محدود رہتی تھی۔ ذاتی تعلقات

۱۔ کلیاتِ سودا، مرتبہ آسی، ص ص ۳۷۶ - ۳۷۷

پر اس کا بہت کم اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے میر کی ہجو کہی تھی۔ جبکہ اُن سے بہت اچھے تعلقات تھے (جیسا کہ نکات الشعرا سے معلوم ہوتا ہے) بعض اشعار میں سودا نے میر کو بُرا بھلا کہا۔ ایک ہجو میں ثابت کیا کہ میر "شیخ" ہیں "سیّد" نہیں۔ لیکن ترکِ وطن کے بعد جن لوگوں کی یاد نے مرزا کو پریشان رکھا، اُن میں میر کا نام سرِ فہرست ہے۔

علی الخصوص تغافل کو میر صاحب کے
کہوں میں کس سے کہ با وصف اتحاد تمام
لکھا نہ پرچہ کاغذ بھی اتنی مدّت میں
کہ بے قراروں میں تا ہوے موجب آرام

ظاہر ہے کہ یہ اشعار اس دَور کے ہیں جب سودا اور میر کے تمام ادبی معرکے ختم ہو چکے تھے اور غالباً ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے تھے۔

سودا کے سب سے اہم ادبی معرکے میر ضاحک کے ساتھ ہوئے۔ جتنی فحاشیت اور ابتذال ان ہجوؤں میں ہے۔ اُس کی دوسری مثال مشکل ہے لیکن جب ضاحک کے لڑکے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں تو سودا پر ضاحک سے ادبی معرکوں کا کوئی اثر نہیں تھا۔

اگر ادبی معرکوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہمیں سودا کے وسعتِ اخلاق سلامتی طبع، بزرگوں کا احترام، چھوٹوں سے مروّت و اخلاق، خاکساری و انکساری کا قائل ہونا پڑے گا۔

ظرافت

سودا بہت ظریف، شگفتہ مزاج اور زندہ دل انسان تھے۔ تذکروں میں ان سے متعلق جتنے لطائف ملتے ہیں، ان سے

یہی اندازہ ہوتا ہے کہ جب تک سودا دہلی میں رہے۔ ان کی ظرافت تہذیب کے دائرے سے باہر نہ گئی لیکن اودھ کے مخصوص ماحول اور خاص طور پر نواب آصف الدولہ کے مزاج نے ان کی ظرافت میں ابتذال اور فحاشیت پیدا کر دی۔

قیام الدین قائم نے مخزنِ نکات میں لکھا ہے۔ سودا خود کہا کرتے تھے کہ ایک دن وہ اور خاکسار، مرتضیٰ قلی کے ہاں موجود تھے۔ چونکہ میر تقی میر اور خاکسار کے تعلقات بہت خراب تھے۔ اس لیے خاکسار نے بے موقع میر کا شکوہ و شکایت شروع کیا۔ اور حاضرینِ مجلس سے درخواست کی کہ وہ میر تقی میر کی ہجو کہیں۔ یہ بات اہلِ محفل میں سے کسی کو پسند نہیں آئی۔ لیکن سودا نے خاکسار کا لحاظ کرتے ہوئے اسی وقت یہ مطلع کہا اور اُن کے حوالے کر دیا۔

میر کا مکھڑا بے نتھا گل زہتی کا سا ہے (؟)[1]
پیٹ بھی اس کا جو میں دیکھا سو کچھ بھنبھق کا سا ہے

مطلع سنتے ہی حاضرینِ مجلس کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا اور خود خاکسار بھی ہنس رہے تھے۔ جب اس بات کو اچھا خاصا وقت گزر گیا اور خاکسار نے دیکھا کہ لوگ ہنسنا بند نہیں کرتے۔ تو خود اپنے پیٹ پر نگاہ ڈالی۔ اور ایک دم کھڑے ہو گئے۔ مرزا سودا اور اُن کے دوستوں کو سخت بُرا بھلا کہا۔ ہر چند لوگوں نے ان کی منت سماجت کی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا اس دن سے سودا اور خاکسار کی ملاقات ترک ہو گئی۔[2]

۱۔ یہ شعر اسی طرح نقل ہوا ہے۔ مخزنِ نکات، ص ۵۲
۲۔ مخزنِ نکات، ص ۵۲

میر تقی میر نے نکات الشعرا میں خود اپنے مشاعرے کا ایک لطیفہ لکھا ہے۔ میر صاحب کے ہاں ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو مشاعرہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ اتفاقاً یہ تاریخ ہولی کے زمانے میں پڑی۔ فضل علی دانا اور مرزا رفیع سودا دونوں مشاعرے میں موجود تھے۔ لیکن دانا کا کچھ عجب لباس تھا۔ وہ سیاہ رنگ کی ایک تنی پہنے ہوئے تھے جس کا دامن زانو تک تھا۔ اس لباس پر اس کا سیاہ رنگ اور سیاہ داڑھی۔ کچھ عجب منظر ہو گیا۔ سودا نے جب انہیں دیکھا تو ان کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔ بیساختہ ایک مصرع کہا۔ ع

یارو ہولی کا ریچھ آیا

"ریچھ" میں لطف یہ تھا کہ ہولی کے موقع پر بچے ایک دوسرے کی خوشی کی خاطر ریچھ، بندر، گھوڑا اور شتر وغیرہ بنتے تھے!

قدرت اللہ قاسم نے شیخ قائم علی قائم کے متعلق بھی ایک لطیفہ لکھا ہے۔ یہ بزرگ معلم اور اٹاوہ کے رہنے والے تھے۔ نواب احمد خاں بنگش کے عہد میں جب سودا فرخ آباد میں تھے تو یہ انعام اللہ خاں یقین کے صاحبزادے مقبول نبی خاں مقبول کی وساطت سے سودا کی خدمت میں پہنچے۔ چند غزلیں سودا کو سنائیں۔ چونکہ اس وقت قائم علی کا تخلص امیدوار تھا۔ اس لیے سودا نے فی البدیہہ ایک شعر پڑھا۔

ہے فیض سے کسی کے یہ نخل ان کا بار دار
اس واسطے کیا ہے تخلص امیدوار

۱۔ نکات الشعرا، ص ص ۱۲۸ - ۱۲۹

یہ بیچارے اس ارادے سے گئے تھے کہ سودا کا تلمذ اختیار کریں گے۔ مگر اس شعر سے شرمندہ ہو کر واپس آ گئے۔ انھوں نے اپنا تخلص بدل کر قائمؔ تو کر لیا لیکن پھر کسی کی شاگردی کا خیال نہیں کیا!

آبِ حیات میں سودا کے لطائف

سودا کے ترجمے میں آزاد نے جو واقعات بیان کیے ہیں۔ انھیں دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ جن کی بنیاد کسی تذکرہ نویس کے معمولی سے بیان پر ہے اور جنھیں آزاد کے قلم نے کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔ دوسرے وہ جن کے مآخذ کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ اور جو ممکن ہے محض اختراعی ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ سودا عام زندگی میں بھی ظریف الطبع اور بلا کے ہنسوڑ تھے۔ لیکن اس سلسلے میں آزاد نے بہت سے ایسے واقعات بھی بیان کیے ہیں جن میں بعض تو صریحاً نہیں مانے جا سکتے اور بعض اُس وقت تک نہیں تسلیم کیے جا سکتے جب تک کسی اور ذریعے سے تصدیق نہیں ہوتی۔ آزاد نے سودا اور شاہ عالم کے تعلقات کے بارے میں لکھا ہے۔

> جب کلام کا شہرہ عالم گیر ہوا تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لیے دینے لگے اور فرمائشیں کرنے لگے۔ ایک دن کسی غزل کے لیے تقاضا کیا۔ انھوں نے عذر بیان کیا۔ حضور نے فرمایا۔ بھئی مرزا کَے غزلیں روز کہہ لیتے ہو؟ مرزا نے کہا پیر و مرشد جب طبیعت لگ جاتی ہے، دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔ حضور نے فرمایا۔ بھئی ہم تو پاخانہ میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ حضور ویسی

۱۔ مجموعۂ نغز، ۱، ص ۸۱

بو بھی آتی ہے۔ یہ کہہ کر چلے آئے۔ بادشاہ نے پھر کئی دفعہ بلا بھیجا اور کہا کہ
ہماری غزلیں بناؤ۔ ہم تمھیں ملک الشعرا کر دیں گے۔ یہ نہ گئے اور کہا کہ حضور
کی ملک الشعرائی سے کیا ہوتا ہے۔ کرے گا تو میرا کلام ملک الشعرا کرے گا
پھر ایک بڑا مخمس شہر آشوب لکھا۔

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں ہے ڈانواں ڈول[۱]"

آزاد کے اس بیان میں کئی باتیں قابلِ غور ہیں۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ کیا شاہ عالم کو سودا سے تلمذ تھا؟ ہمارے خیال سے ایسا نہیں تھا کیونکہ شاہ عالم تقریباً ۱۱۷۲ھ میں نواب عماد الملک کے خوف سے دہلی سے فرار ہو گئے تھے۔ اور ۱۱۷۴ھ میں سودا نے ترکِ وطن کیا۔ اس کے بعد کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں شاہ عالم اور سودا ایک ساتھ رہے ہوں اگر یہ تلمذ اس زمانے سے قبل تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ میر، گردیزی، قائم اور شفیق اس کا ذکر نہیں کرتے۔ ان سب کے تذکرے قریبی زمانے میں لکھے گئے تھے۔ اب صرف اس کا امکان باقی ہے کہ شاہ عالم کو خط و کتابت کے ذریعے تلمذ رہا ہو۔ لیکن اسے تسلیم نہ کرنے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ کسی قابلِ اعتبار تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ سودا کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ آزاد نے مخمس شہر آشوب کے متعلق بھی جو کچھ لکھا ہے وہ درست نہیں۔ کیونکہ ۱۱۸۶ھ میں جب شاہ عالم دہلی کے قلعہ میں واپس آئے تو سودا فرخ آباد میں تھے اور اس سے قبل شاہ عالم بحیثیت شہنشاہ کے دہلی میں کبھی نہیں رہے۔ ہمارے خیال سے یہ مخمس ۱۱۷۴ھ

۱۔ آبِ حیات، ص ص ۱۴۹ - ۱۵۰

(سودا کے ترکِ وطن) سے قبل کا ہے[۱]

محمد حسین آزاد نے سودا اور میر جعفر زٹلی کے متعلق بھی ایک لطیفہ بیان کیا ہے۔

جب مرزا رفیع لڑکے تھے۔ اس وقت میر جعفر زٹلی کا بڑھاپا تھا۔ اگلے وقتوں کے لوگ رنگین جریبیں جن پر نقاشی کا کام ہوتا تھا۔ اکثر ہاتھ میں رکھا کرتے تھے۔ ایک دن شام کے قریب میر موصوف ایک سبز رنگ جریب ٹیکتے ٹہلنے کو باہر نکلے۔ مرزا بغل میں کتابوں کا جزدان لیے سامنے سے آتے تھے۔ اس زمانے میں ادب کی بڑی پابندی تھی۔ بزرگوں کو سلام کرنا اور ان کی زبان سے دعا لینے کو بڑی نعمت سمجھتے تھے۔ مرزا نے جھک کر سلام کیا۔ انھوں نے خوش ہو کر دعا دی۔ چونکہ بچپن ہی میں مرزا کی موزونیٔ طبع کا چرچا تھا۔ میر صاحب کچھ باتیں کرنے لگے۔ مرزا ساتھ ہو لیے۔ انھوں نے نوخیز طبیعت کے بڑھانے کے لیے کہا کہ مرزا بھلا ایک مصرع پر مصرع تو لگاؤ۔ ع

لالہ در باغ داغ چوں دارد؟

مرزا نے سوچ کر جواب دیا ع

عمر کوتاست غم فزوں دارد

میر صاحب نے فرمایا۔ واہ مرزا دن بھر کے بھوکے تھے ہ کھا گئے

مرزا نے پھر کہا ع از غم عشق سینہ خوں دارد

۱۔ قاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ یہ مخمس عہدِ عالمگیر ثانی میں تصنیف ہوا۔ (سب رس، نومبر ۶۰ء ص ۹) مگر قاضی صاحب نے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔

میر صاحب نے فرمایا۔ واہ بھئی دل خون ہوتا ہے۔ جگر خون ہوتا ہے
بھلا سینہ کیا خون ہوگا۔ سینہ پر زخون ہوتا ہے۔ مرزا نے ذرا پھر تکمہ
کیا۔ اور کہا ع

چہ کند شورشِ دردِ دل دارد

میر صاحب نے کہا کہ ہاں مصرع تو ٹھیک ہے لیکن ذرا طبیعت پر
زور دے کر کہو۔ مرزا دق ہو گئے تھے۔ جھٹ کہہ دیا ع

یک عصا سبز زیر ..... دارد

میر جعفر مرحوم ہنس پڑے۔ اور جریب اٹھا کر کہا۔ کیوں! یہ ہم سے بھی۔
دیکھ کہوں گا تیرے باپ سے۔ بازی بازی بریشِ بابا ہم بازی۔ مرزا
لڑکے تو تھے ہی بھاگ گئے!"

آزاد کی قوتِ اختراع اور انشا پردازی کے ثبوت میں یہی لطیفہ کافی ہے
اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ شورش عظیم آبادی نے میر جعفر کے ترجمے
میں لکھا ہے :" لوگ کہتے ہیں کہ نواب ذوالفقار خاں بہادر کے انتقال
کے بعد ایک دن انھوں نے (جعفر نے) یہ شعر کہا۔

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ ہے تسمہ کش فرخ سیر

اس خبر سے بادشاہ کو غصہ آگیا۔ اور انھیں (جعفر) جنت بھیج دیا۔[۲]"
شورش کے اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ جعفر زٹلی عہدِ فرخ سیر میں

۱۔ آب حیات، ص ص ۱۷۴-۱۷۵

۲۔ دو تذکرے (شورش) ۱، ص ۱۶۳

قتل کیے گئے۔

فرخ سیر ۱۱۲۴ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت سودا کی عمر صرف چھ سال تھی۔ ۸ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ کو فرخ سیر کو تخت سے اتار کر اندھا کر دیا گیا۔ اُس وقت بھی سودا کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔ علاوہ ازیں میر حسن نے یہ لطیفہ مرزا بیدل اور جعفر زٹلی سے متعلق بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "ایک دن (جعفر) مرزا بیدل کے پاس گئے۔ مرزا ایک مصرع پر فکر کر رہے تھے۔ ملتفت نہ ہوئے۔ (جعفر نے) پوچھا صاحب و قبلہ آپ نے کون سا مصرع کہا ہے؟ کہا! ہاں یہ مصرع ہے ع

لالہ بر سینہ داغ چوں دارد

میر سطور نے کہا۔ اس میں کیا تامل ہے۔

چو بکے سبز زیر ...... دارد[۱]"

آزاد لکھتے ہیں :۔

خان آرزو کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ سودا ان دنوں نوجوان تھے۔

۱۔ (ا) تذکرہ شعرائے اردو، ص ۴

(ب) قاضی عبدالودود لکھتے ہیں :" .... انشا نورتن مطبوعہ نول کشور ص ۱۰۶ میں ہے کہ اکبر نے لالہ بر سینہ الخ کہا۔ امیر خسرو نے یہ مصرع لگایا

عمر کوتاہ غم فزوں دارد

لطائف عجیبہ مصنفہ بشیر الدین احمد دہلوی مرحوم کی کسی جلد میں اس پر یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ بیربل نے تیسرا مصرع .... چو بکے سبز... الخ کہا۔ ممکن ہے یک عصا... الخ اس کی جگہ ہو کتاب اس وقت پیش نظر نہیں۔" نوائے ادب (اپریل ۱۹۵۶ء) ص ۱۲ ۔

مطلع پڑھا ؎

آلودۂ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

یا تو لاعلمی سے یا ان کی آتش زبانی کے ڈر سے کوئی نہ بولا۔ مگر خانِ آرزو جن کی دایۂ قابلیت کے دودھ سے مظہر، سودا، میر، درد وغیرہ نوجوانوں نے پرورش پائی ہے۔ انھوں نے فوراً یہ شعر پڑھا کہ قدسی کے مطلع پر اشارہ ہے۔

شعرِ سودا حدیثِ قدسی ہے
چاہیے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

(قدسی کا مطلع ہے)

آلودۂ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را
اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را

سودا بے اختیار اُٹھ کھڑے ہوئے۔ خاں صاحب کے گلے سے لپٹ گئے اور اس شکریہ کے ساتھ خوشی ظاہر کی گویا حقیقۃً خاں صاحب نے ان کے کلام کو مثلِ حدیثِ قدسی تسلیم کیا ہے[1]۔"

یہ واقعہ آزاد نے مجموعہ نغز سے لیا ہے مگر قاسم نے صرف اتنا لکھا ہے کہ سودا نے حاجی محمد جان قدسی کی ایک غزل کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اور (خان آرزو کے مشاعرے میں) بڑے تندومد سے پڑھ رہے تھے۔ اتفاقاً اہلِ محفل میں سے کسی کا اُس طرف دھیان نہیں گیا۔ اور اگر گیا بھی ہوگا تو

۱۔ آبِ حیات، ص ص ۱۷۲۔۱۷۳

خاموش رہے ہوں گے۔ کیونکہ معمولی سی بات پر (سودا) ہر کسی کی بے محابا ہجو کہہ دیا کرتے تھے۔ خان آرزو نے بہت تعریف کی اور دوران توصیف یہ شعر فی البدیہہ کہا۔ شعرِ سودا ..... الخ[۱]، ع آلودۂ قطراتِ ..... الخ اور اس کا ترجمہ آزاد کا اپنا اضافہ ہے۔ یہ شعر قدسی کا نہیں ہے۔ مجالسِ رنگین میں رنگین نے یہ فارسی شعر اور سودا کا اُردو ترجمہ دیا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ فارسی شعر کس کا ہے[۲]۔ آزاد نے ان دونوں کو ملا دیا ہے۔

آزاد نے انشا اور سودا کے متعلق لکھا ہے "سید انشا کا عالم نوجوانی تھا۔ مشاعرے میں غزل پڑھی۔ ؎

جھڑکی سہی ادا سہی چینِ جبیں سہی
سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

جب یہ شعر پڑھا

گر نازنیں کہے سے برا مانتے ہو تم
میری طرف تو دیکھیے میں نازنیں سہی

سودا کا عالم پیری تھا۔ مشاعرے میں موجود تھے مسکرا کر بولے۔ دریں چہ شک"۔ اس لطیفے کی کسی اور ذریعے سے تصدیق نہیں ہوتی۔ اگر آزاد کے ذہن کی اختراع نہیں۔ تو یہ واقعہ فیض آباد میں پیش آیا ہوگا۔ کیونکہ انشا کے والد شجاع الدولہ کے دربار سے متوسل تھے۔ سودا ۱۱۸۵ھ میں فیض آباد پہنچے ہیں۔ انشا ۱۱۸۸ھ (وفات شجاع الدولہ) میں فیض آباد سے

۱۔ مجموعہ نغز، ۱، ص ۲۶

۲۔ مجالسِ رنگین، ص ۸

چلے گئے۱۔ اس لیے یہ واقعہ ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان کا ہوگا۔

آزاد نے درد اور سودا کے بارے میں ایک لطیفہ لکھا ہے:۔

"ان (درد) کے ہاں ایک صحبتِ خاص ہوتی تھی۔ اس میں خواجہ میر درد صاحب نالۂ عندلیب یعنی اپنے والد کی تصنیفات اور اپنے کلام کچھ کچھ بیان کرتے تھے۔ ایک دن مرزا رفیع سے سرِ راہ ملاقات ہوئی خواجہ صاحب نے تشریف لانے کے لیے فرمائش کی۔ مرزا نے کہا۔ صاحب مجھے نہیں بھاتا کہ سو کوّے کائیں کائیں کریں اور بیچ میں ایک پدّا بیٹھ کر چوں چوں کرے۔ اس زمانہ کے بزرگ ایسے صاحب کمالوں کی بات کا تحمل اور برداشت کرنا لازمہ بزرگی سمجھتے تھے۔ آپ مسکرا کر چپ ہو رہے۔

مرزا ے موصوف نے ایک قصیدہ نواب احمد علی خاں کی تعریف میں کہا ہے اور تمہید میں اکثر شعرا کا ذکر انھیں شوخیوں کے ساتھ کیا ہے جو ان کے معمولی انداز ہیں۔ چنانچہ اسی کے ضمن میں کہتے ہیں۔

درد کس کس طرح بلاتے ہیں
کرکے آواز منحنی و حزیں
اور جو احمق ان کے سامع ہیں
دمبدم ان کو یوں کریں تحسیں

۱۔ انشا کے قیام فیض آباد کے سلسلے میں ملاحظہ ہو

اسلم پرویز، انشاءاللہ خاں انشا، دہلی، ۱۹۶۱، ص ص ۲۴-۲۶

بجیسے سُبحانَ مَن یّرانی ہر
لڑکے مکتب کے سب کہیں آمیں
کوئی پوچھے ذرا کہ عالم میں
فخر کس چیز کا ہے ان کے تئیں
شعر و تقطیع ان کے دیواں کی
جمع ہووے تو جیسے نقش نگیں
اس میں بھی دیکھیے تو آخر کار
یا توارد ہوا ہے یا تضمیں
اتنی کچھ شاعری پہ کرتے ہیں
میخ در .... آسمان و زمیں[1]"

یہ اشعار نواب احمد علی خاں کی شان میں کہے گئے ایک قصیدے کے ہیں۔ ان سے قبل ایک شعر یہ بھی ہے ؎

یعنی سودا و میر و قائم و درد
لے ہدایت سے تا کلیم و حزیں

جب اس شعر میں درد کا نام آچکا ہے تو بظاہر دوبارہ نام آنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ کلیاتِ سودا مطبوعہ نول کشور میں وہ شعر جس میں درد کا لفظ آیا ہے اس طرح ہے۔

درد کس کس طرح ملاتے ہیں
کر کے آواز منحنی و حزیں

۱۔ آب حیات، ص ص ۱۸۷۔ ۱۸۸

جس کا مطلب صاف یہی ہے کہ شعر میں سوز و گداز نہیں ہوتا۔ آواز کو منحنی اور حزیں بنا کر درد پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض قلمی نسخوں میں " ہلاتے" کی جگہ " بلاتے" ہے۔ جو بظاہر کاتب کا سہو ہے۔ آزاد نے اس سہو سے فائدہ اٹھا کر ایک دل چسپ لطیفہ بنا لیا۔

موسیقی دانی بعض معاصر تذکرہ نگاروں نے سودا کی موسیقی دانی کا بھی ذکر کیا ہے۔ میر حسن نے لکھا ہے :-

در علم موسیقی نیز ماہر ست![1]

عشقی لکھتے ہیں کہ انھیں علم موسیقی اور ستار نوازی میں معقول دستگاہ تھی۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں :-

در علم موسیقی و ستار نوازی دستگاہے معقولے داشت[2]

مصحفی لکھتے ہیں کہ :-

" بہ سبب آگاہی علم موسیقی مرثیہ و سلام کہ گفتہ بر سوز نہادن آں نیز قادر[3]"

حکیم سید احمد علی خاں یکتا لکھتے ہیں کہ سودا علم موسیقی سے آگاہ ہیں اور اپنے کہے ہوئے مرثیوں اور سلاموں کی طرح خود بناتے ہیں[4]

کتّے پالنے کا شوق سودا کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا اور غالباً یہ

۱۔ تذکرہ شعرائے اردو ، ص ۸۳

۲۔ دو تذکرے (تذکرہ عشقی)، ص ۳۸۰

۳۔ تذکرہ ہندی ، ص ۱۲۶

۴۔ دستور الفصاحت ، ص ۱۷

شوق آخری عمر تک قائم رہا۔ جب عہدِ نواب شجاع الدولہ میں مصحفی اُن سے ملنے گئے تو ان کا یہ شوق بدستور تھا۔ چنانچہ مصحفی لکھتے ہیں۔ "فقیر عہدِ نواب شجاع الدولہ بہادر میں اس بزرگ (یعنی سودا) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھیں ابریشم پشم کے کتے پالنے کا بہت شوق تھا۔"

کلیاتِ میر میں ایک ہجو " ہجو عاقل نام ناکسے کہ بہ سگان انسے تمام داشت " کے نام سے ہے۔ یہ ہجو غالباً سودا پر ہے کیونکہ کلیاتِ سودا میں اس کا جواب ہے۔ میر نے اپنی ہجو میں لکھا ہے کہ سودا کتوں کے پیچھے دیوانے رہتے ہیں۔

کتوں کے ساتھ کھانے لگا کتوں سے معاش
بچھڑی کی طرح شام و سحر کتوں کی تلاش
پاکیزگی و لطافت وہ برطرف
کتا بغل میں مارے لگا پھرنے ہر طرف

سودا کو کتے اتنے عزیز تھے کہ اگر کوئی ان کتوں کو کچھ کہتا تو انھیں سخت ناگوار ہوتا۔

دُنکارو کتے کو تو لہو اپنا وہ پیے
ہے اس کی استخواں شکنی کتوں کے لیے

وہ کتوں کی تلاش میں اس طرح مارے مارے پھرتے کہ دین اور دنیا سے بے خبر ہو گئے تھے۔

۱۔ تذکرۂ ہندی، ص ص ۱۲۵-۱۲۶

کتوں کی جستجو میں ہوا روڑا باٹ کا
دھوبی کا کتا ہے کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

انھوں نے دہلی میں تین کتیاں پالی تھیں۔ جن سے انھیں بے انتہا محبت تھی۔ ان کتیوں کی خاطر ہمسایوں کی گالیاں بھی کھانا پڑیں۔ جب یہ کتیاں مریں تو سوداؔ کو بہت افسوس ہوا۔

دلّی میں تین کتیاں کہیں لے کے پالیاں
ہمسایوں کی جنھوں کے لیے کھائیں گالیاں
وہ مر گئیں تو دیر رہا روتا غم زدہ
بستی کے نیچے پھر نہ ہنسا ٹک ستم زدہ
لونگی کا گرم غم جو رہا سوکھ میخ ہوا
برفی کی تعزیت میں سگ روئے میخ ہوا

ظاہر ہے کہ میرؔ نے مبالغے سے کام لیا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ سوداؔ کو کتوں سے بہت محبت تھی۔ اپنے اس شوق کا ذکر انھوں نے ہجوِ فدوی میں بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں :۔

سن بے الّو بہنچ کے بنگالے
مادہ سگ آپ کو تو بنوا لے
میرے تئیں گو ہے بسکہ ذوق بہ سگ
سگ بہت خوب میں نے ہیں پالے

میرؔ کی ہجو کا جواب دس بندوں کی ایک مسدّس میں دیا ہے جس کے دو بند یہ ہیں :۔

اکثر تو مرے خبث میں کہتا ہے یہی بات

کتّوں میں فلانے کی شب و روز ہی اوقات
خود اس کی نجاست کا نہیں کتّے پہ اثبات
لازم ہے مسلماں نہ کرے اس سے ملاقات
یہ چاہیے صحبت سے رکھے ایسے کے اکراہ

کتّے سے شب و روز جو رکھتا ہوں میں صحبت
دیتا ہے مجھے یادِ وفا اور قناعت
دنیا کے وہ جیفے کو سمجھتا ہے نجاست
اک پارچۂ نان پہ ہے مرے ساتھ رفاقت
کس طرح بتا اس کی مرے دل میں نہو چاہ

ترکِ وطن نادر شاہ کے حملے نے دہلی کو اس طرح تباہ و برباد کیا کہ بعض لوگوں نے دہلی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔ لیکن سودا ثابت قدم رہے کیونکہ ان کے سرپرست اور مربّی دہلی میں موجود تھے۔ سودا کے علاوہ کچھ اور اہلِ ہنر بھی دہلی سے نہ گئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ شجاع الدولہ کے مسند نشین ہونے تک، پورے ہندوستان میں فرخ آباد کے علاوہ کوئی دوسرا مقام ایسا نہیں تھا۔ جہاں اہلِ فن کو پناہ مل سکتی تھی۔ برہان الملک کا نادر شاہی حملے کے دوران انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے وارث صفدر جنگ کو دشمنوں نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ شجاع الدولہ کے حالات البتہ کچھ بہتر تھے۔ مگر ابتدائی دورِ حکومت میں وہ بھی ملکی سیاست میں اتنا مصروف رہا کہ اسے "طاؤس و رباب" کی فرصت نہیں ملی۔ اس وقت مشہور و معروف شاعروں میں خانِ آرزو ایسے شاعر ہیں جنھیں شجاع الدولہ کی سرکار سے تین سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ وفات سے کچھ سال قبل جب شجاع الدولہ

کے اکثر دشمن تہ خاک ہو چکے تھے اور انگریزوں کی دوستی حاصل ہو گئی تھی۔ اُس وقت شجاع الدولہ نے فیض آباد میں مستقل قیام کا ارادہ کیا۔ شہر کی تعمیر میں دل چسپی لی۔ اور بزم آرائیوں کے سامان کیے۔ فیض آباد اور بعد میں لکھنؤ ادبی مرکز بن گیا۔ جہاں ہندوستان کے اکثر نامور شاعر اور ادیب اپنی متاعِ ہنر کا صلہ پانے کے لیے پہنچے۔

اودھ کے باقاعدہ ادبی مرکز بننے سے پہلے فرخ آباد ایک ایسا مقام تھا جہاں نواب احمد خاں بنگش کے دیوان مہربان خاں رند کی فیاضیوں نے کچھ شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ ان میں مرزا رفیع سودا اور میر سوز جیسے نامور شعرا بھی تھے۔

دہلی میں احمد شاہ ابدالی کے حملے (۱۱۷۰ھ) نے ایک عظیم سیاسی انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ ابدالی نے نادر شاہ کی تاریخ دُہرا دی۔ اس لیے اکثر لوگ ہراساں و پریشاں دہلی سے نکل کر شہر شہر مارے پھر رہے تھے لیکن سودا اب بھی دہلی ہی میں رہے۔ ان کے مربی عماد الملک کا ستارہ گردش میں ضرور تھا۔ لیکن ابھی تک ان کا سیاسی اقتدار برقرار تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے انھیں دُرّانی فوج اور دو شہزادوں مرزا ہدایت بخش اور مرزا بابر کے ساتھ روانہ کیا تھا تاکہ وہ صوبۂ اودھ سے روپیہ وصول کریں۔ عماد الملک پہلے فرخ آباد میں وارد ہوئے۔ جہاں نواب احمد خاں بنگش نے ان کا استقبال کیا۔ اور نذر گزرانی۔ قائمؔ نے لکھا ہے کہ مرزا رفیع السودا' وزیر الممالک نواب غازی الدین خاں عماد الملک کے ساتھ فرخ آباد پہنچے۔ نواب مہربان خاں رند نے عماد الملک سے درخواست کی اور سودا کو اپنی رفاقت میں لے لیا[۱] جس کا مطلب

۱۔ مخزنِ نکات، ص ۵۵

یہ ہوا کہ سودا ۱۱۷۰ھ میں فرخ آباد وارد ہوئے۔ لیکن صاحب نشترِ عشق کا بیان ذرا مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ احمد شاہ ابدالی کے دوبارہ دہلی آنے پر جو تباہی و بربادی ہوئی۔ اس سے پریشان ہو کر سودا نے ترکِ وطن کیا اور فرخ آباد آ گئے۔[۱]

ابدالی کے دوبارہ دہلی آنے کی مختصر داستان یہ ہے کہ ۱۱۷۰ھ میں ابدالی نے عماد الملک کو امیر الامرائی کے منصب پر فائز کیا۔ جب عماد الملک ابدالی کے حکم سے اودھ کی طرف گئے تو عالم گیر ثانی اور نجیب الدولہ کے بہکانے پر یہ منصب نجیب الدولہ کو عنایت کر دیا گیا۔ عماد الملک نے سورج مل جاٹ کی مدد سے دہلی پر حملہ کر دیا۔ نجیب الدولہ کو بے سر و سامانی کی وجہ سے صلح کرنی پڑی اور اپنے علاقے کی طرف چلے گئے۔ عماد الملک نے ۱۱۷۳ھ میں عالم گیر ثانی اور نواب انتظام الدولہ کو قتل کرا دیا۔ شاہجہاں ثانی کو تخت نشین کیا۔ احمد شاہ ابدالی نے یہ خبر سن کر پھر دہلی کا رُخ کیا۔ عماد الملک نے دہلی سے فرار ہو کر سورج مل جاٹ کے قلعوں میں پناہ لی۔ جس کا ذکر صاحبِ مقالات الشعرا نے بھی کیا ہے۔[۲]

اس کا امکان بہت کم ہے کہ سودا ۱۱۷۴ھ کے بعد بھی دہلی میں رہے ہوں۔ کیونکہ جمادی الآخرہ ۱۱۷۴ھ (جنوری ۱۷۶۱ء) (پانی پت کی لڑائی) کے بعد احمد شاہ ابدالی نے نجیب الدولہ کو امیر الامرائی کے منصب پر سرفراز کیا تھا اور اس کے بعد لگ بھگ دس سال تک نجیب الدولہ کی حیثیت ایک ڈکٹیٹر کی رہی۔ نجیب الدولہ عماد الملک کے جانی دشمن تھے۔ اس لیے بظاہر یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ نجیب الدولہ کے عہد میں سودا جو عماد الملک کے خیر خواہ تھے، دہلی میں

۱۔ نشترِ عشق (قلمی)، ص ۶۶۶

۲۔ قیام الدین حیرت، مقالات الشعرا (قلمی)، رام پور، ورق ۱۰ ب

رہے ہوں گے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ ۱۱۷۴ھ کے لگ بھگ دہلی سے نکل کر عماد الملک کے پاس پہنچ گئے اور عماد الملک کے ساتھ ۱۱۷۴ھ۔۱۱۷۶ھ کے درمیانی زمانے میں فرخ آباد گئے![1] بہرحال ۱۱۷۶ھ میں سودا فرخ آباد میں موجود تھے۔ کیونکہ انھوں نے مہرباں خاں رند کی شادی کا جو قطعہ تہنیت کہا ہے اس کا مادۂ تاریخ ہے:

ہوا ہے وصل ماہ و مشتری کا

اس مادہ سے ۱۱۷۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔ امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا خیال ہے کہ سودا ۱۱۷۶ھ میں فرخ آباد پہنچے![2]

صاحب خزانہ عامرہ کا بیان ہے کہ عماد الملک ۱۱۷۶ھ تک سورج مل

۱۔ (الف) شیخ چاند نے فرخ آباد میں سودا کا سالِ ورود ۱۱۶۷ھ بتایا ہے جو کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جب احمد شاہ درّانی کے شورے سے ۱۱۶۷ھ میں عماد الملک دو شہزادوں کے ساتھ فرخ آباد گئے تو سودا بھی ہمراہ تھے۔ سودا، ص ۵۰

(ب) ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے لکھا ہے کہ "شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں ان کی شاعری عروج پر تھی۔ کئی رؤسا کے ہاں ان کی قدر ہوتی تھی خصوصاً بسنت خاں خواجہ سرا و مہربان خاں زیادہ مہربان تھے۔ جب احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے حملوں سے دلی تباہ و برباد ہو گئی تو سودا نے باہر کا رخ کیا۔ دلی کا دبستانِ شاعری، ص ص ۱۵۰-۱۵۱ ــــ شاہ عالم اگرچہ ۱۱۷۴ھ میں تخت نشین ہوئے تھے لیکن تقریباً دس سال تک وہ الہ آباد میں رہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کا بیان درست نہیں۔ بسنت خاں محمد شاہی دور کا امیر تھا اور مہربان خاں رند وہی ہے جو نواب احمد خاں بنگش کا دیوان تھا۔ بظاہر یہ غلط فہمی آزاد کی پیدا کردہ ہے۔

۲۔ حکیم سید احمد علی خاں یکتا، دستور الفصاحت، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، حواشی ص ص ۵۷-۵۸۔

کے ساتھ مقیم رہے[1]۔ تاریخ فرخ آباد سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ تقریباً اسی سال عماد الملک فرخ آباد پہنچے[2]۔ نواب احمد خاں بنگش نے ان کے لیے اچھی خاصی جاگیر مقرر کردی تاکہ اُن کا گزر ہو سکے۔ تاریخ فرخ آباد ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب شاہ عالم بادشاہ الہ آباد سے دہلی کی طرف جانے لگے تو عماد الملک وہیں موجود تھے۔ انھیں جب یہ خبر ملی کہ شاہ عالم فرخ آباد کے قریب سے گزریں گے تو وہ فرخ آباد سے روانہ ہو گئے کیونکہ انھیں خوف تھا کہ شاہ عالم اپنے والد عالم گیر ثانی کا بدلہ نہ چکالیں۔ شاہ عالم کا یہ سفر ۱۱۸۴ھ میں ہوا تھا جس کا مطلب ہے کہ عماد الملک ۱۱۷۶ھ۔ ۱۱۸۴ھ تک فرخ آباد میں رہے۔ اب سوال یہ ہے کہ سودا کب ان کے ساتھ فرخ آباد آئے۔ ۱۱۷۰ھ میں سودا کے آنے کا کوئی سوال نہیں۔ احمد شاہ ابدالی دوسری بار ۱۱۷۴ھ میں دہلی آیا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ سودا نے اُس سال ترکِ وطن کیا ہے اور عماد الملک کے پاس سورج مل جاٹ کے قلعوں میں پہنچ گئے۔ مرزا مظہر جانجاناں نے کئی خطوط عماد الملک اور ان کے کسی عہدے دار غلام عسکری خاں کو لکھے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عماد الملک خاموش نہیں بیٹھے تھے۔ وہ دہلی پر حملہ کرنے اور منصب امیر الامرائی حاصل کرنے کے لیے برابر کوششیں کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں وہ روہیلوں، مرہٹوں اور جاٹوں سے مدد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ فرخ آباد بھی گئے تھے تاکہ نواب احمد خاں بنگش سے مدد چاہیں۔ سودا اُن کے ساتھ تھے اور مہربان خاں رند

۱۔ خزانۂ عامرہ، ص ۱۵۳

۲۔ میر ولی اللہ، تاریخ فرخ آباد (قلمی)، رام پور

کی فرمائش پر وہیں مقیم ہو گئے۔

فرخ آباد میں سودا نواب مہربان خاں رند کی سرکار سے منسلک رہے۔ اور نواب احمد خاں بنگش سے کوئی قابلِ ذکر تعلق نہیں رہا۔ کلیاتِ سودا میں چند قطعات ہیں جو نواب احمد خاں کی سالگرہ اور غسلِ صحت کے موقعوں پر کہے گئے ہیں۔ ان میں کم سے کم دو اشعار اور زیادہ سے زیادہ پانچ اشعار کے قطعات ہیں۔ جن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ سودا کے نواب احمد خاں سے براہِ راست تعلقات نہیں تھے۔ ورنہ یہ قطعات اتنے مختصر نہ ہوتے۔ غالباً نواب مہرباں خاں رند کے تعلق سے یہ اشعار کہے گئے ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سودا نواب احمد خاں بنگش کی سرکار میں ملازم تھے۔ مگر یہ درست نہیں[1]!

بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ نواب مہرباں خاں رند کو سودا سے تلمذ تھا۔ مگر یہ بھی درست نہیں۔ سودا اس کے دربار سے ضرور متوسل تھے۔ لیکن اس کے استاد میر سوز تھے۔

فرخ آباد کے دورانِ قیام میں محمد یار خاں امیر نے سودا کو بلایا۔ بقول مصحفی "جن دنوں حکیم کبیر سنبھلی کے ترغیب دلانے پر ہندی شاعری نے نواب محمد یار خاں امیر کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچا تو انھوں نے میر سوز اور مرزا رفیع سودا کو خط لکھ کر طلب کیا۔ چونکہ ان دنوں یہ دونوں بزرگ

۱۔ مثلاً:۔ سعادت خاں ناصر لکھتے ہیں "بعد برہمی سلطنت شاہجہاں فرخ آباد تشریف لائے اور نواب احمد بنگش کی سرکار میں نوکر رہے" تذکرہ خوش معرکۂ زیبا (قلمی)۔ مبتلا نے بھی یہی لکھا ہے کہ چندے ..... نزد نواب احمد خاں بنگش گزرانید۔ گلشن سخن (قلمی) ورق ۵۶ ب

مہرباں خاں رندؔ کی سرکار میں صیغۂ شاعری میں عز و امتیاز رکھتے تھے۔ اس لیے ان کا فرخ آباد سے ٹانڈہ (کہ نواب کی بود و باش کا موضع تھا) آنا نہ ہوسکا۔ آخر میاں محمد قائمؔ کہ ان دنوں بسولی میں تھے حسب الاشارہ ٹانڈہ آئے اور والاجناب کی ملازمت حاصل کی۱۔" (فارسی سے ترجمہ) (تذکرہ ہندی، ص ۱۳)

فرخ آباد کے سیاسی حالات خراب ہونے پر سوداؔ کو مجبوراً فیض آباد جانا پڑا۔ یہ یقینی امر ہے کہ سوداؔ ۱۱۸۳ھ تک فرخ آباد میں تھے۔ کیوں کہ لچھمی نرائن شفیقؔ لکھتے ہیں کہ سوداؔ نے غرّہ ربیع الآخر کا لکھا ہوا ایک خط اور اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے کچھ اُردو اور فارسی اشعار دکن میں میر اولاد محمد خاں ذکاؔ بلگرامی کو فرخ آباد سے بھیجے تھے۲۔

مردان علی خاں مبتلاؔ لکھتے ہیں کہ نواب احمد خاں بنگش کی وفات کے بعد سوداؔ فیض آباد چلے گئے۔ نواب کا انتقال ۲۸ ربیع الاول ۱۱۸۵ھ کو ہوا جس کی وجہ سے غالباً رندؔ کے حالات خراب ہوگئے اور سوداؔ کو ۱۱۸۵ھ کے اواخر میں فیض آباد آنا پڑا۔ سوداؔ نے مہربان خاں رندؔ کے دیوان و اشعار کی مدح میں ایک مثنوی کہی ہے۔ جس میں چند اشعار ایسے بھی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوداؔ نواب احمد خاں بنگش کی زندگی ہی میں فرخ آباد سے چلے گئے۔ وہ

۱۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں: "احمد خاں بنگش سے متعلق سوداؔ کی نظمیں ہیں۔ مگر فرخ آباد میں مہربان خاں رندؔ سے توسل رکھتے تھے۔ میرے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں، جسے ریختہ گوئی کی حیثیت سے احمد خاں بنگش نے فرخ آباد آنے کی دعوت دی ہو۔" قاضی عبدالودود، دلّی کا دبستانِ شاعری، ہماری زبان، علی گڑھ، ۸ مارچ ۱۹۵۹ء، ص ۲

۲۔ لچھمی نرائن شفیق، گلِ رعنا (قلمی) ص ۶۱۲

اشعار یہ ہیں :-

لیکن اس نظم سے نہ سمجھیو تو
کچھ صلہ سے غرض ہے سودا کو
اس سے رکھتا ہے یہ دلِ مہجور
مہربان دوستی تری منظور
کر چکا میں دعا پہ ختم کلام
پہونچے رخصت کا مرے تجکو سلام
حشر تک زیرِ سایۂ نواب
رہیو جوں آفتاب عالمتاب[1]

ان اشعار کی روشنی میں شیخ چاند نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سودا نواب کی زندگی ہی میں فرخ آباد سے چلے گئے تھے اور چونکہ ۱۱۸۳ھ میں ان کا فرخ آباد ہونا ثابت ہے اس لیے وہ ۱۱۸۳ھ اور ۱۱۸۵ھ کے درمیان فیض آباد پہنچے[2] ہمارے خیال سے بظاہر کوئی ایسی وجہ سمجھ میں نہیں آتی جس سے مبتلا کا بتایا ہوا سن غلط ثابت ہو[3]

مولانا عبدالحی نے بھی یہی لکھا ہے کہ "۱۱۸۵ھ میں نواب احمد خاں کا

۱۔ ہمارا خیال ہے کہ نواب کی زندگی میں سودا نے فرخ آباد سے جانے کا ارادہ کیا ہوگا مگر بعد میں ملتوی کر دیا۔

۲۔ سودا، ص ۵۶

۳۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی تحقیق ہے "اب عام طور سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ سودا ۱۱۷۳ھ اور ۱۱۷۵ھ کے درمیان فیض آباد پہنچے" لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ص ۸۹

انتقال ہو گیا۔ یہ بر داشتہ خاطر ہو کر فیض آباد چلے آئے[1]۔"

سعادت خاں ناصر نے سودا کے فیض آباد جانے سے متعلق ایک دلچسپ داستان بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "جب نواب شجاع الدولہ بہادر نے سنا کہ مرزا رفیع فرخ آباد آیا ہے۔ شقہ خاص اس کی طلب میں قلمی فرمایا۔ سبحان اللہ کیا وضع داری تھی کہ نواب کے شقہ کے جواب میں یہ رباعی لکھی۔ ؎

سودا پئے دنیا تو بہ ہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ باں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نا کہ دنیا ہووے
بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

۱۔ (و) گل رعنا، ص ۱۳۵

(ب) محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ "..... کئی برس کے بعد وہ قدر دان مر گئے زمانے بدل گئے سودا بہت گھبرائے۔ اس عہد میں ایسے تباہی زدوں کے لیے دو ٹھکانے تھے۔ لکھنؤ یا حیدر آباد، لکھنؤ پاس تھا اور فیض و سخاوت کی گنگا بہہ رہی تھی۔ اس لیے جو دلّی سے نکلتا تھا۔ اُدھر ہی رخ کرتا تھا اور اتنا کچھ پاتا تھا کہ پھر دوسری طرف خیال نہ جاتا تھا۔ اس وقت حاکم بلکہ وہاں کے محکوم بھی جویائے کمال تھے۔ نکتہ کو کتابکے مولوں خریدتے تھے۔ غرض ۶۰ یا ۶۶ برس کی عمر میں دلّی سے نکل کر چند روز فرخ آباد میں نواب بنگش کے پاس رہے۔ اس کی تعریف میں بھی کئی قصیدے موجود ہیں۔ وہاں سے ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہنچے۔ آب حیات، ص ص ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ یہاں آزاد کو کئی غلط فہمیاں ہیں۔ سودا جب دہلی سے نکلے ہیں تو ان کی عمر تقریباً ۵۵ سال تھی۔ وہ فرخ آباد میں چند روز نہیں تقریباً دس سال رہے تھے اور ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ نہیں فیض آباد پہنچے تھے کیوں کہ ان دنوں اودھ کا دار الحکومت فیض آباد تھا۔

حضور پر نور اس رباعی سے بخیلے گراں خاطر ہوئے۔ میر غلام حسین تخلص ضاحک کہ نمک مجلس تھے واسطے رفع ملال یوں بول اُٹھے۔ اگر وہ حضور پر نور کے شتقہ سے نہیں آتا ہے۔ غلام بے طلب کھینچ لاتا ہے۔ قصیدہ سالگرہ کا نواب عماد الملک غازی الدین خاں کی تعریف میں سودا کا کہا ہوا تھا۔ تمام اسی مصنف کی مذمت میں الٹا۔ چنانچہ یہ شعر ؎

پاؤں کھڈی پہ رکھو ہاتھ میں لو آئینہ
.... ناک پہ دھر کر عینک

جب وہ مزخرفات سودا نے سنی بہ حکم آنکہ دیوانہ راہ ہوئے (کذا) روانہ لکھنؤ کو ہوا۔ میر سابق الذکر نے کہ دلیری و شوخ چشمی ان پر ختم تھی۔ بے سابقہ معرفت مرزا کی ملاقات کو قدم رنجہ کیا۔ اسی فروتنی سے غبار عناد کا سودا کے دل سے مطلق صاف ہو گیا۔ موافق قاعدۂ ہندوستان عطر و پان کے واسطے اندر تشریف لے گئے۔ اس عرصے میں کہ برآمد ہوں اس ٹھٹھول نے قلمدان کھولا اور یہ مطلع ایک پرچے پر لکھا دیکھا۔ ؎

رستم سے تو کہہ پیادے سر تیغ تلے دھر دے
پیادے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے دہر مردے

اس کے برابر یہ مطلع لکھ دیا ؎

سودا نے اٹھا چوڑ جب یاد دیا پڑدے
یہ ان ہی سے ہوتا ہے ہر کارے دہر مردے

بعد دو چار گھڑی کے جب وہ صحبت برہم ہوئی۔ سودا نے قلمدان کھولا اور وہ مطلع پڑھا یقین کلی ہوا کہ یہ سید نا سید اور مرد نا معتمد ہے۔ بے اختیار یہ شعر زبان پر گزرا۔ ؎

ریم سوزاک پدر ہے تو یہ شر
رحم مادر سے پلٹ نکلا ہے میٹر"

سودا اودھ میں

۱۱۸۵ھ میں جب سودا اودھ پہنچے تو نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا اور اودھ کا دار الخلافہ فیض آباد تھا۔ سودا نے فیض آباد میں قیام کیا۔ اور نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں معقول تنخواہ پر ملازم ہو گئے[۱]۔ [۲] مصحفی نے لکھا ہے کہ نواب ان کی بہت عزت کرتے تھے[۳]۔ نواب شجاع الدولہ کی وفات پر نواب آصف الدولہ مسند نشین ہوئے تو سودا ان کی سرکار سے متوسل ہو گئے۔ آصف الدولہ نے فیض آباد کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا تو سودا بھی لکھنؤ آ گئے۔ غالباً لکھنؤ میں سودا کی مالی حالت اچھی نہیں رہی۔ اگرچہ کچھ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آصف الدولہ کی سرکار سے انھیں چھ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر مقرر ہوئی تھی۔ علی لطف لکھتے ہیں۔

"جب کہ بعد خراب اور ویران ہونے شاہجہاں آباد کے نقل وحرکت

۱۔ (الف) تذکرہ خوش معرکۂ زیبا (قلمی)

(ب) ناصر کا یہ بیان کہ شجاع الدولہ نے جب سنا کہ سودا فرخ آباد آئے ہیں تو انھیں بلایا جب نہیں آئے تو ضاحک نے ہجو لکھ کر فیض آباد آنے مجبور کر دیا۔ درست نہیں۔ سودا فرخ آباد میں تقریباً دس سال رہے ہیں۔

۲۔ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (قلمی)

۳۔ مصحفی کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ "غرضیکہ شخص جامع الکمالات بود، ہر جا کہ می رفت عزت و حرمت تمام می یافت۔ نواب مرحوم ومغفور نیز بودن اورا در سرکار خود بسیار غنیمت می دانستند" تذکرہ ہندی، ص ۱۲۶

کا اتفاق میرزائے مذکور کو اس سے ہوا۔ تو اور شہروں کی سیر کرتے ہوئے آخر بلدۂ لکھنؤ میں طور سکونت کا اختیار کیا۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت قدر و منزلت کی اور چھ ہزار سالیانہ کی جاگیر مقرر کر دی[۱]"

علی لطف شاید پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے چھ ہزار کی جاگیر کا ذکر کیا ہے لیکن اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا کے متعلق ان کی معلومات بہت محدود تھیں۔ سودا پہلی بار لکھنؤ نہیں۔ بلکہ فیض آباد پہنچے تھے۔ وہ آصف الدولہ کی بجائے نواب شجاع الدولہ کے عہد میں آئے تھے۔ ان غلط فہمیوں کے پیشِ نظر سودا کی آمدنی سے متعلق بھی ان کا بیان قابلِ یقین نہیں۔ اشپرنگر نے بھی یہی لکھا ہے کہ سودا کو آصف الدولہ نے چھ ہزار سالانہ کا وظیفہ دیا تھا[۲]۔ لیکن اشپرنگر کا ماخذ بھی گلشنِ ہند ہے۔ اس لیے قابلِ اعتماد نہیں۔ آزاد نے آمدنی سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

لکھنؤ میں مرزا فاخر مکیں زبان فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ اُن سے اور مرزا رفیع سے بگڑی اور جھگڑے نے ایسا طول کھینچا کہ نواب آصف الدولہ کے دربار تک نوبت پہنچی۔ انجام یہ ہوا کہ علاوہ انعام و اکرام کے چھ ہزار سالانہ وظیفہ ہوگیا۔ اور نواب نہایت شفقت کی نظر فرمانے لگے[۳]۔"

۱۔ گلشنِ ہند، ص ۱۴۲
۲۔ یادگارِ شعرا، ص ۱۱۱
۳۔ آبِ حیات، ص ۱۵۱

اس سلسلے میں بھگوان داس ہندی کا بیان سب سے زیادہ قابلِ قبول معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ لکھنؤ میں سودا سے ان کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ نواب شجاع الدولہ نے سودا کے دو سو روپے ماہوار مقرر کیے اور خلعت عطا کی۔ جب نواب شجاع الدولہ کا انتقال ہوگیا تو آصف الدولہ کی سرکار سے دو سو روپے ماہانہ ملنے شروع ہوگئے[۱]۔ یہ بات اس لیے بھی قریب بہ یقین ہے کہ میر تقی میر کو بھی آصف الدولہ کے دربار سے دو سو روپے ماہانہ ملتے تھے[۲]۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ سودا کو پانچ سو روپے ماہوار ملیں اور میر کو صرف دو سو۔

اگرچہ سودا کا ماہانہ مقرر تھا لیکن آصف الدولہ کے عہد میں اس کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ان کے عہد میں ملازموں کو مہینوں اور بعض اوقات برسوں تنخواہوں سے محروم رکھا جاتا تھا۔ آصف الدولہ کی لاپرواہی اور نا اہل لوگوں کے اقتدار نے صوبے کی آمدنی کو بہت محدود کر دیا تھا۔ جو تھوڑی بہت آمدنی تھی وہ آصف الدولہ کی عیاشیوں کے لیے بھی کافی نہیں تھی۔ سودا براہِ راست درخواست کرتے ہوئے شرماتے تھے۔ اودھ آنے سے قبل کے قصیدوں میں انھوں نے اپنا دامن نہیں پھیلایا۔ ہاں نواب عماد الملک سے ایک طویل قصیدے کے دو اشعار میں یہ درخواست کی تھی۔

اس کے مصرف کے جو دیہات ہیں بس اُن میں سے
اپنے مداح کو بھی کر دے مقرر صحنک

۱۔ سفینۂ ہندی، ص ۱۰۵

۲۔ میر محمد خاں بہادر سرور، عمدۂ منتخبہ، مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، دہلی، ۱۹۶۱ء
ص ۵۵۳

تو ہی اب دل میں کر آپ عرض مری کا انصاف
جائے کس در پہ کہو پہونچ کے ایسے در تک

لیکن ایک قصیدے میں سوداؔ نے آصف الدولہ کو اپنا حال ذرا تفصیلی بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ مجھے اپنی تنخواہ لینے کے لیے ایک ایک آدمی کی خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ مجھے تنخواہ دینے کی بجائے مصرف مطبخ میں سے صحنکِ طعام مقرر کر دیجیے تاکہ ہر روز کی جھک جھک سے نجات پالوں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اس نظم سے غرض ہے مجھے عرض مدعا
مقصد میرا قلیل ہے پہونچے بانصرام
اپنی تری جناب میں اتنی ہی عرض ہے
کس کس کا ملتجی ہوں کہا کر ترا غلام
انصاف ہے کہ ہو وہ عطا اس جناب کی
اور ان کی میں سماجت و منّت کروں مدام
دیہات جو ہیں مصرف مطبخ کے اوس میں سے
اس نقدی کے عوض ہو مجھے صحنک طعام
اے گنج بخش خلق مرا ہے جو مدعا
کرنا روا حضور ترے کس قدر ہے کام

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آصف الدولہ نے سوداؔ کی اس درخواست پہ توجہ نہیں کی۔ اور سوداؔ کو مجبوراً اراکین حکومت کی خوشامد کرنی پڑی۔ سرفراز الدولہ حسن رضا خاں بہادر ایک اَن پڑھ شخص تھے جنھیں جان برسٹو کی عنایت سے آصف الدولہ کی نیابت عطا ہوئی تھی[۱]۔ وہ کافی عرصے تک حکومت کے سیاہ سفید

۱۔ نجم الغنی، تاریخ اودھ، ۳، ص ۱۳۰

کے مالک رہے۔ سودا نے ان کا بھی قصیدہ لکھا۔ جس میں انھوں نے اپنی مالی بدحالی کا ذکر شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

دیا ہے قوت اعضا نے دل کو میرے جواب
سبب ضعیفی کے طاقت ہوئی ہے میری طاق
سپہ گری میں تو گزرا شباب کا عالم
نہیں وہ عمر کہ اب آؤں میں بکار سیاق
جو باندھوں اس پہ کمر اب تو بندھے اس طرح (؟)[۱]
کہ جوں کمان کا قبضہ بندھے مقابل فاق
جو دست و پا میں نہ اس کے رہی ذرا طاقت
لیا میں فن سخن کھول کر کمر سے یراق
سو اب میں تیغِ زباں سے لڑوں ہوں بخت کے ساتھ
ہوں فتحیاب مدد کی جو ہووے تیری وثاق
سلامتی میں تو اپنے روا نہ رکھ مجھ پر
ذلیل و خوار نہ ہوں میں بہ چشمِ اہلِ نفاق
پھرا کروں میں لیے مشتِ استخواں اپنے
میانہ میں پئے عمّال زیر کہنہ رواق
سو اب تو اس سے بھی نوبت گزر گئی ہی مگر
گلے میں کرتہ بپا کفش ہاتھ میں ہو چماق

۱۔ یہ مصرع غالباً اس طرح ہوگا

جو باندھوں اس پہ کمر اب تو اس طرح باندھوں

سپرد تجکو ہے سررشتہ سب کی حرمت کا
کیا ہے اتنی وہ مخلوق کا ہے جو خلّاق
سو طالب اتنے میں حرمت کا اب نہیں جس سے
کروں معاش بسر اپنا میں بہ طمؔ طراق
عوض میں دے مجھے اس نقدی کے تو ایسا گانوں
بسر ہو عمر مری جس سے زیر کہنہ رواق
نہ ایسا گانوں کہ جس سے برسے دستر خوان
ہزار طرح کی نعمت ہو نان و خشک رُقاق
نہ شکل نور علی خاں ہوں کھا کے میں فربہ
نہ سوکھ کر ہوں طرح میرزا رفیع کے قاق

ان اقتباسات کی روشنی میں یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دورِ آصف الدولہ میں ان کی مالی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ انھیں اپنی تنخواہ حاصل کرنے کے لیے آصف الدولہ اور ان کے ملازمین کی خوشامد کرنی پڑتی تھی۔

وفات

مصحفی کے ایک شاگرد میر بہادر علی واَمق نے اپنی ایک تصنیف تصر اللطائف میں لکھا ہے کہ "چونکہ ان دنوں (آصف الدولہ کا) مزاج عہدِ صاحبزادگی سے ہزل کی طرف بہت راغب تھا اور کوئی بھی کلمہ خواہ ان کا ہو یا کسی دوسرے کا انھیں بہت خوش کرتا تھا اور وہ (بات کہنے والے کو) بے انتہا انعام واکرام سے نوازتے تھے۔ ان حالات کے پیشِ نظر مرزا رفیع سوداؔ نے نواب کے مسند نشین ہونے پر یہ مادۂ تاریخ کہا (...... نواب) (نواب سے پہلے ایک فحش لفظ ہے لیکن اس سے مسند نشینی کی تاریخ نہیں نکلتی) وہ جو مثل مشہور ہے کہ سلاطین و امرا کبھی سلام

کرنے سے غصہ ہو جاتے ہیں اور کبھی دشمنی کرنے پر بھی خلعت سے نوازتے ہیں۔ نواب ممدوح اس تاریخ کو سن کر برہم ہو گئے۔ اور سودا کی بے عزّتی کا حکم دیا چنانچہ مشہور ہے کہ سودا اسی شرم وغیرت کی وجہ سے چند روز ہی میں جہانِ فانی سے سدھار گئے اور چونکہ زیادہ آم کھانا ان کی موت کا بہانہ بن گیا تھا۔ اس لیے ایک شخص نے ہندی میں تاریخ وفات کہی۔

انبہ کھاتے کھاتے سودا کی جان نکلی

ایک عزیز نے اسی مضمون کو فارسی میں کہا ہے۔

آہ سودا انبہ خورد و مردؔ

مولف نے نواب کی برہمی کا جو ذکر کیا ہے۔ وہ واقعہ خلافِ قیاس ہے کیونکہ نواب ۱۱۸۸ھ میں مسند نشین ہوئے تھے اور سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا۔ سات سال کو "چند روز" نہیں کہا جا سکتا۔ دوسرے سودا کی کلیات میں بہت سے قصیدے آصف الدولہ کی مدح میں ہیں اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ نواب کی مسند نشینی کے بعد بھی سودا کے نواب سے تعلقات بحال رہے۔ البتہ مولف نے جو تاریخ وفات پیش کی ہے۔ وہ درست معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس تاریخ سے ۱۱۹۵ھ نکلتا ہے اور یہی سال وفات ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ سودا آم کھانے سے مرے۔

شاہ کمال الدین کمالؔ نے سودا کی وفات کے واقعہ کو دوسرے انداز

۱۔ میر بہادر علی واؔمق کی یہ پوری عبارت نثار احمد فاروقی کے ایک مقالے "میر بہادر علی واؔمق"، نقوش، اکتوبر ۱۹۵۸ء، ص ۲۳۳ سے لی گئی ہے۔

میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ” میر چھجو[1] نامی ایک شخص تھے۔ مہوا ان کی چڑھتی اسی مسخرگی کی وجہ سے آصف الدولہ کی سرکار میں ممتاز تھے۔ ایک دن نواب نے مرزا رفیع سودا سے فرمائش کی کہ ایک غزل بر زمین مہوا کہیں۔ سودا گھر آئے اور غزل مہوا کو اس طور سے کہا کہ مہوا کی جگہ لفظ ” دوہی “ بھی چسپاں ہوتا تھا[2]۔ وہ غزل نواب کو بھجوا دی۔ اس کے بعد سودا کی کمر میں درد شروع ہوا۔ قصہ کوتاہ دو تین گھڑی میں اسی درد میں انتقال فرما گئے“[3]

لچھمی نرائن شفیق نے سودا کی وفات پر جو قطعہ تاریخ کہا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴ رجب ۱۱۹۵ھ کو سودا کا انتقال ہوا۔ شفیق نے قطعہ کہا۔

لکھنؤ بیچ میرزائے رفیع ۔۔۔ چوتھی رجب کی جان سیں گزرے
جب کہ ..... گیا ہوئی تاریخ ۔۔۔ ہائے سودا جہان سیں گزرے[4]

۱۔ غالباً یہ وہی مرزا چھجو ہیں جو نواب آصف الدولہ کے ماموں زاد بھائی اور نواب سالار جنگ کے لڑکے تھے نجم الغنی نے ان کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ اودھ ، ۳ ، ص ۱۲۴

۲۔ اس غزل کا مطلع ہے۔

جگ میں تخمیر شراب ہے وہی ۔۔۔ ہرزہ گوئی کا باب ہے دوہی

یہ غزل کلیاتِ سودا میں بھی موجود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کلیات میں یہ شعر زائد ہے ؎

بھونے کوئی جو اس کو گیہوں میں ۔۔۔ ان کی خاطر کباب ہے دوہی

کمالؔ نے مقطع اس طرح نقل کیا ہے۔

میر چھجو جو گالی دیں سودا ۔۔۔ پاس اپنے جواب ہے مہوا

کلیات میں مہوا کی جگہ ” دوہی “ ہے۔

۳۔ مجمع الانتخاب ، ورق ۴۶۵ ب ۔ ۴۶۶ الف

لیکن شاہ محمد حمزہ لکھتے ہیں کہ سودا کا انتقال ماہ جمادی الثانی ۱۱۹۵ھ میں ہوا۔[1] یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کس کی بتائی ہوئی تاریخِ وفات ٹھیک ہے۔[2] مبتلا لکھتے ہیں کہ حالتِ نزع میں سودا کی زبان سے یہ مطلع نکلا ؎

آج سودا جہاں سے اٹھتا ہے
شور و غل ہر مکاں سے اٹھتا ہے[3]

حسین قلی خاں عاشقی[4] اور علی لطف[5] نے لکھا ہے کہ سودا کو امام باڑہ امام باقر میں مدفون کیا گیا۔ علی لطف لکھتے ہیں کہ سودا کے لوحِ مزار پہ فخر الدین ماہر کا یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے :-

خلد کو جب حضرت سودا گئے
فکر میں تاریخ کے ماہر ہوا
بولے منصف دور کر پائے عناد
شاعرانِ ہند کا سرور گیا
۱۱۹۵ھ

۱۔ نص الکلمات (قلمی)، ورق ۲۱۷ ب

۲۔ حصن المتین میں سنِ وفات ۱۱۹۶ھ دیا گیا ہے (بحوالہ دستور الفصاحت ص ۱۲) لیکن یہ درست نہیں۔ صاحبِ تذکرہ خوش معرکہ زیبا نے لکھا ہے کہ مرزا رفیع کو تخلص سودا ایک فقیر نے دیا تھا۔ اور یہ دعا دی تھی کہ تیری عمر تخلص کے ہم عدد ہوگی۔ سودا سے اکہتر سال برآمد ہوتے ہیں۔ جبکہ ہمارے حساب سے سودا نے تقریباً ستتر سال کی عمر میں وفات پائی۔

۳۔ غلام محی الدین مبتلا، طبقاتِ سخن (مائیکرو فلم)

۴۔ نشترِ عشق (قلمی) رامپور، ص ۶۶۶

۵۔ گلشنِ ہند، ص ۱۰۴

مصحفی لکھتے ہیں کہ محرم کے مہینے میں ایک بزرگ کی ایما پر مجھے سودا کے مزار کی زیارت کا اتفاق ہوا۔ لوحِ قبر پر میر فخر الدین ماہر کا قطعہ تاریخ دیکھا۔ چونکہ اس تاریخ کا تعمیہ تاریخ گوئی کے قانون کے خلاف تھا، اس لیے اسی روز تائیدِ فیضِ ربانی سے مولف کے خامۂ خیال سحر کار سے بے کم و کاست ایک قطعۂ تاریخ ٹپک پڑا۔

مرزا رفیع آنکہ ز اشعار ہندیش
ہر گوشہ بود در ہمہ ہندوستان غلو
ناگہ چو در نوشت بساطِ حیات را
گردید مدفنش ز قضا خاکِ لکھنؤ
تاریخ رحلتش بدر آورد مصحفی
سودا کجا و آہ سخنِ دلفریب او

۱۱۹۵ھ

سودا کے شاگرد قیام الدین قائم نے ان اشعار میں تاریخِ وفات کہی۔

آہ! مرزا رفیع دنیا سے
جا کے جنت میں جب مقیم ہوا
دردِ فرقت سے اوس کے مثلِ قلم
اہلِ معنی کا دل دو نیم ہوا
سالِ تاریخ کی تھی مجھ کو تلاش
کیوں کہ بس حادثہ عظیم ہوا

۱۔ تذکرۂ ہندی، ص ۱۲۶

اس میں پیرِ خرد نے از سرِ یاس
یہ کہا "اب سخن یتیم ہوا"[1]

۱۱۹۵ھ

عاشقی نے اس شعر کے دونوں مصرعوں سے سالِ وفات نکالا۔

میرس از من کہ اردو حال چونست
نہ سودا ماند نہ لطف سخنِ سودا[2]

شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی نے تاریخِ وفات کہی۔

گفتم سالِ وفاتش ناسخ
شاعرِ ہندوستان واویلا[3]

۱۱۹۵ھ

عبدالغفور نساخ نے گنجِ تواریخ میں سودا کی تاریخِ وفات اس شعر سے نکالی ہے۔

پئے ترحیل سودا بے تردد
بگو نساخ سودا جوہرِ فضل[4]

۱۱۹۵ھ

۱۔ نص الکلمات (قلمی)، ورق ۲۱۷ ب

۲۔ نشترِ عشق (قلمی)، رام پور، ص ۶۶۶

۳۔ مہدی علی خاں، تاریخِ لطیف (قلمی) رام پور۔ بقول ناصر لکھنوی شیخ ناسخ مغفور نے اسکی یہ تاریخ کہی۔

مضمون تازہ جستن شعر لطیف گفتن — باخویش برد ایوا مرزا رفیع السودا
تاریخ رحلتِ او گفتم بہ تربتِ او — امروز مُرد ایوا مرزا رفیع السودا

۱۱۹۵ھ

تذکرہ خوش معرکۂ زیبا (قلمی) لکھنؤ

۴۔ مولوی عبدالغفور نساخ، گنجِ تواریخ، لکھنؤ، ۱۸۷۵ء، ص ۲۵

مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ جب شاہ حاتم نے سودا کے انتقال کی خبر سنی تو بے اختیار ہو کر کہا۔ "ہائے ہمارا پہلوانِ سخن مر گیا"۔۱

۱۔ آبِ حیات، ص ۱۵۱

تنقید

اپنے منہ کے نہ کہا کن نے سخن کو گوہر
لعل سودا ہی کو پر ہم نے اُگلتے دیکھا

ادبی پس منظر

سودا میدانِ ادب میں اُس وقت آئے ہیں جب شمالی ہند میں اُردو شاعری کے باقاعدہ آغاز کو لگ بھگ نصف صدی گزر چکی تھی۔ شاعروں کی پوری ایک نسل یعنی خانِ آرزو اور اُن کے تلامذہ کا عہد ختم ہو چکا تھا۔ اور دوسری نسل کے شاعروں میں مرزا مظہر کے شاگرد آسمانِ ادب پر چھائے ہوئے تھے۔ سودا کی زندگی کا اچھا خاصا حصّہ پہلی نسل کے اساتذۂ فن کی صحبت میں گزرا۔ جہاں اُن کی ذہنی ساخت پرداخت ہوئی۔ دورۂ ایہام گویاں (خانِ آرزو اور ان کے تلامذہ) ختم ہو گیا۔ اور بساطِ ادب پہ نئے مہرے آئے۔ یہ نو وارد ایہام گوئی کے خلاف تھے۔ فطری طور پہ سودا نہ صرف اس نئی تحریک سے متاثر ہوئے بلکہ انھوں نے "سادہ گوئی" کو رواج اور فروغ دینے میں کسی سے کم حصّہ نہیں لیا۔ اس باب میں اُن ادبی عناصر اور تحریکوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جنھوں نے سودا کے ذہن و شخصیت اور شاعرانہ صلاحیتوں کو متاثر کیا تھا۔

فارسی کا عہدِ زوال اور اردو شاعری

ہندوستان میں فارسی شاعری کا زوال اورنگ زیب کے عہد میں شروع ہوا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ طویل عرصے تک دکن میں قیام اور مرہٹوں سے اورنگ زیب کی آویزش نے فنونِ لطیفہ کو درباری سرپرستی سے محروم رکھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اورنگ زیب کے عقائد نے

بھی اسے فنونِ لطیفہ کی پرورش سے باز رکھا! لیکن فی الواقع یہ دونوں ہی اسباب تھے جنھوں نے اورنگ زیب کے دَورِ حکومت میں شعر و شاعری، موسیقی، مصوری اور دوسرے فنونِ لطیفہ کو افسردہ رکھا۔ وہ شاعری میں بھی صرف ایسے اشعار کو پسند کرتا تھا جن میں معارف و حکم کے مضامین باندھے گئے ہوں یا جن میں کوئی اچھا اخلاقی نکتہ ہو۔ اس پر اس کے رقعات گواہ ہیں جن میں اس نے اپنے ہی اشعار لکھے ہیں۔ مغل بادشاہوں کی فارسی نوازی نے ہندوستان میں کئی عظیم شاعر۔ ادیب اور انشاء پرداز پیدا کیے تھے بلکہ فنونِ لطیفہ کی سرپرستی اور ادب نوازی میں مغل دربار کا یہ حال تھا کہ ولایت زادے ہزاروں میل کا سفر طے کر کے اور صفوی دربار چھوڑ کر ہندوستان آتے تھے۔

۱۔ خافی خان نے منتخب اللباب میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے جلوس کے گیارہویں سال میں دربار میں موسیقی بالکل بند کر دی اور صرف " نوبت " باقی رہ گئی۔ تمام موسیقار جن کو دربار میں بڑی عزت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا بے روزگار ہو گئے۔ چنانچہ ایک جمعہ کو تقریباً بہت سے موسیقار روتے پیٹتے ایک جنازہ لیے جا رہے تھے۔ اورنگ زیب نے اس ماتم اور گریہ و زاری کی وجہ معلوم کرائی۔ انھوں نے جواب دیا۔ اورنگ زیب کے احکامات کی وجہ سے موسیقی کا انتقال ہو گیا ہے اور اسے قبر میں دفن کرنے جا رہے ہیں۔ اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ان سے کہو کہ " چناں بہ خاک بسپارند کہ باز صدا و ندا از و برنیاید "۔ (منتخب اللباب ۲، ص ص ۲۱۲-۲۱۳)

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ عالم گیر نامہ۔ ص ص ۳۵۴-۳۹۱ — محمد ساقی مستعد خاں مآثرِ عالم گیری، مرتبہ آغا احمد علی، کلکتہ، ۱۸۷۱ء، ص ص ۸۱-۸۵

جاگیر داری دَور میں سماجی عزت حاصل کرنے کا بڑا ذریعہ دربار میں رسائی تھا۔ ہر دَور کے کچھ مروّج علوم ہوتے ہیں جنھیں علوم حاضرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مغل دربار کی شان و شوکت کا جب شباب تھا تو علوم معقول و منقول کی تکمیل کرنا ہی علم و فضل کا آخری درجہ سمجھا جاتا تھا اور اس کے ساتھ جہاں منطق۔ فلسفہ۔ ہیئت۔ اقلیدس اور طب وغیرہ کی دید و دانش ضروری تھی وہیں سخن فہمی اور سخن سنجی بھی شرفاء کے محبوب مشاغل تھے۔

چونکہ دہلی کی مقامی زبان میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ دربار کے تکلفات و آداب گفتگو کے بوجھ کی متحمل ہو سکتی اس لیے اہلِ قلم جو عام طور پر دربار میں رسائی چاہتے تھے فارسی کا سہارا لیتے اور شاید یہی ہندوستان میں فارسی کی مقبولیت کا سبب ہے۔ اس طرح فارسی اُردو کے راستے میں ایک بہت بڑا پتھر بن گئی۔ اس کی مقبولیت اُردو کو ادبی حیثیت حاصل کرنے نہیں دیتی تھی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل حکومت کی شکست و ریخت شروع ہو گئی۔ مغل بادشاہ زوال کے طوفان میں گھر گئے۔ انھیں مصائب آلام سے نظریں چرانے کے واسطے نظیریؔ اور عرفیؔ کی نہیں، گویوں اور رقاصوں کی ضرورت تھی۔ حزیںؔ جیسا عظیم المرتبت شاعر ہندوستان آیا اور مغل دربار اس کی قدر و منزلت سے قاصر رہا۔ خانِ آرزو جیسا شاعر اور عالم جسے امام المتاخرین کہا جاتا ہے مغل دربار سے کوئی فیض نہ حاصل کر سکا۔ مغل دربار کے اس رویے سے فارسی کا زوال شروع ہوا۔ لیکن اس زوال نے اُردو کے لیے فضا کو سازگار بنا دیا۔ انسان میں فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ مادری زبان میں اپنے جذبات کا اظہار اور احساسات کی ترجمانی کرے۔ اقتصادی

ضرورتیں اور تمنائے جاہ و منصب اس فطری خواہش کو دبائے ہوئے تھیں لیکن اب اہلِ علم دربار سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ انھیں دربار سے "ستائش کی تمنا" تھی اور نہ "صلے کی پروا" اس لیے یہ حضرات اُردو کی طرف متوجہ ہوئے۔

ایک اہم بات یہ تھی کہ عوام فارسی سے ناآشنا تھے۔ انھیں شعر و شاعری سے محروم رہنا پڑتا تھا۔ شاعر اپنی قوم۔ وطن۔ مذہب اور فرقے کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ دربار نے ان کے جذبات کے ترجمان چھین رکھے تھے۔ اب شاعر اپنے حقیقی سامعین یعنی عوام کی طرف متوجہ ہوئے اور اب انھیں پسند کرنے اور داد دینے والا ایک محدود طبقہ نہیں بلکہ پورا شہر اور پھر شمالی ہند سے جنوبی ہند تک ہندوستان کا ایک بہت بڑا حصہ تھا۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ فارسی زبان کے سلسلے میں ہند ایرانی نزاع اردو شاعری کی مقبولیت کا سبب بنا۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستانی شعراء فارسی میں اپنی پوری زندگی صرف کر دیتے تھے لیکن ایرانیوں کے معیار تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔" استعمال ہند" پر ہمیشہ اہل ایران کو اعتراض رہا۔ آج بھی ہندوستانی شعراء کی فارسی شاعری اہل ایران کی نظر میں سُبک ہندی کہلاتی ہے۔ حالانکہ یہ بات کتنی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ انیسویں صدی

۱۔ اس سبک ہندی کی خصوصیات یہ ہیں :۔

• دقتِ مضامین۔ دقتِ معانی۔ پیچیدگیِ خیال۔ باریک اندیشی۔ نازک کاری مشکل پسندی۔ نکتہ آفرینی۔ دور دراز تشبیہات و استعارات کا کثرت سے

کے آغاز تک کسی ایرانی نے فارسی میں تحقیق کی کوشش نہیں کی، نہ کوئی مستند لغت تیار کی۔ اس کی بہ نسبت فارسی کی بہترین لغات اور قواعد سے متعلق کتابیں ہندوستان میں مدون ہوئیں جن میں غرائب اللغات، مصطلحات، غیاث اللغات اور بہارِ عجم تک کتنے نام آجاتے ہیں۔ اس پر بھی مستزاد یہ ہے کہ ہندوستان میں فارسی کی بہترین لغات اور عروض و معانی کی کتابیں بیشتر اس زمانے میں لکھی گئیں۔ جسے ہم فارسی کے زوال کا زمانہ کہہ کر تعبیر کرتے ہیں۔

مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایرانیوں میں ہمیشہ لسانی تعصب رہا ہے۔ انھوں نے کبھی ہندوستانیوں کی فارسی شاعری کو نہیں سراہا۔ نہ کبھی زبان و قواعد کی تحقیق کے سلسلے میں ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔

ممکن ہے ایران کا ذی علم طبقہ ہندوستانیوں کی ان خدمات کو جو انھوں نے فارسی زبان و ادب کے لیے انجام دیں۔ نظرِ تحسین سے نہ دیکھتا ہو لیکن ہندوستان میں کبھی ایسا تھا اور نہ ہے۔

بقول ڈاکٹر منوہر سہائے انور۔

"یہ درست ہے کہ ہندوستانی سخن طراز دربست الفاظ۔ اسلوب بیان اور پرواز خیال میں ایرانی شعراء کی تقلید کو سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ ایرانیوں سے غلطی سرزد نہ ہونا ان کا جزوِ ایمان

استعمال۔ صحت و زبان کو قربان کر کے نئے مضامین و جدید مطالب کی بندش۔ تصنع اور تکلف میں افراط استحکام زبان و افکار کی طرف سے بے پروائی۔"

سید حسن، ایرانِ امروز میں غالب شناسی، اردوئے معلیٰ، غالب نمبر، دہلی، ۱۹۶۰، ص ۶۹

تھا۔ عہد عالمگیری تک جو اعتراضات ہوئے وہ ایرانی شعراء کے جستہ جستہ اشعار کی حدود سے آگے نہیں بڑھے یعنی یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کسی ہندوستانی صاحبِ قلم نے کسی جلیل القدر ایرانی شاعر کے کُل کلام کو مورد اعتراض بنانا چاہا ہو۔[1]"

عہدِ محمد شاہی میں جب خانِ آرزو نے حزیں کے دیوانِ چہارم کے چار سو اشعار کو غلط ٹھہرایا۔ تو خان آرزو کے ساتھ دینے والے اہلِ قلم کی ایک محدود تعداد تھی بلکہ بعض ہندوستانیوں نے تو خان آرزو پر تنقید کی بوچھاڑ کر دی مطلع السعدین میں وارستہ مل نے حزیں کی موافقت میں آرزو پر اعتراضات کیے ہیں[2]۔ ۱۲۶۷ھ میں امام بخش صہبائی جب قولِ فیصل پر تبصرہ کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ حزیں کی ایرانیت سے مرعوب ہیں۔ حاکم نے آرزو کے بیشتر اعتراضات کو غلط ثابت کیا ہے۔ علی لطف بھی حزیں کا ساتھ دیتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ۱۹۰۹ء میں خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی نے (مخزن میں) حزیں پر مضمون لکھا تو آرزو کے بہت سے

۱۔ معارضۂ حزیں و آرزو۔ منوہر سہائے انور۔ معاصر، حصہ اول، ص ۳۰

۲۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"وارستہ مل سیالکوٹی نے خانِ آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے۔ بایں ہمہ وہ جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، منہ کی کھاتا ہے۔"

خط بنام سرور، خطوطِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، ۲، ص ۲۳۹

اعتراضات رد کیے![1]

ان لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو آرزو کے ہم نوا رہے ہیں۔ گویا ہندوستان کے فارسی شعرا اہلِ علم ایرانیوں سے ہمیشہ مرعوب رہے اور ان کو صاحبِ زبان تسلیم کرکے بطور سند پیش کرتے رہے۔ غالب کو قتیل پر یہ اعتراض تھا کہ وہ ہندی نژاد اہل زبان نہیں تھا۔ غالب اپنے ایبک اور ترک نسل سے ہونے کے ناتے اور اپنے استاد عبدالصمد کے ذریعے اپنا شمار اہلِ زبان میں کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ غالب کے اجداد کو سرزمین ہندوستان میں آباد ہوئے ایک صدی گزر چکی تھی اور ملا عبدالصمد کا دنیا میں جسمانی وجود ہونا آج تک ایک دل چسپ بحث بنا ہوا ہے![2]

غالب ہندوستانی شعرا میں خسرو کے علاوہ کسی کو مستند شاعر نہیں مانتے چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں صاحب عالم کو لکھتے ہیں۔

"میں اہلِ زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔"[3]

۱۔ حزیں اور آرزو کے اس معارضہ کے متعلق تمام معلومات معرکۂ قتیل و غالب۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی سے لی گئیں (احوال غالب۔ ص ص ۱۹۸ - ۱۹۹)

۲۔ قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ عبدالصمد کا خارجی وجود ثابت نہیں۔ یہ غالب کے ذہن کی اختراع تھی۔ ملاحظہ ہو۔ ہرمزد ثم عبدالصمد۔ احوال غالب ص ص ۲۳۴ - ۲۶۵۔ اس مقالے کا جواب مالک رام نے نوائے ادب (جنوری ۱۹۵۲) میں دیا ہے۔ جس میں عبدالصمد کا خارجی وجود ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۳۔ خطوطِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، لاہور، بار دوم، ص ۴۰۰

ایک اور مشکل یہ ہے کہ اگر فارسی دشمنی کو اُردو کی مقبولیت کا سبب تسلیم کر لیا جائے تو دکن میں اُردو کی مقبولیت کا کیا جواز پیش کیا جائے گا۔ دکن میں شمالی ہند سے بہت پہلے دکنی شاعری کا عام رواج ہو گیا تھا اور ہند اور ایرانی نزاع پہلی بار کھل کر خان آرزو اور حزیں کے ہاتھوں سامنے آئی۔

ہمارے خیال سے دکن میں اس کی وجہ ہند ایرانی نزاع کے بجائے بادشاہوں اور صوفیاء کی سرپرستی ہے۔ قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہوں میں اکثر نے خود بھی مقامی زبان میں شاعری کی اور ایسے دوسرے شعراء کی بھی سرپرستی کی جو مقامی زبان میں اظہار خیال کرتے رہے۔

کلیاتِ سودا میں ایک قطعہ ہے جس میں سودا نے ایک فارسی داں کا قول نقل کیا ہے۔ کسی فارسی داں نے اور ہمارے خیال سے خان آرزو نے سودا کو یہ مشورہ دیا تھا کہ فارسی میں شعر کہنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ اہلِ ہند کی زبان نہیں ہے۔ اس لیے ہند نژاد اپنی پوری کوششوں کے باوجود سعدی اور حزیں نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں صرف خسرو، فیضی، آرزو اور فقیر جیسے چند فارسی گو شاعر گزرے ہیں۔ جنھوں نے خود کو مضحکہ سے باز رکھا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ انسان اپنی مادری زبان میں طبع آزمائی کرے۔ اصل چیز فارسی یا اُردو زبان نہیں بلکہ "خوبیٔ مضامین" ہے۔ جن کا بیان کرنا اہلِ ہند کے لیے اُردو میں آسان ہے۔ یہ پورا قطعہ "مرزا کی ریختہ گوئی کی ابتدا" کے تحت نقل کیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ فارسی داں کے بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ فارسی دشمنی کی ترغیب دے رہا ہے۔ اسے فارسی سے محبت ہے۔ ایرانی شاعروں میں وہ سعدی اور حزیں کا احترام کرتا ہے۔ ہند نژاد فارسی شاعروں میں بھی

کچھ کی عظمت کا قائل ہے اور وہ صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ غیر ملکی زبان سے بہتر مادری زبان ہے اور خواہ مخواہ اپنا مذاق اڑوانا اچھا نہیں۔

اس لیے آخر میں کہنا پڑے گا کہ اردو کی مقبولیت میں فارسی دشمنی کو دخل نہیں تھا۔ یہ وقت کی آواز اور تاریخی ضرورت تھی۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز

سودا کی ریختہ گوئی یا فنِ ریختہ کی تربیت و تکمیل اور تعمیر و ترویج میں ان کے حصّے کا منصفانہ جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اُردو شاعری کے تاریخی ارتقاء کو اور اس عہد کے لسانی پس منظر کو سامنے رکھیں۔ اس سلسلے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگرچہ شمالی ہندوستان میں ریختہ کا باقاعدہ آغاز دیوان ولی کے دہلی آنے پر ہوا۔ لیکن ایسا نہیں تھا کہ اس سے پہلے یہاں ریختہ گوئی غیر معروف اور اجنبی رہی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ عہدِ محمد شاہی تک فارسی ہی شرفاء کی زبان تھی اور اس میں تمام علوم و معارف کے گنجینے پوشیدہ تھے اور فارسی کے بُرے یا بھلے جیسے شاعر تھے ان کا مرکز شمالی ہند ہی بنا ہوا تھا اور اس دورِ زوال میں بھی وہ اپنی فارسی شاعری کی آبرو بنائے اور اس کی بات رکھنے پر تُلے ہوئے تھے۔ لیکن اس متاعِ ہنر کی قیمت دینے والا کوئی نہیں تھا۔ ادبی حیثیت سے اہل ایران کے آگے ان کی کوئی قدر و منزلت نہیں تھی۔ مالی حیثیت سے وہ زبوں و خوار تھے کیونکہ دربار نے ان کی سرپرستی کرنی چھوڑ دی تھی۔ عہدِ عالمگیری میں ولی دہلی آئے[۱] اور ان کی وفات (۱۱۱۹ھ) کے بعد ان کا

۱۔ میر نے نکات الشعراء میں ولی کے بارے میں لکھا ہے:۔
"میگویند کہ در شاہجہاں آباد دہلی نیز آمدہ بود بخدمت میاں گلشن صاحب رفت۔"

دیوان دہلی پہنچا تو اس نے گویا ایک تاریخی ضرورت کی تکمیل کر دی اور وہ تکلف دور ہو گیا جو اب تک اردو شاعری کے امکانات سے برتا جا رہا تھا۔ اب ریختہ گوئی بے اعتبار نہیں رہا اور پچاس برس کے اندر ایک ایسا ذہنی ماحول پیدا ہو گیا کہ ریختہ میں شاعری کرنے والے احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں رہے۔ مصحفی نے عقدِ ثریا کے دیباچے میں لکھا ہے

"..... ہمین شعر ریختہ کہ در زمانۂ ما بہ سببِ فصاحت و بلاغتِ ایشان زبان از فارسی در پلّہ کم ہم نیست الخ"

اپنے اشعار میں بھی جا بجا اس کا اظہار و اعتراف کیا ہے۔

کیا ریختہ کم ہے مصحفی کا
بو آتی ہے اس میں فارسی کی

مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ
اب ہے اشعارِ ہندوی کا رواج

و از اشعار خود پارۂ خواند۔ میاں صاحب فرمود۔ این ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند، در ریختہ خود بکار ببر۔ از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت۔"

(نکات الشعراء، ص ۸۹-۹۰)

ص ان کی آمد کے بارے میں قائمؔ نے لکھا ہے۔

"ولی ..... در سن چہل و چہار از جلوس عالمگیر بادشاہ ہمراہ ابو المعانی نام سید پسرے کہ دلش فریفتۂ او بود بہ جہان آباد آمد" (مخزن نکات، ص ۱۰)

عقد ثریا، ص ۲

اور اس میں شک نہیں کہ شعرا میں ذہنی تبدیلی اگر کچھ لوگوں کی انفرادی کوششوں کا نتیجہ سمجھی جائے تو سوداؔ بھی ان لوگوں میں تھے۔ جنھوں نے ریختہ کو مقبول بنانے میں اور ریختہ گوئی کی طرف سے احساس کمتری دور کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔

اس باب میں ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شمالی ہندستان میں ریختہ کے نمونے تیرہویں صدی عیسوی سے ملتے ہیں۔ لیکن باقاعدہ ریختہ گوئی کا زمانۂ آغاز اور اس کا ایک ادبی و شعری تحریک کی شکل میں اٹھان ولی کے دیوان ریختہ کے آنے پر ہوا۔ ولیؔ ۱۱۱۲ھ میں دہلی آئے تھے۔ لیکن ہمیں تیرہویں صدی عیسوی سے مقامی زبان میں اشعار ملنے لگتے ہیں جن کی تخلیق صوفیاء کرام کی مرہون منت ہے۔ ان میں حضرت بابا فرید گنج شکر، حضرت گیسو دراز اور سعدی کاکوروی کے اکثر اشعار تذکروں میں نقل ہوئے ہیں۔ میر حسن نے عہدِ جہانگیر کے ایک شاعر خاکی کا ذکر کیا ہے[1]۔

یقیناً اس زمانے میں اور لوگوں نے بھی اس زبان میں طبع آزمائی کی ہوگی مگر ان کا کلام دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا۔ امیر خسروؔ کی چند غزلیں اور دوسری اصناف کے اشعار ملتے ہیں۔ جن میں فارسی اور اُردو کی آمیزش ہے۔ لیکن ان میں بہت سے اشعار الحاقی ثابت ہوئے ہیں۔ اور انھیں قدیم تر سند کے بغیر امیر خسرو کی تصنیف قبول نہیں کیا جا سکتا۔ غزل جس کا مطلع یہ ہے چندر بھان برہمن کے نام سے منسوب ہے۔

۱۔ تذکرہ میر حسن، ص ۱۷۶

"خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے[1]"
اس غزل کی زبان سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ عہدِ شاہجہاں کے چندر بھان[2] برہمن

۱- علامہ کیفی نے "کیفیہ" میں پوری غزل نقل کی ہے۔ باقی اشعار یہ ہیں:-

پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کیسے
نہ تسبیح ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے
پیا کے ناؤں عاشق کوں قتل باعجب دیکھے ہوں؟
نہ برچھی ہے نہ کرچھی ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے
خوباں کی باغ میں رونق ہوئے تو کس طرح یاراں
نہ دونا ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالا ہے
برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیا سیں
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

برج موہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، دہلی، ۱۹۴۲ء

۲- چندر بھان برہمن کے آباء و اجداد کشمیر سے آگرہ آئے تھے۔ برہمن کے والد پنڈت دھرم داس سنسکرت اور فارسی دونوں کے ماہر تھے۔ برہمن ۹۰۲ھ میں آگرے یا لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت پاکر شاہجہاں کے دفتر میں خاص منشی ہوئے اور پھر داراشکوہ نے اپنا میر منشی مقرر کردیا داراشکوہ کو ان سے بہت محبت تھی۔ اس کے قتل کے بعد برہمن تارک الدنیا ہوگئے اور بنارس چلے گئے۔ وہیں ۱۰۷۳ھ میں انتقال کیا۔ ایک دیوان فارسی اور منشات برہمن ان سے یادگار ہیں

پنڈت برج کشن کول بے خبر وغیرہ، بہارِ گلشنِ کشمیر، ۱، الہ آباد، ۱۹۳۱ء، ص ص ۱۱۲ - ۱۳۰

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو- چندر بھان لاہوری- مرزا سلطان احمد، زمانہ (کانپور) مئی و جون ۱۹۲۱ء

کی نہیں ہوسکتی۔ اس کا مصنف کوئی بھی ہو۔ قوی امکان ہے کہ اس کی تصنیف ولی کی آمد سے قبل ہوئی۔ چند ایسے شاعروں کے نام بھی مل جاتے ہیں جو صرف ہزلیات کے شاعر ہیں اور ریختہ محض تفنن طبع کے لیے کہتے تھے۔ جعفر زٹلی[۱]۔ میر عبدالجلیل اٹل[۲] اور محمد عطاء اللہ[۳] وغیرہ کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے۔

۱۔ "میر جعفر.... جعفر تخلص لقب زٹلی۔ ساکن شاہجہاں آباد..... استعداد درست داشت دریں فن کامل وقت خود گردید۔ ہمہ نجیب و شریف از و ملاحظہ میکردند و خدمت می نمودند ..... می گویند کہ روزے بعد انتقال نواب ذوالفقار خاں بہادر ایں شعر فرمودہ۔

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر بادشاہے تسمہ کش فرخ سیر

ازیں خبر مزاج بادشاہ برہم گشت۔ ایشان را بہ جنت فرستاد۔"

(دو تذکرے (شورش) ص ص ۱۲۱ - ۱۶۳)

۲۔ " اٹل تخلص میر عبدالجلیل مرحوم است۔ وے از سادات زیدیہ بلگرامی الاصل از اولاد امجاد سید ابو الفرح واسطی بود۔ در شعر عربی و فارسی کہ بسبب رتبہ فضیلت بسیار با متانت و شستگی می گفت و بیشتر قصائد دریں ہر دو لسان از و یادگار است۔ واسطی تخلص می کرد .... و وضعش بانکہائے حضرت دہلی ......" (مجموعہ نغز۔ جلد اول۔ ص ۴۲)

۳۔ " خواجہ عطاء اللہ عطاء تخلص۔ شخصے در عہدِ عالمگیر بود۔ او باش وضع موافق طور خود شعر بلند می گفت ہندی و فارسی ہر دو ......

(تذکرہ میر حسن، ص ۱۰۶)

قاضی صاحب نے تذکرہ ہمیشہ بہار کے حوالے سے ان کا سنِ وفات ۱۱۳۵ھ لکھا ہے۔
(معاصر۔ حصہ ۱۵۔ ص ۲۳)

میر نے ریختہ گوئی کی مختلف قسمیں بتائی ہیں۔

۱۔ اول آن کہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی۔

۲۔ دوم آں کہ نصف مصرعش ہندی و نصف فارسی۔

۳۔ سوم آن کہ حرف و فعل پارسی بہ کار می برند[1]

ولی کی آمد سے قبل کچھ کے علاوہ ہزال اور دوسرے شعراء ان اقسام میں شعر کہتے تھے لیکن ولی کے دہلی آنے کے بعد ایک مصرع تو کجا فارسی کے حرف و فعل بھی لانا معیوب سمجھا جانے لگا۔

آبرو لکھتے ہیں۔

جو کہ لاوے ریختے میں فارسی کے فعل و حرف

لغو ہیں افعال اس کے ریختے میں حرف ہے

شمالی ہند والوں کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ اُردو میں بھی سنجیدگی سے اظہارِ خیال کیا جاسکتا ہے۔ ولی کا جو کلام دہلی میں آیا تھا وہ پونے تین صدی کی ذہنی کاوش کی خراد پہ اترا ہوا تھا۔ یعنی دکنی میں سنہ ۸۲۵ھ سے قبل شاعری کا آغاز ہوچکا تھا۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز[2] سے لے کر محمد قلی قطب شاہ۔ ملا وجہی۔ غواصی۔ ابن انشاء اور پھر ولی تک دکنی شاعروں کو تقریباً پونے تین صدیاں گزر چکی تھیں۔ دکنی میں تصوف۔ مذہب۔ فلسفۂ حیات و ممات۔ حسن و عشق۔ عام زندگی کے واقعات غرض ہر طرح کے مضامین

۱۔ نکات الشعراء۔ ص ۱۷۹

۲۔ نصیر الدین ہاشمی نے حضرت گیسو دراز کو دکن کا پہلا دکنی شاعر تسلیم کیا ہے۔
دکن میں اُردو۔ ص ۲۱

کا ڈھیر لگ چکا تھا۔ ولی جس دکنی کو لے کر آئے تھے وہ دکنی عناصر زیادہ ہونے کے باوجود بھی منجھی ہوئی۔ صاف اور سادہ زبان تھی۔ اس میں دکنی محاورے اور الفاظ ضرور تھے مگر وہ شمالی ہند والوں کی زبان سے زیادہ دور نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ولی کا کلام سنتے ہی پہلی بار دہلی والوں کو یہ احساس ہوا کہ اُردو شاعری کو بھی ادبی حیثیت دی جا سکتی ہے۔

ریختہ گوئی کا باقاعدہ آغاز کب ہوا۔ اس کے لیے کسی سن کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ مصحفی نے حاتم کے ترجمے میں لکھا ہے۔

"روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سن دوم فردوس آرام گاہ دیوانِ ولی در شاہ جہاں آباد آمدہ و اشعارش بر زبانِ خورد و بزرگ جاری گشتہ۔ با دو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد۔ بنائے شعر ہندی را بہ ایہام گوئی نہادہ ......" ۱

مصحفی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں اُردو شاعری کا باقاعدہ آغاز فردوس آرام گاہ (۱۱۳۲ - ۱۱۳۳ ھ) میں ہوا لیکن جیسا کہ ہم پہلے بحث کر آئے ہیں اُردو شاعری کا آغاز اس زمانے سے بہت قبل ہو چکا تھا۔ بقول قاضی عبدالودود

"تذکرہ ہندی کی عبارت سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہو گا کہ ریختہ گوئی کی ابتداء ہی سنہ ۲ فردوس آرام گاہ ہجری میں ہوئی۔ مصحفی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حاتم کے قول کے مطابق دیوان ولی کے دہلی آنے کے بعد انھوں نے ناجی وغیرہ کے ساتھ اُردو میں ایہام گوئی کی بنیاد رکھی ..... میرا خیال ہے کہ

۱۔ تذکرہ ہندی، ص ۸۰

حاتم نے مصحفی سے جو کچھ کہا تھا اس سے یہ مقصود نہ تھا کہ کسی زمانے کی تعیین کی جائے ان کی غرض اصلی یہ تھی کہ وہ آبرو وغیرہ کے ساتھ دہلی میں ریختہ گوئی کے بانیوں میں محسوب کیے جائیں[۱]"

مرزا مظہر کی ایک مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

ہمارے ساتھ سے یہ دل بھی بھاگا لیکے جاں اپنا
ہم اس کو جانتے تھے دوست اپنا مہرباں اپنا

حاتم نے بھی اس زمین میں غزل کہی ہے جو دیوان زادہ قلمی نسخہ رامپور میں موجود ہے۔ حاتم نے عنوان میں لکھا ہے کہ غزل مرزا مظہر کی زمین میں ۱۱۳۰ھ میں کہی گئی۔ گویا مرزا نے یہ غزل ۱۱۳۰ھ سے بھی پہلے کہی تھی اور ظاہر ہے کہ اس وقت تک ولی کا دیوان دہلی نہیں آیا تھا۔ حاتم نے مضمون کی زمین میں یہ غزل

ع۔ تاریک گھر ہمارا آکر کرے اجالا[۲]

۱۱۳۱ھ میں کہی تھی۔ حاتم کی ایک اور غزل ہے۔

ع - تاباں ہے اس نگہ سے مرے دل میں نور آج

یہ غزل بھی ولی کی زمین میں ۱۱۳۱ھ میں کہی گئی تھی[۳]۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں :۔

" دیوان زادہ کے نسخہ' لندن میں جس کی نقل حال میں ڈاکٹر شادانی نے

۱۔ عیارستان، قاضی عبدالودود، پٹنہ، ۱۹۵۷، ص ۱۰

میر نے بھی حاتم کے بارے میں طنزاً لکھا ہے " می گوید کہ من با میاں آبرو ہم طرح بودم"
نکات الشعرا، ص ۷۵
اگر یہ طنز نہ ہوتا تو میر حاتم کا قول نقل کرنے کی بجائے خود ہی لکھتے کہ حاتم۔ آبرو کے ہم طرح رہے ہیں۔

۲،۳ - سرگزشت حاتم۔ ص ۱۱۰

مجھے دکھائی ہے۔ ۱۱۲۹ھ میں کہی ہوئی دو غزلیں ہیں۔ جن میں سے ایک وؔلی اور دوسری مضمونؔ کی زمین میں ہے۔[1]"

عبد القادر بیدل کے بارے میں قیام الدین قائم لکھتے ہیں۔

"بالجملہ بیمن تفول زبان ایشان سخن این باباچنان حسنِ قبول یافت کہ ہر بیت دیوانش روشن تراز مطلع آفتاب گردیدہ۔ دریختہ راقسمے بہ فصاحت و بلاغت می گفت کہ اکثر استادان آن وقت ز راہ ہوش شعرِ ریختہ موزوں می نمودند۔ چنان چہ قدوۃ السالکین و زبدۃ الفاضلین مرزا عبد القادر بیدل رضی اللہ عنہ نیز درین زبان غزلے گفتہ۔[2]"

بیدل کا انتقال ۱۱۳۳ھ میں ہو گیا تھا۔[3] ظاہر ہے کہ یہ غزل اس سے قبل کہی گئی ہو گی۔ ۱۱۲۷ھ میں فائز دہلوی نے اپنا کلیات مرتب کر لیا تھا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس کلیات میں دیوانِ اُردو بھی شامل تھا تو غالباً شمالی ہندوستان میں نواب صدر الدین محمد خاں فائز دہلوی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اُردو میں دیوان مرتب کیا اور ۱۱۴۲ھ میں نظر ثانی کی۔[4]

ان تمام شواہد سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی میں دیوانِ وؔلی کی آمد سے قبل ان کا کچھ کلام پہنچ چکا تھا جسے بہت زیادہ مقبولیت ہوئی اور جسے دیکھ کر شمالی ہندوالوں نے بھی اس زبان میں طبع آزمائی شروع کر دی۔

۱۔ عیارستان، ص ۱۱۰

۲۔ مخزنِ نکات، ص ۱۰

۳۔ صدیق حسن خاں، شمع انجمن، بھوپال، ۱۲۹۳ھ، ص ۸۳

۴۔ مسعود حسن رضوی ادیب، فائز دہلوی اور اس کا دیوان، دہلی، ۱۹۴۲، ص ۲۶

اُردو شاعری کے آغاز سے لے کر بہت بعد تک اچھی خاصی تعداد ان فارسی گو شعرا کی بھی ہے جنھوں نے ریختہ کی مقبولیت دیکھ کر منہ کا مزہ بدلنے کے لیے اُردو میں سخن طرازیاں کیں۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ[1]، مرزا معز فطرتؔ موسوی خاں[2]، شرف الدین علی خاں پیامؔ[3]، مرزا علی قلی ندیمؔ[4]، ٹیک چند بہارؔ[5]، میر محتشم علی خاں حشمتؔ[6]، آنند رام مخلصؔ[7]، قزلباش خاں امیدؔ[8]، اسد یار خاں انسانؔ[9]، مرزا گرامیؔ[10]، میر شمس الدین فقیرؔ[11] اور مرزا مرتضیٰ قلی فراقؔ[12] وغیرہ چند قابلِ ذکر شاعر ہیں۔

۱۔ نکات الشعرا، ص ۲۔ مخزنِ نکات، ص ۱۰۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۲۵۔ مجموعہ نغز، ۱، ص ص ۱۱۵-۱۱۶

۲۔ نکات الشعرا، ص ۴۔ مخزنِ نکات، ص ۱۲

۳۔ نکات الشعرا، ص ۲۶۔ مخزنِ نکات، ص ص ۲۲-۲۳۔ تذکرہ ریختہ گویاں، ص ۲۶۔ تذکرہ شعرائے اُردو ص ص ۳۳-۳۴

۴۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۱۷۷۔ تذکرہ ہندی، ص ۲۶۰۔ مجموعہ نغز، ۲، ص ۲۶۹

۵۔ نکات الشعرا، ص ص ۱۳۳-۱۳۴۔ مخزنِ نکات، ص ص ۲۵-۲۶۔ تذکرہ ریختہ گویان، ص ص ۲۱-۲۴۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۲۶۔

۶۔ نکات الشعرا، ص ۳۷۔ گلشنِ گفتار، ص ص ۱۵-۱۸۔ مخزنِ نکات، ص ۲۷۔ تذکرہ ریختہ گویان، ص ص ۴۸-۴۹۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ص ۴۸-۴۹۔ تذکرۂ ہندی، ص ۸۲

۷۔ مخزنِ نکات، ص ۲۷۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۴۵۔ مجموعہ نغز، ۲، ص ۱۷۶

۸۔ نکات الشعرا، ص ص ۷-۸۔ مخزنِ نکات ص ص ۳۰-۳۱۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۰

۹۔ نکات الشعرا، ص ص ۱۲۹-۱۳۰۔ مخزنِ نکات، ص ۳۱۔ تذکرہ ریختہ گویان، ص ۱۷۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ص ۵-۶

۱۰۔ نکات الشعرا، ص ۸۔ مخزنِ نکات، ص ۳۲

۱۱۔ مخزنِ نکات، ص ص ۳۳-۳۴۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۱۱۴۔ مجموعہ نغز، ۲، ص ص ۷۶-۷۷

۱۲۔ مخزنِ نکات، ص ۵۲۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۱۱۴۔

ان میں فطرت کی طرح ایسے شاعر بھی ہیں جن کا ذکر بہت کم تذکروں میں ملتا ہے۔ اور ان میں بھی ایک ہی شعر نقل کیا گیا ہے اور آنند رام مخلص، ٹیک چند بہار جیسے شاعر بھی موجود ہیں جن کی کئی کئی غزلیں ملتی ہیں۔

دو اور فارسی شاعر ہیں جن کا اُردو شاعری پر بہت بڑا احسان ہے اور وہ ہیں سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا مظہر جانجاناں۔ یہ دونوں بنیادی طور پر فارسی کے شاعر ہیں مگر انھوں نے اُردو شاعروں کی پوری دو نسلوں کی ذہنی تربیت میں نمایاں حصّہ لیا۔ شاعروں کی پہلی نسل میں اچھی تعداد ایسے شاعروں کی ہے جو خان آرزو کی شاگرد رہے یا ان کی ادبی محفلوں میں شریک ہوتی ہے۔ خان آرزو اور ان کے تلامذہ کے عہد کو بعض تذکرہ نگاروں نے "دورۂ ایہام گویان" کہا ہے کیونکہ اس دور کے بیشتر شاعر ایہام گو ہیں۔ خود خانِ آرزو نے ریختہ گوئی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ تاہم ریختہ میں ان کے جتنے بھی اشعار ملتے ہیں، ان سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ انھیں صنعتِ ایہام بہت مرغوب تھی۔ تلامذہ خان آرزو کی فہرست حسب ذیل ہے۔

خان آرزو

تلامذہ خان آرزو

شرف الدین مضمون

تلامذہ مضمون

محمد عارف عارف۔ میر فضل علی دانا۔ سید حاتم علی خاں حاتم

نجم الدین عرف شاہ مبارک تخلص آبرو

تلامذہ آبرو

میر سجاد سجاد۔ عبدالوہاب یکرو۔ سید شمس الدین ثاقب۔ شاہ محسن قدسی

سبحان ۔ شہید ۔

غلام مصطفیٰ خاں یکرنگ[1]

تلامذہ یکرنگ

دلاور خاں بیرنگ ۔ محمد اسمٰعیل بیتاب

حسن علی شوق

شہاب الدین ثاقب

میر ناصر سامان

شمالی ہند میں جن شاعروں نے اُردو شاعری کی ابتدا کی۔ ان میں شرف الدین مضمون اور شاہ مبارک آبرو جیسے استادانِ فن بھی تھے۔ اسی لیے قاسم نے خانِ آرزو کے بارے میں لکھا ہے: " اگر شعرائے ہندی زبان را عیالِ خانِ آرزو گویند می سزد"[2] محمد حسین آزاد نے خان آرزو کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے: " خان آرزو کو زبانِ اُردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفہ منطق پر ہے۔ جب تک کہ کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے۔ تب تک اہلِ اُردو خان آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے"[3]۔ تلامذہ آرزو میں مضمون اور آبرو تو ایہام گوئی کے موجد ہیں۔ یکرنگ اور دوسرے شاعروں کے ہاں بھی اچھا خاصا ایہام ملتا ہے۔

۱۔ یکرنگ کو بعض تذکرہ نگاروں نے مرزا مظہر کا شاگرد لکھا ہے۔ مصحفی ان کے بارے میں لکھتے ہیں: " بقولے شاگردِ خان آرزو اور بقولے میاں آبرو از فحوائے کلامش چنیں می تراود کہ شاگرد مرزا مظہر خواہد بود۔"
(تذکرہ ہندی، ص ۲۷۸)

۲۔ مجموعہ نغز، ۱، ص ۲۴

۳۔ آبِ حیات، ص ۱۲۱

اس دور میں خان آرزو اور ان کے تلامذہ کے علاوہ تین شاعر ایسے بھی ہیں جنھیں بجا طور پر "استادانِ فن ریختہ" کہا جاسکتا ہے اور جن کا خانِ آرزو یا ان کے گروہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان شعرا کے نام ہیں۔

فائز دہلوی (ان کے یہاں ایہام بہت کم ہے۔)

شاکر ناجی

شاہ حاتم (حاتم نے بعد میں ایہام گوئی ترک کر دی)

ان کے علاوہ اس عہد کے دوسرے اور تیسرے درجے کے شعراء کے نام یہ ہیں۔ پیر خاں کمترین۔ احسن اللہ احسن۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق مرزا امان بیگ رنگین۔ شاہ فتح محمد دل اکبر آبادی۔ موزوں۔ شاہ فضل علی فضل وغیرہ۔ ان سب کے ہاں بھی ایہام ملتا ہے۔

ایہام گو شعرا کی اس فہرست کو مکمل تو نہیں کہا جاسکتا البتہ اس میں تمام اہم اور نمائندہ شاعر ضرور آگئے ہیں[1]

اعتدال سے بڑھی ہوئی ایہام گوئی نے شعر کو واقعی مرتبۂ بلاغت سے گرادیا تھا۔ قائم نے احسن اللہ احسن کے ترجمے میں بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ "تلاشِ لفظ تازہ و ایہام کرد، اما از غایت ہجومِ الفاظ معنئ شعرش کمتر بہ نظر می آید"[2] ہر خوبی اعتدال سے بڑھ کر خرابی ہو جاتی ہے۔ شعر اختلاف المعنی

۱۔ یہ فہرست مرتب کرنے میں ان تذکروں سے مدد لی گئی ہے۔ نکات الشعرا، گلشن گفتار، تذکرہ ریختہ گویان، مخزنِ نکات، گلزارِ ابراہیم، تذکرہ شعرائے اُردو، گلشنِ ہند، مجموعۂ نغز، دو تذکرے، گلشن بے خار

۲۔ مخزن نکات، ص ۲۲

اور پہلو دار الفاظ میں کھو کر رہ گئے۔ صنعت گری، شعبدہ بازی، آراستگی، تصنع اور بناوٹ کا دوسرا نام شاعری ہوگیا۔ شاعر خیالات کی بجائے ان الفاظ کا پابند ہوگیا تھا جن سے ایہام کا لطف پیدا کیا جا سکتا تھا۔ ایہام کی اس بگڑی ہوئی روش نے ابتذال کو بھی راہ دی۔ الفاظ اور محاوروں کے ایہام سے فائدہ اٹھا کر فحاشیت پیدا کی گئی۔

اس سب کے باوجود ایہام گو شعرا کے تمام سرمایۂ شعری کو میرؔ کی طرح "بے رتبہ"[۱] اور قائمؔ کی طرح "ستم"[۲] کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شاعروں کی ایک پوری نسل کی ادبی خدمات کے ساتھ ناانصافی ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا انھیں میں سے چند بزرگوں کی مرہونِ منت بھی ہے۔ یہ دور قدرِ اول کی شاعری کا دور نہیں تھا۔ ریختہ گو فارسی اور ہندی کے شاعروں کے ذہن سے سوچتے تھے۔ اسی لیے اس دور میں کوئی شاعر انفرادیت پیدا نہیں کر سکا۔ اور نہ ہی کسی کا اپنا "لب لہجہ" بن پایا۔

ان شاعروں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے مختلف زبانوں سے الفاظ مستعار لے کر اردو کو مالا مال کیا۔ ابھی زبان میں اتنی سکت نہیں تھی کہ ہر خیال کو بے تکلف ادا کرتی۔ کجا کہ ایہام جیسی مشکل صنعت کی ذمہ داری

۱۔ میرؔ نے احسن اللہ کے بارے میں لکھا ہے: "طبعش بسیار مائل بہ ایہام بود، ازیں جہت شعرا دبے رتبہ ماند۔" نکات الشعرا، ص ۲۷

۲۔ قائمؔ لکھتے ہیں: "این ستم کہ شاعرانِ ابتدائی زمانہ محمد شاہ باعتقاد خود تلاش الفاظِ تازہ و ایہام نمودہ شعر را از مرتبۂ بلاغت انداختند تا بہ معنی چہ رسد، غرض ناگفتہ بہ۔" مخزنِ نکات، ص ۱۴

سے عہدہ برآ ہو سکتی۔ اس لیے ہندی اور فارسی سے الفاظ، ترکیبیں اور محاورے وغیرہ مستعار لیے گئے۔ ہر لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں۔ ان شعراء نے اس معنوی تنوع کو صنعتِ ایہام کے ذریعہ اجاگر کیا۔ ترتیبِ الفاظ سے نئے نئے معنی پیدا کر کے زبان کی حدود کو وسیع کیا۔ ان شاعروں کا بنیادی کام مرصع سازی ہے۔ انھوں نے اچھے بُرے سب طرح کے نگینے جڑے ہیں۔ انھوں نے کسی ایسے لفظ کو جو اُن کا مفہوم ادا کر سکتا ہو ٹکسال باہر نہیں سمجھا۔ الفاظ کا مزاج پہچاننا اور ترک و قبول کا عمل بعد میں شروع ہوا۔ اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب ایہام گو شعرا نے الفاظ کے انبار لگا دیے تھے![1]

جب ایہام گوئی اعتدال سے بڑھی تو فطری طور پر اس کے خلاف ردِّ عمل ہونا تھا۔ مرزا مظہر جانجاناں فارسی کے شاعر تھے لیکن خان آرزو کی طرح انھوں نے بھی اُردو شاعروں کی سرپرستی کی اور ان کی تربیت میں نمایاں حصّہ لیا۔ بلکہ مرزا مظہر نے خان آرزو سے زیادہ اُردو میں شعر کہے ہیں![2] مرزا نے شاعروں کی دوسری نسل کی ذہنی ساخت و پرداخت کی۔ جانجاناں وہ

۱۔ علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کی زیرِ طبع جلد دوم میں راقم الحروف نے "دورۂ ایہام گویان" پر بہت تفصیلی بحث کی ہے۔

۲۔ عبدالرزاق قریشی نے ان کے ایک چوبیس اشعار (دو مختلف غزلوں کے) مرتب کیے ہیں۔ عبدالرزاق قریشی، مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام، بمبئی، ۱۹۶۱ء ص ص ۲۹۱-۳۱۰ مجھے ان اشعار کے علاوہ ۳۸ اشعار اور ملے ہیں جن پر الحاقی ہونے کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ملاحظہ ہو۔ خلیق انجم، مرزا مظہر جانجاناں، تحقیقی مقالہ، دلی یونی ورسٹی لائبریری۔

پہلے اُردو شاعر ہیں جنھوں نے ایہام کے خلاف باقاعدہ آواز بلند کی اور "سادہ گوئی" کی بنیاد رکھی۔ دیوان زادہ حاتم میں مرزا مظہر کی جس زمین میں کہی ہوئی حاتم کی غزل ہے۔ وہ ۱۱۳۰ھ میں کہی گئی۔ مرزا مظہر کی غزل کا مطلع ہے!

ہمارے ساتھ سے یہ دل بھی بھاگا لے کے جاں اپنا
ہم اس کو جانتے تھے 'دوست اپنا'، مہرباں اپنا

اس پوری غزل کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا نے اُردو شاعری کے باقاعدہ آغاز کے وقت ہی ایہام کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ مگر اس وقت ان کی آواز قبل از وقت تھی۔ وہ شعرا کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے۔ کیونکہ اس عہد میں خان آرزو اور ان کے شاگردوں، ساتھیوں اور بعض دوسرے ایہام گو شاعروں کا طوطی بول رہا تھا اور ایہام مقبولِ عوام تھا۔ لیکن عام روش کے خلاف مرزا طرزِ سادہ میں شعر کہتے تھے۔ یہ ان کی تنہا کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اتنے بڑے بڑے استادوں کی سرپرستی اور پسند عوام کی حمایت کے باوجود تیس برس کے عرصے میں نہ صرف یہ کہ شاعروں نے ایہام گوئی سے توبہ کر لی۔ بلکہ عوام کا مذاق بھی بدل گیا اور شعرا ایہام سے نفرت کرنے لگے۔ مرزا مظہر کی ریختہ گوئی کا زمانہ وہ ہے جب میر اور سودا کی ذہنی نشو و نما بھی نہیں ہوئی تھی اور حاتم، مضمون، آبرو وغیرہ جیسے استادانِ فن کی شاعری شباب پر تھی۔ ان میں صرف حاتم ایسے شاعر ہیں جنھوں نے مرزا مظہر کی اصلاحات کا اثر قبول کیا اور اپنے کلیات میں سے ایہام میں کہے گئے اشعار کو نظری کر کے

۱۔ آزاد لائبریری علی گڑھ میں بھی دیوان زادہ کا قلمی نسخہ ہے۔ جس میں اس غزل پر ۱۱۳۵ھ لکھا ہوا ہے۔

ایک انتخاب مرتب کیا۔ جس کا نام "دیوان زادہ" رکھا۔

یہ مرزا مظہر کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اُردو شاعری ایہام کے خارزاروں سے نکل آئی۔ انھوں نے اُس ادب و شعر کے ایوانِ رفیع کی بنیاد گزاری کی جس کے ستون سوداؔ، میرؔ، دردؔ اور قائمؔ وغیرہ ہیں۔ انھوں نے اُس مکتب اور تحریک کا آغاز کیا۔ جس کے شعائر و خصائص میں سوز و گداز، قلبی واردات، فکری عنصر، حیاتی شاعری، وجدانی پرتو اور غزل کا دھیما لب و لہجہ تیار ہوا۔ جس نے بعد میں دبستان دہلی کی شکل اختیار کر لی اور جسے ہم دبستانِ لکھنؤ سے ممیز کرتے ہیں۔

حیاتِ انسانی کے ارتقا کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے کاموں کا آغاز کسی فرد کی بظاہر نہایت معمولی اور ناقابلِ توجہ کوششوں سے ہوا۔ لیکن جب یہ نخل مراد برومند ہو گیا اور انسان نے اس کا سراغ لگانا چاہا تو اس کی بنیاد گزاری میں کوئی بہت ہی خاموش سا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ تاریخِ ادب اُردو میں یہی معاملہ اُردو غزل کی طرزِ سادہ کے بانی مرزا مظہر کے ساتھ ہوا۔

کوئی بھی اصلاحی کوشش ہو۔ ادب میں اخلاق یا سماج میں۔ ایک دن میں بار ور نہیں ہوا کرتی، نہ معاشرے کے رجحانات دن اور تاریخوں کے ساتھ بدلتے ہیں۔ یہ تعین کرنا تو بہت مشکل ہے کہ مرزا نے ایہام کی مخالفت کس سن میں شروع کی۔ اور اس اصلاحی تحریک کا کب آغاز ہوا۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مرزا اپنی طبعی نفاست پسندی اور سادہ مزاجی کی وجہ سے ابتدا ہی سے طرزِ سادہ اور گفتگوئے شستہ و رفتہ کے شیدائی تھے اور انھیں یہ رمز معلوم تھا کہ شیریں اور اثر انگیز گفتگو وہی ہوتی ہے جو تکلفات کی بناوٹوں

سے عاری ہو۔ مرزا نے ۱۱۶۴ھ سے قبل ریختہ گوئی ترک کر دی تھی اور بقول خانِ آرزو اپنے تلامذہ کی تربیت کے لیے چند اشعار کہہ لیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے تلامذہ کو ایہام کی مخالفت کے لیے تیار کیا۔ خاص طور پر انعام اللہ خاں یقینؔ، احسن اللہ خاں بیانؔ، میر باقر حزیںؔ، محمد فقیہہ صاحب دردمندؔ اور ہیبت قلی خاں حسرتؔ کو اس روشِ خاص کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ دردمندؔ کے علاوہ باقی یہ تمام شاعر صاحب دیوان تھے۔ یقینؔ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے میرؔ اور سوداؔ کے چراغ نہ جل سکے۔

اگرچہ میرؔ اور سوداؔ کو خان آرزو سے تلمذ نہیں تھا۔ لیکن یہ دونوں خانِ آرزو کی ادبی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس لیے ممکن نہیں کہ خان آرزو سے یہ لوگ متاثر نہ ہوئے ہوں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بہ ظاہر یہ دونوں مرزا مظہر کے مخالف ہیں! لیکن ذہنی اعتبار سے ان دونوں نے مرزا مظہر کی تحریک کو جتنا فروغ دیا ہے شاید کسی اور شاعر نے دیا ہو۔ تلامذہ مظہر کے بعد مشعلِ شاعری میرؔ، دردؔ اور سوداؔ کے ہاتھوں میں آئی۔

اگرچہ سوداؔ کے ہاں ایہام کے چند اشعار مل جاتے ہیں۔ لیکن اول تو اتنے بڑے کلیات میں اُن کی کوئی حیثیت نہیں۔ دوسرے ان میں ایہام "بسیار بہ شستگی[2]" باندھا گیا ہے۔ مثلاً

۱۔ سوداؔ نے مرزا کی اصلاحِ زبان کی تحریک کا مذاق ایک قطعہ میں اڑایا تھا۔ جو "ہجو گوئی" کے باب میں نقل کیا گیا ہے۔

۲۔ میرؔ نے نکات الشعرا کے اختتام پر لکھا ہے: "ایہام است کہ در شاعران سلف دریں فن رواج داشت، اکنون طبعہا مصروف ایں صنعت کم است۔ مگر بسیار بشستگی بستہ بشود۔" (نکات الشعرا، ص ۱۷۹)

پوج مجھے اس دیر کہن میں کیا پوجے ہے پتھر کو
مجھ وحشی کو سنا برہمن بتوں نے اپنا رام کیا

لیکن جب سوداؔ محض تفریح طبع کے لیے ایہام میں کچھ اشعار کہتے ہیں تو انھیں صفائی پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ایہام کی ایک غزل کا مقطع ہے۔

اسلوب شعر کہنے کا تیرے نہیں ہے یہ
مضمون دآبرو کا یہ سوداؔ ہے سلسلہ

ورنہ حقیقت میں سوداؔ ایہام کے کٹر مخالف ہیں۔ انھوں نے کھلم کھلا اعلان کیا ہے۔

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

سوداؔ کی غزل گوئی

سوداؔ ایک عظیم شاعر تھے۔ لیکن عظیم غزل گو نہیں اگر اُن کی متاعِ فن غزل اور صرف غزل ہی ہوتی تو ان کا شمار اپنے دور کے دوسرے درجے کے شاعروں میں ہوتا۔ ان کی شہرت اور مقبولیت اور شاعرانہ عظمت کی اصل بنیاد قصیدہ گوئی اور ہجوگوئی کے ساتھ ساتھ اس حقیقت پر بھی ہے کہ ان کے کلیات میں تقریباً جملہ اصنافِ سخن کے کامیاب نمونے موجود ہیں اور صف اول کے غزل گو نہ ہونے کے باوجود انھوں نے غزل کو بہت کچھ دیا ہے۔ اردو غزل میں "خارجیت" "زورِ بیان" اور نشاط آمیز لب ولہجہ" انہی کی دین ہے۔

غزل میں جہاں تک زبان وبیان اور قدرتِ اظہار کا تعلق ہے۔ سوداؔ کا ایک مخصوص رنگ اور لب ولہجہ ہے جو اُن کی استادی پر حرف

نہیں آنے دیتا۔ لیکن غزل کی دوسری شرائط کے اعتبار سے وہ اپنے بعض ہم عصر غزل گو شعرا سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں ہر شاعر آسانی سے طبع آزمائی کر سکتا ہے بلکہ اُردو شاعری کی تو یہ روایت رہی ہے کہ تقریباً تمام شاعروں کی ادبی زندگی کا آغاز غزل ہی سے ہوا۔ لیکن یہ بہت کم مزاجوں کو راس آتی ہے۔ اس میں بیشتر مضامین رسمی اور روایتی ہوتے ہیں۔ عام طور پر شاعر حسن وعشق اور شراب ومیکدہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ لیکن ان رسمی مضامین پر بھی شاعر کی اپنی چھاپ ہوتی ہے۔ ساغر ومینا کے پردوں میں اس کے احساسات، سماج اور دنیا کے متعلق اس کے نظریات، عام زندگی کے تجربات ومشاہدات غرض سب ہی کچھ چھپا ہوتا ہے۔

دوسرے اصنافِ سخن کی طرح غزل کی بنیاد بھی خارجی زندگی پر ہوتی ہے۔ لیکن غزل میں خارجی زندگی براہِ راست نہیں پیش کی جاتی بلکہ مادی تجربات کو پہلے شاعر کے آتش کدۂ دل میں تپنا پڑتا ہے۔ اصل مسالہ دل کی دنیا سے فراہم ہوتا ہے اور دماغ اسے خوب صورت سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اعلیٰ درجے کی غزل گوئی کے لیے "دروں بینی" پہلی شرط ہے۔

سودا کا مزاج اور ذہن غزل کو راس نہیں آسکتا تھا۔ ان کی شوخ، چنچل اور طرارے بھرتی ہوئی ہمہ رنگ طبیعت اس دردمندی، سوز وگداز اور برشتگی وخستگی کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی تھی جو غزل کی خصوصیات ہیں۔ سودا کے ہاں جذبات کی وہ صداقت ومعصومیت، خلوص، خودسپردگی اور دردمندی نہیں ہے جو لب ولہجہ میں نرمی اور گھلاوٹ اور اندازِ بیان میں

سادگی و بے تکلفی پیدا کر کے شعر کو تیر و نشتر بنا دیتی ہے۔ قدرت نے سوداؔ کو حزن و ملال اور ان کے لطیف احساسات سے محروم رکھا تھا اس لیے وہ زندگی کی ٹھوس حقیقت یعنی غم کی آتشِ سیّال کو الفاظ کے نرم و نازک سانچوں میں ڈھالنے سے معذور رہے۔

سوداؔ کا ادبی کارنامہ قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی ہے جن میں داخلیت کی بجائے خارجیت کو دخل ہوتا ہے۔ ان سے قبل ہی یہ دونوں اصناف اُردو میں رائج تھیں۔ لیکن یہ صرف سوداؔ تھے جنھوں نے ان کو باقاعدہ فن کی صورت دی۔ اور فنی اعتبار سے ان اصناف کو انتہا پر پہنچا دیا۔ یہ بات بغیر کسی شک و شبہ کے کہی جا سکتی ہے کہ اس میدان میں کوئی ان کا ثانی نہیں۔

اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سودا پہلے قصیدے اور ہجو کے شاعر ہیں اور بعد میں غزل گو۔ ان کی پوری غزلوں میں جتنے نشتر نکلیں گے وہ شاید ان سے کم ہوں جو دوسرے درجے کے بعض معاصر شعرا کے ہاں مل جائیں گے۔ حالانکہ سوداؔ کے مقابلے میں ان کا سرمایۂ فن بہت مختصر ہے۔

کلیاتِ سوداؔ میں سوز کی سوا سو کے قریب غزلیں اور بیاںؔ، قائمؔ یقینؔ اور شیداؔ کے بعض اشعار بھی شامل ہو گئے ہیں۔ جنھیں ہم مدتوں سوداؔ کا کلام سمجھ کر جھومتے رہے ہیں۔ اور بیاںؔ، قائمؔ وغیرہ کی مثنویاں الگ ہیں۔

سوداؔ کی زندگی ہی میں بعض اہلِ نظر غزل گوئی میں دوسرے شاعروں کو ان پر ترجیح دیتے تھے۔ لچھمی نراین شفیقؔ نے چمنستانِ شعرا میں لکھا ہے۔

"اگرچہ یقین ہے کہ مرزا سوداؔ غزل، رباعی، مخمس و مثنوی و قصیدہ و قطعہ بند وغیرہ میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں .... لیکن یقین کے ریختے میں جو فصاحت و ملاحت

ہے وہ چیزے دیگر ہے[1]" (فارسی سے ترجمہ)

شفیق نے یقین اور سودا کا موازنہ کرتے ہوئے کسی شاعر کی دو رباعیاں بھی نقل کی ہیں[2]۔ جو سوانحی حصے میں پیش کی جا چکی ہیں۔

صاحبِ نشترِ عشق نے لکھا ہے کہ

"اگرچہ سودا تمام طرزِ کلام پر قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن مدح و قدح میں کہ جس سے مراد ہجو و قصیدہ ہے انھوں نے معجزہ دکھایا ہے[3]۔"

شاہ محمد حمزہ نے بھی فص الکلمات میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ

"سودا غزل و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی سب خوب کہتے ہیں اور خاص طور پر قصیدہ گوئی میں سحر سامری دکھاتے ہیں۔"[4]

سودا کے ہم عصر شاعروں میں میر تقی میر عظیم غزل گو شاعر تھے۔ اس لیے اکثر تذکرہ نگاروں نے ان دونوں فن کاروں کا موازنہ کیا ہے۔ اس موازنے سے متعلق کچھ کہنے سے پیشتر مناسب ہے کہ میر کی بنیادی خصوصیت بیان کر دی جائے تاکہ ان دونوں کے فن کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے میر کی غزل گوئی پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"انھوں نے (میر نے) جس درد اور سوز کے ساتھ یہ نغمہ چھیڑا ہے اس کی مثال دنیائے اردو میں نہیں ملتی۔ میر کی فتادگی و دل سوزی خستگی و برشتگی

۱۔ چمنستانِ شعرا، ص ۱۶۲

۲۔ ایضاً، ص ۱۶۲

۳۔ نشترِ عشق (قلمی) ورق

۴۔ فص الکلمات، قلمی

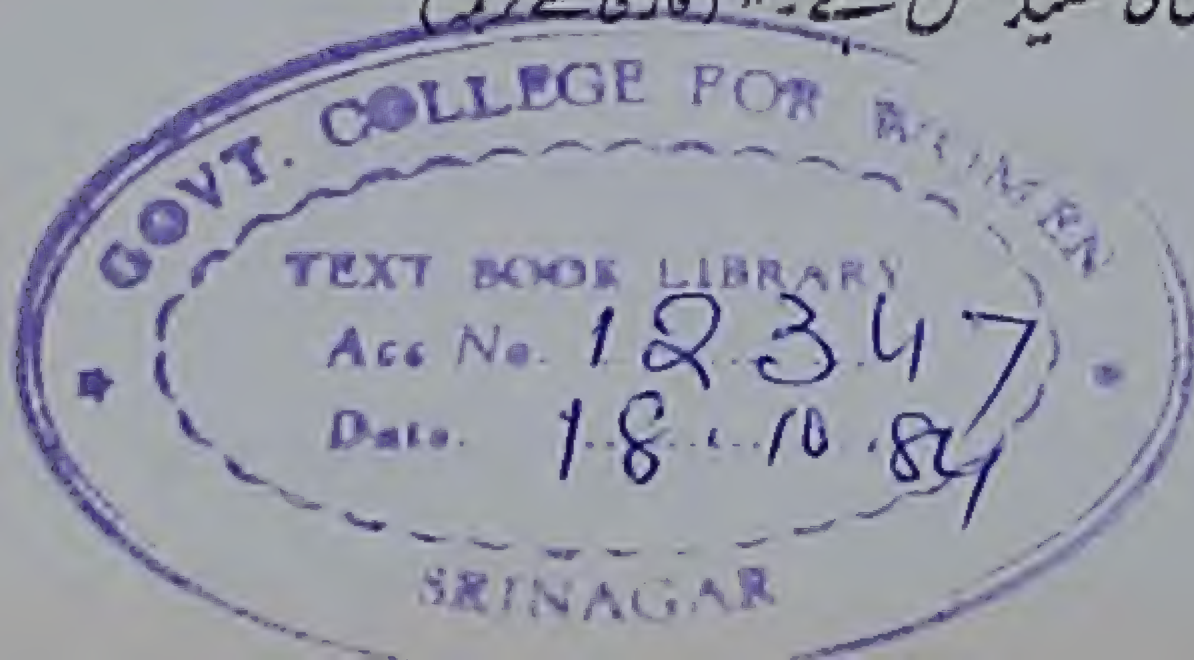
نے تغزل میں ایک معیاری شان پیدا کر دی ہے اور ان کے کلام کو سوز و
گداز کا آتش کدہ بنا دیا ہے[1]۔"

سودا اور میر کے کلام میں صرف یہی فرق ہے کہ سودا اس خصوصیت سے محروم تھے جو میر کا طرۂ امتیاز ہے اور بیشتر تذکرہ نگاروں نے بھی مختلف الفاظ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ بھگوان داس ہندی نے دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اکثر لوگ فن ریختہ میں میر اور مرزا کو ہم پلہ سمجھتے ہیں اور اکثر غزل و مثنوی میں میر کو اور ہجو و قصیدہ میں مرزا کو ایک دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں[2]" (فارسی سے ترجمہ)

حکیم سید احد علی خاں یکتا کو سودا سے بہت عقیدت اور محبت ہے جس کا اظہار انھوں نے دیباچے میں کیا ہے لیکن وہ بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ میر کا فن لاثانی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"میر نے غزل کو اس انداز سے کہا ہے کہ کوئی اور نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ اس باب میں ملک الشعراء پر حرف آتا ہے۔ (بظاہر ملک الشعراء سے مراد سودا ہے) .... لیکن میر کی تقلید و پیروی بہت مشکل ہے۔ اگرچہ ان کا کلام فصاحت نظام سعدی کے کلام کی طرح بظاہر آسان نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں ممتنع ہے۔ بیشتر شعرا اُن کے مقلد ہیں لیکن یہ شعرا مطلقاً ان کی طرز نہیں پا سکے۔ اس کے برخلاف اگرچہ سودا کے کلام میں کمال پختگی ہے لیکن ہر صاحب فہم کے لیے اس کی تقلید ممکن ہے[3]۔" (فارسی سے ترجمہ)



۱۔ میر تقی میر، ص ص ۳۲۱ - ۳۲۲

۲۔ تذکرۂ ہندی، ص ۲۴

۳۔ دستور الفصاحت، ص ۲۵

یحیٰ نے میر اور سودا کے کلام پر بہترین تنقیدی رائے دی ہے۔ دماغ کی شاعری کی تقلید ممکن ہے۔ لیکن دل کی شاعری کی نہیں۔ اور سودا کی غزل گوئی دماغ کی شاعری ہے۔

قدرت اللہ قاسم نے ان دونوں کے فرق کو بڑے خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ " بعض لوگوں کے خیال سے مرزا اچھے غزل گو نہ تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ؎

ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است

مرزا ایک بیکراں دریا ہیں اور میر ایک عظیم الشان نہر۔ جہاں تک فن کی معلومات کا تعلق ہے میر کو مرزا پر برتری اور قوت شاعری میں مرزا کو میر پر سروری حاصل ہے"۔[۱] قاسم کی بات کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ سودا تمام اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ میر صرف غزل گوئی پر قادر تھے۔ مگر اس فن میں بے مثال تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد ان دونوں کے متعلق رائے دیتے ہیں کہ

"میر صاحب کی طبیعت قدرتی دردخیز تھی اور دل حسرت انگیز تھا کہ غزل کی جان ہے۔ اس لیے ان کی غزلیں ہی ہیں اور خاص خاص بحور و قوافی ہیں ہیں۔ مرزا کہ طبیعت ہمہ رنگ اور ہمہ گیر، ذہن براق اور زبان مشاق رکھتے تھے۔ توسنِ فکر ان کا منہ زور گھوڑے کی طرح جس طرف جاتا تھا۔ رک نہ سکتا تھا۔ کوئی بحر اور کوئی قافیہ ان کے ہاتھ آئے تغزل کی خصوصیت نہیں رہتی تھی۔ جس برجستہ مضمون میں بندھ جائے، باندھ

۱۔ مجموعۂ نغز، ۱۰، ص ۱۳۱

لیتے تھے۔ بیشک ان کی غزل کے اکثر شعر چستی اور درستی میں قصیدے کا رنگ دکھاتے ہیں[1]"

آزاد نے میر اور مرزا سے متعلق ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ جس سے ان دونوں کے کلام کی خصوصیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے یہ واقعہ نہ ہوا ہو۔ لیکن اس سے میر اور مرزا کا فرق بخوبی واضح ہوتا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ

" ایک دن لکھنؤ میں میر اور مرزا کے کلام پر دو شخصوں میں تکرار نے طول کھینچا۔ دونوں خواجہ باسط کے مرید تھے۔ انھیں کے پاس گئے اور عرض کی کہ آپ فرمائیں انھوں نے کہا کہ دونوں صاحب کمال ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا صاحب کا کلام واہ ہے مثال میں میر صاحب کا شعر پڑھا ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

پھر مرزا کا شعر پڑھا ؎

سودا کی جو بالیں پہ کیا شورِ قیامت
خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے[2]"

جدید دور کے تذکرہ نگاروں میں رام بابو سکسینہ کہتے ہیں۔

"مختصر یہ کہ وسعتِ نظر، تنوع خیالات جزئیات کے بیان کی قدرت دنیاوی معاملات کی واقفیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مذاق اور

۱۔ آبِ حیات، ص ۱۶۴

۲۔ ایضاً، ص ص ۱۶۴۔ ۱۶۵

ظرافت میں سودا کو میر پر برتری ہے۔ سادگیٔ الفاظ، سلاستِ زبان، عاشقانہ رنگ، درد و اثر، فصاحت و بلاغت اور تصوف میں میر صاحب کو سودا پر فضیلت ہے۔[1]"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے سودا کے قصیدے اور غزل پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔" یہ جو عوام میں مشہور ہے کہ اُن (سودا) کا قصیدہ غزل سے بہتر ہے۔ مہمل بات ہے۔ فقیر (شیفتہ) کے خیال سے اُن کی غزل قصیدے سے بہتر ہے اور قصیدہ غزل سے[2]" (فارسی سے ترجمہ) خود سودا کو بھی یہ احساس تھا کہ لوگ انھیں قصیدے کا شاعر سمجھتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ سودا کا قصیدہ ہے خوب
ان کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ سودا غزل گوئی میں میر تک نہیں پہنچ پائے۔ لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا سودا غزل میں بالکل ناکام رہے؟ کیا ان کا اپنا رنگ اور انداز نہیں تھا اور وہ صرف روایتی مضامین باندھتے رہے۔ شیخ چاند کا یہی خیال ہے کہ سودا کا اپنا کوئی رنگ نہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

" سودا کا غزل میں کوئی خاص رنگ نہیں۔ وہ اس میدان میں طرح طرح طبع آزمائی کرتا ہے۔ غزل کی جان سادگیٔ بیان ہے۔ سودا نے غزل میں اس کا بہت کم خیال رکھا ہے۔"

مجھے شیخ چاند کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ غزل میں سودا کا اپنا مخصوص

۱۔ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، مترجمہ، مرزا محمد عسکری، ۱۹۵۲ء، ص ۱۷۴

۲۔ گلشن بے خار، ص ۱۰۰

رنگ ہے جس کی بنیاد خارجیت، زورِ بیان اور نشاط آمیز لب و لہجے پر ہے۔

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
اِن تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اس مغفور کا

سودا غالباً پہلے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کو داخلیت کی گھٹی ہوئی فضا سے باہر نکالا۔ اگرچہ اس کوشش میں وہ اتنے آگے بڑھ گئے کہ اُن کا کلام عموماً بے تاثیر ہو گیا۔ لیکن مصحفی کے ہاں جو داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج ہے وہ سودا کا مرہونِ منت ہے۔ سودا نے غزل کو جو ایک خارجی انداز بخشا تھا۔ مختلف زمانوں میں ان کے نمائندے انشا، جرأت، ناسخ، شاہ نصیر اور ذوق وغیرہ رہے ہیں۔ یہ تمام شعرا اپنے اپنے مزاج کے مطابق سودا سے متاثر تھے۔ سودا کے ہاں جو زورِ بیان، معنی آفرینی، خیال بندی، پروازِ تخیل، جدّتِ بیان، قدرتِ اظہار، نشاط انگیزی اور جوش و خروش ہے وہ انھیں کا حصّہ ہے۔ سودا کو زبان پر پورا عبور ہے۔ سیکڑوں ہندی اور فارسی محاورے انھیں کی بدولت اردو زبان میں داخل ہوئے۔ الفاظ شدھ ہندی کے ہوں یا ٹھیٹھ فارسی کے، ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ سودا ان کو اس طرح برجستہ استعمال کرتے ہیں کہ وہ الفاظ اُردو کے معلوم ہوتے ہیں۔ زبان پر ان کی یہی قادر الکلامی ہے جو سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دیتی ہے اور وہ مشکل سے مشکل خیال کو باندھ لیتے ہیں۔ ان کی جدّت پسند طبیعت نے گلستانِ غزل کو دلاویز، حسین اور رنگین استعارات اور تشبیہات کے پھولوں سے سجایا ہے۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے کہ سودا کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا زورِ بیان ہے۔ وہ معمولی سے مفہوم کو اس انداز اور ایسے الفاظ میں بیان

کرتے ہیں کہ شعر میں برجستگی صوتی بلند آہنگی ترنم اور ایک مخصوص موسیقیت پیدا ہوجاتی ہے۔ میر نے ان کی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"بسیار خوش گو است، بلاگرداں ہر شعرش طرف لطف رستہ رستہ، درچمن بندیٔ الفاظش گل معنی دستہ دستہ، ہر مصرع برجستہ اش را سرو آزاد بندہ، پیش فکر عالیش طبع عالی شرمندہ۔"[۱]

محمد حسین آزاد نے سوداؔ کی جن خصوصیت کو بیان کیا ہے۔ ان میں سب سے پہلی خصوصیت زور بیان ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"چند صفتیں خاص ہیں جن سے کلام ان کا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ اول یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے۔ جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی۔ بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولایتی طپنچہ کی چاپیں چڑھی ہوئی ہیں اور یہ خاص ان کا حصہ ہے۔ چنانچہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں۔ شعر مزا ہی نہیں دیتا۔"[۲]

ان خصوصیات پر تفصیلی بحث آگے کی جائے گی۔

مناسب ہوگا اگر ہم یہاں ان فارسی شاعروں کا ذکر کردیں۔ جنھوں نے سوداؔ کو متاثر کیا۔ اور ان کی ادبی شخصیت کے بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔

سوداؔ اور فارسی شاعر

عہدِ محمد شاہ میں فارسی شاعری رو بہ زوال تھی لیکن ابھی تک اس کی ادبی حیثیت

۱۔ نکات الشعرا، ص ۱۳۱

۲۔ آب حیات، ص ۱۵۸

برقرار تھی۔ شمالی ہند میں ابتدائی دور کے کچھ فارسی شعرا نے اردو میں شعر کہنا شروع کیے یا اُردو کی سرپرستی کی۔ دوسرے قسم کے شاعروں میں سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا مظہر جان جاناں بہت اہم ہیں۔ جس پر تفصیلی بحث "ادبی پس منظر" میں کی جا چکی ہے۔

فارسی میں اچھے شاعر اور ادیب پیدا ہونا بند ہو گئے تھے۔ لیکن اس دور کے تمام تعلیم یافتہ لوگوں میں فارسی ادب کا بہت اچھا مذاق تھا۔ اور پھر وہ لوگ اُردو شاعروں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ خود فارسی کے بڑے شاعر تھے۔ اس لیے فطری طور پر اردو غزل فارسی سے بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ اُردو شاعروں پر فارسی کا اتنا گہرا اثر تھا کہ ابتدائی دور سے لے کر غالب تک بہت کم صفِ اوّل کے ایسے شاعر ملیں گے۔ جنھوں نے فارسی میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ سودا فارسی میں شعر کہتے تھے انھوں نے خود اپنے ایک قطعہ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ ان کے کلیات میں دیوانِ فارسی بھی شامل ہے فارسی ادب پر ان کی کتنی گہری نظر تھی اور فارسی کے مسلم الثبوت استادوں سے انھیں کتنی عقیدت تھی۔ اس کا اندازہ عبرت الغافلین سے ہوتا ہے۔ جس میں سودا نے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو مرزا فاخر مکیں نے امیر خسرو شیخ سعدی، مولانا روم، مولوی جامی، آسی سبزواری، نعمت خان عالی، مرزا صائب، خان آرزو اور دوسرے فارسی شعرا کے کلام پر کیے تھے۔ اور پھر خود سودا نے فاخر مکیں کے اشعار پر اعتراضات کیے ہیں۔ سند کے طور پر انھوں نے جو فارسی اشعار پیش کیے ہیں وہ بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ انھوں نے فارسی ادب کا اچھا مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے بعض فارسی مصرعوں اور غزلوں کو بھی تضمین کیا ہے۔

سوؔدا نے کسی فارسی شاعر کا مکمل تتبع تو نہیں کیا۔ لیکن اس دور کی فارسی شاعری کے عام رجحانات سے وہ ضرور متاثر ہیں اور بعض شاعروں کے اندازِ سخن کی چھاپ ان کے کلام پر پڑی ہے۔ چونکہ وہ غیر معمولی ذہین انسان تھے۔ ایجاد اور جدّت کی پوری صلاحتیں رکھتے تھے۔ اس لیے فارسی شاعروں سے انھوں نے جو کچھ مستعار لیا۔ اس پر قناعت نہیں کی بلکہ ان تمام پھولوں کو سجا کر خود اپنا گلستاں بنایا ہے۔

اس دور کی فارسی شاعری کے عام رجحانات کو "سبکِ ہندی" کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی بدنظمی، معاشی بدحالی اور رو بہ زوال تہذیب کا اثر فارسی ادب پر یہ پڑا کہ ادب میں جمود آ گیا۔ ایک مخصوص اقتصادی نظام اور تہذیب کی ترقی کے تمام امکانات ختم ہو چکے تھے۔ زندگی ایک منزل پر پہنچ کر رُک گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ادب بھی اس منزل سے آگے نہیں جا سکتا تھا۔ اس ٹھہراؤ اور جمود نے ادب میں جو رجحانات پیدا کیے انھیں اہل ایران "سبکِ ہندی" کہتے ہیں[1]

شاہ حاتمؔ پہلے اُردو شاعر ہیں جو ان رجحانات سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ان کے شاگرد سوؔدا کے ہاں ان میں سے تمام نہیں تو کچھ خصوصیات مل جاتی ہیں۔

سوؔدا پر جن فارسی شاعروں کا اثر نظر آتا ہے وہ اسی سبکِ ہندی کے نمائندہ شاعر ہیں۔

بھگوان داس ہندی نے لکھا ہے: "اگر مثال بندی اشعار غزل میں سوؔدا

۱۔ اردوئے معلّیٰ، غالب نمبر، ۱۰، ص ۶۹

کو اپنے وقت کا صائب کہا جائے تو ٹھیک ہے۔[۱] حکیم سید احمد علی خاں یکتا نے بھی سودا پر صائب کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ سودا اس پاکیزگی اور ملاحت کے ساتھ غزل کہتے ہیں کہ اگر صائب موجود ہوتے تو خود اس کی داد دیتے۔[۲]

سودا کے ہاں جو نشاطیت ہے وہ ایک حد تک صائب کا اثر ہے۔ صائب زور بیان میں غزل کو قصیدے کی حدود میں لے آتے ہیں۔ یہی حال سودا کا ہو۔ ان کی اکثر غزلوں پر قصیدے کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ صائب کی طرح ان کے ہاں بھی مثالی شاعری کے اچھے خاصے نمونے مل جاتے ہیں۔ سودا نے صائب کے ایک مصرع کو بہت دلچسپ انداز میں تضمین کیا ہے ؎

سنا نہووے جو سودا یہ مصرع صائب
تو پوچھ خلق سے میں کیا کروں بیاں تنہا
کہ ایک دن میں آسے راہ میں اکیلا دیکھ
کہا کدھر چلے اے فخر شاعراں تنہا
دیا جواب دلم سیر باغ می خواہد
کہا میں ہو متبسم کہ مہرباں تنہا
جو ہووے امر تو میں بھی چلوں رکاب کے بیچ
رکھے ہے لطف بھی کچھ سیر بوستاں تنہا

۱۔ (الف) سفینۂ ہندی، ص ۱۲۵
(ب) تذکرۂ ہندی، ص ۱۳۵
۲۔ دستور الفصاحت، ص ۱۷

سنا یہ مجھ سے تو کہنے لگا کہ پوچ مگو
گرفتہ ایم اجازت زباغباں تنہا

سوداؔ نظیریؔ نیشاپوری سے بھی بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ نظیریؔ کی طرح وہ بکثرت محاورے استعمال کرتے ہیں۔ اور بقول شیخ چاند "حالات و کیفیات اور معشوقانہ اداؤں کو سوداؔ نے مادی اشیاء سے تشبیہہ دی ہے۔ یہ سب نظیریؔ کا اثر ہے۔ اس کے سوا اس کی تقلید میں مضامین کو جدت آمیز انداز میں بھی بیان کیا ہے۔[1] نظیریؔ کی طرح سوداؔ نے بھی قطعہ بند غزلیں کہی ہیں جن میں وہ کچھ کم کامیاب نہیں ہیں۔ سوداؔ کا ایک مقطع ہے۔

یہ غزل سوداؔ کہی ہے تو نے اس انداز کی
ہند سے پہونچے گی ہاتھوں ہاتھ نیشاپور تک

اس شعر میں سوداؔ نے غالباً نظیریؔ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

سوداؔ کے ہاں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں۔ جن میں مضمون آفرینی، نازک خیالی، باریک اندیشی اور خیال بندی کے جوہر دکھائے گئے ہیں اور بظاہر یہ اثر مرزا عبدالقادر بیدل اور ناصر علی کا ہے، جو اس میدان کے مرد ہیں۔ سودا ناصر علی کو نعمت خاں پر اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ ناصر علی کا "خیال" مرغوب تر ہے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

کم ہے ناصر علی سے نعمت خاں
اُس سے مرغوب تر ہے اس کا خیال

لیکن سوداؔ پر بیدلؔ کی گرفت زیادہ مضبوط ہے۔ انھوں نے بیدلؔ کے

۱۔ سودا، ص ۱۸۶

مصرع بھی تضمین کیے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے۔

سودا بقول حضرت بیدل بکوئے دوست
خطِ جبین ماست ہم آغوشِ نقشِ پا

ایک اور غزل کے قطعہ بند اشعار ہیں۔

سودا سے کہا میں کہ ترے شہرے کو سن کر
دیکھا جو تجھے آکے تو اے بے سروپا ہیچ
بولا کہ تجھے یاد ہے وہ مصرع بیدل
عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ

سودا قصیدے اور ہجو کے بادشاہ تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں "مرزا قتیل چار شربت میں فرماتے ہیں: "مرزا محمد رفیع سودا در ریختہ پایۂ ملا ظہوری دارد وغیر ازیں کہ زبان ہر دو۔ باہم تخالف دارد۔ فرقے نتواں کرد...
مگر ظہوری کی کیا غزلیں کیا قصائد دونوں استعاروں اور تشبیہوں کے پھندوں سے الجھا ہوا ریشم ہے۔ سودا کی مشابہت ہے تو انوری سے ہے کہ محاورہ اور زبان کا حاکم اور قصیدہ اور ہجو کا بادشاہ ہے"۔ یہ جملہ خوبیاں سودا میں موجود تھیں۔ جو بظاہر اس بات کا ثبوت ہیں کہ انوری کو بھی سودا کے مزاج میں اچھا خاصا دخل تھا۔ سودا نے ایک قطعہ بند غزل لکھی ہے جس میں الفاظ کی شان و شوکت، زور بیان اور محاوروں کے برجستہ استعمال میں وہ انوری تک پہنچ گئے ہیں۔ انھیں خود بھی اس کا احساس ہے کہ یہ مخصوص اندازِ سخن انوری کا ہے اسی لیے مقطع میں کہتے ہیں۔

غرض یہ وہ غزل قطعہ بند ہے سودا
کہ اس کی قدر کوئی کیا جز انوری جانے

سلیم اور کلیم فارسی کے مشہور تمثیل نگار شاعر ہیں۔ سودا نے ان کی غزلوں کو تضمین بھی کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں شاعروں کو پسند کرتے تھے۔ ان شاعروں کی طرح سودا کے ہاں بھی تمثیل نگاری ہے اور غالباً اس لیے قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں "در غزل گوئی سلیم و کلیم را پس پشت می گزارد[۱]"

اب ہم مختلف عنوانات کے تحت سودا کی غزل گوئی کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کریں گے۔

داخلیت دبستانِ دلی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں داخلیت کا عنصر زیادہ ہے جس کی بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جب شمالی ہند میں اردو شاعری کی داغ بیل پڑی تو حکومت کی بنیادیں ہل رہی تھیں جس پر تفصیلی بحث پہلے باب میں کی جا چکی ہے۔ کچھ لوگ تصوف کے شیش محل میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ کچھ نے عیش و عشرت میں ڈوب کر زندگی کی تلخیوں کو بھلا دیا تھا۔ اس عہد کے صوفیا یا تصوف کے فلسفوں سے دلچسپی رکھنے والے عام طور پر وہ لوگ تھے جو اجتماعی زندگی سے رشتہ توڑ کر انفرادیت کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ اردو شاعری میں شدید داخلیت انھیں سماجی اور سیاسی حالات کی پیدا کردہ ہے۔ ابتدائی عہد کے بعض اردو شاعر خود صوفی تھے اور اکثر شاعروں کو تصوف سے دلچسپی تھی۔ اسی لیے خود میں "گم رہنے کا انداز" اپنی ذات کے علاوہ تمام کائنات کو فراموش کر دینے کی تمنا، محبت میں محبوب سے بھی بے نیاز ہو جانا داخلیت کے یہ

۱۔ طبقات الشعراء (قلمی)

مختلف روپ شاعری میں بہت مقبول ہوئے۔ داخلیت کے شہنشاہ میر تقی میر ہیں جو برباد ہو گئے لیکن ہارے نہیں۔ جنھوں نے ایک زندہ صوفی کی طرح خود کو گم کرکے پوری کائنات کو حاصل کیا۔ سودا کے ہاں بھی داخلیت ہے مگر اس میں میر کا سا سوز و گداز اور خستگی و برشتگی کی بجائے رنگینی اور سرمستی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے میر اور سودا کی داخلیت اور اظہارِ غم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "مرزا سودا اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے میر اور درد سے مختلف آدمی تھے مگر انھوں نے بھی زمانے کی لاٹھی کھائی تھی۔ انھوں نے متین اور باوقار احتجاج کی بجائے ہزل اور سوقیت کے دامن میں پناہ لی۔ سودا کے انداز کو ہذیانِ غم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے[۱]" ہمیں ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سودا کے ہاں میر، درد اور قائم اور آثر جیسی داخلیت نہیں ہے۔ وہ خارجی شاعر ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو شاعری میں خارجیت کو فروغ انھوں نے ہی دیا۔ اور ان کی غزل میں جو خارجیت ہے وہ ہزل اور سوقیت سے پاک ہے۔

سید امداد امام سودا کی داخلیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"خارجی پہلو کو تو مرزا صاحب ایسا برتتے ہیں کہ زبان اردو میں سوا میر انیس کے کوئی ان کا جواب نہیں ہے مگر داخلی پہلو پر ان کو ویسی قدرت حاصل نہ تھی جس کے سبب سے وہ میر تقی صاحب میر سے غزل سرائی میں پیچھے نظر آتے ہیں[۲]"

۱۔ سید عبداللہ، نقدِ میر، دلی، ص ۷۲

۲۔ امداد امام اثر، کاشف الحقائق، ۲، ص ۱۰۶

سوداؔ کی داخلیت میں خارجیت کی بھی ہلکی سی چاشنی ہوتی ہے۔ ان کے ہاں بہت کم ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں صرف داخلیت ہو چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

عاشق تو نامراد ہیں پر اس قدر کہ ہم
دل کو گنوا کے بیٹھ رہے صبر کر کہ ہم
اتنا کہاں ہے سوز طلب دل تپنگ کا
رکھتی نہیں ہے شمع بھی ایسا جگر کہ ہم

بس نہ تھا اک داغ اے دل پھر تو اس سے لگ چلا
اُس دبی آتش کو ڈرتا ہوں نہ سلگائے فراق

سینے سے سوزِ عشق ترا ہاتھ کب اٹھائے
تا پھوٹ کر جگر سے نہ ہو جائے پارہ داغ

دیکھا جو ادھر خدا سے ڈر کر
دل خالی کیا میں آہ بھر کر

کیوں مجھ کو نہ مارا غم دوری نے ترے آہ
کس منہ سے کروں گا میں پھر اظہارِ محبت

تصوّرِ حسن و عشق | ناممکن ہے کہ سوداؔ قتیل غمزہ و عشوہ نہ رہے ہوں۔ لیکن ان کا عشق بھی لاکھوں انسانوں کی طرح

معمولی عشق تھا۔ جس کی بنیاد ذہنی کیفیات سے زیادہ جسمانی ضروریات پر ہوتی ہے۔ سوداؔ کا دل و دماغ عشق کے معمولی تجربات اور روایتی مضامین تک محدود ہے۔ اس لیے وہ اس مقام سے محروم ہیں جہاں عشق مادّی کثافت کے پردے چاک کر کے حقیقت کا انکشاف کرتا ہے اور عاشق کے دل میں ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری کائنات کا درد سمو دیتا ہے۔ ان کے ہاں مادرائیت اور روحانی عشق کی جھلکیاں بھی نظر آجاتی ہیں۔ مگر یہ عشق صرف ذہن و فکر تک محدود ہے۔ جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس عشق کی بنیاد ان فلسفوں پر ہے جو اس رو بہ زوال تہذیب میں ذہین انسان کے آخری پناہ گاہ بنے ہوئے تھے۔ ان کے مادی عشق میں وہ بلندی اور رفعت نہیں جو ذہنی آسودگی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ان کا عشق صحت مند نہیں اسی لیے ان کے ہاں وہ درد اور کسک نہیں۔ جو ہمیں تڑپا دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے اشعار ہمارے دل کی گہرائیوں کو نہیں چھو پاتے۔

ان کے ہاں عشق کے بیشتر مضامین محض رسمی اور روایتی ہیں اور عشق کا تصور وہی ہے۔ جو اس دور میں مقبول تھا۔ جس میں جنس اور روحانیت، محبوب اور خدا خلط ملط ہو گئے ہیں۔ صوفیاء کے ہاں مادی عشق کی بہت اہمیت تھی کیونکہ یہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے یہ حضرات اپنے مریدوں کو مجازی عشق کی ہدایت کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک انسان خود کو مادی عشق میں جلا کر خاک نہ کرے اسے یہ حق نہیں ملتا کہ وہ خدا تک پہنچنے کی تمنا کرے۔ میر تقی میرؔ کے والد میرؔ کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ

"بیٹا عشق کرو۔ عشق ہی اس کارخانہ ہستی کا چلانے والا ہے... بغیر عشق کے زندگی وبال ہے۔ عشق میں جی جان کی بازی لگا دینا ہی کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے۔ عشق

ہی جلا کر کندن کر دیتا ہے۔[1]"

اسی قسم کی نصیحت نقشبندی سلسلے کی ایک برگزیدہ ہستی یعنی مرزا مظہر جان جاناں کو اُن کے والد بھی کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "جس انسان کا دل محبت کے داغوں سے برشتہ نہیں ہوا۔ اور اس کی طبیعت کے خاشاک جل کر خاک نہیں ہوئے اور دل پاک نہیں ہوا اس کی طینت کی زمین خدا کی محبت کے تخم کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ مجازی عشق زینہ ہے عشق کا۔ اگر تم نے عشقِ مجازی کا رشتہ طوقِ گلو نہ کیا اور کوچہ و بازار میں رسوا و خوار نہ ہوئے تو فقیری کی روح تم سے خوش نہیں رہے گی۔[2]" سودا کے ہاں اس عشق کا تصور تو ملتا ہے مگر صرف رسمی طور پر۔ ان کا شعر ہے۔

ناصحا اس عشق سے ہوتا ہے لذت یاب دل
جس میں حرمت کم ہو رسوائی و خواری بیشتر

ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

سودا ہوے جب عاشق کیا پاس آبرو کا
سنتا ہے اے دیوانے جب دل دیا تو پھر کیا

اس عشق میں سر پر خاک ڈالنی پڑتی ہے۔ گریبان چاک کر کے خاک و خون میں نہانا پڑتا ہے۔ عشق کی لذت تو اسی میں پنہاں ہے کہ انسان ناکام رہے اور خونِ جگر کھاتا رہے۔ بقول سودا خضر نے آبِ حیات صرف اس لیے پیا تھا کہ وہ خونِ جگر کی لذت سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے ؎

۱۔ میر تقی میر، میر کی آپ بیتی، مترجمہ نثار احمد فاروقی، دہلی، ۱۹۵۷ء، ص ۲۳
۲۔ نعیم اللہ بہرائچی، معمولاتِ مظہریہ، کانپور، ۱۲۷۵ھ، ص ۱۱

عشق میں خون جگر کھانے کی گر لذت نہ تھی
خضر نے حیراں ہو آبِ زندگانی کیوں پیا

عشق میں لطف ہی ناکامی کا ہے۔ اگر عاشق کی آہ و زاری کا اثر محبوب پر ہو جائے تو وہ عشق کی اصل لذت سے محروم ہو جاتا ہے۔

تاثیرِ عشق نے مزۂ درد کھو دیا
اُن نے ندان دیکھ مرا حال رو دیا

سوداؔ کو اس کا افسوس ہے کہ "غمِ دوری" میں وہ زندہ رہے۔ گویا ان کی محبت میں ابھی کمی تھی۔ اب ان کی غیرت اور حمیت اجازت نہیں دیتی کہ محبوب کے پاس جائیں اور اظہارِ محبت کریں ؎

کیوں مجھ کو نہ مارا غمِ دوری نے ترے آہ
کس منہ سے کروں گا میں پھر اظہارِ محبت

عشق میں وہ دونوں انسان کامیاب ہیں جنھوں نے اپنے محبوب کو پالیا یا جو محبوب کے راستے پر شہید ہو گئے۔ سوداؔ کوہکن کی اس لیے تعریف کرتے ہیں کہ وہ اگر "قمارِ عشق" میں شیریں کو نہ پا سکا تو کیا ہوا۔ اس نے اپنا سر تو کھو دیا اور پھر سوداؔ خود کو لعنت ملامت کرتے ہیں اور شرم دلاتے ہیں کہ جب اُن سے یہ بھی نہ ہو سکا تو پھر کس منہ سے خود کو "عشق باز" کہتے ہیں ؎

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

اور پھر یہاں سے سوداؔ کے عشق میں ماورائیت پیدا ہونی شروع ہوتی ہے

اُن کا عشق افلاطونی بننے لگتا ہے۔ شاعر پہ محبوب کی آنکھوں کا جادو چلتا ہے اور نہ زلفوں کا سحر۔ وہ عشق برائے عشق کرتا ہے ؎

نہ آنکھوں میں تری جادو نہ ہرگز سحر زلفوں میں
یہ دل جس سے ہے دیوانہ محبت کا ہے وہ لٹکا

عشق ایک فن شریف ہے جو ہر بوالہوس کے بس کی بات نہیں۔ مرزا مظہر کا ایک شعر ہے۔

ہوس عشق مکن اے دل بے صبر و قرار
عاشقی فن شریفے ست ولے کارِ تو نیست

سودا کہتے ہیں۔

گر کہیں عاشق ہے اے سودا تو میں تجھ سے کہوں
وہ عمل میں لائیو جو نیک ہو کردارِ عشق

ایک اور شعر ہے ؎

عشق سے صاف دلوں کو نہیں تازی نسبت
رہے تھا سنگ میں پہلو سے شرر آئینہ

عشق کا وہ مسلک ہے جس میں انسان کے جذبے کی قدر ہے۔ جہاں فلاں ابن فلاں کی کوئی قیمت نہیں۔ عشق کا کوئی حسب ہے اور نہ نسب بقول سودا۔

کہتے ہیں جسے عشق سو وہ چیز ہے سودا ؎
جوں ذاتِ خدا جس کی حسب ہو نہ نسب ہے

عشق کا گھر دیر و حرم کی طرح تنگ بھی نہیں۔ اس میں اتنی کشادگی اور وسعت ہے کہ ہر فرقے، ہر جماعت اور ہر مذہب کے لوگ اس میں آسکتے ہیں ؎

عشق وہ گھر ہے جہاں ہفتاد و دو ملت کو ہے راہ
تنگ جوں دیر و حرم کب در ہے اس درگاہ کا

عشق ایک مذہب ہے۔ اسلام میں خلافِ شریعت کام کرنے والے کو دوزخ میں ڈالا جائے گا لیکن مذہب عشق میں گناہ کرنے والے کے لیے بڑی سزا ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی دوزخ نارِ عشق کا ایک شمہ ہے ؎

عشق کے ذرہ شریعت سے قدم باہر نہ رکھ
سمجھے ہے دوزخ کو اپنا ایک شمہ نارِ عشق

اگر جذبہ صادق ہے اور عاشق سلامت روی سے راہ عشق طے کرتا ہے تو بندگی اپنی انتہا کو پہنچ کر خداوندی ہو جاتی ہے اور بقول سودا ؎

کمال بندگی عشق ہے خداوندی
کہ ایک زن نے مہ مصر سا غلام لیا

اگرچہ محبوب گوشت پوست کا انسان ہے لیکن حقیقت میں یہ مظہر خداوندی ہے۔ خدا کا نور ہے جو خوب صورت انسانوں کے سانچوں میں ڈھل گیا ہے ؎

کفر کی میری تجلی ہے نظیر شمع طور
پوجوں ہوں جس بت کو میں اک نور ہی اللہ کا

محبوب سودا کے عشق کا بھرم اُس وقت کھلتا ہے جب وہ اپنے محبوب کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کے ہاں محبوب کا کوئی مکمل اور جامع تصور نہیں۔ انھوں نے محبوب کے جسم، بعض اعضا اور صفات کی ضرور مدح کی ہے۔ مگر پورا کلیاتِ سودا پڑھنے کے بعد بھی ہمارا ذہن سودا کے محبوب کی تصویر بنانے میں ناکام رہتا ہے۔ اس کی شخصیت اور سیرت الفاظ

کے گورکھ دھندے میں چھپی رہتی ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ خود سوداؔ کے ذہن میں کوئی حسین تصویر نہیں تھی۔ ان کے ہاں ذاتی تجربات مشاہدات اور انفرادی حسیات و تاثرات کی شدید کمی ہے۔ انھوں نے خوب صورتی کو جانچنے کے تمام پیمانے مستعار لیے ہیں۔ ان کا اپنا کوئی معیار نہیں۔ اسی لیے محبوب کی تعریف اور توصیف میں انھوں نے جتنے بھی مضامین باندھے ہیں۔ ان میں کہیں بھی محبوب کی انفرادیت نہیں اُبھرنے پائی۔

اُن کے ہاں وہ معاملہ بندی بھی نہیں جو انشاؔ و جرأتؔ اور بعض دوسرے شاعروں کے ہاں مل جاتی ہے اور جو کم از کم ایک زندہ محبوب کا پتا دیتی ہے۔

سوداؔ کا محبوب امرد ہے ایسے اشعار کی تعداد اچھی خاصی ہے، جن میں انھوں نے اپنے محبوب کے "خط" کے متعلق گل افشانیاں کی ہیں۔ خط کا تعلق جمالیات سے نہیں۔ حسیات اور تاثرات سے بھی بہت کم ہے۔ یہ مضمون صرف شعر کہنے کے لیے ہوتا ہے اس موضوع پر سوداؔ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جز خطِ سبزِ عارضِ دلدار ہم نشیں
دیکھا ہے آپ نے یہ کبھو زنگ اور نمک

خط آچکا پہ مجھ سے وہی ڈھنگ اب تلک
ویسا ہی میرے نام سے ہے ننگ اب تلک

خط سبز اس کے سے عارض پہ ہوگیا دونی صفا
یہ وہ آئینہ ہے پہونچا دے جسے زنگار فیض

کوچ شاہِ حسن کا ہے وہ غبارِ خط نشاں
گردِ لشکر سے اُٹھی وقت سواری بیشتر

ممکن ہے ہیئت کے اعتبار سے اس قسم کے بعض اشعار کا شمار عظیم شاعری میں ہو جائے۔ لیکن جہاں تک مضمون اور مواد کا تعلق ہے یہ تیسرے درجے کی معمولی، سطحی اور ناقص شاعری ہے۔ پہلے شعر کا مضمون "رنگ اور نمک ردیف اور قافیہ کا مرہونِ منت ہے۔ "نمک" ردیف ہے اور "رنگ" قافیہ دوسرا شعر مطلع ہے اور ظاہر ہے کہ "ڈھنگ" اور "تنگ" کے قافیے۔ اسکی تخلیق کے موجب ہیں۔ تیسرا شعر "خط سبز" "دونی صفا" "آئینہ" اور "زنگار" جیسے الفاظ کا گورکھ دھندا ہے۔ چوتھے شعر میں ایک خوب صورت تشبیہہ ہے۔ ان تمام اشعار سے سودا کی قادر الکلامی کا ضرور پتا چلتا ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی شعر بھی ہماری جمالیاتی حس کو اپیل نہیں کرتا۔

اب چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں سودا نے محبوب کے جسم، خط و خال اور بعض اعضاء کی تعریف کی ہے ؎

عالم کا قمری آسا ہے طوق بندگی کا
قامت کو تیرے جیسے سرو رواں بنایا

لب لعل بتاں پر سرخی پاں ہے کہ جادو ہے
بنادی شکلِ طوطی صورتِ سرخاب آتش پر
یہ اس کے رنگ عارض سے ہے دل بیتاب آتش پر
ٹھہرتا ہی نہیں سینے میں جوں سیماب آتش پر

دیکھے اگر صفائے بدن کو ترے صبا
کھولے کبھو نہ شرم سے بند قبائے گل

خال زیر زلف پر مت جی چلا اے مرغِ دل
مان میرا ابھی کہا یہ دام بے دانہ نہیں

سودا خرامِ قد کو ترے دیکھ کر کہے
ہے راستی تو یہ کہ ہوا یاں تمام ناز

ہے خوبی دندانِ دہن خوبوں میں لیکن
بتیسی کہوں اس کی کہ موتی کی لڑی ہے

تبسم یوں نمایاں ہے مسّی آلودہ دنداں سے
نہ ہو ابر سیہ میں اس طرح بجلی کی اچپلیاں

دندان و لب پہ سارے تھا نیم جاں ولیکن
مسّی دو انگلی مل کر کھایا جو پان مارا

ہے سرو سے قامت کے ترے قمری تو والہ
اور کبک دری تک تیری رفتار کا عاشق

نازک اندامی کروں کیا اس کی اے سودا بیاں
شمع ساں جس کے بدن پہ ہو پسینے کا خراش

ان تمام اشعار میں محبوب کے جسم اور اعضا کی تعریف کی گئی ہے۔ مگر کوئی ایک شعر بھی ہماری جمالیاتی حس کی آسودگی کا سامان نہیں بن سکتا۔ یہ سب روایتی مضامین ہیں۔ محبوب کی یہ تمام صفات سو فیصدی رسمی ہیں۔ جن پر فارسی اور اردو کے ہزاروں شاعر طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ ان میں صرف سودا کا طرزِ بیان اور تشبیہات و استعارات ہیں جنھوں نے انھیں گوارا کر دیا ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ سودا کی توجہ زبان و بیان پر تھی۔ وہ محبوب کی خوبیوں سے اتنے متاثر نہیں ہیں کہ ان کے احساسات اور جذبات بے تکلف، سادہ اور بے ساختہ زبان اور لب و لہجہ میں ڈھل جائیں۔ وہ محبوب کی قامت سے زیادہ "قمری" "طوقِ بندگی" "سروِ رواں" پر توجہ صرف کرتے ہیں۔ محبوب کے لب لعلیں اُن کے لیے اتنے اہم نہیں جتنے کہ "طوطی" "سرخاب" اور "آتش" ہیں۔

سودا اور ان کے محبوب کے تعلقات بھی بہت عبرت ناک ہیں۔ وہ اپنے محبوب کی نظر میں ذلیل و خوار رہتے ہیں۔ رقیبوں کو ہمیشہ اُن پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اُن سے محبت یا ان پر التفات تو بہت دور کی بات ہے۔ ان کا ذکر آتے ہی محبوب میلوں دور بھاگ جاتا ہے۔ وہ جب محبوب کو دردِ دل سناتے ہیں تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑتا ہے۔ اس قسم کے مضامین ابتدا سے لے کر آج تک تقریباً تمام غزل گو شعرا کے ہاں ملتے ہیں۔ یہ غزل کے روایتی مضامین ہوتے ہیں۔ جو اکثر محض قافیے کی مجبوری سے باندھے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ شاعر اور محبوب کے اصل تعلقات کی

جھلکیاں بھی ہوتی ہیں جن میں محبت یک طرفہ نہیں ہوتی۔ بلکہ محبوب بھی عاشق پر فدا ہوتا ہے۔ جن سے عاشق کی خود داری اور عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ دونوں کے قابلِ احترام انسانی رشتے کا پتا چلتا ہے۔ مگر سودا اور ان کے محبوب کے تعلقات ہمیشہ ہی مضحکہ خیز رہتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ڈرتے ڈرتے جو کہا میں کہ ترا عاشق ہوں
قہقہہ مار لگا کہنے وہ طناز درست

ٹک سادہ دلی پر تو مرے رحم کر اے یار
ہوں تجھ سے ستم گر سے طلب گارِ محبت

باتیں مجھے بھاتی ہیں آمیزشِ دشنام
ہوں اس لیے اُس شوخ کی گفتار کا عاشق

دیکھے ہے مجھ کو اپنی گلی میں تو پھر مجھے
ویسی ہی گالیاں ہیں وہی سنگ اب تلک

سنتا ہے جس جگہ وہ مرا ذکر ایک بار
بھاگے ہے واں سے لاکھ ہی فرسنگ اب تلک

تصوف

سودا کے ہاں تصوف کے مضامین صرف برائے شعر گفتن ہیں اور بقول محمد حسین آزاد "تصوف جو ایشیا کی شاعری کی مرغوب نعمت ہے۔ اس میں مرزا پھیکے ہیں۔ وہ حصہ خواجہ میر درد کا ہے۔" سودا

شہر آشوبوں اور ہجوؤں کے سہارے زوال پذیر سماج کا مقابلہ کرتے رہے۔ ان کے لب و لہجے میں جو تضحیک اور طنز و تلخی ہے انھیں حالات کی پیدا کردہ ہے۔ جنھوں نے بعض لوگوں کو تصوف کی پناہ گاہ میں جگہ دی تھی۔ جس پر پہلے باب میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔ سودا تصوف کو صرف فلسفہ کی حد تک مانتے تھے۔ ان کی عملی زندگی میں اسے کوئی دخل نہیں تھا۔ ان کے کلام میں تصوف کے جتنے مضامین ملتے ہیں۔ ان کی بنیاد تصوف کے مقبولِ عام فلسفوں پر ہے۔ سودا یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات کے ذرّے ذرّے میں خدا کا ظہور ہے لیکن نگاہِ دیدۂ تحقیق کی ضرورت ہے۔ وہ موسیٰ تھے جنھیں خدا کا جلوہ دیکھنے کے لیے کوہِ طور پہ جانا پڑا۔ اگر دیکھنے والی آنکھ ہو تو ہر سنگ میں اس کے ظہور کا شرار دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

سودا نگاہِ دیدۂ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہے آفتاب کا
ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہِ طور کا

جسے بلبل صرف گلستاں میں دیکھتی ہے۔ وہ بیاباں کے ہر خار میں موجود ہے۔ زلیخا کو جو نور صرف مہ کنعاں میں نظر آیا تھا۔ وہ ہر تارے میں نظر آ سکتا ہے بشرطیکہ چشمِ بینا ہو ؎

بلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا
ہم نے اسے پُرخار بیابان میں دیکھا
روشن ہے وہ ہر ایک ستارے میں زلیخا
جس نور کو تو نے مہ کنعان میں دیکھا

سوداؔ مذہب کی ان ظاہری رسوم کے خلاف ہیں جو انسانوں میں تفریق اور ایک دوسرے سے نفرت پیدا کرتی ہیں۔

خدا سے محبت کرنے والوں کے لیے مسجد اور مندر کی کوئی قیمت نہیں ان کے لیے دل سب سے بڑی عبادت گاہ ہے۔

دیر و حرم کو دیکھا اللہ رے فضولی
یہ کیا ضرور تھا جب دل کا مکاں بنایا

شیخ کعبۂ دل کی حقیقت سے بے بہرہ ہے اور خانقاہ و مدرسہ کی الجھنوں میں گرفتار ہے ؎

کعبۂ دل کی حقیقت کو پہونچ اے شیخنا
خانقاہ و مدرسہ تیرا ٹھکانا ہے عبث

جس نے ذاتِ باری تعالیٰ کا نشان پالیا ہے۔ وہ پھر رام و رحیم سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ خدا ہندو یا مسلمان نہیں ہے، یہ مسجد و مندر انسان کی اپنی تخلیق ہیں۔

ہے مبرّا یہ زباں کہنے سے اب رام رحیم
جن نے پایا ہے نشاں اس کو نہیں نام سے کام

سوداؔ کی نظر میں وہ انسان قابلِ عزت و احترام ہے جو دوسرے انسانوں سے محبت کرتا ہے۔ ہندو بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ مسلمان خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ لیکن سوداؔ اس شخص کو پوجتے ہیں جو آشنا پرست ہے ؎

ہندو ہیں بت پرست مسلماں خدا پرست
پوجوں میں اس کسی کو جو ہو آشنا پرست

ایک بت خانے کو توڑ کر مسجد بنانے سے اتنا ثواب نہیں ہوتا جتنا

برہمن کا دل توڑنے سے گناہ ہوگا۔

توڑ کر بت خانے کو مسجد بنا کی تو نے شیخ
برہمن کے دل کی بھی کچھ فکر ہے تعمیر کا

خدا کو تلاش کرنا ہے تو انسانوں ہی میں تلاش کرو۔ خدا کے بندوں کی دل جوئی کرو۔ خدا خود مل جائے گا ؂

شیخ کعبہ میں خدا کو تو عبث ڈھونڈے ہے
طالب اس کا ہے تو ہر ایک کی کر دل جوئی

سودا کے ہاں جو کہیں کہیں انسانی عظمت کا احساس ملتا ہے۔ وہ بھی تصوف کی دین ہے۔ مثلاً

جو خاک نشیں ہیں نہ انھیں سمجھیو کم قدر
وہ دانہ ہے خرمن جسے ماٹی میں رلایا

واعظ و زاہد

صوفی حضرات اہلِ باطن ہوتے ہیں جو تصنع، بناوٹ اور دکھاوے سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کا مقصد خدا تک پہنچنا اور خود کو خدا کی ذات میں گم کرنا ہوتا ہے۔ وہ اس کی قطعی پروا نہیں کرتے کہ ان کے بارے میں عوام کی کیا رائے ہے۔ اس کے برعکس زاہد اور واعظ کی زندگی میں مکر اور ریا کو دخل ہوتا ہے۔ ان کے کردار اور گفتار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان کی تنہائیاں رندِ مشرب کی زندگی کی طرح رنگین اور ہر طرح کے گناہوں سے لبریز ہوتی ہیں۔ سودا جیسے ظریف انسان کو اس سے بہتر اور کیا موضوع مل سکتا تھا۔ ان کے دیوان میں سیکڑوں اشعار ایسے ہیں جن میں واعظ کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ اور اکثر اشعار میں نظریاتی اختلاف سے زیادہ مضحکہ اڑانے کا جذبہ کارفرما نظر

آتا ہے۔ یہاں صرف چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

پھرے ہے شیخ یہ کہتا کہ میں دنیا سے منہ موڑا
الٰہی ان نے اب داڑھی سوا کس چیز کو چھوڑا

مغ نے دی پگڑی یہ زاہد کے مجھے قرض شراب
کام سوداؔ ہی کا ہوتا ہے خدا ساز درست

شیخ اتنا تو جتاؤ نہ تم اپنا تقویٰ
عوض مے گرو ہے جبّہ و دستار ہنوز

شیخ صاحب سے مریدوں کو نہیں زنہار فیض
بخشے ہے رندوں کو ان کا جبہ و دستار فیض

کہا تو مان لے سوداؔ کا توبہ کر اس سے
لب و دہن کے تئیں کرکے شست و شو واعظ

بے ثباتی

صوفی شعرا کا یہ بہت محبوب موضوع ہے۔ بے ثباتی اور قناعت کے فلسفے زوال پذیر سماج میں بہت مقبول ہوتے ہیں۔ اگر بعض مصلح دماغوں نے حکمراں طبقے کی عیش کوشی اور دنیا پرستی کے خلاف بے ثباتی اور قناعت کے فلسفوں کو پیش کیا تو عوام کی اخلاقی صحت و درستی کے لیے۔ لیکن یہ فلسفے شکست خوردہ انسانوں کے زخموں پر مرہم کا کام بھی کرتے رہے ہیں۔ اگر انسان مادّی دنیا میں ناکام رہے تو دل کو یہ کہکر

تسکین دے لیتا ہے کہ یہ دنیا ناپائدار ہے۔ یہاں ہمیشہ کس کی بنی رہی ہے دنیا کی مثال اس سورج کی ہے جو صبح پوری تاب ناکیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ لیکن شام ہوتے ہوتے جس کا چہرہ زرد پڑ جائے۔ پھر ایسی ناپائدار چیز سے دل لگانے سے فائدہ؟ سوداؔ نے اس موضوع پر بہت شعر کہے ہیں ؎

رخصت ہے باغباں کہ ٹک دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا

دور ساغر تھا ابھی یا ہے ابھی چشم پر آب
دیکھ سوداؔ گردشِ افلاک سے کیا کیا ہوا

مہماں جو کوئی آیا گھر آسماں دنی کے
دو دن کھلا کے روٹی اس کو ندان مارا

آراستہ جو بزم ہوئی دورِ فلک میں
واں جام بجز گردشِ ایام نہ آیا
ہے رنگ تماشائے جہاں صورتِ خورشید
جو صبح کو دیکھا وہ نظر شام نہ آیا

انتہا عیش جہاں کی جو تو دیکھا چاہے
بزم مستاں پہ نگہ غور سے کر آخرِ شب

اس جامہ پہ اتنا نہ ابھر بلبلے کی طرح
جامہ یہ ترا پوچ ہے تو غیر ہوا ہیچ

کر خانۂ گردوں پہ نظر چشم فنا سے
ہے مثل حباب اس کی بھی تعمیر ہوا پر

دیوے تجھے وہ کچھ کہ نہ پھر چھین لے تجھ سے
زنہار نہ رکھ یہ طمع خام جہاں پر

کچھ اس چمن میں آکے نہ دیکھا میں جوں حباب
آب رواں کو سیر کیا سو بھی یک نفس

قناعت اگرچہ سودا ہرگز قانع نہیں تھے۔ ان کی تمام زندگی امیروں اور نوابوں کی قصیدہ خوانی میں گزری۔ مگر ان کے کلام میں قناعت کے موضوع پر جتنے اشعار ملتے ہیں تصوف کے کسی اور فلسفہ پر نہیں ملتے۔ بظاہر اس کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اُس دور کے عوام میں قناعت کے فلسفے کو بہت زیادہ مقبولیت تھی۔ جو اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کا ردِعمل تھا۔ مغل تخت پر اتنی تیزی سے بدلتے ہوئے بادشاہوں کو دیکھ کر انسان گوشہ نشینی کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ سودا کا شعر ہے ؎

خطرہ ہے تجھ سے مسندِ شاہی کو اے فلک
حاضر ہے پوست سخت مرا پشم تو اکھاڑ

دہلی کی عظیم الشّان عمارتوں اور حویلیوں کو اجڑا ہوا اور برباد دیکھ کر انسان سوچتا تھا کہ ان حویلیوں کا مالک بننے سے بہتر ہے کہ وہ کلاہِ فقیر سر پہ سجا لے۔ بقول سوداؔ ؎

منعم نہ مر بنائے عمارت کی فکر میں
یہ سب حویلیاں تھیں جہاں تک، ہیں اب جاڑ

ایسی سجی ہے سر پہ ہمارے کلاہِ فقر
جس کے حضور ہو نہ سکے تاج شاہ سبز

گھر امن کا اسی کو ملا زیر آسماں
جس نے جہاں میں آن کے مسمار کی ہوس

مفلسوں کو نہیں دنیا میں کسی کا خطرہ
خوف ہے ان کو کہ جو دام و درم رکھتے ہیں

گو منتظر دعا کا ہمارے ہے اب قبول
دست و دہن پسارئیے اپنی یہ خو نہیں

یہ رتبہ جاہِ دنیا کا نہیں کم مال زادی سے
کہ اس پر روز و شب میں سینکڑوں ہی چڑھتے آتے ہیں

دیکھی نہ بنا ہم نے وہ قصرِ فریدوں کی
جو اپنے خرابہ کی تعمیر نظر آئی

سودا کے عہد میں تبدیلی اتنی تیزی سے ہو رہی تھی کہ قناعت کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ کل جو تخت پر تھا، آج بھیک مانگ رہا ہے۔

طلب نہ چرخ سے کرنا تو راحت اے سودا
پھرے ہے آپ وہ کاسہ لیے گدائی کا

سیم و زر کے آگے سودا کچھ نہیں انسان کی
خاک میں رہنا بھلا تھا بلکہ اس اکسیر کا

میخانے میں ازل کے مرے دل سے زاہدا
دھویا ہے نقش ساقی نے امید و بیم کا

بیٹھ رہ سودا تسلّی دل کو دے
دربدر منت سے کیا حاصل پھرا

حباب آسا کیا ہے کارِ استغنا تمام اپنا
رکھا محروم میں قطرے سے اس دریا میں جام اپنا

طمع دولت کی بیتاب و تعب مت رکھ زمانے سے
مہوس تا نہ جھونکے آگ میں مس زر نہیں ہوتا

مجھ گدا نے بھی کسی شاہ سے ڈالا نہ سوال
گو مجھے بخت نے اسکندر و دارا نہ کیا
دیر بانٹے تھا متاع دو جہاں اے سودا
بینوائی نے مری اس کو اشارا نہ کیا

شاہاں سے سوال اپنی رعونت شکنی ہے
کونین تلک ورنہ ہے پیش نظرا ہیچ

نہ دیکھی خوشدمی جز یک تبسم ہم نے غنچے میں
ہوا سے اس چمن کے ہے دلا ترک ہوس بہتر

نظر میں ان کے جن کو دولت استغنا نے بخشی ہے
مگس سے ہے ہما بہتر، ہما سے ہے مگس بہتر

احساسِ تشنگی

سودا کو اس سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی زوال کا شدید احساس ہے جس نے حکمران طبقے سے لے کر عوام تک ہر فرد کی زندگی کو اجیرن بنا رکھا تھا۔ سودا کی ہجو و شہر آشوب طنز و ظرافت اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ان میں سیاسی اور سماجی شعور تھا۔ وہ حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ورثے میں جو مروجہ علوم ملے تھے اور جن فلسفیوں اور ادیبوں نے ان کی شخصیت بنائی تھی۔ ان میں سے کوئی سودا کی رہنمائی نہیں کر سکتا تھا اور سودا حالات کا تجزیہ نہ کر سکے اور زوال کے گہرے اندھیرے میں دور تک روشنی کی کرن نہ دیکھ سکے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان

کے یاں تشنگی، پیاس اور بے چینی کا احساس پیدا ہوگیا۔ انھوں نے زندگی میں سب کچھ حاصل کیا۔ دولت، عزت اور شہرت ہمیشہ ان کے غلام رہے لیکن جب سودا اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالتے تو انھیں ایسے لوگ بھی نظر آتے جو حوادثِ زمانہ کے شکار تھے، سودا خود کو اس سماج کے اعلیٰ طبقے کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ اس لیے اس طبقے کی بربادی خود ان کی بربادی تھی۔ شریفوں کو ذلیل اور ذلیلوں کو شریف بنتے دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتے ہیں۔ وہ جاگیرداری نظام کے پروردہ تھے۔ جس میں شرافت کا دارومدار انسان کے خاندان، خون اور حسب و نسب پر ہوتا ہے۔ ذاتی صلاحیتوں پر نہیں سودا اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس کی زبوں حالی عبرت ناک تھی۔ ان کے سامنے اعلیٰ طبقے کا اقتدار پاش پاش ہو رہا تھا، اور نچلے طبقے کے بعض ذہین افراد اپنی ذاتی کوششوں، سازشوں اور چال بازیوں سے دولت اور طاقت حاصل کر رہے تھے۔ زوال کے اس خطرناک طوفان میں بعض لوگ ایسے ساحل پر اُتر گئے جہاں تصوف کے فلسفوں کی مدد سے انھوں نے زندہ رہتے ہوئے بھی زندگی سے فرار حاصل کر لیا اور وقتی طور پر مصائب و آلام سے نجات پالی۔ مگر سودا کے پہلو میں دل نہیں تھا اور دماغ بہت ہی مشکل سے تصوف سے سمجھوتہ کر سکتا تھا۔ اس لیے حالات کی ننگی تلوار ہمیشہ ان کی گردن پر لٹکی رہی وہ اپنے دور کے سیاسی اور سماجی حالات سے کس حد تک متاثر تھے انھوں نے حالات کا کس طرح تجزیہ کیا اور ان پر کس طرح تنقید کی ہے؟ اس پر تفصیلی بحث "شہر آشوب" کے باب میں کی گئی ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگرچہ مالی اعتبار سے سودا تقریباً تمام زندگی آسودہ رہے۔ انھیں اپنے عہد کے امراء و روساء اور

نوابین کی سرپرستی حاصل رہی۔ لیکن انھیں یہ احساس ہمیشہ پریشان کرتا رہا کہ آسمان ان کے حق میں بخیل ہے۔ انھیں دنیا میں وہ سب کچھ نہ مل سکا جس کے وہ مستحق ہیں۔ سودا نے اپنی ناکامی کا ذکر طرح طرح سے کیا ہے۔ محبت میں ناکامی اور محبوب سے دائمی جدائی بھی دنیوی ناکامی کے استعارے ہیں۔ اس موضوع پر چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

پایا وہ ہم اس باغ میں جو کام نہ آیا
کچھ اپنے تئیں جز ثمر خام نہ آیا

اس کا تو گلہ کیا ہے کہ بستانِ جہاں میں
مجھ تک قدح بادۂ گلفام نہ آیا

یوں منہ نہ دھوائے صبح کے آگے مرے سودا
جوں لالہ پر از خون جگر جام نہ آیا

کسی کا دین کیا حق نے کسی کی دنیا
سب کا سب کچھ کیا پر تجھ کو ہمارا نہ کیا

برگشتہ نصیب اپنے نہ پھرتے کبھو دیکھے
ہر چند رہی گردشِ ایام جہاں پر

پائے نہ جھانکنے بھی کبھو ہم در چمن
رکھتے ہیں دل میں رخنۂ دیوار کی ہوس

آن کر اس میکدے کے بیچ جز چشمِ پُر آب
قسمت اپنی ہم نہ پائے ساغرِ معمور تک

کیا گلا صیّاد سے ہم کو یونہیں گزرے ہے عمر
اب اسیرِ دام ہیں تب تھے گرفتارِ چمن

خرمن برق زدہ کا ہوں وہ دانہ کہ مجھے
نہ کوئی مرغ چگے نے کوئی بو دے مجھ کو

غم پرستی

غم زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔ اس کا اثر مزاج پر مختلف ہوتا ہے۔ بعض ہستیاں غم کو شکار کر لیتی ہیں اور بعض کو غم۔ میرؔ نے انفرادی اور ذاتی غم کو اتنی وسعت دی کہ اس میں آفاقیت پیدا ہو گئی۔ ان کے اشعار میں کائنات کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی یاسیت اور قنوطیت کی فضا میں انسانی وقار وعظمت کا احساس بلند حوصلگی، زندگی کی ہلچل، گرمی، تڑپ اور ناکامیوں سے کام لینے کا سلیقہ ملتا ہے۔ جس سے غم زدہ اور شکست خوردہ انسان میں حوصلہ، عزم اور نبرد آزمائی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر سوداؔ کا غم انفرادی اور کسی حد تک روایتی ہے۔ ایک بڑے شاعر کی طرح سوداؔ اپنے غم میں آفاقیت اور ہمہ گیریت پیدا نہیں کر سکے۔ ان کے غم میں وہ وسعت پیدا نہ ہو سکی جو اپنے دامن میں ہر قسم زدہ کو پناہ دے سکے اور جو ہر زخم پر مرہم کا کام دے سکے۔ غم کے بیان میں ان کی خارجیت مخل ہوتی ہے۔ ان کا مزاج مفہوم کے بیان کرنے سے زیادہ الفاظ کی مرصع کاری کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اسی

لیے ان کی داستانِ غم سن کر بے ساختہ منہ سے " واہ " نکل جاتی ہے لیکن " آہ " صرف میر کا حصّہ ہے

سودا کے ہاں غم کے بیشتر مضامین رسمی ہیں جن پر ان کے اندازِ بیان کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

سودا وصل میں بھی غمِ ہجر کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں کیونکہ غم ایک مستقل کیفیت ہے اور وصل وقتی ؂

وصل بھی ہو تو دل مرا غم کو نہ چھوڑے ہجر کے
یہ تو ہمیشہ ہے رفیق وصل ہے گاہ گاہ کا

آنکھوں سے آنسو اس وقت بہتے ہیں جب انسان اپنے غم کی انتہا پر پہنچ جائے اور ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو کسی کے رونے کا ذکر سن کر متاثر نہ ہوں۔ لیکن سودا اپنی اشک باری کا ذکر اس طرح اور ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ پڑھنے والا ان کی شاعرانہ صناعی کا تو ضرور قائل ہو جاتا ہے لیکن متاثر نہیں ہوتا۔ مثلاً

قطرہ گرا تھا جو کہ مرے اشکِ گرم سے
دریا میں ہے ہنوز پھپھولا حباب کا

کچھ تازہ تعلق نہیں اس دل کو الم سے
تھا طفلی میں گہوارہ مرا دامن غم سے

شربت ہے مجھے زہرِ غمِ ہجر کہ میری
گھٹی جو بنی روزِ تولد سو وہ سم سے

غافل غضب سے ہو کے کرم پہ نظر نہ رکھ
پُر ہے شرار برق سے دامن سحاب کا

پوچھتے ہی پوچھتے گذری ہے مجھ کو روز و شب
چشم ہے یارب مری یا منہ کسی ناسور کا

سودا سے یہ پوچھا میں دل میں بھی کسی کو دوں
وہ کہہ کے بیاں اپنا روداد بہت رویا

بعض اشعار میں سودا میر سے قریب آگئے ہیں۔ اس لیے ان اشعار میں تاثیر بھی ہے اور درد بھی۔ لیکن ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ چند ملاحظہ ہوں۔

دوستو سنتے ہو سودا کا خدا حافظ ہے
عشق کے ہاتھ سے رہتا ہے یہ رنجور سدا

بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہو گیا
دی تھی خدا نے آنکھ پہ ناسور ہو گیا

اس باغ میں اک گل کو خنداں جو کہیں دیکھا
سو غنچہ کی واں صورت دلگیر نظر آئی

زور بیان

سودا کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت زورِ بیان ہے اور یہی خصوصیت انھیں اپنے ہم عصروں سے

الگ کرتی ہے۔ اگرچہ دوسرے شعرا کے یہاں بھی یہ صفت پائی جاتی ہے لیکن اس ہمہ گیری کے ساتھ نہیں کہ اسے ان کے کلام کی خصوصیت کہا جا سکے۔ یہ سوداؔ اور صرف سوداؔ کا حصہ ہے۔ اسی نے سوداؔ کو انفرادیت بخشی ہے اور اسی خصوصیت کی وجہ سے سوداؔ کی آواز سب سے علیحدہ ہے۔ ان کی طبیعت میں جو شگفتگی و زندہ دلی، نشاط و سرمستی اور رنگینی ہے۔ اسی نے ان کے وجدان کو نشاط آمیز بنایا ہے۔ اور یہ زورِ بیان اسی نشاط آمیز وجدان کا عطیہ ہے۔ ان کے کلام میں داخلیت موجود ضرور ہے۔ لیکن اس میں سوز و گداز، درد و غم اور دھیمی دھیمی آنچ کی بجائے، شوخی، البیلاپن اور زیرِ لب مسکراہٹ ہے۔ دبستانِ دلّی کے بیشتر شاعروں کے کلام پر یاسیت و قنوطیت، رنج و غم اور شکست خوردگی کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس سوداؔ کے ہاں وہ رجائیت ہے۔ جو شکست کھا سکتی ہے لیکن شکست تسلیم نہیں کر سکتی۔ وہ بربادیوں کا ماتم نہیں کرتے، ناکامیوں کا نوحہ نہیں پڑھتے بلکہ ان کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور ان پر قہقہہ لگاتے ہیں اسی جذبے اور فطرت نے انھیں عظیم ہجو نگار بنایا ہے۔

نشاط آمیز وجدان نے ان کے کلام میں ہماہمی اور طوفان کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ سوداؔ صرف مفہوم ہی پر نہیں بلکہ الفاظ پر بھی توجہ کرتے ہیں۔ میرؔ اور سوداؔ کو زبان پر تقریباً برابر قدرت تھی۔ لیکن میرؔ قلبی واردات کو سیدھے سادے الفاظ میں پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے لیے شاعری درد و غم کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اس کے برعکس سوداؔ اسے فن سمجھتے ہیں۔ انھوں نے عبرت الغافلین اور سبیل ہدایت میں جو تنقیدیں کی ہیں ان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معنی و الفاظ دونوں کو برابر اہمیت دیتے تھے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے سوداؔ کی اس خصوصیت کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں " اُن کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کُھلا رہتا تھا اس پر سب رنگوں میں ہم رنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ۔ جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز۔ نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے اور کہیں رکے نہیں۔ چند صفتیں خاص ہیں۔ جن سے کلام اُن کا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریبان ہے جیسے آگ کے شعلہ میں گرمی اور روشنی، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولائتی طپنچہ کی چاپیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اور یہ خاص ان کا حصّہ ہے۔ چنانچہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں شعر مزا ہی نہیں دیتا[۱]۔" حقیقت یہی ہے کہ سوداؔ کو الفاظ کی مرصع کاری پر جو قدرت تھی۔ وہ مشکل ہی سے نصیب ہوتی ہے۔ ان کے بیشتر اشعار بے ساختہ اور برجستہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ صرف آمد ہے شاعر نے دماغ پر زور نہیں دیا خود بخود یہ شعر ہو گیا ہے۔ حالانکہ ایک اچھا شعر کہنے کے لیے ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

غنچے سے مسکرا کے اسے زار کر چلے
نرگس کو آنکھ مار کے بیمار کر چلے
آئے جو بزم میں تو اٹھا چہرے سے نقاب
پروانے ہی کو شمع سے بیزار کر چلے

۱- آبِ حیات، الہ آباد، ۱۵۷، ۱۵۸

لطف اے اشک کہ جوں شمع گھلا جاتا ہوں
رحم اے آہ شرر بار کہ جل جاؤں گا

چمن میں صبح جب اس جنگ جو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا آبِ رواں سے کام لیا

سوداؔ جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

سوداؔ کی جو بالیں پہ کیا شورِ قیامت
خدّام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

تم جن کی ثنا کرتے ہو کیا بات ہے ان کی
لیکن ٹک ادھر دیکھیو اے یار بھلا میں

یہ اشعار زورِ بیان کی بہترین مثال ہیں۔ ان کی برجستگی، سلاست، روانی، صفائی اور بے ساختگی کہہ رہی ہے کہ یہ معمولی دماغ کی پیداوار نہیں لطفِ بیان نے ان میں شعریت پیدا کی ہے۔ ان میں زندگی کی ہمہ رنگی ہے خارجیت ہے۔ لیکن وہ خارجیت نہیں جس نے بعد کے شاعروں میں مریضانہ

صورت اختیار کرلی تھی۔ غم ہے۔ لیکن نبرد آزمائی کے حوصلے کے ساتھ۔ اسلوبِ بیان میں دریا کا سا بہاؤ ہے۔ یہ فن اکتسابی نہیں، خداداد ہے۔

سوداؔ کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے تکرارِ لفظی سے بھی کام لیتے ہیں میرؔ کے ہاں بھی اس کی اچھی خاصی مثالیں ہیں لیکن دونوں کے ہاں نمایاں فرق ہے۔ سوداؔ کے ہاں تکرارِ لفظی، شوخی، شگفتگی اور رنگینی کو بڑھاتی ہے لیکن میرؔ کے ہاں داخلیت کی کیفیت اور اثر کو۔

بولو نہ بول شیخ جی ہم سے کڑے کڑے
یاں چٹ کئے ہیں اس سے عمامے بڑے بڑے

قامت نے تیرے باغ میں جا خطِ بندگی
لکھوالیا ہے سروِ چمن سے کھڑے کھڑے

بوسہ کی ان لبوں سے یہ سوداؔ ہوس نہ رکھ
جن سے کہ مانگ مانگ میں دشنام رہ گیا

سن سن کے عرض حال مرا یار نے کہا
سوداؔ نہ باتیں بیٹھ کے یاں متصل بنا

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی چلے گئے
پھر پھر گل آچکے پہ سجن تم بھلے گئے

ساقِ سیمیں تری شب دیکھ کے گوری گوری
شرم سے شمع ہوئی جاتی ہے تھوری تھوری

سوداؔ کے ہاں زورِ بیان کی ایک اور صورت ہے اور وہ ہے حروفِ عطف یا حروف ربط کے واسطے سے مصرع یا شعر کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا، یا مختلف ہم معنی الفاظ کو حرفِ عطف کے واسطے سے ایک مصرع میں جمع کرنا۔ اس سے ان کے کلام میں جو صوتی بلند آہنگی، ترنم اور موسیقیت اور پُرشور بیان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ ان کی مخصوص انفرادیت کی تشکیل کرتی ہے۔

عزت و آبرو و حرمت و دین و ایماں
روؤں کس کس کو میں یارو کہ گیا کیا کیا کچھ
والہ و شیفتہ و زار و حزین و مجنوں
اپنے عاشق کو کل اس نے نہ کہا کیا کیا کچھ
ضعف و ناطاقتی و سستی و اعضا شکنی
ایک گھٹنے میں جوانی کے بڑھا کیا کیا کچھ

نہ تلطف نہ محبت نہ مروّت نہ وفا
سادگی دیکھ کہ اس پر بھی ملا جاتا ہوں

جور و ستم تعدی و اندوہ و درد و غم
مائل ہوئے ہیں اس دلِ ناشاد کی طرف

یا تبسم یا نگہ یا وعدہ یا گاہے پیام
کچھ بھی اے خانہ خراب اس دل کے سمجھانے کی طرح

مہر و وفا و شرم و مروّت سبھی کچھ اس میں سمجھے تھے
کیا کیا دل دیتے وقت اس کو ہم نے خیالِ خام کیا

دین و دل و ایمان و حواس و خرد و ہوش
سب کچھ گئے لے کر نہ گئے سینے سے غم کو

صورت میں میں کہتا نہیں ایسا کوئی کب ہے
اک دھج ہے سو وہ قہر ہے آفت ہے غضب ہے

صبر و قرار و ہوش و دل و دیں فدا کیا
تس پر بھی میری جان تجھے مجھ سے کیں رہا

نشاط آمیزی

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ سوداؔ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو نشاط آمیز لب و لہجہ دیا ہے۔ اور یہی خصوصیت ہے جو انھیں میرؔ، دردؔ اور دوسرے ہم عصر شعرا سے الگ کر کے ان کی آواز میں انفرادیت اور مخصوص آہنگ پیدا کر دیتی ہے۔ اگرچہ سوداؔ اس گہرائی، گیرائی، خود سپردگی اور خستگی سے محروم تھے۔ جو شدید داخلیت کے لیے ضروری ہیں لیکن وہ اس بگڑی ہوئی خارجیت کے بھی شکار نہیں جو فحاشی کی حدوں سے آگے نکل جاتی ہے۔

ان کے ہاں ایک رکھ رکھاؤ، اعتدال اور توازن ہے۔ جسے ان کے مزاج کی شگفتگی اور رنگینی نے حسین تر بنا دیا ہے۔ فراق گورکھپوری نے سودا کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔ "سودا کے کلام میں داخلیت کی چاشنی ہوتے ہوئے بھی خارجیت نمایاں ہے۔ لیکن اس کے یہاں داخلیت نے سوز و ساز اور درد و غم کا گہرا رنگ اختیار کرنے کی بجائے شگفتگی، البیلا پن، سرمستی، نشاط اور رنگینی اختیار کرلی ہے۔ کیونکہ جب داخلیت بجائے غم کے نشاط کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ تو نشاط کی فطری وسعت شاعر کے دل کو دنیا کی زنگارنگ بزم آرائیوں کی طرف لے جاتی ہے اور صحیح معنی میں خارجی شاعری کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے[۱]"۔ سودا کے کلام میں تڑپا دینے والی تاثیر نہیں ہے لیکن ان کے مضامین میں جدت و ندرت ہے۔ تنوع و نکتہ آفرینی ہے۔ شوخی اور شگفتگی ہے جس کا اثر زبان و بیان پر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ سودا کی شاعری صرف "درد و غم" کا بیان یا پردۂ سخن نہیں بلکہ وہ ہیئت پر بھی پوری توجہ صرف کرتے ہیں۔ اب سودا کے چند ایسے اشعار ملاحظہ فرمائیے جس میں انھوں نے غم عشق کا بیان کیا ہے:۔

جوں شمع تن ہوا شب ہجراں میں صرف اشک
پر جس قدر میں چاہوں تھا اتنا نہ رو سکا

نہ کھینچ اے شانہ ان زلفوں کو یاں سودا کا دل اٹکا
اسیر ناتواں ہے یہ نہ دے زنجیر کا جھٹکا

۱۔ فراق گورکھپوری، انداز ے، الہ آباد، ۱۹۵۶ء، ص ۲۲

داغ تجھ عشق کا جھمکے ہے مرے دل کے بیچ
مہر ذرہ میں درخشاں نہوا تھا سو ہوا

تاثیر عشق نے مزۂ درد کھو دیا
ان نے ندان دیکھ مرا حال رو دیا

بوسہ کے ذائقہ کو نہیں شہد وسم میں فرق
ہم پی گئے اسے ہمیں قسمت نے جو دیا

ہے طرفہ تمنّا کہ رہوں لب بہ لب اس کے
جس سے کہ کبھو بوسہ بہ پیغام نہ آیا

خبر لے وادی میں سوؔدا کی یوں سنا ہے آج
کہ ایک شوخ کسی بے گنہ کو مار آیا

سینے سے میں دعا کو لایا جو شب لبوں تک
کہنے لگی اجابت کیدھر خیال آیا

جب تیشہ کوہکن نے لیا ہاتھ تب یہ عشق
بولا کہ اپنی چھاتی پہ دھرنے کو سل بنا

ترے کوچے سے جو میں آپ کو چلتے دیکھا
جی کسی تن سے نہ اس طرح نکلتے دیکھا

ہے فکرِ وصل صبح تو اندوہ ہجر شام
اس روز و شب کے دھندے میں میں اب تو مر چلا

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں
یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

جب میں گیا اس کے تو اسے گھر میں نہ پایا
آیا وہ اگر میرے تو در خود نہ رہا میں

عجب قسمت ہماری ہے کہ جس کی شمع الفت سے
چراغ دل کیا روشن سو ہے داغ آشنائی کا

جو مذکور اس سے کرتا ہے مرا غم خوار رونے کا
تو کہتا ہے کہ چپ رہ ہے اسے آزار رونے کا

خونِ جگر شراب ترشح بہ چشم تر
ساغر مرا گرو نہیں ابر بہار کا

کیا کروں گا لے کے واعظ سے حوروں کے جام
ہوں میں ساغر کش کسی کی نرگس مخمور کا
کس قدر بنت العنب سے دل ہے سوداؔ کا بھرا
زخم نے دل کے نہ دیکھا منہ کبھی انگور کا

قطرۂ اشک ہوں پیارے مرے نظارے سے
کیوں خفا ہوتے ہو پل مارتے ڈھل جاؤں گا
چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہت گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

ظالم میں کہہ رہا کہ تو اس خوں سے درگذر
سوداؔ کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

سادگیٔ بیان

یہ ٹھیک ہے کہ سوداؔ کی غزل پر قصیدے کا رنگ ہے لیکن ان کے ایسے اشعار کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے جن میں سادگیٔ بیان کا اعجاز دکھایا گیا ہے۔ ان اشعار میں سوداؔ نے فارسی ترکیبوں اور فارسی اضافتوں سے دامن بچائے رکھا ہے۔ ان اشعار میں حسنِ بیان بھی ہے اور تاثیر بھی۔ ان کے ہاں سہلِ ممتنع نہیں ہے۔ لیکن اس سہل بیانی اور سادگیٔ بیان کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں۔ جس پر ہر شاعر کو قدرت نہیں ہوتی۔ یہ سلاست اور روانی آسانی سے پیدا نہیں ہوتی۔

حاضر ہے تیرے سامنے سودا اگر اس کو قتل
مجرم یہ سب طرح سے ہے پر یک نگاہ کا

دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفتِ جاں کو
خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

جگر ان کا ہے جو تجھ کو صنم کہہ یاد کرتے ہیں
میاں ہم تو مسلماں ہیں خدا بھی کہتے ڈرتے ہیں

یارو میں کیا عہد اسے مانیو تم سچ
پھر دل نہ کہیں دوں اگر اب کے رہے جی بچ

سوجھی تدبیر نہ تقدیر کو بہلانے کی
جب تجھے قتل پہ عاشق کے مچلتے دیکھا

سرشک چشم نہ تھا میں کہ اے فلک تو نے
نظر سے خلق کے گرتے نہ مجھ کو تھام لیا

تیرے کوچہ سے جو میں آپ کو چلتے دیکھا
جی کسی تن سے نہ اس طرح نکلتے دیکھا

جو عمل چاہیے کیجیے مرے دکھ دینے کا
وہ نہ کیجے کہ کہے کوئی سزاوار نہ تھا

پیار، و اشفاق و وفا مہر و محبت الطاف
دل کو جس روز لیا کون سا اقرار نہ تھا

غیروں کو دیکھ بیٹھے ہوئے بزم میں تری
جب کچھ نہ بس چلا تو میں ناچار اُٹھ گیا

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اس کے کوچے میں نہ چل ساتھ مرے اے سودا
آفت آجائے نہ اے یار کہیں میرے سر پر

سودا کا حال تو نے نہ دیکھا کہ کیا ہوا
آئینہ لے کے آپ کو دیکھے ہے تو ہنوز

ساقی گئی بہار رہی دل میں یہ ہوس
تو منتوں سے جام دے اور میں کہوں کہ بس

نہ دیکھا اس سوا۔ کچھ لطف اے صبح چمن تیرا
گل ادھر لے گئے گلچیں گئی روتی ادھر شبنم

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

چھوٹی بحروں میں شعر کہنا میر کا فن ہے۔ سودا نے بھی اس میں طبع آزمائی کی ہے اور جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے۔ وہ اکثر میر تک پہنچ جاتے ہیں۔ میر چھوٹی بحروں میں سادگی بیان سے کام لے کر شعر کو تیر و نشتر بنا دیتے ہیں۔ سودا نے بھی چھوٹی بحروں میں گفتگو ئے سادہ کی ہے۔ رہا سوال تاثیر کا تو وہ صرف میر کا حصّہ ہے۔

دیکھے بلبل جو یار کی صورت
پھر نہ دیکھے بہار کی صورت
برق دیکھی ہو جس نے سو جانے
مجھ دل بے قرار کی صورت

قاصد اشک آ کے خبر کر گیا
قتل کوئی دل کا نگر کر گیا
فائدہ اب کیا کرے تریاق وصل
زہر غم ہجر اثر کر گیا

دل میں ترے جو کوئی گھر کر گیا
سخت مہم تھی کہ وہ سر کر گیا
وہم غلط کار نے دل خوش کیا
کس پہ نجانے وہ نظر کر گیا

دیکھا جو ادھر خدا سے ڈر کر
دل خالی کیا میں آہ بھر کر

رنجش کا مرے نہ پوچھ باعث — آجانے دے یار در گذر کر

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں — ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں
نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے — سو اک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں

جب نظر اس کی آن پڑتی ہے — زندگی تب دھیان پڑتی ہے
جھیل لیتے ہیں عاشق اے فریاد — جس کے سر جیسی آن پڑتی ہے

دل کسی سے کہ جب پلٹتا ہے — دین و دنیا سے جی اچٹتا ہے
عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف — دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے

مشکل زمینیں سودا نے نئی نئی اور مشکل زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اپنی چابک دستی سے ان سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دیا ہے۔ انھیں الفاظ پر اتنی قدرت ہے کہ خارزار بھی گلستاں بن جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ زبان کی خارجیت اشعار کو سوز و گداز سے محروم کر دیتی ہے۔ سودا کی ایسی غزلوں میں محض قافیہ بندی ہوتے ہوئے بھی وہ خارجی فن کا مکمل نمونہ ہیں۔ ان زمینوں میں سے بیشتر سودا کی اپنی ایجاد ہیں۔ یہاں چند زمینیں اور ردیف قافیے پیش کیے جاتے ہیں جن سے سودا کے عظمتِ فن کا اندازہ ہوگا۔

ع ٹک خاک لیے تو چھوڑ کے غافل پلنگ و خواب

سنگ و خواب: بنگ و خواب، ننگ و خواب، شلنگ و خواب، لنگ و خواب۔

ع ہمیشہ سے مری چشم پر آب در تہ آب

حباب در تہ آب ، گلاب در تہ آب ، سراب در تہ آب ، خراب در تہ آب ، کباب در تہ آب ، آفتاب در تہ آب ، حجاب در تہ آب ، خوشاب در تہ آب

ع وہ ابہت ہے جو دے سر کو سنگ و خشت

زشت شکست ، کنشت شکست ، زشت شکست ، کشت شکست

ع فندقی انگشت کیا کر رہا ہے رنگ دست

اورنگ دست ، مرسنگ دست ، زیر سنگ دست ، ڈھنگ دست ، جنگ دست پاسنگ دست ، دنگ دست ۔

ع لاگے ہے کس کے منہ پہ بائیں زور پشت دست

مغرور پست دست ، دور ، بدستور ، پور ، مقدور ، نور ، منظور

ع ہستی کو تری بس ہے اک گل کی اشارت

بلبل ، مل ، تل ، کاکل ، پل ، سنبل ، قلقل

ع نامے کا اپنے چمن میں جو کروں ساز درست

آواز ، انداز ، اعجاز ، ناز ، طناز ، دغا باز ، خدا ساز

ع بنگ پی بنگ خیال اس کا ہے افلاک پرست

خاک ، ادراک ، تاک ، نتراک ، ہوسناک ، خاک ، مسواک ، بیباک

ع اشک کو کب ہے شناسائے گھر سے پیوند

نظر ، شجر ، سحر ، اثر ، دیدۂ تر ، جگر ، ہنر

ع کھینچ کر پوست کرے گردش ایام سفید

بادام ، انجام ، گل اندام ، سیہ فام ، شام ، نیگام

ع یہ اس کے رنگ عارض سے ہے دل بیتاب آتش پر

سیماب، آب، تیزاب، اسباب، شب تاب، سرخاب، شراب ناب گرداب، پیچ وتاب۔

ع کب لگ سکے اس سے کوئی رنگ اور نمک

نیرنگ، تنگ، سنگ، رنگ، جنگ، ڈھنگ، آہنگ، بنگ، گلرنگ۔

سودا کی مشکل زمینوں کی ان غزلوں میں بھی بیشتر اشعار ایسے ہیں جو صرف قافیہ بندی کے زمرے میں آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی زمینوں میں مضمون کی طرف شاعر کی توجہ بہت کم جاتی ہے۔

شمع رو کہنا اسے سودا ہے تاریکیٔ عقل
شمع کا عکس اس کے عارض پہ کلف ہے ماہ کا

سمور و قاقم و سنجاب سرما میں منعم کو
رکھیں ہیں آسرا غربا لے لیج و لنگ آتش کا

کر رکھا ہے کلس گنبد دستار اُسے
شیخ جی آپ ہیں کس مرتبہ مسواک پرست

جو دیکھے مرغ ہوا کو وہ دام میں تیرے
تو ہووے رشک سے ماہی کباب در تہ آب
گئی ہے سر سے گذر موج اشک آنکھوں کی
مجھے یہ سے گئی خانہ خراب در تہ آب

بے خوابی سے ہے میرے جو شاکی وہ شمع رو
یارو کہو یہ اس سے کہ ناداں پتنگ و خواب

دل طوطئ خط کو نہ دے اس شوخ کے سودا
کھاوے گا اس آئینے کو زنگارِ محبت

دامن ابر نچڑتا ہے جو اتنا شاید
کسو عاشق کے ہوا دیدۂ تر سے پیوند

فریب وعدہ کا شکوہ جو میں رو رو کے کرتا ہوں
تو میری سادہ لوحی پہ وہ ہنس دیتا ہے قہقہ کر

جز خط سبز عارض دلدار ہم نشیں
دیکھا ہے آپ نے یہ کبھو رنگ اور نمک

ہر مرغ کو پہچان کے نامے کو تو لینا
نامے کے کبوتر کا ہے میرے جگری رنگ

ایہام گوئی

سودا جب میدانِ ادب میں آئے ہیں تو ایہام گوئی متروک ہو چلی تھی اور اکثر شاعر اس غیر فطری صنعت سے متنفر ہو چکے تھے۔ شاہ حاتم ایہام گوئی سے توبہ کر چکے تھے۔ سودا جیسے ذہین انسان کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ بھی ایہام گوئی سے

انکار کر دیں۔ ان کا شعر ہے۔

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

تاہم سودا کے یاں بھی ایہام کی چند مثالیں مل جاتی ہیں۔ لیکن کلیاتِ سودا کی ضخامت کے پیشِ نظر ان مثالوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اگر سودا ایہام میں شعر کہتے ہیں تو انھیں یہ معذرت پیش کرنی پڑتی ہے۔

اسلوب شعر کہنے کا تیرا نہیں ہے یہ
مضمونِ آبرو کا ہے سودا یہ سلسلہ

چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں سودا نے ایہام سے کام لیا ہے۔

کس قدر بنت العنب سے دل ہے سودا کا برا
زخم نے دل کے نہ دیکھا منہ کبھی انگور کا

سودا غزل چمن میں تو ایسی ہی کہہ کے لا
گل پھاڑیں سن کے جیب کو، دیں بلبلیں صلا

حکاک کا پسر بھی مسیحا سے کم نہیں
فیروزہ ہو دے مردہ تو دیوے ہے وہ جلا

جب مست چمن سے ہو چلا گھر کو وہ لالا
غنچے نے صراحی لی اٹھا گل نے پیالا

انھوں نے ایک پوری غزل ایہام میں کہی ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے لالچی تو کیسہ غیروں کا مت ٹٹولے
جو کچھ تو چاہے یک شب مجھ پاس آ کے سو لے
وہ تو بیچی کا ہرگز ہم کو لکھے نہ نامہ
گدڑی میں جا کبوتر لیتا ہے مول گولے

اس غزل کے مقطع میں بھی سودا نے معذرت پیش کی ہے۔

ہو شاد اس غزل سے روح آبرو کی سودا
تو اس زمیں میں ناداں طور اپنا کیوں نہ بولے

مزاح اور ظرافت

سودا اُردو ہجو نگاری کے امام ہیں اور ابھی تک اردو ادب کی پوری تاریخ اس فن میں سودا کا جواب پیدا نہیں کر سکی۔ ان کی ہجو نگاری پر علیحدہ باب میں بحث کی جائے گی۔ یہاں صرف اس ظرافت کا جائزہ لینا مقصود ہے۔ جو اُن کی غزلوں میں بکھری ہوئی ہے۔

سودا فطری طور پر ہنسوڑ، زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ ان کا کلیات پڑھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے اردگرد ہونے والے واقعات اور حالات کا گہری نظر سے جائزہ لے رہا ہے۔ جہاں کہیں اسے بے جوڑ بے ڈھنگی، بے آہنگ اور مضحکہ خیز چیزیں نظر آتی ہیں۔ وہ ہنس دیتا ہے کبھی یہ ہنسی زیرِ لب ہوتی ہے اور کبھی قہقہہ بن جاتی ہے۔ سودا اپنے کمالِ فن سے ان واقعات کی تصویر اتار دیتے ہیں۔ اور اگر اصل واقعات میں کچھ کمی ہو تو وہ اپنے زورِ تخیل سے انھیں مکمل اور جامع بنا دیتے ہیں۔ اس

طرح ان کے ذاتی مشاہدات و تجربات تمام انسانوں کی ملکیت بن جاتے ہیں۔

بقول مولانا محمد حسین آزاد ان کے دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا وہ خود ہنستے تھے اور دوسروں کو ہنساتے تھے۔ اسی لیے ان کی غزلوں میں بھی ظرافت کا عنصر ہے۔

غزل میں جہاں کہیں ان کی رگِ ظرافت پھڑکی ہے۔ وہ متانت و سنجیدگی اور تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں آئے۔ ایک اچھے ظرافت نگار کی طرح اکثر و بیشتر وہ خود ہی اپنے نشتروں کا شکار بنتے ہیں۔ انھوں نے اپنی اور محبوب کی کمزوریوں کا اس طرح سے مضحکہ اُڑایا ہے کہ بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ یہ ظرافت اس عہد کے عاشق اور محبوب کے تعلقات کی مکمل تصویریں بھی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اس مصیبت سے تو مت مجھ کو نکال اب گھر سے
تو کہے آج ہی جا میں کہوں کل جاؤں گا

نواحی میں ترے کوچے کی ہے یہ حال سودا کا
کہ جوں چند آشیاں گم کر کے بستی میں پھرے بھٹکا

باتیں کرو عدو سے سودا کو گالیاں دو
قرباں ہوں آپ کی میں اس داو اور دہش کا

مجلس سے مجھ کو اٹھتے جلیسوں کے سامنے
عزت کبھو نہ دی یہ کہ پوچھے کدھر چلا

نکلا پڑے ہے جامہ سے کچھ ان دنوں رقیب
تھوڑے سے دم دلاسے میں کتنا اپھر چلا

مانگا جو میں دل کو تو کہا بس یہی اک دل
جتنے ہی تو چاہے مرے کوچے سے اُٹھا لا

دیکھتا ہوں میں تری بزم میں ہر ایک کا منہ
طلب رحم کی نظروں سے گنہگار کی طرح

نکالے ہے وہ بے رخ ہو کے اپنے گھر سے یوں مجھ کو
شہ شطرنج کو جس طرح کشتیں دیویں شہہ شہہ کر

ڈرتے ڈرتے جو ترے کوچے میں آجاتا ہوں
صیدِ خائف کی طرح رو بقضا جاتا ہوں

جب پیرِ مغاں سے جا میں دخترِ رز مانگی
بولا کہ سعادت ہے پر وہ ابھی بالی ہے

جو یوں لاٹھی دکھاتا ہوں تو دانت اپنے نکوسے ہر
رقیب آگے ترے دے ہے مجھے بندر کی سی گھڑکی

فارسی اور اُردو ادب میں شیخ و زاہد کی عیاری و مکاری پر بہت لے دے

رہی ہے۔ ان دونوں زبانوں کے طنز و ظرافت کا بیشتر حصّہ اس موضوع پر ہے۔ سوداؔ نے بہت دل چسپ انداز میں واعظ و شیخ کی گت بنائی ہے۔ اس موضوع پر پہلے بحث کی جاچکی ہے۔ یہاں چند شعر اور ملاحظہ فرمایئے۔

ہیچ ہیں دنیا تو ہم چھوڑیں گے لیکن زاہدا
چھوڑنا تیری طرح داڑھی کا مشکل ہوئے گا

ٹوٹا وضو شیخ تو جو رد کے ان کی نیند
اچٹی تو یہ کہا کہ صدائے تفنگ و خواب

واعظا دیکھیو بولا تو اگر سوداؔ سے
بے طرح کا ہے یہ کافر بت بیباک پرست

ڈروں ہوں میں نہ کریں رند تیری داڑھی کا
تبرکات میں داخل ہر ایک مو واعظ

ہزار شیشۂ مے اس میں تیں چھپائے ہیں
تری جو پگڑی ہے یہ صورتِ سبو واعظ

دیکھ زاہد کے سر عمامۂ نو
ہاتھ اٹھا رند بولے یا رزاق

شیخ صاحب کے عقد میں دنیا
آئی تھی کب جو دی انھوں نے طلاق

پھرے ہے شیخ یہ کہتا کہ میں دنیا سے منہ موڑا
الٰہی ان نے اب داڑھی سوا کس چیز کو چھوڑا

غزل کے بعض قطعات ظرافت کی مکمل تصویریں ہیں۔ جن میں سودا نے مضحکہ خیز واقعات پیش کیے ہیں اور ان واقعات کی ستم ظریفی کا اکثر شکار خود ہیں۔

سودا کو کہتے ہیں کہ ہے اس سے مصاحبت
کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا
اوروں کی نسبت ان دنوں کچھ لگ چلا تھا وہ
دو چار جھڑکیوں میں بدستور ہو گیا

ایک اور قطعہ میں سودا نے اُردو شاعری کی اس روایتی محفل کا مضحکہ اڑایا ہے جس میں محبوب اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے عاشق وہاں پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ ہی بے اعتنائی برتی جاتی ہے جو روایتی عاشق کی قسمت میں ہے۔ سودا کے قدرتِ بیان اور جزئیات نگاری نے اس قطعہ کو انتہائی دلچسپ بنا دیا ہے۔

ترغیب نہ کر مجھ کو واں چلنے کی اے سودا
اس یار نے اب ہم سے یہ چھل نکالی ہے
دار دمیں ہوا اس کے کل گھر میں تو یہ دیکھا
تیوری سے چڑھا صورت کچھ اور بنالی ہے

ہر بات پہ ہے میری اوروں سے اسے چشمک
مجھ پر وہ کنایہ ہے نوکر پہ جو گالی ہے
غیر اس کے اشارے سے جب کرنے لگے نوکیں
اُٹھائیں یہ کہہ کر تب یاں مرغ کی پالی ہے
ایک ان میں سے یوں بولا کیوں جاتے ہو تم بیٹھو
جاؤ گے تو یہ مجلس پھر لطف سے خالی ہے
اس شوخ نے یہ سُن کر بولا کہ خدا سے ڈر
سر پر سے بلا اپنی جوں توں کی میں ٹالی ہے
پس غور کر اے ناداں جس گھر میں یہ صحبت ہو
واں جا کے خوشی آنا یہ خام خیالی ہے

ایک اور قطعہ میں سودا نے ایک شیخ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ شیخ صاحب قسمت کے مارے ایک شام کو اتفاق سے میخانے سے گذرے۔ رندوں نے کس طرح ان کا استقبال کیا اور ان کی کیا گت بنائی سودا کی زبانی سنیے ؎

کوئے میخانہ سے ناگہ شام کو گذرے جو شیخ
کیا کہوں سودا جو رندوں نے سلوک ان سے کیا
کر سلام ان کو کہا جلدی سے لو یارو قدم
ہیں زِ قسمِ اولیا یا از قبیلِ انبیا
کوئی بولے تھا ملو منہ سے انھوں کی خاکِ پا
کوئی کہتا تھا کرو آنکھوں میں اپنے طوطیا
آخرِ کار اس جگہ کیا دیکھتا ہوں رات کو
وہ مقدّس صورت اور ایسے بزرگِ بے ریا

ڈھونڈتے جاتے ہیں پیچھے پیچھے عمامہ کو آپ
اک مرید آگے چلا جاتا ہے دکھلاتا دیا

قطعات

سوداؔ فارسی کے جن شاعروں سے متاثر تھے ان میں نظیری نیشاپوری کا بھی نام آتا ہے۔ نظیری کی طرح سوداؔ نے بھی اکثر قطعہ بند غزلیں کہی ہیں۔ ان کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ جزئیات پر ان کی گہری نظر رہتی تھی اور رہی سہی کسر وہ اپنے تخیل سے پوری کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض قطعات منظوم افسانچے بن گئے ہیں۔ اس قسم کے چند قطعات "ظرافت نگاری" کے تحت دیے جا چکے ہیں۔ چند اور ملاحظہ ہوں۔ ایک قطعہ میں سوداؔ نے اہلِ دنیا اور اہلِ چمن کا موازنہ کیا ہے۔ انھیں اہلِ چمن پر رشک آتا ہے۔ کیونکہ خدا نے زندگی کا پورا لطف ان کی قسمت میں لکھا ہے وہ کسی سے حسد کرتے ہیں اور نہ کوئی اُنسے۔ انھیں والئ شام بننے کی تمنّا ہے اور نہ والئ روم، نہ وہ ہوسِ جاہ ومنصب میں گرفتار اور نہ کوئی انھیں بخشش کرنے والا ہے۔ یہ اہلِ چمن کبھی تلاشِ دنیا میں مارے مارے نہیں پھرتے ان کی پوری زندگی عیش وعشرت کا مرقع ہے۔ صبح کو جب بلبل حسین نغمے سناتی ہے تو ہر ایک گل بہار سے اپنے حصّے کا جام لے لیتا ہے۔ اس قطعہ میں سوداؔ کی تمنا ردِّعمل ہے۔ اُن کے سیاسی وسماجی حالات کا۔ اب وہ قطعہ ملاحظہ ہو۔

معاشِ اہلِ چمن جائے رشک ہے سوداؔ
کہ زندگی کا انھوں نے مزا تمام لیا
کسی کا ان میں سے محسود ہے نہ والئ روم
حسد کسی کو نہ اس پر کہ جن نے شام لیا
کہیں نہ واسطے منصب کے ہیں یہ مجرائی
سلام کر کے کسو سے نہ لاکھ دام لیا

کبھو میں ان کو نہ دیکھا تلاشِ دنیا میں
کبھو نہ فکر و تردد سے کوئی کام لیا
ادھر شروع ہوا صبح نغمۂ بلبل
ادھر بہار سے ہر ایک گل نے جام لیا

ایک اور قطعہ ملاحظہ ہو، جس میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس قطعہ میں بھی بھرپور افسانویت ہے۔

پوچھا اک روز میں سودا سے کہ اے آوارہ
تیرے رہنے کا معین بھی مکاں ہے کہ نہیں
یک بیک ہو کے برآشفتہ لگا یوں کہنے
کچھ تجھے عقل سے بہرہ بھی میاں ہے کہ نہیں
دل کو جن کے ہے تعلق یہ مکاں کیا جانے
عدم و ہستی انھوں کے بگماں ہے کہ نہیں
دیکھا میں قصرِ فریدوں کے در اوپر اک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

اُردو میں اس قسم کی قطعہ بند غزلیں بہت کہی گئی ہیں۔ میر تقی میر کے یہاں بھی اس کی اچھی مثالیں موجود ہیں۔ لیکن سودا نے ان قطعات کو جس مقصد کے لیے استعمال کیا اور جس طرح اپنے مشاہدے اور تجربے سے انھیں مکمل تصویریں بنا دیا اس کی مثالیں اُردو شاعری میں بہت کم ملیں گی۔

عریانیت

سودا نے ہجو نگاری میں فحاشیت اور ابتذال کی انتہا کر دی ہے۔ جو ہجویں دہلی میں کہی گئی ہیں۔ ان میں سودا تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں گئے۔ ضاحک اور فاخر مکیں کی ہجویں اودھ میں کہی گئیں۔

اور انھیں دونوں کی ہجوؤں میں سب سے زیادہ فحاشیت ہے جس کا صاف مطلب ہے کہ اودھ کا ماحول اس فحاشیت کے لیے سازگار تھا۔ غزل میں سودا نے بہت کم فحش، عریاں اور مبتذل شعر کہے ہیں۔ اور وہ بھی انشا اور جرأت کی معاملہ بندی کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ اگرچہ اردو میں خارجیت کی ابتدا سودا سے ہوتی ہے لیکن سودا معاملہ بندی کی اس کیچڑ میں نہیں گرے جس نے بہت سے دامنوں کو خراب کیا۔ بلکہ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ سودا کے ہاں معاملہ بندی بہت کم ہے اور فحش اشعار کی تعداد حیرت انگیز طریقہ پر مختصر ہے اور اتنے اشعار خواجہ میر درد جیسے بزرگ کے دیوان میں بھی مل جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سودا کے ہاں غزل گوئی کے خاص معیار تھے اور انھوں نے غزل پر ہجو کا کوئی اثر نہیں پڑنے دیا۔ اس کے برعکس میر صرف غزل کے شاعر تھے۔ مگر ان کے ہاں فحش اشعار کی تعداد سودا کے اشعار سے کہیں زیادہ ہے۔

معاملہ بندی کے چند اشعار سنیے۔

ہوا جاتی رہی دعدول ہی میں تو شک نہالی کے
جو اب بھی سو رہو مل کر تو جاڑا ہے دو لائی ہیں

صورت ملی دد کی زباں کو کر دگے کیا
گو ہم سے تم نے صحبتِ شب کی چھپائی بات

پھولوں کی سیج پر جو نہ سوئے تو کیا ہوا
یہ عیش ہے کہ تو ہو بغل بیچ تنگ و خواب

آج تو مل گئے تنہا یہ کہو تو بارے
اب نہ ملنے کی مکافات کروں یا نہ کروں

اب چند اشعار ایسے ملاحظہ ہوں جن میں ہلکی سی فحاشی ہے۔ مگر ناگوار نہیں۔ سے

چٹکی اُٹھ کر میں تجھے رات کروں یا نہ کروں
حق خدمت بھی کچھ اثبات کروں یا نہ کروں

اُٹھ جانے میں ہے زور مزا یار سے لڑ کر
ملتے ہیں تو پھر چھاتی سے چھاتی کو رگڑ کر

واہ وا بے تمباکو والے کے
دے ہے تو دھا ہمیں دکھا کے گال

تمثیل نگاری اس فن میں سودا نے صائب کا تتبع کیا ہے۔ بقول شیخ چاند صائب نے یہ صنعت زیادہ تر اخلاقی اور حکیمانہ مضمون کے لیے استعمال کی ہے۔ لیکن سودا نے اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کے ساتھ ساتھ عاشقانہ مضامین میں بھی اس صنعت کا استعمال کیا ہے۔ اس صنعت میں پہلے ایک دعویٰ کیا جاتا ہے اور پھر ثبوت کے طور پر کوئی مثال پیش کی جاتی ہے۔ مثلاً سودا پہلے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر انسان کی فطرت ہی خراب ہو تو نیک لوگوں کی صحبت کیا اثر کر سکتی ہے اور مثال یہ دیتے ہیں کہ آبِ گہر سے کبھی رشتہ تر نہیں ہو سکتا۔ یا پہلے مصرع میں کہتے ہیں کہ روشن دل کبھی اپنی حد سے آگے نہیں بڑھتے اور پھر چراغ کی مثال

دیتے ہیں۔ جو کبھی اپنے سائے سے آگے نہیں بڑھتا۔

سودا کے عہد میں اُردو ابھی نوزائیدہ تھی۔ یہ سودا کی قادر الکلامی اور استادی کا کرشمہ ہے کہ انھوں نے بعض مشکل مضامین ادا کیے ہیں۔ اس صنعت میں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زینت دلیل مفلسی ہے ٹک کماں کو دیکھ
نقش و نگار چھٹ نہیں کچھ اس کے خانے میں

ہیں زمانے کی سخاوت کا نہیں ہرگز مقر
چھین کب لیتے ہیں کچھ دے کر کسی کو اہلِ جود

دل بے عشق کی دشمن ہے تحریک نفس ناصح
کرے ہے کام پتھر کا ہوا مینائے خالی سے

امن دو دل کو یک جا بہ بساطِ دوراں
چوٹ کھاتی نہیں وہ نرد جو ہو نرد کے ساتھ

خیال بندی

سودا کے لیے شاعری دردوغم کے اظہار کا ذریعہ نہیں تھی۔ بلکہ وہ شاعری کو ایک فن سمجھتے تھے۔ اسی لیے ان کے ہاں خارجیت ہے۔ ان کی غزل میں بے شک وہ تڑپا دینے والا اثر نہیں ہے جو داخلی شاعروں کی خصوصیت ہوتا ہے۔ لیکن غزل کی ہیئت کو جو کچھ انھوں نے دیا ہے، ان کے عہد کا کوئی شاعر نہیں دے سکا۔ خیال بندی اور مضمون آفرینی صرف ان شاعروں کے کلام میں ملتی ہے۔ جو دل

سے نہیں دماغ سے شاعری کرتے ہیں۔ جن کا مشاہدہ بہت وسیع ہوتا ہے اور جنھیں زبان و بیان پر پوری قدرت ہوتی ہے۔ یہ جادو دکھانے کا فن ہے۔ اس میں واردات قلبی، انسانی جذبات اور احساسات کی ترجمانی نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف شکوہِ الفاظ استعاروں اور تشبیہات کی مرصع کاری ہوتی ہے۔ معنی یابی اور مضمون آفرینی کے بارے میں محمد حسین آزاد نے بہت بچی تلی رائے دی ہے۔ وہ آب حیات میں لکھتے ہیں: "کلام کو رنگین اور استعارہ و تشبیہ سے بلند کر دکھانا آسان ہے۔ مگر زبان اور روزمرہ کے محاورے میں صاف صاف مطلب اس طرح ادا کرنا جس سے سننے والے کے دل پر اثر ہو یہ بات بہت مشکل ہے۔ شیخ سعدی کی گلستاں کچھ چھپی ہوئی نہیں ہے نہ اس میں نازک خیالات ہیں نہ کچھ اعلیٰ مضامین ہیں، نہ پیچیدہ تشبیہیں ہیں نہ استعارہ در استعارہ فقرے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں، صاف صاف باتیں ہیں۔ اس پر آج تک اس کا جواب نہیں۔ مینا بازار اور پنج رقعہ کے انداز میں صدہا کتابیں موجود ہیں۔ اس معاملے میں غور کے بعد یہ معلوم ہوا کہ جو بزرگ خیال بندی اور نازک خیالی کے چمن میں ہوا کھاتے ہیں اوّل ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسے نئے مضامین نکالیں جو اب تک کسی نے نہ باندھے ہوں لیکن جب متقدمین کے اشعار سے کوئی بات بچی ہوئی نہیں دیکھتے تو ناچار انھیں کے مضامین میں موشگافیاں کرتے ہیں۔ اور ایسی ایسی لطافتیں اور نزاکتیں نکالتے ہیں کہ غور سے خیال کریں تو نہایت لطف حاصل ہوتا ہے۔[۱]"

فارسی میں ناصر علی، غنی اور بیدل کے کلام کو اور اُردو میں ناسخ کی پوری

۱۔ آبِ حیات، ص ص ۳۹۰۔۳۹۱

شاعری کو اس معنی یابی اور مضمون آفرینی نے ڈبویا۔ سودا کے ہاں خیال بندی فارسی شاعروں اور خاص طور پر بیدل کے اثر سے آئی۔ ان کی ہمہ گیر طبیعت نے یہ اثر ضرور قبول کیا۔ مگر بہت معمولی۔ اس لیے ان کے ہاں اس قسم اشعار کی تعداد غزلوں میں بہت محدود ہے۔ البتہ قصائد میں نسبتاً زیادہ ہے اور درحقیقت خیال بندی قصائد ہی کے لیے موزوں بھی ہے۔ اب چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رطوبت داغ دل میری کی ہے گرداب آتش کا
فسونِ عشق نے زہرہ کیا ہے آب آتش کا

قطرہ گرا تھا جو کہ مرے اشکِ گرم سے
دریا میں ہے ہنوز پھپھولا حباب کا

گل مرے مشہد پہ کب بھیجے ہے وہ ابرو کماں
طرح غنچہ کے کھلے جب تک نہ پیکاں تیر کا

بسانِ طائرِ رنگِ حنا قدم لے کر
ہر ایک کبک نے پیارے ترا خرام لیا

دیکھا میں جب گلے میں تیرے ہار دست غیر
تارِ نگہ میں اشک کا دانہ پرو دیا

لبِ لعلِ بتاں پر سرخیٔ پاں ہو کہ جادو ہے
بنا دی شکل طوطی صورتِ سرخاب آتش پر

گر نہو بانیٔ دل اس کا خوف سے اے شعلہ خو
لگ اٹھے تیری نگاہِ گرم سے درپن میں آگ

یہ نہیں دریا کہ جس سے گذرے تو پل باندھ کر
موجِ چشمِ عاشقاں دے توڑ پل میں پُل کے پُل

اُڑ لگتی ہے جلوے پہ حسینوں کے مری آنکھ
دید اُن کی سے پہنچے ہے بہم بال و پرِ چشم

بمعنی آشنا مینائے مے ہے پر ز خاموشی
برائے ہرزہ گو گفتار لاطائل ہے شیشے میں

طائرِ رنگِ حنا کی نمط اب اے صیاد
ہوں تو میں ہاتھ میں تیرے پہ اڑا جاتا ہوں

خیالِ پنجۂ مژگاں میں یہ احوال ہے دل کا
کہ جیسے صید کو شاہیں کا چنگل مسلتا ہے

شمع رو کہنا اُسے سودا ہے تاریکیٔ عقل
شمع کا عکس اس کے عارض پر کلف ہی ماہ کا

حسنِ تعلیل اس صنعت میں پہلے شاعر کوئی واقعہ یا حقیقت بیان کرتا ہے اور اس واقعے کے ظہور پذیر ہونے کی جو علت پیش کرتا ہے وہ صرف اس کے ذہن کی پیداوار ہوتی ہے۔ مثلاً پہلے مصرع میں شاعر اپنے محبوب کو خطاب کرکے کہتا ہے۔ رات تو بے نقاب پھرتا ہے اور دوسرے مصرع میں اس دعوے کی دلیل پیش کرتا ہے کہ جبھی تو سورج شرم کے مارے پانی میں جا چھپتا ہے۔ حالاں کہ رات کو سورج کے چھپنے کے وجوہ کچھ اور ہیں۔ سودا کو یہ صنعت بہت پسند تھی اس لیے ان کے کلام میں حُسنِ تعلیل کی بہت مثالیں ملتی ہیں۔

چمن نہ تنہا جنھوں کے غم سے ہنوز چھاتی پہ کھائے ہی گل
رکھے ہے اب تک ہزار جا سے روش بھی سینہ فگار اپنا

دلیل ہے تری شب بے نقاب پھرنے کی
چھپے ہے شرم سے جا آفتاب در تہ آب

تارے یہ نہ سمجھو بہ شبِ تار فلک پر
پہنچی ہے مری آہِ شرر بار فلک پر

تنہا نہ شمع روئے ہے سودا کی خاک پر
گل بھی تو لوٹتا ہے گریباں کو پھاڑ پھاڑ

تنبم کرے ہے دامن گل شست و شو ہنوز
بلبل کے خون کا نہ گیا رنگ و بو ہنوز

کلیوں نے دیکھ شوخیٔ گل چیں کو اس قدر
اتنا لہو پیا کہ ہے پر خوں دہن ہنوز

کس کے ہیں زیر زمیں دیدۂ نم ناک ہنوز
جا بجا سوت ہیں پانی کے تہ خاک ہنوز

یاقوت نہیں ہے وہ ترے لعل سے اے شوخ
جا ڈوبی ہے یہ آب میں ہو کر خجل آتش

کہکشاں ہے نام کو لیکن مرے احوال پر
آسماں روتا ہے منہ پہ دھر کے ہر شب آستیں

شب نہ تنہا بے قراری سے مجھی کو کام ہے
نور شمع اس شوخ بن جوں برق بے آرام ہے

لالۂ خود رو نہیں ہے خون نے فرہاد کے
جوش میں آکر لگا دی کوہ کے دامن میں آگ

تشبیہات و استعارات

سوداؔ نے تشبیہوں اور استعاروں کو بھی اظہارِ بیان کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ تشبیہوں کے سہارے سے ایک مفہوم ادا کرتے ہیں۔ ایک مفہوم کے سہارے تشبیہ کا استعمال نہیں کرتے۔ اسی لیے ان کی تشبیہیں بہت سادہ اور پرکار ہوتی ہیں جن کی بنیاد ان کے تجربات اور مشاہدات پر ہوتی ہے سوداؔ تشبیہ کی مدد سے بے جان الفاظ میں روح ڈال کر ایک جاندار تصویر بنا دیتے ہیں۔ محبوب کی نازک اندامی کے لیے اس سے بہتر تشبیہ نہیں ہو سکتی کہ جب محبوب کو پسینہ آتا ہے تو اس کے جسم پر ایسے خراش آجاتے ہیں جیسے موم پگھلنے سے شمع پر۔

نازک اندامی کروں کیا اس کی اے سوداؔ بیاں
شمع ساں جس کے بدن پر ہو پسینے کا خراش

شاعر محبوب کی گلی سے بغیر آواز پیدا کیے دبے پاؤں آہستہ آہستہ گزرتا ہے تاکہ کسی کو خبر نہ ہو۔ اس کی اپنی کوئی منزل اور جائے قیام نہیں ہے جس طرف راستہ ملتا ہے وہ بڑھ جاتا ہے۔ دیکھیے سوداؔ نے اس کیفیت کو کیسی تشبیہ کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

تری گلی سے گذرتا ہوں اس طرح ظالم
کہ جیسے ریت سے پانی کی دھار گذرے ہے

سوداؔ نے ان تشبیہات کے بیان میں زندگی کے عام تجربات اور مشاہدات سے بھی کام لیا ہے۔ جب لشکر روانہ ہونے کے لیے تیاری کرتا ہے تو ہر طرف گرد اٹھتی ہیں۔ سوداؔ اس تشبیہ کا بڑا برجستہ استعمال کرتے ہیں۔

کوچ شاہِ حسن کا ہے وہ غبار خط نشاں
گرد لشکر سے اٹھی وقتِ سواری بیشتر

یہ حقیقت ہے کہ تشبیہوں نے بعض اشعار کو بے مزہ اور پھیکا بھی کر دیا ہے۔ تو یہ سودا کی غزل کی عام خصوصیت ہے۔ چند تشبیہیں اور استعارے اور ملاحظہ فرمائیے۔

بخشے ہے یوں دل کو میرے تقویت دشنام یار
جوں دوائے تلخ سے پاوے کوئی بیمار فیض

دیکھوں ہوں یوں میں اس ستم ایجاد کیطرف
جوں صید وقت ذبح کے صیاد کیطرف

تجھ بن اعضا کا ہے یہ میرے حال
تارِ شیرازہ بن ہوں جوں اوراق

ٹکڑے تو ابھی لعل کے دل بیچ دھرے ہیں
ہم نے تو ابھی موتی ہی آنکھوں میں بھرے ہیں

جن نے نہ دیکھی ہو شفقِ صبح کی بہار
آکر ترے شہید کو دیکھے کفن کے بیچ

حلقہ میں اس کی زلف کے عارض پہ کر نظر
جوں شب میں رہ گیا ہو گرہ کھا کے نورِ صبح

بزم میں وہ شمع رو یارب کرے گا کب ورود
یوں ہوں آتش زیر پا جس طرح سے مجمر میں عود

دُرآویزہ اس کی زلف اور رخسار سے باہم
جھمکتا ہے برنگِ گوہرِ شب تاب آتش پر

قصیدہ نگاری

موضوع کے اعتبار سے قصیدے کا دامن بہت وسیع ہے، اس میں مدح ستائش اور ہجو کے علاوہ مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی جا سکتی ہے، مثلاً مناظر قدرت، مظاہر فطرت، پند و نصائح، مذہبی خیالات، معاشی بدحالی، سیاسی انتشار موسم کی کیفیت، مختلف علوم کا بیان وغیرہ بھی قصیدے کے موضوعات ہیں۔ شہر آشوب بھی قصیدے ہی کا ایک انداز ہے۔

قصیدے کی ابتدا عربی زبان سے ہوئی، بقول شبلی:

"ایران میں جس زمانے میں شاعری کا آغاز ہوا، عرب کی شاعری مدحیہ قصائد پر محدود تھی، اس لیے ایرانی شعراء نے بھی انہی کی تقلید کی۔ اس کے ساتھ صلہ اور انعام کی توقع صرف قصیدہ سے ہو سکتی تھی۔ یہ اسباب تھے کہ ایران نے سب سے پہلے قصیدہ گوئی سے ابتدا کی[1]۔"

دکنی اُردو میں آغاز ہی سے قصیدے ملتے ہیں۔ بہمنی دور میں نظامی، بیدار، مشتاق، لطفی، عادل شاہی دور میں عبدل، قطب رازی، کمال خاں رستمی، ملک خوشنود، نصرتی اعلیٰ اور ایاغی۔ قطب شاہی عہد میں

۱۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، ۵، ۱۹۲۴، ص ۱

غواصی، طبعی اور بعد کے شاعروں میں بحری، نوری، ضعیفی اور ولی اورنگ آبادی وغیرہ نے بھی قصیدہ نگاری کے اچھے نمونے چھوڑے ہیں[1]

اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے قصیدے کے چار حصّے ہوتے ہیں۔ پہلے حصّے کو تشبیب کہا جاتا ہے، بقول شبلی "عرب میں مدحیہ قصائد کا یہ انداز تھا کہ تمہید میں عشقیہ اشعار ہوتے تھے، جن کو تشبیب کہتے ہیں[2]" اہلِ ایران نے صرف عشقیہ مضامین کی پابندی نہیں رکھی بلکہ طرح طرح کے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ عام طور پر نصائح، مذہبی خیالات، صبر اور قناعت، خودداری، انسانی عظمت، دنیا کی بے ثباتی و ناپائیداری، شاعرانہ تعلی، ہم عصروں پر طعن و تعریض، معاشی بدحالی وغیرہ جیسے مضامین باندھے جانے لگے۔ تشبیب کے بعد گریز ہوتا ہے، یعنی شاعر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اصل موضوع کی طرف آتا ہے، پھر مدح شروع ہوتی ہے، اور دعا پر قصیدے کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اُردو میں بھی عام طور پر انھیں اجزائے ترکیبی کو برقرار رکھا گیا۔

سودا کے معاصرین نے بھی قصیدے کہے ہیں مگر انھیں دیکھ کر یہ اندازہ

۱- جلال الدین احمد جعفری کا تحقیق ہے:

"کہ اس عہد کے شعرا میں ہاشمی، نصرتی، وجہی وغیرہ اور بعض سلاطینِ قطب شاہی کا پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں نے سخن گستری کے میدانوں میں اپنی اپنی جولانیاں دکھائی ہیں لیکن ان سب کے ذخائر کلام میں مثنوی، مفردات، قطعات اور مراثی کے سوا قصائد کا وجود اس وقت متحقق نہیں ہے۔"

جلال الدین احمد جعفری، تاریخ قصائدِ اُردو، الہ آباد، ص ۱۴

۲- شعر العجم، ۵، ص ۱

ہوتا ہے کہ ابھی اردو زبان قصیدے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔[1] سوداؔ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے قصیدہ نگاری کو باقاعدہ فن کی حیثیت سے انتہائی بلندی پر پہنچایا۔ سوداؔ کے بعد اردو ادب کی تاریخ میں صرف ذوقؔ وہ شاعر ہیں جنھیں دوسرا بڑا قصیدہ گو کہا جا سکتا ہے۔ لیکن قصائدِ ذوقؔ میں وہ تنوع، نیرنگی قدرتِ اظہار اور وہ پُرشور اندازِ بیان نہیں ہے جو اچھے قصیدے کیلیے لازم ہے اور یہی وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے سوداؔ کو انفرادیت بخشی ہے۔ قصیدے کا اندازِ بیان دوسرے اصنافِ سخن سے مختلف ہوتا ہے۔ مضمون آفرینی، جوشِ بیان، پختگی کلام، مشکل زمینیں، شکوہِ الفاظ، روانی و سلاست اور جدّتِ ادا وغیرہ قصیدے کی خصوصیات ہیں۔ سودا کے قصائد میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ قصیدے کے لیے خارجیت بہت ضروری ہے۔ سودا کے عہد میں دلّی کے تقریباً تمام شاعر دل کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ سوداؔ پہلے شاعر ہیں جو اپنے اندر کی دنیا سے نکل کر باہر آئے ہیں۔

مولانا سید علی طبا طبائی نے میر کے متعلق لکھا ہے کہ وہ قصیدہ کہنا نہیں جانتے تھے۔[2] طبا طبائی کا جواب دیتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی نے میر اور سوداؔ کی قصیدہ نگاری کا موازنہ کیا ہے۔ میرؔ اور سوداؔ نے ایک ہی زمین میں قصیدہ کہا ہے۔ دونوں نے قصیدے میں بہاریہ تشبیبیں لکھی

۱۔ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی لکھتے ہیں: "متقدمین کے دور میں ہمیں کوئی قابل ذکر قصیدہ نگار نہیں ملتا۔ اس دور میں زیادہ سے زیادہ ولیؔ کے قصائد پیش کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن انھیں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہے۔" نگار اصناف سخن نمبر، جنوری فروری ۱۹۵۷ء، ص ۵۰

۲۔ شرح دیوان غالب ص ۹۳ — بحوالہ شعر الہند، ۱، ص ص ۶۷۔ ۷۰

ہیں۔ مولانا نے ثابت کیا ہے کہ میر کی تشبیب کے مقابلے میں سودا کی تشبیب کچھ بھی نہیں ہے[1]۔ اس موازنہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں :

"مولوی عبدالسلام ندوی نے نہ پورے قصیدہ اور پوری تشبیب کو سامنے رکھا اور نہ ان اصولوں کو جو اس زمانہ میں قصیدہ کا معیار تھے، محض چار شعروں کو لے کر سودا کے خلاف اور میر کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ یہ طریقۂ بحث، آئینِ انتقاد کے منافی ہے۔ میر پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے، اس لیے انھوں نے قصیدے بھی لکھے، لیکن فن کے لحاظ سے ان کے قصائد سودا و ذوق کے ہم رتبہ نہیں ہو سکے[2]"

اُردو کے تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے سودا کو امامِ فن مانا ہے، بعض لوگ سودا کو بنیادی طور سے قصیدہ گو مانتے تھے اور ان کے قصیدے کو غزل پر ترجیح دیتے تھے۔ خود سودا نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ سودا کا قصیدہ ہے خوب
ان کی خدمت میں لیے، میں یہ غزل جاؤں گا

شیفتہ نے بھی گلشن بے خار میں لکھا ہے :

"عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ اس کا (سودا) قصیدہ غزل سے بہتر ہے، مہمل بات ہے۔ فقیر کے خیال سے اس کی غزل قصیدے سے بہتر ہے اور قصیدہ غزل سے[3]" (فارسی سے ترجمہ)

۱۔ عبدالسلام ندوی، شعرالہند، ۱، اعظم گڑھ، ۱۹۴۹ء، ص ص ۶۷۔ ۷۰

۲۔ میر تقی میر، ص ۴۱۸

۳۔ گلشن بے خار، ص ۱۰۰

صاحبِ طورِ کلیم نے بھی شیفتہ کے الفاظ دہرائے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ معدودے چند کو چھوڑ کر سب تذکرہ نگاروں نے سوؔدا کی قصیدہ نگاری اور ہجو گوئی کو ان کی باقی تمام شاعری پر ترجیح دی ہے!

سوؔدا نے اپنے فن کی بنیاد فارسی قصیدہ نگاری کی روایات پر رکھی ہے بلکہ ان کے بعض قصیدے فارسی کے مشہور شاعروں کی زمینوں میں ہیں

۱۔ سوؔدا کے فنِ قصیدہ نگاری کے متعلق رائیں نقل کی جاتی ہیں۔ مصحفی لکھتے ہیں: "اگر در علو مراتب معانی ابیات قصیدہ خاقانی گویم روا۔ نقاش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ اوست حالا ہر کہ گوید پیرو و تتبعش خواہد بود" (تذکرہ ہندی، ص ۱۲۵) میر حسن لکھتے ہیں: "در قصیدہ و ہجو ید بیضا دارد، قصائد عذب و دل آویز و بیان ہجو بلند" (تذکرہ میر حسن، ص ص ۸۲-۸۳) عاشقی کی رائے ہے: "جمیع ریختہ گویانِ ہند وے را امام فن و پیغمبر سخن می دانستند۔ اگرچہ جملہ طرز کلام استادی بود حاوی الا در مدح و قدح کہ مراد از ہجو و قصیدہ اعجاز بکار بردہ، و قصائد ریختہ بر قصائد ملا عرفی شیرازی پہلو بہ پہلو گفتہ" (نشترِ عشق، ص ۶۶۵) صاحب تکملۃ الشعرا قصیدہ گوئی میں انھیں بے مثل اور بے بدل بتاتے ہیں۔ "خصوصاً در قصیدہ گوئی بے مثل و بے بدل بود" (تکملۃ الشعرا ص ۲۹۶) نقش علی کا بیان ہے۔ "خصوصاً در مدح و ہجا گوئی یکتا است" (باغ معانی، ورق ۶۲ ب) شاہ حمزہ کا خیال ہے: "علی الخصوص در قصیدہ گوئی بازوے سحر سامری می کشد، و قصائدش با قصائد عرفی پہلو می زند" (فص الکلمات، ورق ۴۱۷ ب) مبتلا لکھتے ہیں: "عجوبۂ زماں و سرخیلِ ریختہ گویان ہندوستاں بود۔ در جمیع فنون نظم خاصہ در قصائد دقت بسیار بکار بردہ" (گلشن سخن ورق ۵۶ ب) سحر لکھنوی لکھتے ہیں: "در قصیدہ گوئی عرفی عہد و در غزل نظیریٔ وقت خویش بودہ" (بہار بے خزاں، ص ۸۵) آزردہ لکھتے ہیں: "در شاعری فیہا در قصیدہ گوئی و ہجا بزبان ریختہ گوئی بہ منزلتے رسیدہ کہ بالا بر ازاں ممکن نیست" (تذکرۂ آزردہ، ص ۲۸)

مثلاً

اُڈھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

اسی زمین میں انوری کا بھی مشہور قصیدہ ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

جرم خورشید چو از حوت در آید بہ حمل
اشہب روز کند ادہم شب را ارجل

عرفی کا بھی ایک قصیدہ اسی زمین میں ہے۔

چہرہ پرداز جہاں رخت کشد چوں بہ حمل
شب شود نیم رخ و روز شود مستقبل

بلکہ اس زمین کے قصیدے میں سودا نے عرفی کا ایک مصرع بھی تضمین کیا ہے۔

تا کجا شرح کروں میں کہ بقول عرفی
اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل

خاقانی کے ایک قصیدے کا مطلع ہے۔

نثار اشکِ من ہر شب شکر ریز است پنہانی
کہ ہمت را زنا شوئست بازانو وپیشانی

اسی زمین میں سودا نے آنحضرتؐ کی شان میں ایک قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع ہے۔

ہوا جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے، زنار تسبیحِ سلیمانی

خاقانی کا ایک اور قصیدہ ہے۔

ایں کز جہاں علامت انصاف شد نہاں
اے دل کرانہ کن زمیاں خانۂ جہاں

سودا کا سجع ہے۔

منکر خدا سے کیوں نہ حکیموں کی ہو زباں
جب شہرہ سے مرے ہو ہلا اس قدر جہاں

بعض تذکرہ نگاروں نے رائے دی ہے کہ سودا کے قصائد عرفی، خاقانی اور انوری کے پہلو بہ پہلو ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ سودا اکثر میدانوں میں فارسی قصیدہ گو شعرا سے آگے نکل گئے ہیں، مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

"اوّل قصائد کا کہنا اور پھر اس دھوم دھام سے اعلیٰ درجۂ فصاحت و بلاغت پر پہنچانا ان کا پہلا فخر ہے۔ وہ اس میدان میں فارسی کے نامی شہسواروں کے ساتھ عناں درعناں ہی نہیں گئے بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے ہیں، ان کے کلام کا زور و شور انوری اور خاقانی کو دبا جاتا ہے اور نزاکت مضمون میں عرفی و ظہوری کو شرماتا ہے[1]"

یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ سودا نے فارسی قصیدہ گو شعرا کو بہت پیچھے چھوڑ دیا، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سودا اردو قصیدہ نگاروں کے امام ہیں۔

سودا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علیؑ، حضرت امام کاظمؑ، حضرت امام ضامن، حضرت امام عسکریؑ، حضرت امام مہدیؑ، حضرت فاطمہؑ

۱۔ آب حیات، ص ص ۱۵۲۔۱۵۳

حضرت امام زین العابدینؑ، حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ، حضرت امام باقرؑ، حضرت امام جعفر صادقؑ اور حضرت امام تقیؑ کی مدح میں لکھے ہیں۔ باقی قصائد میں سودا نے عالمگیر ثانی، شاہ عالم، غازی الدین خاں وزیر آصف جاہ، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، حکیم میر محمد کاظم، سرفراز الدولہ حسن رضا خاں، نواب سیف الدولہ احمد علی خاں، بسنت خاں خواجہ سرا، نواب مہرباں خاں رند، نواب عماد الملک کی مدح کی ہے۔ ایک فارسی قصیدہ در تعریف مسجد نو بھی کلیات میں شامل ہے۔

اب قصائد سودا کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔

مطلع: عام طور پر مطلع کی خوبی یا خرابی قصیدے کے باقی اشعار کا پتا دیتی ہے، اس لیے قصیدہ نگار کوشش کرتا ہے کہ جدتِ خیال اور جدتِ بیان سے ایسی ندرت اور شگفتگی پیدا کر دے کہ سننے والا اور پڑھنے والا چونک جائے اور اس کی تمام تر توجہ قصیدے کی طرف مبذول ہو جائے۔ سودا نے اس کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ ان کے اکثر مطلعے اس فن کا بہترین نمونہ ہیں حضرت امام مہدیؑ کی مدح میں قصیدے کا مطلع ہے۔

جوں غنچہ آسماں نے مجھے بہرِ عرضِ حال
دیں سو زباں دہن میں ولیکن سبھی ہیں لال

اس قصیدے کا مطلع ثانی ہے۔

چاہے اگر کوئی دو جہاں کا متاع و مال
تیرے گدائے در سے کرے آ کے وہ سوال

سرفراز الدولہ کی مدح میں جو قصیدہ ہے، اس کے مطلع میں جدت نے عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔

صباح عید ہے ، اور یہ سخن ہے شہرۂ عام
حلال دختر رز بے نکاح و روزہ حرام

حضرت فاطمہؓ کی مدح میں ایک قصیدے کا مطلع ہے۔

مکھڑے سے اپنے زلف کے پردے کو تو اٹھا
ابر سیہ میں ماہِ درخشاں کو مت چھپا

ایک اور مطلع ہے۔

ہووے جو قطرہ ریز یہ چشمِ تر آب میں
پیدا ہو پھر بجائے گہر اخگر آب میں

چند مطلعے اور ملاحظہ ہوں۔

ہوا جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

چہرہ مہروش ہے ایک سنبل مشک فام دو
حسن بتاں کے دور میں ہے سحر ایک شام دو

یار و مہتاب و گل و شمع بہم چاروں ایک
ہیں اکتاں، بلبل و پروانہ بہم چاروں ایک

ایک مطلع میں فاخر مکیںؔ کے استاد اکسیرؔ پر کس انداز میں چوٹ کی ہے۔

مستغنی ذاتی نہ ہو ہوس کی ہو تسخیر
معدن ہے جہاں سونے کا واں خاک ہی اکسیر

تشبیب | جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ہے کہ تشبیب قصیدے کی تمہید ہوتی ہے۔

اکثر و بیشتر تشبیب کا مدح سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، چونکہ اس میں ہر طرح کے موضوعات کی گنجائش ہے، اس لیے شعرا کو اپنی علمیت، قابلیت کے اظہار اور قادر الکلامی کے جوہر دکھانے کا پورا موقع ملتا ہے. سودا کی بیشتر تشبیبیں بہت دل چسپ ہیں، بعض میں جدتِ فکر اور ندرتِ بیان نے تشبیب کو فن قصیدہ گوئی کا بہترین نمونہ بنا دیا ہے۔ سودا نے بھی ان تمام موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے جو فارسی قصیدوں میں موجود تھے ایک نعت کی تشبیب میں وہ قناعت کی تلقین کرتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ اگر انسان اپنے میں کوئی ہنر پیدا کرے تو پھر اسے دنیاوی جاہ و جلال کی ضرورت نہیں، دولت جمع کرنے سے پریشانیٔ خاطر کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ہوا جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیحِ سلیمانی
ہنر پیدا کر اول، ترک کیجو تب لباس اپنا
نہ ہو جوں تیغ بے جوہر دگر نہ ننگِ عریانی
فراہم زر کا کرنا باعثِ اندوہِ دل ہووے
نہیں کچھ جمع سے غنچہ کو حاصل جز پریشانی
خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہلِ دولت کی
نہ جھاڑے آستینِ کہکشاں شاہوں کی پیشانی
کرے ہے کلفت ایام ضائع قدر مردوں کی
ہوئی جب تیغ زنگ آلودہ کم جاتی ہے پہچانی

ایک منقبت کے تشبیب کے اشعار ہیں۔

اگر عدم سے نہ ہو ساتھ فکر روزی کا
تو آب و دانہ کو لے کر گہر نہ ہو پیدا
نہیں ہیں طالب رزق آسمان سے کہ مجھے
یقیں ہے کاسۂ واژوں میں کچھ نہیں ہوتا
نکل وطن سے ہے غربت میں زور کیفیت
کہ آب بحت ہے جب تک ہے تاک میں صہبا
ہنر کو مفلسی ہرگز ضرر نہیں کہ نہیں
چنار کو تہی دستی سے نقص جوہر کا

تشبیب کا ایک خاص موضوع موسم بہار ہے۔ سوؔدا کے صرف ایک قصیدے کی تشبیب بہاریہ ہے، جس میں اکتیس اشعار میں موسم بہار کی عکاسی کی گئی ہے۔ زورِ بیان، تشبیہات، استعارات اور جدّت تخیل نے بہت سے اشعار کو انتہائی دل چسپ بنا دیا ہے، لیکن بعض اشعار میں یہی خصوصیات اعتدال سے گزر کر عیب بن گئی ہیں، اس تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سجدۂ شکر میں ہے شاخ ثمردار ہر ایک
دیکھ کر باغ جہاں میں کرم عزوجل
واسطے خلوت نوروز کے ہر باغ کے بیچ
آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل
تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل
بار سے آبِ رواں عکس ہجوم گل کے
لوٹے ہے سبزہ پہ از بسکہ ہوا ہے بے کل

آب جو گردِ چمن لمعۂ خورشید سے ہے
خطِ گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول
لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم
پانوں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل
سایۂ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر
ساغرِ لعل میں جوں کیجیے زمرد کو حل

اس بہاریہ تشبیب کے ایسے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں، جن میں مبالغہ آرائی کی وجہ سے عیب پیدا ہو گیا ہے، جن کا بہار کی عکاسی سے کوئی تعلق نہیں اور جو صرف ذہنی مشق کی مثال ہیں۔ یہ اشعار ہم کو بالکل متاثر نہیں کرتے۔

شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہونچی ہے
شمع ساں گرمیٔ نظارہ سے جاتی ہے پگل
جوشِ روئیدگیٔ خاک سے کچھ دور نہیں
شاخ میں گاوِ زمیں کے ہے جو پھوٹے کونپل
فیض تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے
شہد ٹپکے جو لگے نشترِ زنبورِ عسل
کشت کرتے ہیں ہر ایک تخم سے از فیض ہوا
گرتے گرتے بہ زمیں برگ و بر آتا ہے نکل
سبز فام ان دنوں آتا ہے نظر ہر گلرد
خواہ ہو شیخ پسر خواہ ہو فرزند مغل

سوداؔ نے بعض تشبیہوں میں تعلّی بھی کی ہے۔ ایک منقبت کی تشبیب میں

اپنے فن کی تعریف کی ہے اور ایک ایسے شاعر کو بُرا بھلا کہا ہے جس نے ان پر سرقہ کا الزام لگایا تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

نام آوری کے واسطے حاسد نہ کر تلاش
جا گہ کسی کے نام کو اس عہد میں کہاں
گر یاں کہے تو ریختہ ایراں میں فارسی
چاہے جگہ جو شہرہ کو ہو تو نہ یہاں نہ وہاں
عالم کی السنہ پہ مرا اس قدر ہے شعر
گویا ورق بیاض کا ہر منہ میں ہے زباں
میں نے سنا کہ تجھ کو مرے ایک شعر پر
دزدی کا اپنے معنی کے ہے وہم مہرباں
شاید باتفاق توارد ہو پر مجھے
لفظوں کا اپنے غم کہ ہوئے کس پہ رائگاں
از راہِ دوستی میں کہوں تجھ سے ایک بات
طبع شریف پر جو نہ آوے ترے گراں
زنہار ہم سری کا مرے تو نہ کر خیال
ہوگا غریب مضحکہ نزدیکِ شاعراں

تشبیب کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ایسے موضوعات پر طبع آزمائی کی جائے جو ممدوح کی حیثیت کے مطابق ہوں، یعنی تشبیب میں جو کچھ کہا جائے وہ موقع محل کے بالکل ہی خلاف نہ ہو۔ سودا نے اکثر قصیدوں میں اس کا خیال رکھا ہے، لیکن بعض میں ان کا قلم بہک گیا ہے، انھوں نے حضرت علیؑ کے قصیدے کی تشبیب میں جو غزل شامل کی ہے اس کے چند اشعار

یہ بھی ہیں۔

چہرہ مہر وش ہے ایک سنبل مشک فام دو
حسن بتاں کے دور میں ہے سحر ایک شام دو
میرے تیرے یہ ربط ہے جیسے میانِ بحر و موج
واقعی میں تو ایک ہیں گو کہ ہوئے بنام دو
ابروئے یار کا خیال دل میں رہے ہے روز و شب
ہووے جو تیغ آبدار کیوں نہ کرے نیام دو

ایک اور قصیدہ حضرت علیؑ کی شان میں ہے، اس کی تشبیب میں بھی ایسے ہی اشعار شامل ہیں جو کسی طرح بھی جائز نہیں۔

غازی الدین خاں وزیر کے قصیدے میں سودا نے خوشی کو ایک حسینہ تصور کر کے اس کا سراپا لکھا ہے۔ سراپا لکھنے کا اچھوتا انداز ہے، ایک صبح سودا کی آنکھ جھپک گئی، تو خوشی نے درِ دل پر دستک دی، شاعر نے پوچھا، کون؟ جواب ملا کہ خوشی! شاعر نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ ایک توبہ شکن حسینہ کھڑی ہے، اس کے حسن و جمال نے پہلی ہی نظر میں سودا کو دیوانہ کر دیا۔ اس کے بعد سراپا شروع ہوتا ہے، جس میں سودا نے اپنے فن کا کمال دکھایا ہے۔

گریز تشبیب کے بعد شاعر اصل موضوع یعنی مدح پر آتا ہے، چونکہ تشبیب اور مدح دو مختلف چیزیں ہوتی ہیں اس لیے ان دونوں میں تعلق پیدا کرنے کے لیے ایک یا ایک سے زیادہ شعر کہا جاتا ہے۔ ان اشعار کو گریز یا مخلص کہا جاتا ہے۔ گریز کی خوبی یہ ہے کہ اس میں بے ساختگی اور برجستگی ہو۔ یہ نہ معلوم ہو کہ شاعر نے زبردستی مدح کا ذکر چھیڑا ہے، بلکہ

ایسا معلوم ہو کہ باتوں باتوں میں ذکرِ ممدوح آگیا ہے جو بالکل فطری ہے۔ قصیدے کے حسن و کمال کا اچھا خاصا دار و مدار گریز پہ ہوتا ہے، سودا نے گریز کے اشعار پہ پوری توجہ صرف کی ہے، ان کے اکثر گریز بے تکلف اور بدیع ہیں جن میں فن کی پوری مہارت دکھائی گئی ہے۔ بعض قصیدوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ممدوح کا ذکر باتوں باتوں میں آگیا ہے اور بعض میں ممدوح کا ذکر اس طرح آتا ہے جیسے تشبیب کا لازمی نتیجہ ہو، ایک نعتیہ قصیدے میں سودا دنیاوی عشق میں اپنی ناکامی اور سیہ بختی کا ماتم کر کے خود کو اس طرح سمجھاتے ہیں۔

خدا کے واسطے باز آ تو اب ملنے سے خوباں کے
نہیں ہے ان سے ہرگز فائدہ غیر از پشیمانی
نظر رکھنے سے حاصل ان کے چشم و زلف کے اوپر
مگر بیمار ہووے صعب یا کھینچے پریشانی
نکال اس کفر کو دل سے کہ اب وہ وقت آیا ہے
برہمن کو صنم کرتا ہے تکلیفِ مسلمانی
زہے دینِ محمد پیروی میں اس کے جو ہو ویں
زہے خاکِ قدم سے اس کی چشمِ عرش نورانی

اور پھر آنحضرتؐ کی شان میں اصل مدح شروع ہوتی ہے، حضرت علیؑ کے قصیدے میں سودا اپنے محبوب کے جور و ستم اور بے وفائی کا گلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

فریاد کروں کس سے روا داری کی تیرے
کہنے کے لیے گبر و مسلماں ہے برابر

نالش کروں اب واں کہ جہاں حق بطرف ہیں
مور و ملخ و دیو و سلیماں ہے برابر

اب گریز کے بعد حضرت علیؑ کی شان میں مدح شروع ہوتی ہی حضرت امام مہدیؑ کی منقبت میں سودا کسی ایسے شاعر کی خبر لیتے ہیں جس نے ان پر سرقہ کا الزام لگایا تھا، پھر شاعرانہ تعلّی کے بعد اس طرح اصل موضوع پر آتے ہیں۔

نام اپنے سے کوئی جو میرے شعر کو پڑھے
بولے فصاحت اس کا نہیں یہ لبِ دہاں
اس کا یہ شعر ہے کہ قلم جس کی روز و شب
ایسے جناب کی ہے ثنا میں مدح خواں

اور یہاں سے سودا اصل موضوع پر آجاتے ہیں۔ حکیم میر محمد کاظم کی شان میں کہے گئے قصیدے میں سودا فنِ طبابت کا بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انسان کا جسم کن کن چیزوں سے مرکب ہے، بیماریوں کے مختلف وجوہ بیان کرکے تشخیص مرض کے طریقوں پر روشنی ڈالتے ہیں اور پھر کہتے ہیں۔

قاعدہ یوں ہے پھر آگے ہے شفا اس کے ہاتھ
جس کے ہے قبضۂ قدرت میں علاجِ عالم
سو تو ان باتوں میں ہے خوض طبیبوں میں کسے
اس زمانے میں بجز میر محمد کاظم

کہیں کہیں سودا نے ڈرامائیت پیدا کرکے گریز کو بہت دل چسپ بنا دیا ہے غازی الدین کے قصیدے میں خوشی سودا کو جگاتی ہے، اور کہتی ہے کہ " اب تو شیشۂ مے اندوہ کا پتھر سے پٹک "، آج خوشی کا دن ہے، لوگوں کو

محتسب کا خوف نہیں ہے، ہر گھر میں خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں مگر تو آج بھی حزن و ملال میں ڈوبا ہوا ہے، یہاں سے گریز شروع ہوتا ہے۔

سن کے میں نے یہ کہا اس سے کہ اے مایۂ ناز
خیر ہے بات سمجھ کر تو کہہ اتنا نہ بہک
بے سبب کیونکہ میں اندوہ کی الفت چھوڑوں
کس طرح دوستیٔ غم کروں دل سے منفک
کر کے دریافت یہ مجھ سے کہا اس نے کہ مگر
سمع میں تیرے یہ مژدہ نہیں پہنچا اب تک
آج اس شخص کی ہے سالگرہ کی شادی
کہ بصورت ہے وہ انسان و بہ سیرت ہے ملک
یعنی نواب سلیماں خرد نام آصف جاہ
عید میں جس کے یہ غیور بزرگ و کوچک

سوداؔ نے گریز کی اس ٹیکنک کو خطابیہ قصائد میں زیادہ دلچسپ انداز سے استعمال کیا ہے، عماد الملک کی مدح میں قصیدے کی ابتدا اس طرح کی ہے۔

کہے ہے کاتبِ دوراں سے منشیٔ تقدیر
سمجھ کے دفترِ قسمت کیا کر اب تحریر
یہ روز و شب تو بنائے گا تا کجا اس طرح
کہ جام مہر میں آتش دے مہ کو کاسۂ شیر

مختلف مشورے دیکر کاتب دوراں اصل وجہ بتاتا ہے۔

سنا نہیں کہ غازیٔ دیں عماد الملک
جو میر بخشی تھا واں کا سو اب ہوا ہی وزیر

آصف الدولہ کے قصیدے کی ابتدا بالکل ڈرامائی انداز میں ہوتی ہے۔ قصیدے کا مطلع ہے۔

سودا پہ جب جنوں نے کیا خواب و خور حرام
لائے گھر اس طبیب کے ہے عقل جس کا نام

طبیب نے سودا کا حال دیکھ کر کہا کہ اس کے لیے فصد و مسہل بہت فائدہ مند ہوں گے۔ سودا نے سُن کر جواب دیا کہ میرے جسم میں تو خون کی ایک بوند بھی نہیں ہے، اصل بات یہ ہے کہ میرے جسم میں جتنا لہو تھا وہ اس سال خیر آباد کے عامل نے پی لیا اور مسہل تو وہ انسان لے جس نے زیادہ کھایا ہو میرے لیے تو عید کا مہینہ بھی رمضان ہی رہا اور قرض لے کر علاج کرنے سے فائدہ؟ یہ سُن کر عقل مشورہ دیتی ہے۔

تب اس نے یوں کہا کہ بتاؤں میں وہ علاج
اس درد سے تو پا کے شفا ہو جو شاد کام
اس کے حضور عرض یہ کر جس کے سایہ میں
مورِ ضعیف پیل سے لے اپنا انتقام

اور پھر آصف الدولہ کی مدح میں اشعار ہیں۔

نواب بسنت خاں خواجہ سرا کے قصیدے میں سودا نے تمثیل نگاری سے کام لیا ہے۔ قصیدے کے ابتدائی دو شعر ہیں۔

کل حرص نام شخصے سودا پہ مہربان ہو
بولا نصیب تیری سب دولتِ جہان ہو
گر اشرفی روپے کی خواہش ہو تیرے دل میں
ظاہر تیرے پہ ہر جا گنجینۂ نہاں ہو

"حرص" چھ اشعار میں سودا کو دعائیں دیتا ہے۔ سودا جواب دیتے ہیں۔

سن کر یہ حرف بولا سودا کہ قدر و رتبہ
کب اشرفی روپے کی نزدیک عاقلاں ہو

اور پھر سودا صبر و قناعت کی تلقین کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ زر و جواہر آنے جانے والی چیز ہے، دولت سے انسان کا دل کالا ہو جاتا ہے، اہلِ دانش کبھی ہوسِ جاہ و منصب نہیں کرتے۔ گریز کا آخری شعر ہے۔

جو کچھ کہا ہے تو نے یہ تجھ کو سب مبارک
میں اور میرے سر پہ میرا بسنت خاں ہو

گریز کے بعد اصل موضوع یعنی مدح شروع ہوتی ہے۔ مولانا شبلی نے مدح کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"(قصیدہ) .... جس کا اصلی موضوع مدح ہے، بڑے کام کی چیز ہے، لیکن اس کے لیے شرط ہے کہ (۱) جس کی مدح کی جائے درحقیقت مدح کے قابل ہو (۲) مدح میں جو کچھ کہا جائے سچ کہا جائے (۳) مدحیہ اوصاف اس انداز سے بیان کیے جائیں کہ جذبات کو تحریک ہو۔ فارسی قصائد میں یہ شرطیں کبھی جمع نہیں ہوئیں، اولاً تو اکثر ایسے لوگوں کی مدحیں لکھی گئیں جو سرے سے مدح کے مستحق نہ تھے، یا تھے تو ان کے واقعی اوصاف نہیں لکھے گئے، بلکہ تمام قوت مبالغہ اور غلو میں صرف کر دی گئی اکبر، خانخاناں، شاہجہاں کے سینکڑوں معرکے تاریخی یادگار ہیں، جن کے بیان سے مردہ دلوں میں جنبش پیدا ہو سکتی ہے۔ عرفی، نظیری، فیضی وغیرہ نے ان لوگوں کی مدح میں سینکڑوں پرزور قصائد لکھے لیکن ان معرکوں کا کہیں نام تک نہ آیا۔ اس کے مقابلے میں عرب کی شاعری پر نظر ڈالو

عرب اولاً تو کسی کی شاعرانہ مدح کرنا عار سمجھتے تھے، اور مدح کرتے تھے تو کبھی صلہ اور انعام لینا گوارا نہیں کرتے تھے، پھر جو کچھ کہتے تھے، سچ کہتے تھے۔ ایک رئیس نے ایک عرب شاعر سے کہا کہ میری مدح لکھو، اس نے کہا: "افعل اقول" یعنی تم کچھ کر کے دکھاؤ تو میں کہوں ؎۱"

یہ اقتباس طویل ضرور ہے، لیکن سودا کے قصائد کو سمجھنے کے لیے مفید ہے۔ اگر مولانا کی ان تین شرطوں کو مدح کا معیار مان لیا جائے تو ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ سودا نے (مذہبی قصائد کو چھوڑ کر) ان شرائط کا بہت کم خیال رکھا ہے۔

انھوں نے قصائد میں اس قدر مبالغے سے کام لیا ہے کہ سننے والے کے ذہن پر ممدوح کی شخصیت کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ ان کی قادر الکلامی اور مبالغہ آرائی نے نواب شجاع الدولہ جیسے بہادر اور دلیر سپاہی اور احمد علی خاں کو برابر کر دیا ہے۔ مدح کرتے ہوئے شاعر کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ممدوح کی کچھ نہ کچھ ذاتی خصوصیات بغیر مبالغے کے پیش کرے تاکہ انفرادیت اُبھر سکے۔ سودا نے ایسا نہیں کیا، ان کے یاں ایک اچھے انسان کا مخصوص تصوّر ہے، یہ وہ انسان ہے جو جاگیرداری دور میں آئیڈیل ہو سکتا تھا۔ اس کی خصوصیات ہیں: عدل و انصاف، ایمانداری، فیاضی، مروّت، حلم، نیکی و بزرگی، خداترسی، وغیرہ، بزرگانِ دین کی علمیت و قابلیت کی مدح کر رہے ہوں یا کسی بادشاہ و نواب کی یا کسی امیر کی، سودا اس انسان میں یہی خوبیاں دیکھتے ہیں۔ چونکہ سودا کے مدح کے مضامین محدود ہیں۔ اس لیے ان کے قصائد

۱۔ شعرالعجم، ۵، ص ص ۲۱-۲۲

میں ایک بزرگ دین اور عام ممدوح میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے، حضرت علیؑ اور آصف الدولہ کی شجاعت، بہادری، عدل وانصاف وغیرہ پر کہے گئے اشعار کا اگر موازنہ کیا جائے تو کوئی فرق نہیں ملتا، اور ہرگز یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ایک دنیائے اسلام کا ہیرو ہے اور دوسرا ایک چھوٹی سی ریاست کا نواب اور پھر شجاعت و بہادری میں آصف الدولہ کا جو حال تھا اس سے کون واقف نہیں۔ جاگیرداری دور کے انسان کی خصوصیات کو سوداؔ کے قصائد میں ملاحظہ کیجیے۔

عدل وانصاف حضرت علیؑ کے عدل وانصاف کی مدح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

رکھا جب سے قدم مسند پہ آ اون نے شریعت کا
کرے ہے موج بحر معدلت تب سے بہ طغیانی
اگر نقصان پہ خس کے شرر کا ٹک ارادہ ہو
گرہ کو آگ کے وہیں کرے غرق آن کر پانی
یہ کیا انصاف ہے یارو کہ طیر و وحش تک جگ میں
اس امن وعیش سے اپنی بسر اوقات لے جانی
پلے ہے آشیاں میں باز کے بچہ کبوتر کا
شباں نے گرگ کو گلہ کی سونپی ہے نگہبانی

ایک اور قصیدہ میں کہتے ہیں۔

طبع انساں میں تیرے عدل سے رکھتے ہیں اثر
حنظل و آب بقا شربت و سم چاروں ایک

آفت و قہر و بلا و غضب آفاق کے بیچ
ہو کے آپس میں ترے تیغ کا دم چاروں ایک

یہ اشعار بھی حضرت علیؑ کی مدح میں ہیں۔

ہیبت عدل یہ تیری ہے کہ ہر دشت میں شیر
واسطے دردِ سر آہو کے گھِسے ہے صندل
سامنے بز کے یہ کیا دخل کہ نکلے آواز
گرگ کے پوست کو منڈھوا کے بجائیں جو دہل

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی مدح سرائی اس طرح کی ہے۔

ازبس اب ان کے عدل سے معمور ہے جہاں
پہونچا ہے کار خلق اس امن و اماں تلک
بچہ جو گوسپند کا گم ہو تو گرگ و شیر
پہونچا دیں تا نہ ڈھونڈھ کے اس کو جہاں تلک
دہشت سے اس خیال کے زہرہ ہو ان کا آب
پہونچیں نہ ہم مباد کسی کے گماں تلک
گلچیں کی کیا مجال جو توڑے چمن میں پھول
صورت سے گل کے لرزے ہے بادِ خزاں تلک
بہ جائے ایک خس کبھو ریلے میں موج کے
زنجیر سے بندھا پھرے آبِ رواں تلک

عالم گیر ثانی کی مدح میں سوداؔ نے جو قصیدہ کہا ہے اس میں یہ اشعار بھی ہیں۔ جہاں پناہ ترے درگہ عدالت میں
کسی کو دیوے اذیت کوئی معاذ اللہ

جلے جو شام کو پروانہ بزم میں تیری
تو صبح شمع کے آتا ہے سر پہ روزِ سیاہ
شرارِ سنگ سے خاشاک کو پہونچے ضرر
لے آوے کھینچ کے دیوان کوہ کو پرکاہ

غازی الدین خاں کے عدل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

عدل یہ عصر میں اوس کی ہے کہ ہر ایک طبیب
شعلۂ تپ کو بھی تبرید لکھے خار خسک
کرنے دیوے نہ رفو چاک کتاں کو انصاف
تا نہ رشتہ کے لیے ماہ کی کھولے بیچک

شجاع الدولہ ایسے عادل اور منصف تھے کہ بقول سودا۔

تو وہ عادل ہے جہاں میں کہ قلمرو میں ترے
چیونٹی دستِ تعدی سے نہووے پامال

ایک اور قصیدے میں وہ کہتے ہیں۔

کیا بیاں اس کی عدالت کا زباں پر لاؤں
سحر ہے صولتِ عدل اس کے تئیں کر اعجاز
باز و کنجشک کی کھینچے جو مصوّر تصویر
رعب کنجشک سے پرواز کرے صورتِ باز
پیشِ خس تاب نہ آتش کو بجز خاموشی
نہ یہ طاقت کہ زباں اپنی کرے شعلہ دراز

آصف الدولہ کے انصاف و عدل کا بیان اس طرح کیا ہے۔

جا سے بیجا تیرے قلمرو میں کب توانا سے ناتواں ہوئے

ذرۂ خاک کی حفاظت کوں باد تند آکے پاسباں ہووے
سنگ اس عہد میں ہو واں پانی شیشہ گر کی جہاں دکاں ہووے

سرفراز الدولہ کے عدل کی داد ان الفاظ میں دی ہے۔

بروز جمعہ سدا ہاتھ میں لے ناخن گیر
پھرے ہے شیر کو بیشے میں ڈھونڈتا حجام
اسی امید پہ تا قصر کرکے ناخن شیر
برائے ہیکلِ اطفال دے کے لے انعام

ان اشعار میں سودا نے حضرت علیؑ، حضرت امام موسیٰ کاظمؑ، حضرت امام ضامنؑ، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، حسن رضا خاں کے عدل وانصاف کی مدح کی ہے۔ اس موضوع پر سودا کے مخصوص مضامین ہیں، جسے وہ مختلف الفاظ میں بیان کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً اب طاقتور کمزوروں کو پریشان نہیں کرتے، بلکہ شیر بھی بکریوں سے ڈرتے ہیں۔ شیر، گرگ، اژدر، باز وغیرہ نے اپنی خونخواریت چھوڑ دی ہے، آگ، شمع، حنظل، سم، سنگ وغیرہ نے اپنے منفی اثرات ترک کر دیئے ہیں۔ سودا کے جدّت بیان نے ان مضامین کو ثقافتی تشبیہوں اور استعاروں کے سانچوں میں ڈھالا ہے، یہ اشعار حسن تخییل، زور بیان، حسن تعلیل اور جدتِ فکر کا بہترین نمونہ ہیں، مگر ان کی بنیادی خرابی صرف یہ ہے کہ حضرت علیؑ اور عالم گیر یا آصف الدولہ کے مدحیہ اشعار میں قطعی فرق نہیں ہے، پھر کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ ہو، بالکل یہی حال دوسرے اوصاف کا ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت یہ اوصاف بھی ملاحظہ کیجیے۔

شجاعت و بہادری :

کیا بتاؤں جس قدر اس کی برش کا ہے صفا
کیا کروں میں زور یہاں اپنے مولا کا بیاں
روز میداں سامنے آوے گر اس فن کا عدو
کوئی نہ گردوں سا جس کے سر کا ہووے استخواں
جب کمر سے کھینچ کر مارے وہ اس کے فرق پر
موئے سر سے ناخنِ پا تک نہ ٹھہرے درمیاں

(قصیدہ در مناقب حضرت علیؑ)

دعوائے بندگی ہو جسے اوس جناب میں
اس کے تئیں ہے فنِ شجاعت میں یہ کمال
مستک میں فیلِ مست کے مارے اگر وہ تیر
گردن میں استخواں کے کبھو بند ہوے بحال
سوفار اس طرح سے نمودار ہو رہے
جوں اژدہا پہاڑ سے جھانکے ہے سر نکال

(قصیدہ در منقبت امام مہدیؑ)

رستم کو خبر ہو کہ ترا اوس پہ ہے آہنگ
جیوے بھی جو پیٹن کے تو کھایا نہ لگے انگ
بل چیونٹی کا پاوے تو کرے پھینے کا واں قصد
بہمن پہ تجھے دیکھ کے عرصہ ہو نپٹ تنگ
طائر کے جو تو صید پہ لے تیر و کماں ہاتھ
ار جن کے وہیں چہرے سے پرواز کرے رنگ

حربے سے یہ دہشت پڑے ساونت کے دل میں
بچ جائے اگر جان سے کھا کر تر سر چنگ
ہاتھ اس کے میں دے کر کبھو شمشیر برہنہ
اک آئینہ دکھلاؤ تو بھاگے وہ دو فرسنگ

(قصیدہ در مدح شجاع الدولہ)

تجھ نعرۂ غضب کی یہ صولت ہے گر سنیں
فیصل ہوں بر د بحر کے باشندگاں تمام
زہرہ ہو آب سینہ میں، ہیبت سے شیر کا
تڑپے نہنگ پیاس سے ماہی ہو جوں بدام
اشجع تو اس قدر ہے کہ میداں میں روزِ جنگ
کیا تاب روبرو ہوں ترے رستم اور سام
قالب تہی کریں وہ قلم اوس کی دیکھ کر
تصویر تری تیغ کی کھینچے جو بے نیام

(قصیدہ در مدح آصف الدولہ)

فیاضی :

چاہے اگر کوئی دو جہاں کا متاع و مال
تیرے گدائے در سے کرے آکے وہ سوال
برسے ترا جو ابرِ کرامت زمین پر
پیدا بجائے دانہ گہر ہوں ہر ایک سال

(قصیدہ در مدح امام مہدیؑ)

کسی کے آگے کوئی ہاتھ پسارے کیا دخل
مٹھی باندھے ہوئے پاتا ہے تولد کودک
(قصیدہ در مدح غازی الدین خاں)

گہرفشاں ہے سدا دست فیض کا اس کے
تگرگ بار نہو جس کے ابر عشر عشیر
غنی ہوا ہے یہ اس کے کرم سے ہر محتاج
کہ فرق ہو نہیں سکتا بہم امیر و فقیر
تمیز کیا کہوں اجزائے کار کی اس کے
کہ جس کے رمز کو پہونچے نہ آسماں کا دبیر
دوام زلفِ بتاں سے کرے اسے تنخواہ
جو مانگے فرقۂ عشاق سے کوئی جاگیر
(قصیدہ در مدح آصف جاہ)

سخا میں حاتمِ طائی کو تجھ سے نسبت کیا
مرے سخن کو یقیں کر وہ ہے زباں زدِ عام
بزیرِ سقفِ فلک شہرۂ سخا اوس کا
طنین پشہ صدا فیل کی ہے درحمام
(در سرفراز الدولہ)

گلشنِ دہر میں چہار طرف
ایک مفلس جو ڈھونڈیے تو نہیں
غنچہ کی بھی گرہ میں بند کیا
اس کی بخشش نے مشتِ زر کے تئیں
(قصیدہ در مدح نواب احمد علیخاں)

مروّت :

رائج اتنی ہے مروّت کہ غزالوں کو پلنگ
اس طرح سمجھے ہے فرزند گویا لے پالک

(قصیدہ در مدح نواب غازی الدین خاں)

جس جگہ تیری مروت کا زباں پر ہو ذکر
شعلہ واں خس کی اذیت کو سمجھتا ہے وبال
پدری کی ہے انھوں کی جو تیرے دامن تک
مادرِ گیتی کی بے مہری سے پہونچے اطفال

(قصیدہ در مدح شجاع الدولہ)

ان کے علاوہ سوؔدا نے فہم و ادراک، حلم، عفو و کرم، نیکی و بزرگی، شرافت و پاکیزگی، خداترسی، علمیت و قابلیت وغیرہ جیسی خصوصیات کی تعریف کی ہے۔ انھوں نے مہرباں خاں رند کے دیوان و اشعار کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے۔ ممدوح کی شخصیت اور اس کی ذات کے علاوہ سوؔدا نے اس کے ساز و سامان کی بھی مدح کی ہے۔ مثلاً اکثر قصیدوں میں گھوڑا ہاتھی، تلوار، تیر، کمان، سپر، نیزہ، پالکی اور نالکی وغیرہ کی تعریفیں کی گئی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو مرثیوں میں جو ان اشیاء کی تعریفیں ملتی ہیں، اس کی روایت سوؔدا ہی نے قائم کی تھی تو غلط نہ ہوگا، کیونکہ سوؔدا سے قبل اردو مرثیوں میں یہ انداز نہیں تھا۔ سوؔدا نے ایک قصیدے میں شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خاں روہیلے کے معرکے کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ سوؔدا حافظ رحمت خاں کے ساتھیوں سے پوچھتے ہیں کہ تم تو جانگسار تھے ایک ہی قوم اور ایک ہی گروہ کے تھے، پھر یہ کیسے ہوا کہ تم میدان جنگ میں

حافظ کی لاش چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ وہ لوگ سودا کو جواب دیتے ہوئے شجاع الدولہ اور اس کی فوج کے کارناموں کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسے جانباز بہادروں کے مقابلے میں کون ٹھہر سکتا تھا، ہم تو خیر ساتھیوں میں تھے، خود حافظ کا لڑکا باپ کی لاش چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اس قصیدے میں سودا نے میدانِ جنگ کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے اور کوشش کی ہے کہ معمولی تفصیلات بھی بیان کر دی جائیں، یہ قصیدہ اُردو رزمیہ کا بہترین نمونہ اور شجاع الدولہ کی مدح کا بہت ہی خوبصورت انداز ہے۔

دعا یا حسنِ طلب مدح کے بعد بزرگان دین سے دعا مانگی جاتی ہے، اور اگر قصیدہ اہلِ دول کی شان میں ہے تو حسن طلب سے کام لے کر اپنے لیے کچھ مانگا جاتا ہے۔ سودا کا حسنِ طلب بہت کمزور ہے، اگرچہ وہ قصیدہ نگار ہیں لیکن دستِ طلب دراز کرتے ہوئے انھیں بہت شرم آتی ہے اور جب تک وہ بالکل ہی مجبور نہیں ہو جاتے اپنے لیے کچھ نہیں مانگتے۔ سودا نے صرف غازی الدین خاں وزیر، آصف الدولہ اور سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کے سامنے ہاتھ پھیلایا ہے، باقی قصیدوں میں ممدوحین کے اقبال کی بلندی کی دعائیں مانگی ہیں۔

بہ کچھ کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود قصائدِ سودا اُردو نظم کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں، سودا الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے اور وہ ہر لفظ کے مزاج اور اس کے استعمال سے بخوبی واقف ہیں۔ طرح طرح کی تشبیہات اور استعارات کے سہارے ایک ہی بات کو سو انداز سے کہہ سکتے ہیں، مشکل اور سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دینا سودا ہی کا کام تھا، بعد کے تمام قصیدہ نگار سودا سے متاثر ہیں اور اکثر

شعرا نے ان کی زمینوں میں قصیدے لکھے ہیں۔

ہجو گوئی ظرافت نگار جب ناہموار، بے آہنگ، بدصورت اور ناقص چیزیں دیکھتا ہے۔ تو اپنی تخلیقی قوتوں کو روبکار لاکر انھیں اور بھی مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔ اس عملِ تخلیق کے پیچھے مختلف جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ ظرافت نگار بے ڈھنگے بے تناسب اور بے محل عناصر پر خود بھی ہنستا ہے اور اپنی صناعی اور خلاقی کی قوتوں کا استعمال کر کے دوسروں کے لیے بھی ہنسنے ہنسانے کا سامان فراہم کرتا ہے۔ وہ اخلاقی مصلح نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد صرف ہنسنا ہنسانا ہے۔ اس کے برعکس طنز نگار کی مسکراہٹ میں نشتر بھی ہوتے ہیں۔ جن کا استعمال سماج اور زندگی کے ناسوروں پر کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد ایک تعمیری کام یعنی انسان کی اصلاح ہوتا ہے۔ ہجو نگاری کے محرکات بھی تقریباً وہی ہوتے ہیں جو ظرافت نگاری کے ہیں۔ بقول کلیم الدین احمد "ظرافت نگار کسی مشاہدہ کو دیکھ کر مسکرا اٹھتا ہے لیکن کسی اور قسم کا جذبہ اس کے دل میں نہیں ابھرتا۔ اسی جگہ ظرافت نگار اور ہجو گو کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ ہجو گو بے ڈھنگے، ناقص، بدصورت مناظر کو دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے۔ ناانصافی، بے رحمی، ریاکاری کی مثالیں دیکھ کر اس کے دل میں نفرت، غضب، حقارت اور اسی قسم کے جذبات ابھرنے لگتے ہیں۔ وہ بھی صناع ہے اس لیے وہ اپنے جذبات کو محض سیدھے سادے طور پر بیان نہیں کرتا۔ وہ اپنے جذبات سے ان کی شدت کے باوجود علیحدگی اختیار کرتا ہے اور ان سے الگ تھلگ ہو کر اور انھیں قابو میں لاکر ان کا صنعت کارانہ اظہار کرتا ہے۔ اس صنعت کارانہ اظہار کی وجہ سے جذبات کی شدّت میں کمی نہیں زیادتی ہوتی ہے۔ ہجو گو انسانی کمزوریوں، خامیوں، فریب کاریوں کو

اپنے طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ لیکن ہجو گو انسان ہے اور انسانی حدود میں گھرا ہوا ہے۔ اس لیے اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر اس کی ہجوؤں کی ابتدا کسی ذاتی جذبہ سے ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے فن کی اہمیت اور اس کی ضروریات سے آگاہ ہے تو وہ اپنے ذاتی جذبے سے علیحدگی اختیار کرتا ہے اور اسے ایک قسم کی عالمگیری عطا کرتا ہے۔ بہر کیف ہجو گو سارے جذبات پر تصرف رکھتا ہے۔ وہ ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے۔ وہ ہمدردی، ترحم، انصاف اور فیاضی کے جذبات کو ابھارتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ غصہ، بغض اور حقارت کو بھی بھڑکاتا ہے۔ ظرافت نگار کے مقابلے میں اس کی جذباتی دنیا زیادہ وسیع اور کشادہ ہے[1]۔"

جیسا کہ کلیم الدین صاحب نے کہا کہ ہجو گوئی میں فنکار کی ذات اور شخصیت کو براہِ راست دخل ہوتا ہے۔ اس لیے ہجو کی بنیاد عام طور پر کسی ذاتی جذبے پر ہوتی ہے۔ لیکن اس فن کا کمال یہ ہے کہ فنکار اپنے فن میں اتنی وسعت ہمہ گیریت اور عمومیت پیدا کرے کہ اس میں کسی فرد، جماعت یا اداروں کے نام کی حیثیت محض ایک نشان یا اشارہ کی رہ جائے۔ اور فنکار کا جذبہ یا اس کی شخصیت اتنی دب جائے کہ پہچانی نہ جا سکے۔ اور ہجو انسانی کمزوری ظلم و ستم، ناانصافی، عیاری و مکاری، خود پرستی اور خود فریبی، جھوٹی عزت اور وقار کے خلاف ایک بلند آواز بن جائے۔

ظرافت نگاری اور ہجو گوئی میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ عام طور پر ظرافت نگار تہذیب اور اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ اس کے

۱۔ نقوش طنز و مزاح نمبر، ص ۱۵

برعکس ہجوگو کے ہاں حقارت اور نفرت کے جذبات کی اتنی شدّت ہوتی ہے کہ وہ پھبتی، تمسخر، استہزا اور مضحکہ اڑانے سے آگے بڑھ کر فحش نگاری اور ابتذال پر بھی اتر آتا ہے۔

اردو شاعری میں ہجوگوئی کی ابتدا بھی فارسی ہی کے اثر سے ہوئی۔ فارسی میں اس کا آغاز عہدِ ساسانی کے شاعر رودکی سے ہوتا ہے لیکن ان کے ہاں ہجویہ اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ اسی عہد کے ایک اور شاعر دقیقی نے بھی اس فن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن ابھی یہ فن ابتدائی مدارج میں تھا۔ دورِ سلجوقی میں انوری، خاقانی اور سوزنی نے اسے بہت ترقی دی۔ ان کے بعد کمال اصفہانی کا نام آتا ہے۔ کمال ہر شاعر کے لیے ہجوگوئی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ اُن کے خیال سے جو شاعر اس پر قدرت نہیں رکھتے ان کی مثال ایسے شیر کی ہے جو حریفوں سے مقابلہ کرنے کے لیے چنگال اور دنداں نہ رکھتا ہو۔ پروفیسر محمد علم الدین سالک نے ان کا ایک قطعہ نقل کیا ہے۔

ہجا گفتن ہر چہ پسندیدہ نہ بود (؟)
مبادا کسے کالت آں ندارد
ہر آں شاعرے کو نہ باشد ہجا گو
چو شیرے کہ چنگال و دنداں ندارد
خداوند امساک را ہست دردے
کہ الا ہجا ہیچ درماں ندارد
چو نفریں بود بولہب زایزد (؟)
مرا ہجو گفتن پشیماں ندارد

اگر ہجو گوئی تو در گردن من
کہ ہرگز زیانے بہ ایماں ندارد[1]

عبید زاکانی کے کلام میں بھی ہجویہ شاعری کی اچھی خاصی مثالیں مل جاتی ہیں۔

شمالی ہند میں اُردو شاعری کے آغاز ہی سے ہجو گوئی کی ابتدا ہوئی اس سلسلے میں غالباً پہلا نام میر جعفر زٹلی کا ملتا ہے۔ لیکن ان کا مزاج ہزل گوئی کی طرف زیادہ راغب تھا۔ انھوں نے باقاعدہ ہجویں نہیں کہیں۔ البتہ ان کے کلام میں ہجویہ اشعار اچھے خاصے مل جاتے ہیں۔

ابتدائی عہد کے بیشتر اُردو شاعروں نے ہجویہ اشعار کہے ہیں۔ بڑی بڑی برگزیدہ ہستیاں بھی اس سے دامن نہ بچا سکیں۔ حاتم، آبرو، میر، شاکر ناجی اور کمترین وغیرہ کے یہاں تو اس قسم کے اشعار مل ہی جاتے ہیں۔ حیرت ہے کہ مرزا مظہر جانجاناں جیسے ثقہ بزرگ بھی خاموش نہیں رہے۔

سودا نے ہجو گوئی کو باقاعدہ فن کی صورت دی۔ وہ اس فن کے امام ہیں اور خاتم بھی۔ ان سے پہلے اور ان کے بعد اُردو میں کوئی اتنا بڑا ہجو گو نہ پیدا ہو سکا۔[2] انشا اور مصحفی نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی۔

۱۔ نقوش۔ طنز و مزاح نمبر، ص ۱۲۸

۲۔ آزاد لکھتے ہیں۔ مگر اس وقت تک اردو کے شاعر صرف ایک دو شعروں میں دل کا غبار نکال لیتے تھے۔ یہ طرزِ خاص کہ جس سے ہجو ایک موٹا ٹہنا اس باغ شاعری کا ہوگئی۔ انہی (سودا) کی خوبیاں ہیں۔ عالم، جاہل، فقیر، امیر، نیک، بد کسی کی داڑھی ان کے ہاتھ سے نہیں بچی۔ آبِ حیات، ص ۱۵۴

مگر ان کی ہجویں تیسرے درجے کی ہیں۔ جن کی بنیاد محض ذاتی عناد و بغض پر ہے۔ انشاؔ میں وہ تمام صلاحیتیں تھیں جو انھیں ایک عظیم ہجو نگار بنا سکتی تھیں۔ مگر انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو معمولی ادبی معرکوں میں ضائع کر دیا۔ مصحفیؔ اس مزاج کے آدمی نہیں تھے۔ انھیں تو انشاؔ نے خواہ مخواہ اس میدان میں کھینچ لیا تھا۔

سوداؔ کے ہاں رچا ہوا سماجی شعور تھا۔ ان کے اکثر مربّی وہ لوگ تھے جو صاحبِ اقتدار تھے۔ ان کی صحبتوں میں رہ کر سوداؔ نے ملکی سیاست کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔

ان کی ہجوؤں کو بہ غور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سوداؔ اپنے زمانے سے شدید ناآسودگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی ناآسودگی اور غم حقارت اور نفرت کے جذبے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ لیکن یہی جذبہ ان کی ہجو نگاری کا سرچشمہ ہے۔

رشید احمد صدیقی نے سوداؔ کی ہجو گوئی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے

"سوداؔ کو ہجو و ہجا میں نہ صرف فضل تقدم حاصل ہے بلکہ ان کے کلام سے طنزیات کی بہترین صلاحیت و استعداد بھی نمایاں ہے .... بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔ اس معیار پر سوداؔ کی ہجویں تمام و کمال پوری نہیں اترتیں۔ تاہم اس خارستان میں بھی طنز و مضحکات کے ایسے نمونے ملتے ہیں جن سے ان کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کا ہمیں پوری طرح معترف ہو جانا پڑتا ہے"[1] میرے خیال سے کوئی ایک طنز بھی ایسا نہیں

[1] رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکاتِ اردو، الہ آباد، ص ۴۶

ملے گا۔ جس کا محرک ذاتی جذبہ نہ ہو۔ ذہن و فکر کی ایسی برہمی اور شگفتگی کا تصور ہی ناممکن ہے۔ جس کی بنیاد ذاتی عناد و تعصب اور ذاتی جذبے پر نہ ہو لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ ہجو نگار کے کمال کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اور شخصیت کو زیادہ سے زیادہ چھپانے اور فن میں ہمہ گیری اور عمومیت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

سودا نے ہجو گوئی کے لیے تقریباً تمام اصنافِ سخن استعمال کیے ہیں۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، ترکیب بند، ترجیع بند، رباعی، قطعہ وغیرہ۔ غرض ہر صنف میں ہجویں موجود ہیں۔

سودا کی ہجوؤں کو پانچ مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ وہ ہجویں جن کی بنیاد محض ذاتی بغض وعناد پر ہے یا جس کا مقصد کسی سے چھیڑ چھاڑ کرنا ہے۔

۲۔ اخلاق کی اصلاح کے لیے لکھی جانے والی ہجویں۔

۳۔ مذہبی اختلاف پر لکھی جانے والی ہجویں۔

۴۔ وہ ہجویں جو ادبی اختلاف یا معاصرانہ چشمکوں کی وجہ سے لکھی گئیں۔

۵۔ وہ ہجویں جن میں اپنے دور کے سیاسی حالات کی ابتری اور مالی بدحالی کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔

ہجوؤں کا مختلف عنوانات کے تحت جائزہ لینے سے قبل مناسب ہے کہ سودا کی ہجو گوئی کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جائے۔

سودا کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ وہ جب کسی منظر کو دیکھتے ہیں تو پہلی ہی نظر میں ان کا ذہن منظر کی معمولی سے معمولی تفصیل کو محفوظ کر لیتا ہے۔ اسی لیے جب وہ اس منظر کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالتے ہیں تو کوئی گوشہ تشنہ نہیں

رہنے پاتا۔ اصل منظر میں جو کچھ کمی رہ جاتی ہے، سوداؔ اسے اپنے زورِ تخیل سے پورا کر دیتے ہیں۔ جو مصوری اور شاعری کا حسین ترین امتزاج ہے۔ اس جزئیات نگاری کے لیے اعتدال اور توازن اساسی شرط ہے۔ سوداؔ جب اعتدال کی حدوں میں رہتے ہیں تو ان کی تصویریں فن کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی وہ توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ سوداؔ نے راجہ نرپت سنگھ کے ہاتھی کی ہجو کہی ہے۔ ہاتھی بہت کمزور اور لاغر ہے۔ سوداؔ اس کے پورے جسم کا جائزہ ان الفاظ میں لیتے ہیں۔

خداوندا یہ آرا ہے کہ خرطوم
یہ ظالم چیرتا ہے جس سے مظلوم
غرض ہونی تھی باقی ماندوں کی خیر
بسانا تھا خدا کو کعبہ و دیر
بدن پہ اب نظر آتی ہے یوں کھال
طناب سست سے خیمہ کا جوں حال
نمودار اس طرح ہر استخواں ہے
گویا ہر پسلی اوس کی نردباں ہے
نہ بیڑی ہے نہ کٹ بندھن نہ لکڑا
رکھے ہے ناتوانی اس کو جکڑا
ضعیفی نے کی اس کی فربہی گم
گیا ہاتھی نکل اور رہ گئی دم
سمجھنا فیل اسے دیوانہ پن ہے
کسی مدت کا یہ بامِ کہن ہے

ستوں اس کے تلے یہ پاؤں ہیں چار
رہے دو دانت آگے سو ہیں اڑوار
جو بیٹھے یہ تو اُٹھنا ہے اسے دور
لگیں جب تک نہ اس کو راج مزدور
ہلاتا یوں ہے یہ کانوں کو ہر بار
کہ دھونکیں پنکھوں سے کویلوں کا انبار
یہ عالم چلنے میں خرطوم کا ہے
کہ دستِ کور میں گویا عصا ہے

سودا پڑھنے والے کے سامنے اس ہاتھی کی جو تصویر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اُس میں کامیاب ہیں۔ انھوں نے اپنے تخیل اور تشبیہات و استعارات کے سہارے ہاتھی کی مکمل تصویر کھینچ دی ہے اور معمولی سے معمولی تفصیل کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن یہی جزئیات نگاری کبھی کبھی اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ پڑھنے والا اکتا جاتا ہے اور ہجو بے اثر ثابت ہوتی ہے۔ سودا کے کلام میں ایسی ہجویں بھی ہیں جن کی دل چسپی اور حسن طوالت کی نذر ہو گیا ہے۔

ہجو کی ایک خصوصیت مبالغہ آرائی بھی ہے۔ بعض واقعات، مناظر یا تصویریں ہماری توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کر سکتیں۔ ہجو نگار ان واقعات وغیرہ کے پیش کرنے میں مبالغے سے کام لیتا ہے تاکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔ تصویر کے بعض حصّوں کو نمایاں کرنے کے لیے مصوّر کو تیز اور شوخ رنگ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ ہجو نگار شوخ اور تیز رنگوں کا کام مبالغے سے لیتا ہے لیکن یہاں بھی اعتدال شرط ہے۔ سودا اکثر اعتدال کی حدوں سے باہر نکل جاتے ہیں۔ ان کا مبالغہ غلو کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

اور ہجو حقیقت کم اور جن اور پری کی کہانی زیادہ بن جاتی ہے۔ ہجو میر ضاحک میں ضاحک کے زیادہ کھانے کا بیان اس طرح کیا گیا ہے۔

گھر میں اب جس کے دیگچہ کھڑکے
در پر اس کے یہ بیٹھے یوں اڑ کے
گور سے پھر جو رستم اُٹھ کر آئے
میت اس کی اٹھائے یا نہ اٹھائے
آگ لگ کر کسی کے گھر سے دود
ایک ذرہ بھی گر کرے ہے نمود
لوگ تو دوڑے ہیں بجھانے کو
دوڑے یہ لے رکابی کھانے کو
ہر کسی بنیئے کی دکاں پہ جا
اپنی باتوں میں اس کو لے ہے لگا
کام ہر وجہ اپنا کر لیوے
گلّے بندر کی طرح بھر لیوے
توڑ کھاتا ہے جا کے پاخانے
یہ بواسیر اپنی کے دانے

اگر ضاحک کسی کی شادی میں جاتے ہیں تو وہاں کی تقریبوں اور سامانِ عیش وعشرت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ بلکہ

یہی پوچھے ہر ایک سے بے شرم
پڑی کا آٹا سخت ہے یا نرم

صاحبِ خانہ اس میں گر جھنجھلائے
اپنے نفروں سے جوتیاں لگوائے
اس کو ہرگز نہیں حیا سے لگاؤ
جائے تو یہ کہے پلاؤ پلاؤ

اس قسم کا بے اثر اور بے کیف مبالغہ سودا نے عام طور پر ادبی معرکوں میں کہی جانے والی ہجوؤں میں کیا ہے۔ بعض دوسری ہجوؤں میں مبالغہ نے بہت زیادہ حسن پیدا کر دیا ہے اور ہجو کے اثر کو بہت بڑھا دیا ہے۔ شاہجہان آباد کے ایک کوتوال فولاد خاں کی ہجو میں سودا کہتے ہیں کہ فولاد خاں نے چوروں سے رشوت لے رکھی ہے۔ اس لیے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کے جتنے ملازم ہیں وہ ایک سے ایک بڑھ کر چور ہیں اور حالت یہ ہے کہ اگر فولاد خاں کی نظر بچ جائے تو یہ چور اُس کے مال پر بھی ہاتھ صاف کر دیں۔ فولاد خاں ان کی حرکتوں سے تنگ آگیا اور ایک دن اُن سے کہا۔

ایک دن اس نے سب سے طنز کی راہ
کہا تم ہو مرے نپٹ دل خواہ
چیز میری جو اب چراؤ تم
چوک میں بیچنے نہ جاؤ تم
قیمت اس کی جو کچھ مشخص ہو
ادتنے کو تم اسے مجھی کو دو
ایک ان میں سے یہ سخن سن کر
لگا کہنے کہ اس سے کیا بہتر

کیا جب آپ تم نے یہ انصاف
میں بھی کرتا ہوں عرض رکھیے معاف
آپ کے سر پہ یہ جو پگڑی ہے
دو خریدار اس کے ہیں درپے
دس روپے وہ مجھے دلاتے ہیں
کہیے اب آپ کیا لگاتے ہیں

ان خصوصیات کے علاوہ سودا کی ہجو گوئی کی ایک خصوصیت فحش نگاری بھی ہے۔ لیکن سودا نے فحاشی اور ابتذال سے کام اکثر ان ہجوؤں میں لیا ہے جو ادبی معرکوں میں کہی گئیں۔ باقی ہجوؤں میں ابتذال شاذ و نادر ہی ہے اور وہ بھی اعتدال اور توازن کے ساتھ۔ میر ضاحک خاص طور پر ان کی فحش نگاری کے شکار ہوئے ہیں۔ ان معرکوں میں سودا اپنے حریف سے آگے بڑھ کر اس کے لائق احترام لواحقین کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ میر ضاحک کی بیوی اور ندرت کشمیری کی دختر پر سودا کی ہجویں موجود ہیں جو کسی طرح بھی مناسب نہ تھیں۔

ادبی معرکے

سودا کی ہجو گوئی کا یہ حال تھا کہ لوگ ان سے خائف رہتے تھے۔ کریم الدین نے لکھا ہے کہ "خان آرزو کے مکان پر جن ایام میں مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ سودا بھی وہاں حاضر ہوا کرتا تھا۔ جب سودا غزل پڑھا کرتا تھا تمام شعرا حاضرینِ مجلس مشاعرہ اس کی مدح کیا کرتے تھے۔ اس مدح کے دو سبب ہوتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ شاعر واقع میں اچھا شعر کہتا تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ سب شاعر ہجو سے ڈرا کرتے تھے بھی اگر اُس کی تعریف نہ کریں گے وہ ہجو کرے گا۔ اس خوف

سے سب کو واہ واہ کرنا پڑتا ہے۔[1] قدرت اللہ قاسم نے بھی مجموعۂ نغز میں تقریباً یہی بات لکھی ہے۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے ان ادبی معرکوں میں سوداؔ کو بے قصور بتایا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ سوداؔ کے مخالفین نے پہلے ہجو کہی اور پھر سوداؔ نے جواب دیا۔ قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں کہ محمد بقا اکبر آبادی، فدوی پنجابی اور ضاحک دہلوی نے رکیک ہجویں کہہ کر سوداؔ کو اشتعال دلایا۔[2] فدوی کے ترجمے میں حکیم سید احد علی خاں یکتا لکھتے ہیں۔ فدوی قوتِ شاعری اور معمولاتِ فن کے غلط زعم میں مرزا سوداؔ سے مقابل ہو گئے۔[3] حسرت کا ذکر کرتے ہوئے یکتا لکھتے ہیں۔ طنطنۂ شاعری اور معلوماتِ فن کی وجہ سے سلطان الشعرا (سوداؔ) سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔[4] مرزا علی لطف نے فدوی اور سوداؔ کے معرکے میں سوداؔ کو بے قصور بتاتے ہوئے لکھا ہے۔ فدوی برخود غلط انسان تھے۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ سے مباحثہ کرنے فرخ آباد آئے اور ذلّت اٹھائی۔[5] مردان علی خاں مبتلا بھی فدوی کو "خود پسند اور برخود غلط"[6] بتاتے ہیں۔ غرض نہ صرف تذکرہ نگاروں کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ اکثر ابتدا

۱۔ طبقات الشعرا۔ کریم الدین، ص ۱۰۵

۲۔ مجموعۂ نغز، جلد ۱، ص ۳۰۴

۳۔ دستور الفصاحت، ص ۷۶

۴۔ ایضاً، ص ۲۷

۵۔ گلشن ہند، ص ۱۹۰

۶۔ گلشنِ سخن، ورق ۴۰ ب

دوسری طرف سے ہوتی تھی۔ بلکہ خود سودا کی ہجوؤں میں بھی اس کے شواہد موجود ہیں۔ ایک ہجو یہ غزل کے اشعار ہیں۔

بعضے ایسے بھی ہیں نا معقول ہے جن کا سخن
اپنی شہرت ہونے کی سمجھیں ہیں وہ تدبیر جنگ
پوچ گوئی سے نہیں ہٹتے بہ میدانِ سخن
کرتے ہیں گویا وہ جڑ کر پاؤں میں زنجیر جنگ
یحد گر ہوتا ہی ہے سقم سخن پر اعتراض
اس پہ کیا لازم جو کیجے ہو گریباں گیر جنگ
ابرو و مژگاں کے مضموں میں کرے جوان کے دخل
کرنے یہ اُس سے لگیں ناداں بہ تیغ و تیر جنگ
میں تو ہوں حیران اب ان شاعروں کی وضع پہ
کرتے پھرتے ہیں جو پڑھ پڑھ شعر بے تاثیر جنگ
ایک ان میں سے لگا سودا کے آگے پڑھنے شعر
واسطے اتنے کہ تا کیجے بایں تزویر جنگ
سن کے یہ بولا خدا کے واسطے کیجے معاف
میں تو ہوں شاعر غریب اور آپ ہیں شمشیر جنگ

کسی نے سودا کی ہجو کہی۔ سودا اسے جواب دیتے ہیں۔

گر ہجو میری کہنے سے اس پہ ہو نگاہ
نا یہ بھی کہے جانے مجھے خلق اللہ
سو دہم تمھارا ہے میں اور آپ کی ہجو
لاحول ولاقوۃ الا باللہ

میر تقی نامی دہلی میں ایک مرثیہ گو شاعر تھے۔ انھوں نے سودا پر اعتراضات کیے۔ سودا نے سبیل ہدایت میں ان اعتراضات کا ذکر کیا ہے۔

آپ کے ہوتے جب کسی کے حضور
مرثیہ کہنے کا ہوا مذکور
واں یہ بولی زبانِ سحر طراز
حق میں اس بے زباں کے بندہ نواز
ریختے کی جو وہ کہے ہے غزل
لفظ و معنی میں اس کے کم ہے خلل
مرثیوں کے سنے جو کتنے بند
بندش ان کی نہ آوے اپنے پسند
معنی ان کے تب آویں فہم کے ہاتھ
شرح لکھدے جو مرثیہ کے ساتھ

ظاہر ہے کہ سودا کب اعتراضات برداشت کر سکتے تھے۔ انھوں نے اگرچہ میر تقی کی ہجو نہیں کہی لیکن اُن کے مرثیہ پر بھرپور تنقید کر کے انھیں نا اہل ثابت کر دیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ اکثر و بیشتر پہلے زیادتی دوسری طرف سے ہوتی تھی۔ لیکن ایسی بھی مثالیں موجود ہیں جن میں سودا نے ابتدا کی۔ ضاحک اکثر لوگوں کی ہجو کرتے تھے۔ یہی بات سودا کو ناگوار تھی۔ انھوں نے ضاحک کی ہجو لکھی اور پھر ضاحک نے بھی جواب دیا۔ میر علی ہاتف نے حکیم آفتاب کی ہجو کہی تھی۔ سودا کو یہ بات بھی ناگوار گذری اور انھوں نے میر علی ہاتف کی ہجو کہہ دی۔

ایک بار انشاء اللہ خاں انشا کے والد ماشاء اللہ خاں مصدر سے ملنے گئے۔ کچھ بات ناگوار گذری اور سوداؔ نے ان کی ہجو کہہ دی۔

سوداؔ اور قیام الدین قائمؔ

قائمؔ کو سوداؔ سے تلمذ تھا۔ اسی لیے قائمؔ نے اپنے تذکرے میں سوداؔ کا ذکر بہت ادب اور احترام سے کیا ہے۔ بلکہ سوداؔ کو حضرتم لکھا ہے۔ بقول قاضی عبدالودود قائمؔ سوداؔ کا عقیدت مند شاگرد تھا۔ سوداؔ کی مدح میں جو قصیدہ قائمؔ نے لکھا ہے۔ اس کے دیوان (نسخۂ انڈیا آفس) میں موجود ہے۔ سوداؔ کی وفات کے بعد قائمؔ نے ایک غزل کہی تھی جس کی ایک بیت ہے۔

پڑھیے کس کا سخن کہ دل سے مٹے
داغ مرزا رفیع سوداؔ کا[1]

لیکن کلیاتِ سوداؔ میں ایک مثنوی ہے جس کا عنوان ہے مثنوی بطور ساقی نامہ در ہجو میاں فوقی۔

قدرت اللہ قاسمؔ نے لکھا ہے کہ یہ مثنوی سوداؔ نے قائمؔ پر کہی ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ قائمؔ پہلے ہدایت اللہ ہدایتؔ کے شاگرد تھے۔ کسی بات پران بن ہوگئی۔ قطع تعلق کر لیا اور استاد کی ہجو کہی۔ قاسمؔ نے قائمؔ کے تین شعر بھی نقل کیے ہیں۔ قائمؔ سوداؔ کے شاگرد ہوگئے اور بقول قاسمؔ خباثتِ اصلی کی وجہ سے ان کی شاگردی سے بھی پہلو تہی کی۔ سوداؔ نے ان کی ہجو میں ایک ساقی نامہ کہا۔ بعد میں قائمؔ کے معافی مانگنے پر ہجو پر ایک فرضی نام فوقی ڈال دیا گیا۔[2]

۱۔ اردو ادب، اکتوبر ۱۹۵۰ء، ص ۱۵۳

۲۔ مجموعۂ نغز، ۲، ص ص ۸۲۔۸۳

اس مثنوی کے مطالعہ سے یہی پتا چلتا ہے کہ زیادتی قائمؔ کی تھی۔ انھوں نے ہی پہل کی تھی۔ سوداؔ نے صرف جواب دیا ہے اور ظاہر ہے کہ سوداؔ جیسا قادر الکلام شاعر جب جواب دینے پر آئے گا تو کیا کچھ نہ کہے گا۔ چند تمہیدیہ اشعار کے بعد سوداؔ اصل موضوع پر اس طرح آتے ہیں۔

ٹک میاں فوقی کے گھر تک اے صبا
کہہ سلامِ شوق تو جا کر مرا
بعد ازاں کہیو کہ اتنا بھی غرور
شاعری کے فن میں کرنا کیا ضرور
اوروں کو بکری کہو شیر آپ کو
بکری بھی گر کچھ کہے پھیر آپ کو
بات بکری کی لگے تم کو بُری
دوڑو تم اس پہ قلم کی لے چھُری

ان اشعار سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا قائمؔ کی طرف سے ہوئی تھی۔ سوداؔ کہتے ہیں کہ عام زندگی میں وہ بکری ہی سہی لیکن میدانِ سخن کے وہ مرد ہیں۔ جس میں قائمؔ کی حیثیت مبتذل بند اور ایک عالم کے چور کی ہے

گرچہ میں بکری ہوں تم شیر جری
پر قلم کی تیغ کاغذ کی پھری
پاس اس عاجز کے بھی ہر آن ہے
دیکھ لو یہ گو ہے یہ میدان ہے
کیا قصیدہ کیا غزل کیا قطعہ بند
جو ردیف و قافیہ کیجے پسند

آپ کہہ کر مجھ کو بھی فرمایئے
جس کو جی چاہے اسے دکھلایئے
گھر میں شیخی کرنی کچھ رکھتی ہے مول
گُھیا میں گڑ پھوڑنے سے کیا حصول

اس کے بعد سوداؔ نے قائمؔ پر الزام لگایا ہے کہ قائمؔ نے سارے مضامین دوسرے شاعروں کے چرائے ہیں۔

ہو گیا ظاہر جو کچھ تھا تم میں زور
مبتذل بند اور ایک عالم کے چور

آخر میں سوداؔ نے قائمؔ کی ایک غزل کے کچھ اشعار پر تنقید کی ہے۔ پوری مثنوی میں سوداؔ نے کہیں تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

سوداؔ اور ندرتؔ کاشمیری

ندرت فارسی کے شاعر تھے۔ ناصرؔ لکھنوی نے لکھا ہے: "مولوی ندرتؔ کاشمیری کہ فاضل اور علامہ عصر تھا۔ اُس (سوداؔ) کے مقابلے میں ایسا شرمندہ ہوا کہ ترکِ دہلی کے سوا کچھ بن نہ آیا۔ ایک شعر مولوی ندرتؔ کی غزل کا کہ سوداؔ کی خدمت میں ہے، لکھا جاتا ہے۔

خود بخود در جنگ باشد آں رفیع پست قدر
سربسر سودائے خود از جہل صفرا ریختہ[1]"

سوداؔ نے اسی غزل کو مخمس میں تضمین کر کے ندرتؔ کی ہجو کر دی۔ یہ ہجو کلیاتِ سوداؔ میں موجود ہے۔ اس مخمس کے پہلے بند میں سوداؔ نے ندرتؔ پر

۱۔ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (قلمی)

الزام لگایا ہے کہ ان کے شعر ناموزوں ہوتے ہیں۔ دوسرے بند سے پتا چلتا ہے کہ ان دونوں کا اختلاف کسی حسین کی وجہ سے تھا۔ بند یہ ہے۔

قاضی اور کوتوال سے لے جاتے ہیں تا بصدر
جنگ کا مبدا ہے تیرے گھر وہ رشک ماہ بدر
پھر مجھے کہتا ہے اے بھڑوے تو یہ از راہِ عذر
خود بخود در جنگ باشد آں رفیع پست قدر
سر بسر سودائے خود از جہل صفرا ریختہ

مگر یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ہجو میں خواہ مخواہ بھی اس قسم الزامات لگائے جاتے ہیں اور ممکن ہے کہ سودا کا اشارہ دخترِ ندرت کی طرف ہو۔ ایک مخمس اور ایک مسدس اور ہیں۔ مخمس ندرت کی ہجو میں اور مسدس ندرت کی دختر کی۔ ندرت کی ہجو میں سودا نے طرح طرح کے مشورے دیئے ہیں۔ جن میں سے سب سے اہم یہ ہے۔

ایسی غزل کا عرس میں تم سے جو انصرام ہو
بحر میں جس کی ہر طرح شبہ خاص و عام ہو
تقطیع اس کی جس کنے صبح سے تا بہ شام ہو
اس کی طرف سے آخرش تم کو یہی پیام ہو
گھوڑے کو دو نہ دو لگام منہ کو تنک لگام دو

مسدس میں سودا نے دخترِ ندرت کے حسن و شباب کی تعریف کی ہے کلیات سودا میں ایک رباعی بھی ہے جس میں سودا نے ندرت پر وہی الزام لگایا ہے کہ شعر ناموزوں کہتے ہیں۔

رباعی ملاحظہ ہو۔

گر ہجو پہ سودا کے اسے رغبت ہے
ہونے دو کہ گیدی کے تئیں رجعت ہے
موزوں نہ کرے شعر کو اپنے احمق
کرتا پھرے ہجو لوگوں کی یہ ندرت ہے

مرزا مظہر

مرزا مظہر نقشبندی سلسلے کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ بیشتر تذکرہ نگاروں نے بہت ادب اور احترام سے ان کا ذکر کیا ہے۔ خود سودا نے ان کی وفات پر قطعۂ تاریخ کہا تھا۔ لیکن سودا نے ان کی بھی ہجو کہی ہے۔ غالباً مرزا مظہر خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ سودا کی ہجو چار شعر کی ہے جس میں مرزا مظہر پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ان کا شعر فارسی ہے نہ اُردو۔ بلکہ باٹ کا روڑا ہے۔

مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ
سودا یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا
آگاہ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ
واقف جو ریختہ کے ذرا ہووے ٹھاٹ کا
سن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ
اور ریختہ بھی ہے تو فیروز شہ کی لاٹ کا
القصہ اس کا حال یہی ہے جو سچ کہوں
کتا ہے دھوبی کا کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا[1]

۱۔ آخری مصرع کے محاورے سے فائدہ اُٹھا کر آزاد لکھتے ہیں۔ نکتہ اس میں یہ ہے کہ مرزا صاحب نے ایک دھوبن گھر میں ڈالی تھی۔ (آبِ حیات، ص ۱۴۳) یہ نکتہ غالباً آزاد کے ذہن کی اختراع ہے۔ اس کا کوئی اور ثبوت نہیں ملتا۔

بقا اور سودا بعض تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ بقا نے پہلے سودا کی ہجو کہی۔ بقا نے میر اور مرزا دونوں کی ہجویں ایک ساتھ کہی ہیں۔ ان کا پانچ اشعار کا ایک قطعہ ہے۔

عیب ہے گرچہ کثرت یک لفظ
سخن فارسی سے تا ہندی
پر جدا ہے تمام عالم سے
طرزِ سودا و وضع میر تقی
یعنی وہاں لفظ تو ہے بر کُن شعر
ہے ہے سے یہاں کلام کی بھرتی
کھول دیوان دونو صاحب کے
اے بقا ہم نے بھی زیارت کی

۱۔ کمال نے ان کا نام محمد بقا (تذکرہ کمال، ورق ۱۰۰ ب) اور ذکا نے محمد بقا اللہ خاں لکھا ہے (عیار الشعرا، ورق ۳۱ الف) غالباً ذکا کا بیان درست ہے کیونکہ بقا کے والد کا نام حافظ لطف اللہ خوش نویس اکبر آبادی تھا (خوش معرکہ زیبا۔ قلمی) ذکا نے لکھا ہے کہ تلاشِ روزگار میں شاہجہاں آباد سے لکھنؤ چلے گئے ہیں (عیار الشعرا، ورق ۳۱ الف) ۱۲۰۶ھ میں حج کے لیے روانہ ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ (تذکرہ کمال ورق ۱۰۰ ب)۔ ناصر لکھنوی کے بیان کے مطابق آخری عمر میں دیوانے ہو گئے تھے۔ جب حالت ٹھیک ہوئی۔ تو زیارت کے لیے روانہ ہو گئے۔ ناصر ہی کا بیان ہے کہ ان کا پہلے غمیں تخلص تھا۔ شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے تو انھوں نے بقا تخلص قرار دیا۔ خوب چند ذکا لکھتے ہیں کہ فارسی میں انھیں محمد فاخر مکین اور اردو میں شاہ حاتم سے تلمذ تھا۔

شعر سودا و میر کے دیکھے
وہ تو توتو کریں ہیں یہ ہی ہی

قدرت اللہ قاسم، ناصر لکھنوی وغیرہ نے دو شعر نقل کیے ہیں۔ جو بقا نے میر اور مرزا کی ہجو میں کہے تھے۔

مرزا و میر دونوں باہم تھے نیم ملّا
فن سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا
اس واسطے بقا اب، ہجوؤں کی ریسماں سے
دونوں کو باندھ باہم میں نے کیا ہی پورا[2]

مگر حیرت ہے کہ کلیاتِ سودا میں بقا پر کوئی ہجو نہیں۔ شاید سودا نے بقا کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ یا ممکن ہے کہ سودا کی کہی ہوئی ہجو دست بردِ زمانہ کی نذر ہوگئی ہو۔ میری نظر سے کلیاتِ سودا کے قلمی نسخوں میں بھی بقا پر کوئی ہجو نہیں گزری۔ یہ معرکہ لکھنؤ میں ہوا تھا جیسا کہ مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں لکھا ہے۔

۱۔ یہ اشعار تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ تذکرہ کمال اور تذکرہ خوش معرکۂ زیبا دونوں میں موجود ہیں۔ البتہ تیسرا شعر تذکرہ کمال میں نہیں ہے۔

۲۔ شاید بقا کو میر اور مرزا کی شہرت اور مقبولیت ناگوار گزرتی تھی۔ کمال نے بقا کا ایک قطعہ نقل کیا ہے۔ جس میں وہ اپنے ریختہ کو رشکِ غزلِ سودا بتاتے ہیں۔ س

یہ میرا ریختہ رشکِ غزلِ سودا ہے
لیکن اس پر بھی بقا کو یہ گماں ہے کہ نہیں
بس مجھی کو نظر آتا ہے یہ نعل بے جرم
تم بھی ٹک دیکھو صاحب نظراں ہے کہ نہیں

میر تقی اور سودا

میر تقی کا ذکر سودا کی ہجو گوئی کے تحت نہیں آنا چاہیے تھا کیونکہ سودا نے ان کی ہجو نہیں کہی بلکہ اُن کے ایک مرثیے پر اعتراضات کیے ہیں۔ یہ اعتراضات ایک مثنوی سبیل ہدایت کی شکل میں ہیں۔ چونکہ یہ ادبی معرکہ تھا۔ اس لیے اس کا ذکر یہاں کیا گیا۔

میر تقی دہلی کے رہنے والے تھے اور بحیثیت مرثیہ گو انھیں اچھی خاصی شہرت حاصل تھی۔ سبیلِ ہدایت سے پتا چلتا ہے کہ پہل انھوں نے کی تھی۔ بقول سودا۔

سو زبانی تمھاری اے مخدوم
ہوا اپنے تیئں کو یوں معلوم
مرثیہ وہ جسے عوام الناس
روئیں سُن سُن پڑھیں جب ان کے پاس
اور سودا کا مرثیہ سُن کر
چپ ہی رہ جاؤں ہوں میں سر دھن کر
کیسی ہی طرح کوئی اس کی بنائے
لیکن اس پر کبھو نہ رونا آئے
بارہا یہ سخن ہوا ظاہر
حق میں بندے کے غائب وحاضر

سودا اس قسم اعتراضات سننے کے عادی نہیں تھے۔ انھوں نے میر تقی کا ایک مرثیہ حاصل کیا اور اس کے ایک ایک شعر پہ دل کھول کر تنقید کی۔ پہلے ہی شعر پر سودا نے انتیس[۲۹] اشعار میں تنقید کی ہے۔ پہلے ان کے مرثیے کا شعر پیش کیا ہے اور پھر اس پر تنقید کی ہے۔ (اسی مثنوی کے درمیان میں

سودا نے اُردو نثر بھی لکھی ہے)

میر تقی کا ایک شعر ہے۔

اے تصدق یہ پدر یہ مادر اور یہ جدِ پاک
ختم ہے تم پر یہ سب صاحب کمالی السّلام

سودا اعتراض کرتے ہیں۔

گر نہیں جانتے تو سن لو اب
ساتھ اوس کے ہے جس کا نام و نسب
گر تعلق کمال کا ہوتا
پسرِ نوح باپ سا ہوتا
منحصر کچھ نہیں نسب پہ کمال
جس پہ ہو فضل ایزد متعال
بندشِ الفاظ کی غلط اس کی
بری ہے معنی کی نمط اس کی
پیش مصرع میں لفظ "یہ" سے مراد
آپ کو ہے بزرگیٔ اجداد
پر نکلتا ہے اس سے یوں بیکد
سب تصدق پدر سے لے تا جد

میر تقی کا شعر ہے۔

ہے گریباں گیر گردوں تیرے لشکر کا لہو
تا قیامت کم نہیں ہوتی ہے لالی السّلام

سودا اعتراض کرتے ہیں۔

خوں سوا ایسی جا ہیں لفظ لہو
نہیں آتا محاورے میں کبھو
اور لالی کا حرف کر دو حک
ہو نہ ثابت شفق سے یہ جب تک
تا نہ تشبیہ ہو شفق کی یہاں
معنی جو چاہو اس میں تم سو کہاں

میر تقی کا شعر ہے۔

اے ہو الاوّل ہو الآخر کے مالک بالیقیں
وے ہو الظاہر ہو الباطن کے والی السّلام

سوؔدا معترض ہیں۔

کیا ہو الاوّل و ہو الآخر
کیا ہو الباطن و ہو الظاہر
حق کی جانب پھرے ہے ان کی ضمیر
اس سوا جس پہ کہیے ہے تکفیر
کیا یہ خاطر میں آپ کے آیا
مالک اس کا حسینؑ ٹھہرایا

اس طرح سوؔدا نے میر تقی کے صرف چند اشعار پر اعتراضات کیے ہیں اور عام طور پر سوؔدا حق بجانب ہیں۔

میر تقی میر اور سوؔدا

میر نے نکات الشعرا میں سوؔدا کی بہت تعریف کی ہے۔ اُن سے متعلق لکھا ہے.... خوش خلق، خوش گو، گرم جوش یار باش، شگفتہ رو نوجوان ہے..... غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی

سب خوب کہتا ہے۔ وہ سرآمد شعرائے ہندی ہے۔ بہت خوش گو ہے......
چنانچہ ریختہ کا ملک الشعرا اسی کو ہونا چاہیے! انھوں نے نہ صرف نثر بلکہ نظم میں بھی سودا کی فنی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی
گیا ہو میر دیوانہ رہا سودا سو مستانہ

میر کی ایک ہجو ہے جس کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز و طور
اب چنانچہ میر و مرزا کا ہے دور

سودا نے بھی میر کی اوستادی تسلیم کی ہے۔

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ
ہونا ہے تجھ کو میر سے اوستاد کی طرف

سودا نے ایک مثنوی میں بھی میر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

کیا رہا ہے مشاعرہ میں اب
لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں
میر و مرزا رفیع و خواجہ میر
کتنے یہ اک جوان ہوتے ہیں

لیکن ان دونوں کے کلام میں ایک دوسرے کے خلاف بھی اشعار ملتے ہیں اور یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ابتدا کس نے کی۔ سودا کا شعر ہے۔

نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے
وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا سمجھے

۱۔ نکات الشعرا، ص ۲۳۱

میر کا شعر ہے۔

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یوں ہی سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

بات صرف شعروں تک نہیں رہی بلکہ دونوں نے ایک دوسرے کی باقاعدہ ہجویں بھی کہیں اور اس کی ابتدا غالباً میر ہی کی طرف سے ہوئی۔ سودا کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا۔ میر کو یہ بات بہت ناگوار تھی۔ انھوں نے سینتیس[۲] اشعار کی ایک ہجو کہی۔ جس میں سودا کو بہت برا بھلا کہا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اک جو بچر کو رزق کی وسعت سی ہوگئی
تنگی کی حوصلے نے تو رجعت سی ہوگئی
کتوں کے ساتھ کھانے لگا کتوں سے معاش
بھچڑی کی طرح شام و سحر کتوں کی تلاش
کتے ہیں پاس کتے ہیں جیب و کنار میں
کتے ہیں آستینوں میں کتے ازار میں
آواز دے دے کتوں کو توڑے ہے اپنی جان
مرجائے گا یہ بھونکتے ہی بھونکتے ندان

اس ہجو پر سودا کا نام نہیں ہے۔ بلکہ کلیاتِ میر مرتبہ آسی میں اس ہجو کا عنوان "ہجو عاقل نام ناکسے کہ بسگان انسے تمام داشت" ہے۔ کلیاتِ سودا میں اس کا جواب شامل ہے اور اس کے عنوان میں میر تقی میر کا نام بھی موجود ہے اصل عنوان ہے "مخمس در جواب طعنِ میر تقی کہ فی الحقیقت میر شیخ بودہ است" مخمس میں میر کو شیخ بتایا گیا ہے۔ میر نے سودا کو جو برا بھلا کہا تھا۔ اس سب کا جواب دیا گیا ہے اور آخر بند میں سودا نے الزام لگایا ہے کہ میر کو علتِ مشائخ ہے۔

تین بند ملاحظہ ہوں۔

کر شیخ زباں اپنی مری خبث سے کوتاہ
نے گل ہوں میں اس باغ میں نے خارِ سرِ راہ
خوبی سے نہ شہرہ نہ بدی سے ہوں بافواہ
مستے بُرہ میکدہ ہر شام و سحرگاہ
واقف نہ کسی سے میں نہ مجھ سے کوئی آگاہ

یہ سچ ہے جو کہتا ہے تو مجھ پر بھی یقیں ہے
کتّے کو کہے پاک سو وہ دشمنِ دیں ہے
لیکن وہ سگِ نفس نجس اس سے کہیں ہے
تجھ پر جو ہر اک لحظہ و ہر آن تعیں ہے
تو اس کا نہ کہنا کرے تب پاک ہے واللہ

سودا بزبان جز سخن راست نہ لاوے
احمق ہو جو تجھ سا کوئی تو اس کو نہ بھاوے
کتّے کا ملوث تو نہا پاک ہو آوے
علّت کی مشائخ کے جو دھوئے سے نجاوے
خالی کریں دھو دھو اُسے زمزم کا اگر چاہ

سودا نے میر کی ایک اور ہجو کہی ہے۔ جس میں سودا کا فنِ ہجو گوئی معراج پر ہے۔ نو اشعار کے اس ہجویہ قطعہ میں سودا کہتے ہیں۔ ایک دن میں ایک مشفق کے گھر گیا۔ ان کے ہاں ایک بزرگ کاتب تھے۔ بیچارے بہت پریشان تھے انھوں نے سودا کو اپنی مصیبت کا حال ان الفاظ میں سنایا۔

ایک مشفق کے گھر گیا تھا میں
سنو ٹک نقل یہ عجائب ہے
ان کے گھر میں سا ہے ایک مردِ بزرگ
خوشنویسی کے فن سے کاسب ہے
راقم سر نوشت کا اس کو
ہے بجا گر کہوں کہ نائب ہے
کہنے لاگا وہ آ کے مجلس میں
آہ یہ نفسِ شوم غالب ہے
ورنہ لکھنے سے ہاتھ اٹھاؤں میں
کیا کروں فکرِ قوت واجب ہے
میں جو پوچھا سبب کہا مت پوچھ
بات کہنی یہ نا مناسب ہے
لیکن اس واسطے میں کہتا ہوں
درد سننے کا تو جو طالب ہے
ہے جو کچھ نظم و نثر عالم میں
زیرِ ایرادِ میر صاحب ہے
ہر ورق پر ہے میر کی اصلاح
لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے

معلوم ہوتا ہے کہ میر اور سودا کی معاصرانہ چشمکیں بہت معمولی رہیں۔ کیونکہ ترکِ وطن کے بعد جب سودا کو اپنا وطن اور اہلِ وطن یاد آتے ہیں تو میر صاحب کی یاد انھیں خاص طور پر پریشان کرتی ہے۔ ان کے اشعار ہیں۔

ہمیں لے آئی ہے شہرِ غریب جس دن سے
کبھو انھوں کی طرف سے نہ نامہ و پیغام
علی الخصوص تغافل کو میر صاحب کے
کہوں میں کس سے کہ با وصفِ تمام
لکھا نہ پرچۂ کاغذ بھی اتنی مدت میں
کہ بے قراروں کو تا ہووے موجبِ آرام

میرے خیال سے میر اور سودا نے ایک دوسرے کی ہجو اسی وقت تک کہی جب تک سودا دہلی میں تھے۔ میر کی ہجو کا ایک مصرع ہے۔

دلی میں تین کتیاں کہیں لے کے پالیاں

بعض محققین نے اس مصرع کے پیشِ نظر یہ ثابت کیا ہے کہ ہجو سودا کے ترکِ وطن کے بعد کہی گئی۔ حالانکہ اس مصرع سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔

فدوی اور سودا

اکثر تذکرہ نگاروں نے اس معرکے میں فدوی کو قصوروار ٹھہرایا ہے۔ علی لطف نے لکھا ہے کہ فدوی برخود غلط آدمی تھا۔ مرزا محمد رفیع سودا سے مباحثہ کرنے فرخ آباد آیا اور ذلت اُٹھائی [۱]۔ اس معرکے میں سودا کے ساتھ ان کے ایک شاگرد فتح علی شیدا بھی شریک تھے۔ کلیاتِ سودا میں ان کی ایک مثنوی" در ہجو فدوی متوطن پنجاب کہ در اصل بقال بچہ بود " بھی شامل ہے۔ سعادت خاں ناصر لکھنوی نے لکھا ہے کہ سودا نے فدوی کی ہجو" قصہ بوم اور بقال کا" لکھی ہے۔ حالانکہ یہ ہجو سودا کی کہی ہوئی نہیں بلکہ ان کے شاگرد فتح علی شیدا کی ہے۔ اس کا ثبوت اول تو

۱۔ گلشنِ ہند، ص ۱۹

مثنوی کے بعض اشعار ہیں اور دوسرے بعض تذکرہ نگاروں مثلاً میر حسن، قدرت اللہ شوق اور علی لطف نے لکھا ہے کہ اس کے مصنف شیدا ہیں۔[1] اس مثنوی سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ پہلے فدوی اور شیدا میں معرکہ ہوا تھا اور سودا بعد میں میدان میں آئے ہیں۔ فدوی کی عادت تھی کہ ہر ایک کے شعر پر اعتراض کرتے تھے۔ اور اپنی بیاض کو جامی کے دیوان سے بھی بہتر سمجھتے تھے۔ شیدا لکھتے ہیں۔

شعر پہ ہر ایک کے کرتے ہیں وہ اعتراض
جامی کے دیواں سے خوب جانیں ہیں اپنی بیاض
سب پہ کرے ہے وہ طعن جتنے کہ استاد ہیں
شعر پہ میرے بھی اب ان کے یہ ایراد ہیں

شیدا نے کسی شعر میں "شیخ اور برہمن کو دین سے نسبت لکھا تھا"۔ اس پر فدوی نے اعتراض کیا کہ شیخ کا دین ہوتا ہے اور برہمن کا دھرم۔ شیدا اس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

شعر وہ میرا سنا جا کے انھوں نے کہیں
شیخ و برہمن کو ہے جس میں کہ نسبت بہ دیں
اپنی سخن فہمی پہ کہتے ہیں یہ ہو کے گرم
دین تو ہے شیخ کے اور برہمن کے دھرم

شیدا اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

۱۔ قاضی عبدالودود اسے سودا کی تصنیف مانتے ہیں۔ تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو۔ "سودا کا الحاقی کلام"۔

سن کے غرض میں یہ بات بولوں جو جل بھن کے اب
کھول کے ٹک گوش فہم سن لیں یہ احباب سب
میری زبانی انھیں یہ جو ہیں قرآن خواں
پوچھے تو اتنا کوئی تم میں سے اے مہرباں
آیۂ قرآں کو کیوں دھولئے ڈالو ہو تم
کافروں کو ہے خطاب جس میں لکم دینکم
دونوں پہ اطلاق دیں از روئے قرآن ہے
خواہ برہمن کوئی خواہ مسلمان ہے
شیخ ہی سے سمجھے ہو دین کی نسبت فقط
اپنی زلیخائی پر کتنے ہو بر خود غلط
دین اگر ہووے ایک جمع نہ ادیان ہو
دو ہی نہ سمجھے اسے ان سا جو نادان ہو

اس کے بعد شیداؔ نے ایک نقل بیان کی ہے۔ جس میں ایک بنیئے اور الّو کا قصّہ بیان کر کے فدوی کو الّو بنایا ہے۔ کلیاتِ سوداؔ میں اس مثنوی کے بعد پانچ اشعار کی ہجو ہے۔ جس میں سوداؔ نے لکھا ہے کہ فدوی کو شعر و شاعری سے تو کوئی سروکار ہے نہیں۔ استادانِ فن سے خواہ مخواہ لڑتا بھڑتا ہے۔ حسرت سے دھول دھپا کرتا ہے۔ اس قطعہ کا آخری شعر ہے۔

گر شاعری یہی ہے دھولیں تو کیا ہیں اک دن
پاپوشیں کھا کسو سے تڑ وا دے گا یہ کلّا

کلیاتِ سوداؔ میں ایک اور ہجو "ہجوِ فدوی" کے نام سے ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ سوداؔ کے فرخ آباد چھوڑنے کے بعد تک یہ معرکہ جاری رہا۔ کیونکہ

ایک بند میں سودا کے فیض آباد پہنچنے کا ذکر ہے۔

سُن بے الّو پہونچ کے بنگالے
مادہ سگ آپ کو تو بنوالے
میرے تئیں گو ہے بسکہ ذوق بہ سگ
سگ بہت خوب میں نے ہیں پالے
اپنے شاگرد ڈھونڈتا ہے عبث
سگ سے اک آکے تو گرہ کھالے
ایسے شاگردوں سے کہیں بہتر
نکل آویں گے بھونکنے والے
صورتوں میں پڑیں گے رنگا رنگ
لال طوسی سفید اور کالے
چاہے الّو ہی تو رہے بن کر
خلق شاگرد اپنے کر ڈالے
کس نیاید بزیر سایۂ بوم
در ہما از جہاں شود معدوم

اس ہجو کے پہلے بند سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اصل جھگڑا فدوی اور سودا کے شاگرد شیدا کا تھا۔ سودا لکھتے ہیں۔

فدویا بولے ہے میں ہوں استاد
میں کیا فنِ شاعری ایجاد
آکے شیدا جو ہے مرا شاگرد
گوشِ دل سے سنے مرا ارشاد

مرتبہ اس کے شعر کا ہو یہ
سخن اس کا سخن کے ہو استاد
رفتہ رفتہ سُنا یہ شیدا نے
کہا اس نے کہ خانماں برباد
معنی کے گھر کو تو نے ویراں کر
پھینک دی اس کی کھود کر بنیاد
کس طرح سے میں ہوں ترا شاگرد
بیت سعدی کی یہ مجھے ہے یاد
کس نیاید بزیر سایۂ بوم
در ہما از جہاں شود معدوم

سوؔدا نے نو بندوں کا ایک اور مخمس لکھا ہے۔ جس میں فدوی کو طرح طرح سے "اُلّو بنیئے کا" ثابت کیا ہے۔ اس مخمس کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

کیا ہے چرخ بنانے میں اسکے میں یہ ہنر
نہیں ہے اصلی و نقلی میں فرق ذرّہ بھر
جو اور بوم ہو سو مادہ یہ لگے وہ نر
جو راہ باٹ میں آتا ہے صبح و شام نظر
کہے ہے خلق وہ جاتا ہے اُلّو بنیئے کا

نظر کرو تو کہ ذرّہ بھی بھڑوے میں ہے شعور
جو ملنے سے کس و ناکس کے ہوئے ہے مغرور
کسی کو صحبت شعر اس سے کچھ نہیں منظور
ہوئی ہے بسکہ یہ صنعت گری مری مشہور
ہر ایک دیکھنے آتا ہے اُلّو بنیئے کا

فدوی نے سوداؔ اور شیداؔ کی جو ہجویں کہی تھیں، وہ اب نہیں ملتیں۔ البتہ محمد حسین آزادؔ نے آب حیات میں تین مصرعے نقل کیے ہیں۔ جو بقول آزادؔ فدویؔ نے سودا کی ہجو میں کہے تھے۔

کچھ کٹ گئی ہے بیٹی کچھ کٹ گیا ہے ڈورا
دُم داب سامنے سے وہ اڑ چلا لٹورا
بھڑوا ہے مسخرا ہے سودا اسے ہوا ہے

جعفر علی حسرت اور سودا

ان دونوں کا کوئی باقاعدہ معرکہ نہیں ہوا۔ جن دنوں سوداؔ فرخ آباد میں تھے شاید حسرت بھی وہاں تھے۔ کیونکہ سوداؔ نے فدویؔ کی ہجو میں ایک شعر یہ بھی کہا تھا۔

حسرت سے دھول دھپا لڑتا ہی شاعری پر
یاں تک کہ فخر اپنا کرتا ہے یہ بلّلا

ناصرؔ لکھنوی نے تذکرہ خوش معرکۂ زیبا میں لکھا ہے کہ "جب تمام ہندوستان میں سودا کی شہرت ہوئی اور حسرت کا بازار ٹھنڈا رہا تو اس نے مرزا رفیع پر اعتراض کرنا شروع کیا۔ سوداؔ نے نواب شجاع الدولہ بہادر کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک مصرع ہے۔ ع

نورِ خورشید ہو جس طرح سے شب کو زائل

بہ سبب ریاضی دانی کے اس پر یہ اعتراض کیا کہ نور خورشید کا شب کو زائل نہیں ہوتا۔ اس مکابرہ میں تفضیل حسین خاں مدعی اور مدعا علیہم ہوئے خاں صاحب نے کہا نور خورشید کا زائل ہونا تاریکیٔ شب سے اور ثابت اور فروع کوکب اس پر حجت ہے۔ ایک دن میر سوزؔ نے مرزا رفیع سوداؔ سے کہا ہم حسرتؔ کو آپ کی طرف ناصاف اور ہر بات میں خلاف پاتے ہیں۔ کچھ ہجو

سے اوس کو مالش دیا چاہیے اور معترف اپنے قصور اوسے کیا چاہیے۔ سودا نے فرمایا میں اوس کی ہجو کرتا ہوں جو شاعر ہو نہ کہ ایسے شاعر کی یہ رباعی تمہارے نام سے کہی جاتی ہے۔ اوس کی تنبیہ کو کافی ہوگی۔

کیوں سوز پہ حسرت کا نہ دل ہووے پسند
ہے شعر کی گرمی کا دھواں اس کی بلند
حسرت اوسے کیوں نہ ہووے شاعر بے سوز
عطار کا لونڈا ہے وہ ماٹھو گل قند[۱]

میر سوز اور سودا بعض شواہد سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سوز اور سودا کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ جب سودا نے فرخ آباد سے عزم سفر کیا تو میر سوز کے سرپرست اور شاگرد مہربان خاں رند کے دیوان اور اشعار کی تعریف کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے۔

شعر کی بحر میں ترا اوستاد
کشتیٔ ذہن کو ہے بادِ مراد
لیک خدمت میں تیری اتنی عرض
کرنی اس خیر خواہ کو ہے فرض
اس کو ہر طرح تو غنیمت جان
پھر ملے گا نہ سوز سا انسان

میں نے دیوانِ سوز کے تین چار قلمی نسخے دیکھے ہیں مگر کسی میں ایک

۱۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلمی)۔ سودا نے حسرت کی ہجو میں غزل کہی ہے جس کا مطلع ہے

بھدنے کا آندھی سے اڑا ڈھیر ہوا پر ہر مرغ اسے کھا کے ہوا سیر ہوا پر

شعر بھی ایسا نہیں جو سودا کی ہجو میں کہا گیا ہو۔ خود کلیاتِ سودا مرتبہ آسی میں بھی سودا کا ایسا کوئی شعر نہیں۔ البتہ بعض تذکروں میں یہ شعر ملتا ہے۔

سودا یہ سخن کے تیر انظم کلام
کہتی ہے سوز کی استادی ہائے ہائے (؟)

مرزا فاخر مکیں اور سودا

سودا کے شاگرد نے ایک ہجو میں لکھا ہے:

سودا و مکیں میں پڑی اوس سے ہے لڑائی
تھے ورنہ بہم پیش ازیں جوں شکر و شیر

اس شعر سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے ان دونوں کے تعلقات بہت اچھے تھے عبرت الغافلین سے اس معرکہ کے بیشتر حالات کا علم ہوتا ہے۔ اشرف علی خاں ایک با اخلاق مہذب اور عمدہ گھرانے کے فرد تھے۔ انھوں نے طویل عرصے کی محنت سے فارسی شاعروں کا ایک تذکرہ مرتب کیا۔ اور تصیح کے لیے فاخر مکیں کے پاس لے گئے۔ مکیں نے کہا کہ "ما را دماغ نیست خوب ایں کار را برائے خاطرِ شما بشرطے قبول کنم کہ اشعار تمام شعرائے ہند را از

۱۔ مطبوعہ کلیاتِ سودا میں ایک طویل ہجو ہے جس کا مطلع ہے۔

کیا حضرتِ سودا نے کی اے مصحفی تقصیر　　کرتا ہے جو ہجو اس کی تو ہر صفحے میں تحریر

بعض محققین اور ناقدین کو دھوکا ہوا کہ یہ قصیدہ خود سودا کی تصنیف ہے۔ حالانکہ اندرونی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سودا کے شاگرد کا کہا ہوا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ شاگرد کون تھا۔ قاضی عبدالودود نے مختلف دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ قصیدہ سودا کے شاگرد مرزا احسن کی تصنیف ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ اردو ادب، اکتوبر ۱۹۵۰ء، ص ص ۱۵۳- ۱۷۹

فیضی و غنی و ناصر علی و بیدل و سراج الدین علی خاں آرزو و میر شمس الدین فقیر گرفتہ یک قلم خط بکشم مگر تصحیح و انتخاب اشعار شعراے اہلِ ولایت خواہم نمود۔" اشرف علی خاں کو یہ منظور نہیں تھا، وہ تذکرہ واپس لے آئے اور شیخ آیت اللہ ثنا کے پاس لے گئے۔ شیخ مذکور نے چند جزو کی تصحیح کی تھی کہ انھیں لکھنؤ سے فیض آباد جانا پڑا۔ اشرف علی خاں مجبور ہو کر پھر مرزا فاخر کے پاس گئے۔ مرزا نے کہا میں اس نسخے کی تصحیح اس وقت کروں گا جب تم تحریری درخواست لکھ کر دو گے۔ اشرف علی خاں نے وہ تحریر لکھ کر دی۔ مرزا نے غصّے سے وہ تحریر پھینک دی اور کہا جو کچھ میں کہوں وہ لکھو۔ چنانچہ اشرف نے مجبوراً وہ تحریر لکھی۔ جس کی عبارت تھی کہ میں پہلے بھی یہ تذکرہ مرزا فاخر کی خدمت میں لایا تھا مگر مصروف ہونے کی وجہ سے وہ تصحیح نہ کر سکے۔ مجبوراً تذکرے کے تیس جزو شیخ آیت اللہ ثنا کے پاس لے گیا کیوں کہ میں ان کی اوستادی تسلیم کرتا تھا۔ انھوں نے عرصے تک یہ تذکرہ دیکھا۔ انھوں نے غلطیوں کو صحیح سمجھا اور بعض غلطیوں کو اور بھی غلط کر دیا۔ اس لیے مجبوراً دوبارہ مرزا فاخر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کیونکہ آجکل اس شہر میں ان سے بڑا صاحبِ کمال کوئی نہیں ہے اور اُن سے تصحیح کی پھر درخواست کی۔[۱] (فارسی سے ترجمہ) اشرف علی خاں نے مجبوراً یہ عبارت لکھ کر دے دی۔ مرزا فاخر نے اکثر اساتذہ کے اشعار قلم زد کر دیئے بلکہ بعض کی اصلاح بھی کی۔ اشرف علی خاں نے جب یہ خبر سُنی تو بہت پریشان ہوئے اور وہ تذکرہ واپس لے آئے اور کچھ دن بعد سوؔدا کے پاس آئے۔ سوؔدا نے کہا کہ مجھے فارسی سے کچھ زیادہ علاقہ نہیں۔ آپ کسی اور کے پاس

۱۔ کلیاتِ سودا، مرتبۂ آسی، ص ص ۳۷۵ - ۳۷۶

لے جایئے۔ مگر وہ تذکرہ چھوڑ گئے۔ کچھ دن بعد سودا نے تذکرے کا مطالعہ کیا، تو انھیں بڑی حیرت ہوئی کیونکہ اکثر مشاہیرِ فن کے اشعار قلم زد تھے یا ان پر اصلاح کی گئی تھی۔ سودا کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور انھوں نے مرزا فاخر مکیں کی بد دماغی اور خود سری کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم کیا۔ "عبرت الغافلین" مکین کی اصلاحوں کا جواب ہے۔ مکین نے امیر خسرو، سعدی، مولانا روم، مولوی جامؔ، آہی سبزواری مولانا افسری، نعمت خاں عالی، مرزا صائب، امتیاز خاں خالص، خانِ آرزو محمد قلی سلیم طشتری وغیرہ کے اشعار قلم زد کیے۔ سودا نے عبرت الغافلین میں یہ تمام اشعار پیش کیے ہیں۔ فاخر مکیں نے جو اصلاحیں دی تھیں۔ سودا نے ان کا جائزہ لے کر اعتراضات کا جواب دیا ہے اور پھر خود فاخر کے کلام پر اعتراضات کیے ہیں۔

مرزا احسن نے جو مصحفی کی ہجو لکھی ہے۔ اس میں سودا اور مکین کے ادبی معرکے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اشرف علی خاں نامی با خلاق مہذب
تھے عمدہ گھرانے سے وہ ایک مرد بہ توقیر
تھا شعر کا شوق ان کو جوانی سے نہایت
مصروف اوسی میں رہے جب تک کہ ہوئے پیر
ایک عمر کے عرصہ میں بہت شوق و شغف سے
اون خاں نے کیا تھا غرض اک تذکرہ تحریر
مذکور سُنا فارسی گوئی کا مکیں کے
اشرف علی خاں نے جو با فواہ جماہیر
اس تذکرہ کو لے گئے القصہ وہ اوس پاس
تا دیکھے وہ اس تذکرہ کے شعر بتاخیر

دکھلایا جب اوس تذکرہ کو خاں نے مکیں کو
تب عذر دماغ اپنا بیاں کر وہ بہ تحریر
تصحیح رکھی اوس کی گئی شرط پہ موقوف
جو جو اسے منظور تھا لا اوس کو بہ تقریر
ہاتھ اپنے سے اک بند پہ لکھ اوس نے وہ شرطیں
جو باتیں کہ پائیں تھیں قرار اوس کی بہ تدبیر
پھر اوس نے کہا کیجے مہر اپنی اب اس پر
تا ہووے باسناد مزیّن بہ تحاریر

اشرف علی خاں کی یہ تحریر اپنے پاس رکھ کر مکیں نے تذکرہ کی اصلاح شروع کی۔ کچھ دن میں اشرف علی خاں کو خبر ملی کہ مکین نے اپنی شمشیر قلم سے بڑے بڑے مشاہیر کی گردنیں اُڑا دی ہیں۔ اُن کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور

پاس اوس کے سے القصّہ وہ بپیش آیہ خشونت
اوس تذکرے کو لائے اوٹھا سخت ہو دلگیر
لا گھر میں جو اوس تذکرے کے حال کو دیکھا
سودا کنے لا اوس کو لگے کرنے یہ تقریر
اس ظلم کا انصاف کرو، دو میری تم داد
میں ورنہ گریباں کو ڈالوں گا ابھی چیر

سودا نے انکساری سے کام لیتے ہوئے کہا کہ آپ واقعی انصاف کے طالب ہیں تو اُن لوگوں کے پاس جائیے جو فارسی کے استاد ہیں۔ میں تو ریختہ گو ہوں۔ سودا کا جواب سُن کر اشرف آزردہ ہو کر واپس چلے گئے لیکن تذکرہ وہیں چھوڑ گئے۔ مجبور ہو کر سودا اس تذکرے کی طرف متوجہ ہوئے تو انھیں

معلوم ہوا کہ فاخر مکیں نے اساتذہ فارسی کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔

دیکھی تو عجب طرح کا ہے قتل مچایا
ہاتھ اپنے میں لے اوس نے قلم کا تبر و تیر
اوستادوں کے وہ شعر کہ ہر حرف جنھوں کا
دیوان فصاحت کے کتابہ کی ہے تحریر
اوس کے تئیں کاٹا ہے بنایا ہے بگاڑا
ہر شعر کے معنی کو کیا ہے زبر و زیر
کاٹا کوئی مصرع کوئی مصرع ہے بنایا
بے معنی کوئی لفظ کہہ اوس کی لکھی تقریر
ٹھہرایا ہے بے معنی کوئی مصرعۂ اوستاد
مصرع کوئی بے معنی کہہ اس میں کیا تسطیر

اس کے بعد سودا کے اعتراضات کا ذکر کیا گیا ہے۔

مئی ۱۹۶۴ء کے معاصر میں "معارضۂ سودا اور مکین پر کچھ نئی روشنی" کے عنوان سے افسر الدولہ فیاض الدین حیدر کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ ان میں مکین کے ایسے تین خطوط کا تعارف کرایا گیا ہے جن سے اس معرکے پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ مکین نے قاضی لطف اللہ خاں ناطق کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔

دریں ایام عجب ہنگامہ روزے شد، مجملاً اینکہ یکے از ہندی گویان کہ بہ سودائے خام خود را رفیع القدر در مراتب کلام می داند از دو سہ سال اکثر آمدہ اظہار ہزار گونہ رسوخ و خلوص می کرد، درخواست تغیر و تبدل کلام فارسی خود می نمود آخر کار بجائے رسید کہ ہیچ قسم در

تائید درستی اعتقاد باقی نگذاشت، قبول نکردم، ارادہ مجلس ضیافت مع یاران ظاہر کرد بلطائف الحیل گذراندم وگفتم شما درکار خود ثانی ندارید دانند من درکوچہ وبازار ہزار کس ہرطرف پیدا می شود دست بردار از خیال خود بظاہر نبود، یکایک سلب ماہیت چنیں شد کہ قول دیوانہ،

مصرع شاگرد ہمہ عالم واستاد حزینم

بعمل آورد — وحال آنکہ اوّل چنیں گفتہ بود مصرع

استاد ہمہ عالم وشاگرد حزینم

ایں مصرع ظاہراً واکہ درحق شیخ علی حزیں علیہ رحمۃ گفتہ، القصہ حالا باوجود تجاہل وتغافل مخالفت ہا می کند۔ چنانچہ روزے پیش مختار الدولہ بواسطہ عزیزے استغاثہ کرد، باآنکہ روے ندیدنی فقیر را نواب معز اللہ ندیدہ بود۔ جواب داد کہ برما ثابت است کہ فلانے باہیچ احدے سروکار ندارد برخود شما شاں حکومت ما سزاوار نیست ۱

اس خط میں مکینؔ نے اشرف علی خاں کے تذکرے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بلکہ سوداؔ پر الزام لگایا کہ وہ مکینؔ کا تلمذ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ انھیں منظور نہیں تھا۔ اس لیے سوداؔ ناراض ہوگئے۔ میرا خیال ہے کہ مکینؔ نے حقیقت چھپائی ہے اور یہ محض الزام تراشی ہے کہ سوداؔ ان کا تلمذ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ یہ واقعہ سوداؔ کی آخری عمر کا ہے۔ اس وقت سوداؔ جیسے مشہور شاعر کو شاگرد بنانا کسی کے لیے بھی قابلِ فخر تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ فارسی میں سوداؔ کو شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی لیکن اردو میں تو انھیں جو مقام حاصل تھا۔ وہ صدیوں

۱۔ مکین کے خطوط کے حوالے معاصر حصہ ۱۹، مئی ۱۹۶۴ء سے لیے گئے۔

میں دوچار ہی کو ملتا ہے۔

بہر حال اس معارضہ نے اتنا طول کھینچا کہ مکین کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ وہ محمد راغب خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آتش در خانہ ناہنجار افتد کہ دریں تازگی خیلے با من کج باخت، بتاریخ دوازدہم شہر ذی قعد روز سہ شنبہ خود را از دست کشمکش عزیزاں اینجا خلاص نمودہ، ارادہ گرم روی کردم، آخر روز درعین ہوائے ابر بہ خانہ دوستے نقل مکان کردم باوجودیکہ شب بہ شدت بارش شد و صبح کمال برودت و ابر بود روانہ شدہ بہ بجنور رسیدم و گوشہ گزیدم۔ شب از کوفت راہ و تنہائی و عدم رفیق مزاج داں انچہ گذشت صبر برآں کرد۔ چہار دہم روز پنجشنبہ بوقت طلوعِ آفتاب بہ سیندی کہ چہار پنجم کردہ بود تا آخر روز آہستہ آہستہ رسیدہ۔ طرفہ خلل در نمو محسوس کردم.... روزِ جمعہ از آں جا بہ ہماں حال قدم در راہ گذاشتیم بعد دوپہر بہ سدھولی کہ چہار کردہ بود وارد شدہ منزل گرفتیم، سامعہ و باصرہ معطل شد و حواس دیگر مختل، سقوطِ اشتہا بدرجہ ای کہ رغبت ہیچ چیز نبود، چنانچہ اصلاً نخوردم[1]۔"

مکین کے اس خط سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ سودا کے گھر کو آگ لگ گئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اکثر بیدلاں در آتش زبانہا سوختہ و آتش فساد برائے خود افروختہ ایں است کہ دریں ایام خانہ اش سوخت و آب از دیدہ بریخت فایدہ

[1] معاصر، حصہ ۱۹، ص ۵ ۷

نیند وخت اللھم احفظنا من شرور انفسنا![1]

اگر سودا نے فاخر مکین کی ہجو کہی ہے۔ تو مکین نے بھی اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی۔ انھوں نے بھی سودا کی شاعرانہ صلاحیتوں کا مذاق اڑایا ہے۔

نہ دید از خود فروشی دشمنِ ما جنس بہبودے
بہ بازار جہاں دارد عبث سودائے بے سودے
دکانے چیدہ بہر گرمی بازار از سودا
ندارد گرچہ غیر از آہ محرومی دم و دودے
بایں بے مایگی جوش خریداران طمع دارد
خیال باطل او را تماشی کاش می بودے
طمع گوئی از گفتار صاحب پایگاں گیرد
کند ابلہ فریبی تاکہ از قلب زر اندودے
متاع روے دست اوست قصد روکشی با من
بجز رو ساختن ہرگز نہ بیند روے مقصودے
بدل با وعدہ نقد وفا جنس جفا کردہ
نمی داند کہ در پیش است آخر روز موعودے
مرا ارزاں نماید خود گراں قیمت شود لیکن
نمی ارزد بہ پشیزے نرخ خود چنداں کہ افزودے
براہ وصف گاہے یک وجب رہ طے نمی کردے
بگاہ طعنہ در یک گام صد گز راہ پیمودے

۱۔ معاصر، حصہ ۱۹، ص ۷۶

سخن با ہر کس از بیش و کم من درمیاں دارد
زدلالی دل او ہیچ آیا شرم نہ نمودے[1]

غلام حسین ضاحک اور سودا

ضاحک ان خوش نصیب لوگوں میں ہیں جنھیں سودا کی ہجوؤں نے زندۂ جاوید کیا ہے۔ سودا اور ضاحک دونوں ایک دوسرے کی ہجو گوئی میں فحش نگاری کی انتہا تک پہنچ گئے تھے۔ عام طور پر یہی خیال تھا کہ ضاحک کا دیوان مرتب ہی نہیں ہوا محمد حسین آزاد نے لکھا تھا کہ "میر حسن مرحوم ان کے صاحبزادے سودا کے شاگرد تھے۔ میر ضاحک کا انتقال ہوا تو سودا فاتحہ کے لیے گئے اور دیوان اپنا ساتھ لیتے گئے۔ بعد رسم عزا پرسی کے اپنی یاوہ گوئی پر جو کہ اس مرحوم کے حق میں کی تھی بہت سے عذر کیے اور کہا کہ سید مرحوم نے دنیا سے انتقال فرمایا۔ تم فرزند ہو جو کچھ اس روسیاہ سے گستاخی ہوئی معاف کرو۔ بعد اس کے نوکر سے دیوان منگا کر جو ہجویں ان کی کہی تھیں سب چاک کر ڈالیں۔ میر حسن نے بہ مقتضائے علو حوصلہ و سعادت مندی اسی وقت دیوان باپ کا گھر سے منگایا اور جو ہجویں ان کی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں[2]۔" اب آزاد کا بیان ایک دلچسپ حکایت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ اول تو میر ضاحک کا دیوان مل گیا ہے[3] اور دوسرے ضاحک

۱۔ معاصر حصہ ۱۹ / ص ص ۷۳-۷۴

۲۔ آب حیات ص ص ۱۸۲-۱۸۳

۳۔ یہ دیوان بتیا راج۔ بہار کے محافظ خانے میں محفوظ تھا۔ قیام الدین احمد صاحب نے معاصر (جولائی ۱۹۶۲ء) میں اس کا تعارف کرایا ہے۔ میں نے اصل دیوان نہیں دیکھا۔ اسی مقالے سے استفادہ کیا ہے۔

کا انتقال سوداؔ کی وفات کے بعد ہوا! دیوان میں سوداؔ کی ہجویں موجود ہیں۔

ان دونوں کے معرکے کی ابتدا کب ہوئی؟ اور کس نے کی؟ اس سے متعلق ناصر لکھتے ہیں: "جب نواب شجاع الدولہ بہادر نے سُنا کہ مرزا رفیع فرخ آباد میں آیا ہے شقہ خاص اس کی طلب میں قلمی فرمایا سبحان اللہ کیا وضع داری تھی کہ نواب کے شقہ کے جواب میں یہ رباعی لکھی سے سوداؔ پئے دنیا تو بہر سو کب تک (پوری رباعی دی ہے) حضور پُرنور اس رباعی سے نہلے گراں خاطر ہوئے۔ میر غلام حسین بہ تخلص ضاحک کہ ندیم مجلس تھے۔ واسطے رفع ملال یوں بول اُٹھے اگر وہ حضور پُرنور کی شقہ سے نہیں آتا ہے غلام بے طلب کھینچ بلاتا ہے قصیدہ سالگرہ کا نواب عماد الملک غازی الدین خاں کی تعریف میں سوداؔ کا کہا ہوا تھا تمام اس مصنف کی مذمت میں الٹا۔ چنانچہ یہ شعر۔

پاؤں کھڈّی پہ رکھو ہاتھ میں لو آئینہ
بال ..... کے چنو ناک پہ دھر کے عینک

جب وہ مزخرفات سوداؔ نے سنے بحکم آنکہ دیوانہ راہوئے بس است روانہ لکھنؤ کو ہوا۔ میر سابق الذکر نے کہ دلیری و شوخ چشمی ان پر ختم تھی۔ بے سابقہ معرفت مرزا کی ملاقات کو قدم رنجہ کیا۔ اس فروتنی سے غبار عناد کا سوداؔ کے دل سے مطلق صاف ہوگیا۔ موافق قاعدہ ہندوستان عطر و پان کے واسطے اندر تشریف لے گئے۔ اس عرصہ میں کہ برآمد ہوں اس ٹھٹول نے قلمدان کھولا اور یہ مطلع ایک پرچہ پر لکھا دیکھا

رستم سے تو کہہ پیارے سر تیغ تلے دھر دے
پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے و ہر مردے

۱۔ علی گڑھ میگزین ۱۹۵۳ء، ص ۱۴۳

اس کے برابر یہ مطلع لکھ دیا

سودا نے اٹھا چوتڑ جب پاد دیا پڑدے
یہ ان ہی سے ہوتا ہے ہر کا لے وہ ہر مردے

بعد دو چار گھڑی کے جب وہ صحبت برہم ہوئی۔ سودا نے قلمدان کھولا اور وہ مطلع پڑھا یقین کلی ہوا کہ سید ناسید اور مرد نامعتمد ہے بے اختیار یہ شعر زبان پر گزرا۔

ریم سوزاک پدر ہے تو شہر یہ
رحم مادر سے الٹ نکلا ہے میر[1]

اول یہ ترجیع بند کہا بعد اس کے یہ قصیدہ۔

ضحاکا کیوں نہ وہ پرواز کرے زیر فلک
پہنچی پشتین سے ہو نطفہ کی حلت جس تک[2]

بعد خرابی بسیار باستدعائے میر حسن یہ ہجو مولوی ساجد شاہ آبادی کے نام پر ہوئی۔ باقی ترجیع بند اور مخمس و مثنوی ہنوز بدستور[3]۔"

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں "سودا نے جو ان کے حق میں گستاخی کی ہے اس کا سبب یہ ہوا کہ اول کسی موقع پر انھوں نے سودا کے حق میں کچھ فرمایا۔ سودا خود ان کے پاس گئے اور کہا کہ آپ بزرگ میں خرد آپ سید میں آپ کے

۱۔ ناصر نے پورا ترجیع بند نقل کیا ہے۔
۲۔ قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ "ناصر نے جس کافیہ قصیدے کے بارے میں لکھا ہے کہ دراصل ضاحاک کی ہجو میں تھا، یہ قابلِ قبول نہیں، یہ ہجو ساجد ہی کی ہے۔" علی گڑھ میگزین ۱۹۵۳ء، ص ۱۳۷
۳۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا، قلمی، آزاد لائبریری، علی گڑھ

جد کا غلام عاصی اس قابل نہیں کہ آپ اس کے حق میں کچھ فرمائیں۔ ایسا نہ کیجیے کہ مجھ گنہگار کے منہ سے کچھ نکل جائے اور قیامت کے دن آپ کے جد کے سامنے روسیاہ ہوں۔ تلامیذِ الٰہی کے دماغ عالی ہوتے ہیں۔ ان کی زبان سے نکلا کہ نہیں بھئی یہ شاعری ہے اس میں خردی و بزرگی کیا۔ سوداؔ آئیں تو کہاں جائیں۔ پھر جو کچھ انھوں نے کہا خدا نہ سنوائے[1]! لیکن یہ تمام بیانات درست نہیں۔

سوداؔ نے ضاحکؔ کی ہجو میں جو ترجیع بند کہا تھا جس کا مطلع ہے۔

جا صبا ضاحکؔ سے کہہ بعد از سلام
کیوں کیا کرتا ہے ہجوِ خاص و عام

اس کے بعض اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضاحکؔ ہر شخص کی ہجو کرتے تھے۔ ان میں بعض لوگ سوداؔ کے ملنے والے بھی تھے۔ یہ بات انھیں ناگوار گزری۔ اور انھوں نے ضاحکؔ کی ہجو کہہ دی۔ اس معرکے کی ابتدا غالباً اسی ترجیع بند سے ہوئی۔ چند جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

آپ کو کہتا ہے تو سیّد ہوں میں
جد مرا پوچھو تو ہے خیر الانام

بس دکھا تو اب کسی کی ہجو میں
ہو اگر ختمِ رسالت کا کلام

ہجو کرتا کیوں تو ان اشخاص کی
وہ جو ہیں ممتاز زیرِ آسماں

۱۔ آبِ حیات، ص ۱۸۲

کہہ معالج خاں نے تیرا کیا کیا
شعر ان کا اپنے منہ میں گہہ بھرے
میر نواب اور ان کے بھائی کی
ہجو تو کرتا ہے وہ ہیں منگرے
میرزا بہلو سے تا مرزا علی[2]
نظم میں آئے تمہے سب سے پرے

کیجیو میری تو اے بھڑنٹے نٹ
تو سہی دوں بانس سے تجھ کو الٹ

آخری شعر بتا رہا ہے کہ ضاحک نے ابھی تک سودا کی ہجو نہیں کہی تھی۔ اور ضاحک نے جو میر نواب، ان کے بھائی، مرزا بہلو، مرزا علی اور معالج خاں وغیرہ کی جو ہجویں کہی تھیں۔ وہ سودا کو ناگوار گزریں اور یہی ناگواری ہجو گوئی کی

۱۔ دیوان ضاحک میں معالج خاں کی ہجویں موجود ہیں۔ دو شعر یہ ہیں۔

کھووے ہے سب کی ذات اور ایماں ۔۔۔ طرفہ ہے یہ کوئی معالج خاں
ہے معالج کہ یا ہے یہ دجّال ۔۔۔ پڑے سب سیدوں کا اس پہ دبال

(معاصر جولائی ۱۹۶۲ء، ص ص ۱۱۶-۱۱۷)

۲۔ کلیاتِ سودا مرتبہ آسی میں یہ نام مرزا رفیع ہے لیکن اکثر معتبر قلمی نسخوں میں مرزا علی ہے۔ مطبوعہ کلیاتِ سودا میں مرزا علی کی ہجو کے ایک مخمس کے تین بند موجود ہیں۔ "اک قصہ میں سنا تھا مردم سے یہ قضا را۔" نو بند کا یہ مخمس دیوان میر حسن کے قلمی نسخے (رضا لائبریری رام پور ص ص ۳۰۸-۳۱۰) میں موجود ہے۔ غالباً یہ سودا کا نہیں ہے کیونکہ کلیاتِ سودا کے اکثر قلمی نسخوں میں نہیں ہے۔

ابتدا کا سبب بنی۔ سودا نے ایک اور مخمس لکھا تھا۔ کلیاتِ سودا مرتبہ آسی میں "یہ مخمس در ہجو اہلیہ میر ضاحک" کے عنوان سے شامل ہے۔ مگر اس کے صرف پانچ بند دیئے ہیں جبکہ قلمی نسخوں میں ۴۵ بند ہیں۔ مخمس کا پہلا بند ہے۔

ضاحک کی اہلیہ نے جب ڈھول گھر دھرایا
بے وجہ رات ساری ہمسایوں کو جگایا
بیٹھک میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب ہلایا
تب شیخ سدو اُس پر اساک کھا کر آیا
بولا کہ کیوں بے ضاحک بجرا کوئی منگایا

سودا نے ضاحک کی ہجو میں ایک مثنوی بھی کہی تھی۔ جس کا مطلع ہے۔

عجیب و غریب زیر سما
اک یہاں صورت آشنا اپنا

اس مثنوی میں ضاحک کی بسیار خوری کا طرح طرح سے مضحکہ اڑایا ہے۔

محمد حسین آزاد نے سکندر مرثیہ گو اور ضاحک سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "سودا کے دیوان میں میر ضاحک مرحوم کی یہ ہجو جب میں دیکھتا تھا:۔ یارب یہ دعا مانگتا ہے تجھ سے سکندر ۔۔ تو حیران ہوتا تھا کہ سکندر کا یہاں کیا کام میر مہدی حسن فراغ ..... کو خدا مغفرت کرے انھوں نے بیان کیا کہ ایک دن حسبِ معمول مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں پائیں باغ میں نخت بچھے تھے۔ صاحب عالم خود مسند پر بیٹھے تھے۔ شرفا و شعرا کا مجمع تھا۔ مرزا رفیع اور میاں سکندر مرثیہ گو بھی موجود تھے کہ میر ضاحک تشریف لائے۔ ..... اتفاقاً صاحب عالم نے مرزا رفیع سے کہا کہ کچھ ارشاد فرمایئے.... سودا نے کہا۔ میں نے تو ان دنوں میں کچھ کہا نہیں۔ میاں سکندر کی طرف اشارہ کیا کہ

انھوں نے ایک مخمس کہا ہے۔ صاحب عالم نے فرمایا کیا؛ سودا نے پہلا ہی بند پڑھا تھا کہ میر ضاحک مرحوم اُٹھ کر میاں سکندر سے دست و گریباں ہو گئے۔ سکندر بیچارے حیران کہ نہ واسطہ نہ سبب یہ کیا آفت آگئی۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں صاحبوں کو الگ کیا اور سودا کو دیکھئے تو کنارے کھڑے مسکرا رہے ہیں[1]۔ اس مخمس کا پہلا بند ہے۔

یارب تو مری سن لے یہ کہتا ہے سکندر
ضاحک ..... کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تولد ہو اگر بچۂ بندر
گلیوں میں نچاتا پھرے وہ بنگلے کے اندر
روٹی تو کما کھاوے کسی طور مچھندر

دیوانِ میرحسن میں ایک مخمس شامل ہے جو اس کا جواب ہے۔ اس کا پہلا بند ہے۔

ضاحک نہ خوف کر تو اب کیا ہے یہ مچھندر
بجرے کا ہے وہ .... اور زادۂ قلندر
باندھے ہے جب نہ تب وہ بکرے کو باہر اندر
لکڑی کے بل نچا تو اس کو مثالِ بندر
.... ڈرے ہے تیرا .... یہ ہے سکندر

سکندر کی ہجو میں جو مخمس ہے وہ سودا ہی کی تصنیف ہے۔ کیونکہ کلیاتِ سودا کے اکثر معتبر قلمی نسخوں میں شامل ہے[2]۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کا

۱۔ آبِ حیات، ص ص ۱۸۳-۱۸۴
۲۔ پہلے قاضی عبدالودود صاحب اسے سکندر کی تصنیف بتاتے تھے (علی گڑھ میگزین ۵۲-۱۹۵۱ء ص ۳۱) لیکن

جواب کس نے لکھا تھا۔ دیوان ضاحک میں یہ مخمس شامل نہیں ہے اور مخمس میں جتنی فحش نگاری کی گئی ہے اور جس طرح کے مشورے دیئے گئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ میر حسن کی تصنیف نہیں کیونکہ ایک بیٹا اپنے باپ کو اس طرح کے مشورے نہیں دے سکتا۔ غالباً یہ مخمس ضاحک کا کہا ہوا ہے اور ان کے دیوان میں شامل ہونے کی بجائے دیوان میر حسن میں شامل ہو گیا ہے۔

دایون ضاحک میں سودا کی ہجویں موجود ہیں۔ ایک غزل کے دو شعر ہیں ؎

اتنا آگے کبھی سودا نہ ہوا تھا سو ہوا
بنگلے میں بیٹھ کے رسوا نہ ہوا تھا سو ہوا
گو کہ در ماہہ ہوا بیش ولے عزت کم
شاعروں بیچ جو تھیلا نہ ہوا تھا سو ہوا

ایک ہجو میں ضاحک نے سودا کے کتوں کے شوق کو برا بھلا کہا ہے تین شعر ملاحظہ ہوں۔

اوس کا سارے سگوں سے ناتا ہے
ایک سفرہ پہ ساتھ کھاتا ہے
کلوا اور جھبرا لینڈی اور تازی
سب شریک طعام اور ہم بازی
کلوا کلہ چباۓ جاتا ہے
اوجھڑی جھبرا ساتھ کھاتا ہے

اب وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سودا کی کہی ہوئی ہے۔ (سویرا، خاص نمبر ۲۹، ص ۵۷)

ایک دوسری ہجو کے دو اشعار یہ ہیں۔

ناصر الملک کا وہ سالا ہے
چاہے گھڑنے میں کھیلا کالا ہے
سلف سب شاعروں میں سودا ہے
ایک سر میں ہزار سودا ہے

مذہبی ہجویں سودا کی مذہبی ہجویں صرف تین ملتی ہیں۔ کسی مجتہد نے یہ فتوی دے دیا کہ کوّا حلال ہے۔ اس مضحکہ خیز بات پر سودا کی رگِ ظرافت پھڑک گئی اور انھوں نے مجتہد اور ان کے حامیوں کی ہجو کہہ ڈالی۔ ہجو کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

لشکر کے بیچ آج یہی قیل وقال ہے
کھانے کی چیز کھانے کا سب کو خیال ہے
یوں دخل امر ونہی میں کرنا محال ہے
جو فقہ داں ہیں سب کا یہ اُن سے سوال ہے
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوّا حلال ہے

مسخرے کے ساتھ اس کے حامی چاند خاں اور اک مہربان بھی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔

حامی انھوں کے قول کا ہووے ہے چاند خاں
اور دوسرے میں کیا کہوں اک اپنے مہرباں
کچھ شک رہا ہے کوّے کی حلّت کے درمیاں
ہم سے جو کوئی پوچھے تو ہم بھی کہیں کہ ہاں
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوّا حلال ہے

اس کے بعد سودا نے ایک دلچسپ قصہ بیان کیا ہے۔ ایک مجتہد نے اپنے نوکر سے کہا: "کوا حلال چیز ہے میرے لیے پکا۔" نوکر نے پہلے تو انکار کیا۔ لیکن آقا کے اصرار سے تنگ آکر پکانے پر مجبور ہو گیا۔ بہ مشکل تمام کوا پکا۔ تو مجتہد بولے: "گھی پی لیا ہے تو نے تو کوا رہا ہے خام۔" نوکر نے جواب دیا میاں خدا کا نام لو۔ میرے لیے تو یہ سور سے بھی زیادہ حرام ہے آقا کو غصہ آگیا۔ انھوں نے ملازم کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ نوکر بھی خاموش نہ رہا اور آخر نوبت یہ پہنچی۔

جس وقت بڑھ پڑی غرض آپس میں دوت دات
ایدھر سے دھول چلنے لگی اور ادھر سے لات
پگڑی انھوں کی ان کنے جیب ان کی ان کے ہات
مبدا جو اس فساد کا پوچھو تو اتنی بات
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے

لوگوں نے بیچ میں پڑ کر ان دونوں کو چھڑایا۔

مطبوعہ کلیاتِ سودا میں ایک ہجو ہے جس کا عنوان ہے: "قصیدہ در ہجو شخصے کہ متعصب بود۔" لیکن بہت سے قلمی نسخوں میں شاہ ولی اللہ کا نام موجود ہے ہجو کی ابتدا میں سودا نے شاعرانہ تعلی سے کام لیتے ہوئے کہا ہے۔

کروں چمن میں اگر جا کے میں غزل خوانی
تو بلبلیں ہوں مرے چہچے کی دیوانی
موا نہیں وہ مرے صیت شعر کو سن کر
زمیں میں شرم سے اب گڑ گیا ہے خاقانی
یقیں تو جان کہ زانو ادب کے اس فن میں
کرے ہے تہ مرے آگے عبید زاکانی

اس کے بعد سودا اصل موضوع پر آتے ہیں۔

نہووے کیونکہ مرا رتبہ شعر میں یاں تک
میں کیسے پیر کی کرتا ہوں اب ثنا خوانی
انھوں کی ذاتِ مبارک میں یہ تعصب ہے
کریں نہ چشم میں سرمہ ہو گر صفاہانی
کوئی جو اس کا سبب جا کے پوچھے ہے اون سے
تو کہتے ہیں کہ ہے یہ بھی کوئی مسلمانی
لگانا سرمہ کو واں کے جہاں رہیں شیعہ
بھلی ہیں اس سے تو یہ آنکھیں کور ہو جانی
علی کا نام لے کوئی جو آ کے مجلس میں
کہیں ہیں قتل کرو اس کو ہے یہ ایرانی

اس کے بعد سترہ اشعار میں سودا نے تقریباً یہی باتیں کہی ہیں اور شاہ ولی اللہ پر ان کے مذہبی تعصب کی وجہ سے لعن طعن کی ہے۔

ایک اور ہجو مولوی ساجد کی ہے۔ مطبوعہ نسخے میں اس ہجو کا عنوان ہے۔ "قصیدہ در ہجو مولوی ساجد در بیان آنکہ یزید علیہ اللعنۃ را اولی الامر گفتہ بود۔" اس ہجو میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک رافضی عالم سنّی بن کر مولوی ساجد کے پاس گیا اور پوچھا۔

کہ دیکھ ماہ محرم نبی کی اُمّت میں
درست ہے کہ یہ دیں یکدگر مبارکباد
پہن لباس مکلّف بروزِ عاشورہ
کریں معانقہ آپس میں ہو کے خرّم و شاد

رافضی عالم کو سنّی سمجھتے ہوئے مولوی ساجد نے

دیا جواب کہ ہم سنّیوں کے مذہب میں
عمل یہ ان دنوں کرتے نہیں ہیں کچھ ایجاد
یہ بات ہوتی ہی آتی ہے عہدِ حضرت سے
ہزار جا ہے کتب بیچ اس کا استشہاد
حنا کو ہاتھوں سے ملنا لگانا سرمے کا
لباس پہن کے پڑھنا وظیفہ و اوراد
بڑا ثواب ہے اس کا کہ ہے یہ روزِ عید
کریں نہ گو یہ عمل شیعیان زراہِ عناد

یہ باتیں سن کر رافضی عالم نے مکابرہ شروع کر دیا۔ اور ایسی ایسی دلیلیں پیش کیں کہ بقول سودا

غرضکہ رافضی بے ادب نے از رہِ جہل
خموش مولوی صاحب کو کر کے حد سے زیاد
یہ کہہ کے اٹھ گیا ظاہر ہے اس حمایت سے
خسر یزید کا تو ہے وہ ہے ترا داماد

اس ہجو کا آخری شعر مطلع کی شکل میں ہے۔

مکن تو لعن بہ شمر و یزید و ابنِ زیاد
بگو بہ مولوی ساجد مدام لعنت باد

دیگر ہجویں اس عنوان کے تحت سودا کی بعض اخلاقی اور سماجی ہجوں کا ذکر کیا جائے گا۔ مطبوعہ کلیاتِ سودا میں بخیل لوگوں پر دو ہجویں ہیں۔ پہلی ہجو کا عنوان ہے "مثنوی در ہجو امیر دولت مند بخیل" مثنوی

کی ابتدا خدا کی تعریف سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک دلچسپ نقل بیان کی ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

اتفاقاً اک آشنا میرے
گئے تھے ایک عمدہ سے ڈیرے
جو ہیں وارد ہوئے یہ واں ناگاہ
اٹھا چاروں طرف سے ابر سیاہ

بارش کے آثار دیکھ کر صاحب خانہ بہت پریشان ہوئے۔ اس نے مہمان سے پوچھا کہ بارش ہونے والی ہے۔ تمھارے پاس واپس جانے کا کوئی سامان ہے۔ مہمان نے جواب دیا مجھے کیا پتا تھا ورنہ میں کچھ نہ کچھ لے آتا۔ اتنے میں بارش شروع ہو گئی۔ صاحبِ خانہ نے کہا میری بدنصیبی ہے کہ آپ تشریف لائے بارش میں بھیگتے ہوئے واپس جائیں گے۔ مہمان نے جواب دیا۔

بولے یہ سادگی سے کیا ہے ضرور
بھیگتا جاؤں گا میں اتنی دُور
رکھے خالق سلامت آپ کی ذات
نہ کھلے گا تو میں رہوں گا رات

یہ جواب سن کر صاحبِ خانہ کی تو جان نکل گئی۔ مگر اب صبر کے سوا کیا چارہ تھا کھانے کا وقت ہوا تو مہمان نے بکاول سے کہا کچھ تیار ہے تو لاؤ۔ اتفاق سے صاحبِ خانہ وہاں موجود نہیں تھا۔ بکاول نے آقا کے بخل کی داستان تقریباً ۴۷ اشعار میں بیان کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ چونکہ صاحبِ خانہ کا مطبخ شاذ و نادر ہی استعمال ہوتا تھا۔ اس لیے بکاول مطبخ کا حال بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے۔

بسکہ مطبخ میں سردی رہتی ہے
ناک باورچیوں کی بہتی ہے
اون کے مطبخ سے دود اوٹھے اگر
سقّے لے دوڑتے ہیں مشکیں بھر
لگے ہے دینے کوئی اوٹھکے اذاں
کوئی دکھلاوے ہے کھول کر قرآں

بکاول صاحب خانہ کے لڑکے کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ایک دن اس لڑکے نے اپنے کسی دوست کی دعوت کر دی۔ بھلا یہ فضول خرچی کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ وہ آگ بگولا ہو گیا اور جو کچھ نہ کہنا تھا اس نے کہا۔ اپنے لڑکے پر ناراض ہوتے ہوئے صاحب خانہ فرماتے ہیں۔

یارو مجھ سے تو لاولد بہتر
میرا بیٹا اور اس قدر ابتر
اس کا دادا بھی گرچہ تھا عیّاش
اس سلیقے سے پر کرے تھا معاش
جو کوئی اس کے گھر میں نوکر تھا
رات کو اس پہ یہ مقرر تھا
پھرتا وہ ٹکڑے مانگتا گھر گھر
لاتا آقا کے آگے جھولی بھر
اچھے چُن چُن کے آپ کھاتے تھے
برے تنخواہ میں لگاتے تھے

ایک اور بخیل پر ہجو ہے جو اس ہجو کے مقابلے میں غیر دلچسپ ہے۔

مطبوعہ کلیات میں صرف دو بند ہیں، ممکن ہے کسی قلمی نسخے میں اور بند مل جائیں۔

بخیل کی طرح سودا اس آدمی کو بھی پسند نہیں کرتے جو بڑھاپے میں شادی کرتا ہے۔ اس موضوع پر سودا کی تین ہجویں ملتی ہیں۔ ایک ہجو کا عنوان ہے "قطعہ تاریخ ہجو شیخ صنعت اللہ کہ کتخدا شدہ بود"۔ اس نو اشعار کی ہجو میں کسی نے ایک بوڑھے کی جوان بیوی سے پوچھا کہ تیری عقل پر کیوں پتھر پڑ گئے تھے جو تو نے اس "مٹّی کے تھوے" سے شادی کی۔ یہ سن کر بیوی نے

دیا جواب کہ اے بھڑوے خبر ہے تجھ کو
فرشتے نے مرے دامن کو آج تک نہ چھوا
سو ایسے خرس سے میں بیاہ کرنے بیٹھوں گی
کہ جس کی داڑھی کا ہر بال جیسے ہووے سوا
میں پیر زادی کر اس کی جہاں میں ہوں مشہور
جو کہتی ہوں اسے بھائی تو وہ کہے ہے بوا

ایک شیخ صاحب نے "بارہ برس کی چھوکری" سے شادی کر لی۔ پہلے تو سودا نے ان کی شادی کا حال بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ پھر میاں بیوی کے تعلقات، بیان کیے ہیں۔ کچھ بند ملاحظہ ہوں۔

تھے بسکہ شیخ بات سے دنیا کی پاک صاف
مسواک لے کے جورو سے کرنے لگے زفاف
چوٹی سے اپنی کھول کے اُن نے وہیں موباف
مشکیں جکڑ انھوں کی کہا کیجیے معاف
مجھ کو تو کچھ ولی نظر آتے ہیں شیخ جی
لایا غضب میں شیخ کو جورو کا بند دست

مشکیں توڑا پلچ گئے جورو سے کر کے جست
بال اس کے ان کے ہاتھ تھے ریش انکی اسکے دست
عہدے سے بر نہ آئے تھے از بس ضعیف و پست
پاپوشیں تب سے جورو کی کھاتے ہیں شیخ جی

جورو سے شیخ جی کو یہ صحبت ہے اب مدام
بھڑوا و مسخرا و مچھندر ہے ان کا نام
خلوت میں جب بلاتے ہیں اس کو بوقتِ شام
دیتی ہے تب وہ بھیج کے لوگوں سے یہ پیام
بیٹی کو اپنی کیوں یہ بلاتے ہیں شیخ جی

ایک اور مخمس ہے جو کسی شیخ جی کی شادی پر کہا گیا ہے۔ اس میں بھی دولھا کی اسی طرح گت بنائی گئی ہے۔

سودا کی اور بھی کئی دلچسپ ہجویں ہیں۔ مثلاً "مثنوی در ہجو طفلِ ضائع روزگار لکڑی باز" اس ہجو میں کہانی کے ذریعہ اخلاقی درس دیا گیا ہے۔ "مثنوی در ہجو حکیم غوث" میں حکیم صاحب کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ نجف خاں سے نواب ضابطہ خاں کی شکست پر بھی ایک ہجویہ قطعہ لکھا ہے۔ اس طرح اور بھی چند ہجویں ہیں جو کلیاتِ سودا کے مطبوعہ نسخے میں شامل ہیں۔

ہمیں ان ہجوؤں میں نہ صرف اس عہد کی معاشرت، تہذیب اور سیاسی اور سماجی حالات کی جھلکیاں ملتی ہیں بلکہ ایسا بھی مواد حاصل ہوتا ہے جس سے سودا کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان ہجوؤں سے بآسانی سراغ لگایا جا سکتا ہے کہ سودا کن اخلاقی اور انسانی قدروں پر ایمان رکھتے تھے۔ خود ان کے عہد کے انسان کا اندازِ فکر کیا تھا۔ کسی شاعر کی شخصیت کو سمجھنے کیلیے

ضروری ہے کہ ادبی محقق اس شاعر کے عہد کا گہرا مطالعہ کرکے تخیل کی مدد سے خود کو اس ماحول میں پہنچا دے تاکہ شاعر کے ماحول اور اس کے اندر کے انسان کو قریب سے دیکھ سکے۔ اس سلسلے میں ہجویاتِ سودا کا مطالعہ خاص طور پر اہم ہے۔

سودا کے بعد متعدد شعرا نے ہجویں کہیں، لیکن سودا اس فن کو جس بلندی پر پہنچا گئے تھے۔ اس سے آگے اور کوئی نہ جا سکا۔ سودا قصیدہ کی طرح اس فن کے بھی امام اور خاتم قرار پاتے ہیں۔

مصحفی اور سودا[1]

ان دونوں کی عمروں میں اتنا فرق تھا کہ جب مصحفی پیدا ہوئے ہیں تو سودا مقبولیت اور شہرت کی انتہائی بلندیوں پر تھے۔ مصحفی کی سودا سے ملاقات بھی صرف ایک بار ہوئی تھی[2]۔ اس وقت سودا لکھنؤ میں تھے۔ چونکہ مصحفی کے لکھنؤ میں قیام کی کوئی صورت نہیں نکلی اس لیے وہ دہلی واپس آگئے اور ۱۱۹۸ھ میں جب دوبارہ لکھنؤ پہنچے تو سودا کی وفات کو تین سال گزر چکے تھے۔ جس کا مطلب ہے کہ یہ دونوں کبھی ایک دوسرے کے مدمقابل نہیں ہوئے۔ نیز یہ کہ مصحفی کی کوئی تصنیف سودا کی وفات سے قبل اشاعت پذیر نہیں ہوئی۔ اُن کا سب سے پہلا تذکرہ "عقد ثریا" ہے جو سودا کی وفات کے بعد مکمل ہوا۔ اس میں مصحفی لکھتے ہیں۔

"اگرچہ مردِ کم علم بود اما ذکاوت و روانیٔ طبعش از کلامش پیداست، در زبانِ ریختہ

۱۔ مصحفی اور سودا کے موضوع پر قاضی عبدالودود کا مقالہ اردو ادب اکتوبر ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ میں نے اسی مقالے سے استفادہ کیا ہے۔ (خ۔ا)

۲۔ مصحفی لکھتے ہیں: "فقیر در عہدِ نواب شجاع الدولہ بہادر روزے برائے دیدن ایں بزرگ بہ خدمتش رسیدہ بود۔" تذکرۂ ہندی، ص ص ۱۲۵ - ۱۲۶

علم یکتائی برافراشتہ وہمیشہ با امراصحبت داشتہ۔ قصائد وغزلے در جواب بعضے قصائدِ عرفی تصنیف نمودہ و ماسوائے ایں در گفتن ہجو ہا قدرتِ شاعری خود را نمودہ، غرضکہ ہمہ باتفاق بہ سبب شہرتِ بسیار وخوبی کلام استاد مسلم الثبوتش میدانند، والحق کہ چنیں نامش در ہندوستان وردِ زبان بازاریان وغزلیات دیوانش بہر اطراف وجوانب و ہر جاہل و امی را برزبان با ایں ہمہ شہرت کہ در ریختہ نصیبش بود آخر آخر عنانِ (کذا) شعر فارسی ہم سر بیدہ در راہ درد آوردہ۔ اگر چہ ایں حرکت مناسب شانش نہ بود[1]"

گویا مصحفی نے سودا پر اعتراض کیے ہیں کہ وہ

۱۔ کم علم ہیں۔

۲۔ ان کی شہرت بازاریوں میں ہیں۔

۳۔ ہر جاہل اور امی کی زبان پر اُن کے اشعار ہیں۔

۴۔ اس کے علاوہ مصحفی نے سودا کی فارسی گوئی کو ناپسند کیا ہے۔

مصحفی کی دوسری تصنیف تذکرۂ ہندی وفاتِ سودا کے تقریباً ۱۴ سال بعد شائع ہوئی۔ اس میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"(سودا) .... در عصر خویش سر آمد شعرائے ریختہ گو گزشتہ۔ بعضے او را دریں فن بہ ملک الشعرائی پرستش می کنند۔ بعضے بہ سبب دریافتِ اغلاطِ صریح و توارد صاف در بعضے اشعارش بہ جہل و سرقہ اش نیز نسبت می دہند۔ غرض ہر چہ بود در روانی طبع نظیر خود نہ داشت ...... دیوانش بہ فرنگ وصفاہاں رسیدہ، دیگرے ایں شہرت در خواب ندیدہ۔ اگر در

۱۔ عقدِ ثریا، ص ۳۳

مثال بندی اشعار غزل صائب وقتش گویم بجا است ۔ و اگر در علو مراتب
معانی ابیاتِ قصیدہ خاقانی گویم روا۔ نقاش اول نظم قصیدہ در زبانِ
ریختہ او ست۔ حالا ہر کہ گوید پیرو و تتبعش خواہد بود ۱؎"

یہاں مصحفی اعتراض کرتے ہیں کہ

۱۔ بعض لوگ کلام سودا میں اغلاطِ صریح اور توارد و صاف کو سودا کے جہل
اور سرقہ سے نسبت دیتے ہیں۔

سودا کے متعلق یہ باتیں صرف وہ شخص کر سکتا ہے۔ جسے اُن سے کوئی
بغض ہو۔[۲] سودا یقیناً کم علم نہیں تھے۔ ان کا اُردو، فارسی کلام، عبرۃ الغافلین
اور سبیلِ ہدایت اس کا ثبوت ہیں۔ یہ بھی غلط ہے کہ اُن کی شہرت صرف
بازاریوں میں تھی اور صرف جاہل اور اُمّی لوگوں کو ان کے اشعار یاد تھے۔
حقیقت یہ ہے کہ سودا کو خواص اور عوام دونوں میں مقبولیت حاصل تھی۔ اس
کا ثبوت لاتعداد کلیاتِ سودا کے قلمی نسخے ہیں جو ہندوستان اور غیر ممالک کی
لائبریریوں میں ملتے ہیں۔ فارسی میں ممکن ہے بہت اچھے شعر نہ کہہ پائے ہوں لیکن
ایسا بھی نہیں کہ اس دور کے ہندوستانی فارسی شعرا کے مقابلے میں کچھ نہ ہوں
سودا پر توارد کا الزام بے جا ہے۔ اردو کا کوئی شاعر اس الزام سے بری نہیں۔ خود
مصحفی بھی ۔ رہا سوال اغلاطِ صریح کا۔ تو یہ بھی مصحفی کی زیادتی ہے۔ سودا کے کلام
میں زبان کی صرف وہ غلطیاں ملتی ہیں جنھیں اس عہد میں جائز سمجھا جاتا تھا۔

۱۔ تذکرہ ہندی، ص ۱۲۵

۲۔ مصحفی نے بڑی ہوشیاری سے سودا پر اعتراض کیا ہے۔ خود تو ان کی بہت تعریف کی ہے۔ اور
اعتراضات دوسروں کی زبانی کرائے ہیں۔

نہ صرف نثر میں بلکہ مصحفی نے نظم میں بھی سوداؔ پر اعتراضات کیے ہیں یا خود کو ان سے بہتر شاعر بتایا ہے!

مصحفی نے دیوانِ اوّل میں سوداؔ کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ دیوانِ دوم لکھنؤ میں مرتب ہوا تھا۔ اس میں یہ دو اشعار ہیں۔

مصحفی ریختہ پہنچا ہے مرا رتبے تک
شوریاں گرد ہے مرزا کی بھی مرزائی کا

سوداؔ کا بھی سرد ہو چکا ہے بازار
اب بزمِ سخن ہے مرے دم سے گلزار

دیوانِ چہارم میں یہ دو شعر ہیں۔

غرورِ شاعری اے مصحفی اچھا نہیں اتنا
تجھے کیا میر و مرزا سے ہے چپ اے مصحفی نسبت

میر و مرزا کے جو طالع نہ ملے ہم کو تو کیا
مصحفی اپنا زمانہ بھی پر اچھا گزرا

دیوانِ ہفتم میں یہ اشعار بھی ہیں۔

مسند نشینِ ریختہ جب تک ہے مصحفی
جیتا ہے میر درد بھی سوداؔ نہیں موا

۱۔ یہ تمام اشعار مصحفی اور سوداؔ، قاضی عبدالودود، اردو ادب، اکتوبر ۱۹۵۰ء سے لیے گئے ہیں۔

کچھ میں جرأت نہیں ہوں مصحفی سحر بیاں
میر و مرزا سے لڑانے یہ غزل جاؤں گا

دیوانِ ہشتم کا ایک شعر ہے۔

کلام میر کا ہو مصحفی کہ مرزا کا
نہ پا سکے گا مرے انتخاب سے پیوند

قصائد میں بھی مصحفی نے سودا کا ذکر کیا ہے۔ ایک قصیدے میں مصحفی نے سودا کا تفوق تسلیم کیا ہے۔

بھلا میرے مرقع کا بھی عالم اک ذرا دیکھو
اگر ہے ہاتھ میں سودا کے یار و خامۂ مانی
قصائد میں مرے اور اس کے چنداں فرق تو کیا ہے
میں عرفی ہی سہی اس فن کا گر گزرا وہ شروانی

ایک قصیدے میں سودا کو پورا شاعر تسلیم کیا ہے۔

کیوں کے دلی کے بیچ گزرے ہیں
ڈھائی شاعر سر آمد شعرا
اس کی تفصیل یہ کہ کہتے ہیں
میر و مرزا و درد وا دردا

غزل اور قصیدے کے ان اشعار میں مصحفی نے کبھی سودا کو خود سے بڑا شاعر مانا ہے۔ کبھی ان پر اپنا تفوق ظاہر کیا ہے۔ کبھی ان کو شروانی (خاقانی) تسلیم کیا ہے اور کبھی پورا شاعر۔

لیکن ایک قصیدے میں مصحفی نے سودا کو بہت زیادہ بُرا بھلا کہا ہے۔

یہ گوئے یہ میداں یہ زباں اور یہ بیاں ہے
دعویٰ ہو جسے شعر کا آئے نہ کہاں ہے
سودا کے تئیں کہتے ہیں شاعرِ مغلق
سو شاعری اس کی بھی بلیغوں پہ عیاں ہے
مضمون و معانی سے نہیں بہرہ کچھ اس کو
سچ پوچھو تو ارد کی فقط صاف زباں ہے
سو اس میں بھی تو غور سے دیکھے تو بہت جا
معنی ستم لفظ سے فریاد کناں ہے

سوال یہ ہے کہ آخر مصحفی کو سودا سے کیا عناد تھا۔ ان دونوں کے ذاتی تعلقات کبھی نہیں رہے جو کسی متنازعہ کا امکان ہوتا۔ مصحفی صرف سودا کی شہرت اور مقبولیت سے آزردہ خاطر تھے۔ جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

مصحفی اک میں رہا ہوں یادگارِ رفتگاں
جان تو قائم مقام میر اور مرزا مجھے

مرزا و میر کا تو نہ کر ذکر مصحفی
اشعر ہیں اب تو کشورِ ہندوستاں میں ہم

اس شعر میں تو مصحفی نے بالکل صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

حسد کی جا نہیں اے مصحفی کلام ان کا
کہ اپنے وقت کے مرزا و میر ہم بھی ہیں

مصحفی کے اس رویے کے خلاف تلامذۂ سودا کا صف آرا ہونا ایک فطری بات تھی۔ مصحفی نے ایک قصیدہ لکھا ہے۔ جس

۱۔ قاضی عبدالودود نے یہ قصیدہ اردو ادب، اکتوبر ۱۹۵۰ء، ص ص ۱۲۰۔۱۲۵ پر نقل کیا ہے۔

میں انھوں نے کہا ہے کہ کوئی شخص مصحفی کے نام سے تلامذۂ سودا کی ہجو لکھتا ہے حالانکہ

جو لوگ آج ہیں قائم مقام سودا کے
کروں گا ہجو میں ناحق انھوں کی نام بہ نام
خدا نخواستہ کچھ سر پھرا نہیں میرا
ولے جو چاہے کرے یوں یہ گردش ایام
کہ دوست اپنے جو ہوں وہ بھی پھر بنیں دشمن
یہی تو چاہے ہے البتہ آسماں کی خرام

اس کے بعد تلامذۂ سودا میں مرزا احسن، میر فخرالدین ماہر اور محمد رضا کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ میں تو ان سب کی عزت کرتا ہوں۔ اس کے بعد مصحفی لکھتے ہیں کہ ان کے ایک شاگرد گرم یہ خبر لائے ہیں کہ تلامذۂ سودا نے مصحفی کی ہجو لکھی ہے۔

میں گوشہ گیر ہوں مدت سے پر یہ قہر سنو
کہ جب گیا ہے کبھی گرم اُس طرف ناکام
لکھے ہیں ہجو میاں مصحفی بہم یہ لوگ
دیا ہے بس یہی شاہ کمال نے پیغام

پھر مصحفی نے تلامذۂ سودا کو ان الفاظ میں ڈرانے کی کوشش کی ہے۔

نہیں یہ ہجو کے قابل پر اُن کی خدمت کو
جو یوں بھی چاہیں تو کافی ہیں بس مرے خدام
اگرچہ ہیں وہ نواخواں ولیکن ان میں سے
بلا ہیں منتظر و گرم جوں برہنہ حسام

اس قصیدے سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ مصحفی کو یہ اطلاع ملی کہ تلامذۂ سودا

نے ان کی ہجو کہی ہے تو انھوں نے کوشش کی کہ اُس ہجو کی اشاعت نہ ہو۔ اگر وہ یہی قصیدہ ہے۔

کیا حضرتِ سودا نے کی اے مصحفی تقصیر
کرتا ہے جو ہجو اس کی تو ہر صفحے میں تحریر

تو اس کی اشاعت ہو کر رہی۔ یہ ہجو کلیاتِ سودا، مطبوعہ مطبع مصطفائی اور کلیاتِ سودا مرتبہ آسی دونوں میں موجود ہے۔ اس ہجویہ قصیدے میں مصحفی کے تمام اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ قصیدہ کس نے لکھا تھا۔ یہ پتا نہیں چلتا کیونکہ کسی کلیات میں مصنف کا نام نہیں ملتا۔ قاضی عبدالودود نے ثابت کیا ہے کہ یہ قصیدہ مرزا احسن کی تصنیف ہے۔ میرے خیال سے یہ بھی ممکن ہے کہ فخرالدین ماہر۔ محمد رضا اور مرزا احسن تینوں اس کے مصنف ہوں۔ کیونکہ مصحفی کا یہ شعر قابلِ غور ہے۔

لکھے ہیں ہجو میاں مصحفی بہم یہ لوگ
دیا ہے بس یہی شاہِ کمال نے پیغام

اس شعر میں " بہم یہ لوگ " غور طلب ہے۔ اس زمانے میں ہجو نگاری اتنی عام تھی کہ اگر یہ کسی ایک شاعر کا ہوتا تو اسے اپنا نام چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ چونکہ کم از کم تین لوگ شریک تھے۔ اس لیے کسی ایک کے نام سے منسوب نہیں کیا جا سکا۔

مرثیہ نگاری

مرثیہ اردو شاعری کا بیش بہا خزانہ ہے۔ اس میں غزل کی سادگی و سوز و گداز۔ قصیدے کی شان و شوکت، مثنوی کا اندازِ بیان، رزم و بزم کی مرقع کشی، فطرت نگاری، انسانی رشتوں اور تعلقات کی ترجمانی، حق اور باطل کی جنگ وغیرہ سب ہی کچھ شامل ہے

اُردو میں مرثیہ نگاری کی ابتدا محمد قطب شاہ کے عہد میں ہوئی اور دکنی شاعروں نے اس صنفِ سخن پر کافی توجہ دی۔ دکن کے مرثیہ گو شاعروں کی فہرست اچھی خاصی طویل ہے۔ البتہ شمالی ہند میں سودا سے قبل مرثیہ کہنے والوں کی تعداد بہت محدود تھی۔ ان میں غلام مصطفیٰ[1] خاں یکرنگ[1]، میر امانی[2]، خواجہ برہان الدین عاصی[3]، اعلیٰ علی[4]، سید محمد تقی[5]، نذر علی خاں گمان[6]، میرزا علی قلی ندیم[7]، میر عبداللہ مسکین، حزین[9]، غمگین[10] وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ شمالی ہند کے یہ شعرا مرثیے کو

۱۔ میر نے ان کے مرثیے کے تین اشعار نقل کیے ہیں۔ نکات الشعرا، ص ۱۹۱

۲۔ میر امانی والد میر آشی (عاصی) .... با فقیر بسیار آشنا بود۔ بیشتر فکر مرثیہ می نمود۔ تذکرۂ شعرائے اُردو، ص ۱۵

۳۔ خواجہ برہان الدین عاصی (آشی) .... متوطن شاہجہاں آباد .... مرثیہ ہم خوب می گوید۔ نکات الشعرا، ص ۱۱۸

۴۔ .... میر اعلیٰ علی از سادات عالی شان .... ابن میر ولایت اللہ خاں .... مرثیہ نیز می گوید۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۲۰

۵۔ سید محمد تقی۔ سید نجیب الطرفین از مرثیہ گویانِ حضرت ابا عبداللہ الحسین ... مولدش شاہجہاں آباد الحال بطرفِ فرخ آباد استقامت دارد۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۳۷۔ سودا نے سبیل ہدایت میں انھیں کے مرثیے پر اعتراضات کیے ہیں۔

۶۔ مردے ست، سپاہی پیشہ از یاران کوکہ خاں فغاں۔ اصلش از شاہجہاں آباد ست، مرثیہ و منقبت و غزل ہمہ می گوید۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۱۴۰ - ۱۴۱

۷۔ شعر فارسی و مرثیہ در ریختہ بہ خوبی می گفت۔ چنانچہ اکثر مرثیہ ہائے او مشہور اند۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۱۷۷

مغفرت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس لیے اکثر ان کے مرثیے فنِ شاعری کے عام اصولوں سے آزاد ہوتے تھے۔ سوداؔ نے سید محمد تقی کے مرثیے پر اعتراضات کرتے ہوئے لکھا تھا۔

آپ کے مرثیے کا ہوں قائل
خون جس سے عوام کا ہے دل
سن کے جُمّا سے جس پہ بدھو تک
شام سے کوٹیں سینہ صبح تلک
لیکن افسوس صد ہزار افسوس
یہی آتا ہے بار بار افسوس
بدھو جُمّا سمجھ بجے رو دیں
معنی اس کے نہ مجھ سے حل ہو دیں

سوداؔ کو بنیادی اعتراض یہ تھا کہ مرثیہ گو شاعر فنِ شاعری کے اصولوں کی پابندی نہیں کرتا۔ سید محمد تقی پر اعتراض کرتے ہوئے سوداؔ نے اُردو نثر میں لکھا تھا۔

پس لازم ہے کہ مرتبہ در نظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ کہ برائے گریہ عوام اپنے تئیں

۸۔ سوداؔ نے ایک شہر آشوب میں مسکینؔ کا ذکر کیا ہے۔

استفادہ تمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

محمد عتیق صدیقی صاحب نے ان کا اسّی بندوں کا ایک مرثیہ نقل کیا ہے۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۲۱-۲۶۱

۹، ۱۰۔ حزیںؔ اور غمگینؔ دونوں مسکینؔ کے بھائی تھے۔ درگاہ قلی خاں ان تینوں کے بارے میں لکھتے ہیں "بزبان ریختہ مرثیہ گفتن مہارتے تمام دارند۔ در ہمہ شہر کلام اینہا شہرت دارد۔ و در واقع ہر سہ کس بسیار خوب مرثیہ می گویند"
مرقع دہلی، ص ۵۱

ماخوذ کرے۔ نادر مقالہ ہے کہ عقلا جو نہ سمجھیں اور ضبط تضحیک و قصد بکا ہیں رہیں اس

کا سیاق و سباق جہلا دریافت کریں۔ اور چھوٹ [illegible] ہیں۔

معنی لفظوں سے ہوتے ہیں [illegible] روپوش

یاں تلک [illegible] سخن پہ [illegible][1]

یہ حال صرف سید محمد تقی ہی کا نہیں تقریباً اکثر مرثیہ گو شعرا کا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ادب اور احترام کی وجہ سے کسی میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ ان کے مرثیوں پر اعتراض کریں۔ لیکن سودا کب چوکنے والے تھے۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ سودا نے کب مرثیہ نگاری کی ابتدا کی۔ میر، خواجہ خاں حمید اور نگ آبادی اور قیام الدین قائم نے سودا کے مرثیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ غالباً لچھمی نرائن شفیق پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے "کلیاتِ سودا" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"کلیاتش متضمن بر قصائد و مثنوی و .... مخمس و ترجیع بند و قطعہ و رباعی و مرثیہ قریب دو ہزار بیت، بنظر امعان رسیدہ"۔[2]

چمنستانِ شعرا کا سنہ تالیف تقریباً ۱۱۷۵ھ ہے۔ گویا ۱۱۷۵ھ سے قبل جو کلیاتِ سودا مرتب ہوا تھا۔ اس میں مرثیے بھی تھے۔ لیکن شفیق کے الفاظ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک سودا نے مرثیہ نگاری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ رواجِ زمانہ سے متاثر ہو کر چند مرثیے کہہ لیے ہوں گے۔ شیخ چاند لکھتے ہیں: "سنہ ۱۱۷۵ھ سے قبل سودا کے مراثی کا ذکر سننے میں نہیں آیا۔ سب سے

۱۔ کلیاتِ سودا، ص ۴۴۳

۲۔ چمنستانِ شعرا، ص ۳۲۷

پہلی مرتبہ اس کے مرثیوں کا ذکر شفیق نے اس کے کلیات کے بیان کے سلسلے میں کیا ہے۔ یہ ابھی تک نہیں معلوم ہوا کہ سودا نے دہلی میں مرثیہ کہنا شروع کیا تھا یا وہاں سے جانے کے بعد۔ ۱۱۷۵ھ تک کے مرتبہ کلیات میں اس کے کسی مرثیے کا پتا نہیں چلتا۔ معلوم نہیں کہ شفیق کے پیشِ نظر کس سنہ کا کلیات تھا![1] ہمارا خیال ہے کہ سودا نے دہلی ہی میں مرثیے کہنے شروع کر دیئے تھے۔ لیکن فرخ آباد میں مہربان خاں رند کے مذاق نے سودا کو مجبور کر دیا کہ وہ سنجیدگی سے اس فن کی طرف متوجہ ہوں۔

اُردو مرثیہ نگاری کے ارتقا میں سودا کی حیثیت اُس سنگ میل کی ہے۔ جو ایک واضح اور صاف راستے کے تعین میں مددگار ہوتا ہے![2] سودا نے مرثیہ نگاری کی ابتدا کی اور نہ ہی اسے انتہا پر پہنچایا۔ لیکن اس صنفِ سخن کی ہیئت اور مواد میں ان کے تجربات بہت اہم اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضمیرؔ، خلیقؔ اور بعد کے عظیم مرثیہ گو شعرا انیسؔ اور دبیرؔ نے سودا سے بہت کچھ حاصل کیا ہے![3]

معلوم ہوتا ہے کہ سودا کے ابتدائی مرثیے فن کے کچھ اچھے نمونے نہیں تھے۔ اس لیے بعض لوگ سودا کے مرثیوں پر اعتراض کرتے تھے اور بعض انھیں مرثیہ گوئی

۱۔ سودا، ص ۲۸۸

۲۔ اظہر علی فاروقی لکھتے ہیں، مرزا سودا کے مرثیے ایک سنگ میل کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اردو مرثیہ، ص ۲۱۵

۳۔ دبیر نے سودا کی زمین میں ایک مرثیہ کہا جس کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

بس اے دبیر سینہ ہے بریاں جگر کباب، سودا کے مرثیے کا تو ممکن نہیں جواب
بر فضلِ حق سے مرثیہ یہ بھی ہے انتخاب کافی ہے تجھ کو بخششِ محشر کے واسطے

کا اہل ہی نہیں سمجھتے تھے! خود سوداؔ نے "سبیلِ ہدایت" میں اس کا ذکر کیا ہے کہ سید محمد تقی ان کے مرثیوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شعر کے قاعدے کے موجب ہم
کہنے لاگے تھے مرثیہ کم کم
سو زبانی تمہاری اے مخدوم
ہوا اپنے تئیں کو یہ معلوم
مرثیہ وہ جسے عوام الناس
روئیں سُن سُن پڑھیں جب ان کے پاس
اور سوداؔ کا مرثیہ سُن کر
چپ ہی رہ جاؤں ہوں میں سر دُھن کر
کیسی ہی طرح کوئی اس کی بنائے
لیکن اس پر کبھو نہ رونا آئے
بارہا یہ سخن ہوا ظاہر
حق میں بندے کے غائب و حاضر
سچ ہے یہ مجکو مرثیے کا ڈھب
نہیں آتا وہ جس سے رو دیں سب

۱۔ سوداؔ کے مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے آزادؔ لکھتے ہیں:

"مرثیے اور سلام بھی بہت کہے ہیں۔ اس زمانے میں مسدس کی رسم کم تھی۔ اکثر مرثیے چو مصرع ہیں۔ مگر مرثیہ گوئی کی آج کی ترقی دیکھ کر ان کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ شاید انھیں مرثیوں کو دیکھ کر اگلے وقتوں میں مثل مشہور ہوئی تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں۔" آبِ حیات، ص ۱۵۶

بعض لوگ سوداؔ سے فرمائش کرتے تھے کہ وہ مرثیوں کے علاوہ کچھ اور سنائیں سوداؔ ان کو جواب دیتے ہیں۔

جو مجھ سے کہتے ہیں کہ مرثیے سوا کچھ اور
وہ چاہتے ہیں زباں سے مری سنا کچھ اور
کبھو نہ میں تو کہوں اس کے ماورا کچھ اور
الم سے آلِ محمد کے ہے بھلا کچھ اور

لیکن کچھ ہی عرصے میں سوداؔ نے اس فن پر کمال حاصل کر لیا اور اپنے تمام معاصر مرثیہ گو شعرا پر سبقت لے گئے۔ سوداؔ سے قبل مرثیے غزل کے انداز پر مربع یا چومصرعے کہے جاتے تھے۔ سوداؔ نے مرثیے کی تیکنک میں گوناگوں تجربات کیے۔ ان کے ہاں مرثیے کی حسب ذیل صورتیں ملتی ہیں۔

۱۔ منفردہ ۲۔ مستزاد منفردہ ۳۔ مثلث ۴۔ مثلث مستزاد ۵۔ مربع ۶۔ مربع مستزاد ۷۔ مخمس ترکیب بند ۸۔ مخمس ترجیع بند ۹۔ مسدس ۱۰۔ مسدس ترکیب بند ۱۱۔ دہرہ بند ۱۲۔ مرثیہ دوازدہ مصرع معہ دہرہ۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مرثیہ کو پہلی بار جس نے مسدس کی شکل دی وہ سوداؔ ہیں اور بعد میں مرثیہ کی یہی فارم سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ شبلیؔ کا بیان ہے کہ "اس وقت تک مرثیے عموماً چومصرعے ہوتے تھے۔ غالباً سب سے پہلے سوداؔ نے مسدس لکھا[1]"، سوداؔ کے معاصرین میں سکندرؔ[2] ایک مرثیہ گو شاعر

۱۔ موازنہ انیسؔ و دبیرؔ، ص ۱۶ - اثر لکھنوی لکھتے ہیں "جہاں تک تحقیق ہو سکا ہے سوداؔ ہی پہلا شاعر تھا جس نے صنفِ مسدس میں مرثیہ کہا۔ انیسؔ کی مرثیہ نگاری، ص ۶

۲۔ پورا نام خلیفہ محمد علی، سکندرؔ تخلص (مجموعہ نغز، جلد ۱، ص ۲۹۹) اور عرف میاں گھسیا تھا (تذکرہ

تھے۔ چونکہ وہ صرف مرثیہ کہتے تھے۔ اس لیے انھیں مرثیہ گوئی کے میدان میں بہت شہرت اور مقبولیت تھی۔ ان کے متعلق سید افضل حسین ثابت رضوی نے لکھا ہے۔

"سب سے پہلے جن بزرگوار نے مرثیہ مسدس کیا وہ سکندر پنجابی مرثیہ گو شاعر ہیں اور سب سے پہلا اس طرز کا یہ مشہور و مقبول مرثیہ ہے۔

ہے روایت شترا سوار کسی کا تھا رسول[1]

شعرائے اردو، ص ۹۲، دو تذکرے، عشقی، ص ۴۳۸، شورش نے ان کا نام شیخ سکندر لکھا ہے (دو تذکرے، شورش، ص ۴۳۰) جو غلط ہے۔ سکندر پنجابی الاصل تھے لیکن ان کی نشو و نما دہلی میں ہوئی تھی۔ (مجموعہ نغز) محمد شاکر ناجی کے شاگرد تھے (تذکرہ کمال، ورق ۶۲ ب، تذکرہ شعرائے اردو، مجموعہ نغز) ادبی زندگی کے آغاز میں قصہ خوانی کرتے تھے۔ بعد میں مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے (تذکرہ ہندی ص ۱۱۶) شاہ کمال نے فیض آباد کے جن شاعروں کا ذکر کیا ہے ان میں سے سودا کے ساتھ سکندر کا بھی نام ہے (تذکرہ کمال دیباچہ) جس کا مطلب ہے کہ سکندر فیض آباد بھی گئے تھے۔ کمال مدعی ہیں کہ لکھنؤ میں ان کی سکندر سے ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ اور لکھنؤ ہی سے سکندر حیدر آباد آئے (تذکرہ کمال)، سکندر ہر وقت شراب پیے رہتے تھے (تذکرہ سرور ص ۲۵۰۔ تذکرہ شعرائے اُردو۔ مجموعہ نغز) مصحفی نے تذکرہ ہندی (تالیف ۱۲۰۰ - ۱۲۱۰ھ) میں لکھا ہے کہ ان کی عمر پچاس سے متجاوز ہو گی (تذکرہ ہندی) حیدر آباد میں انتقال کیا۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ حیدر آباد میں ان کی قبر زیارت گاہ عوام ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس شہر کے لوگوں نے اُن کی لاش کربلائے معلیٰ بھیج دی (مجموعہ نغز) سرور نے بھی یہی لکھا ہے کہ ان کی لاش کربلائے معلیٰ بھیج دی گئی تھی (تذکرہ سرور) انھوں نے ایک قصہ لاح و ماہی و بادشاہِ دل خواہ بھی لکھا تھا۔ اکثر پنجابی، پوربی، بنگالی اور مارواڑی میں مرثیے کہے تھے (تذکرہ شعرائے اردو)

۱۔ امیر احمد علوی نے دس بندوں کا یہ مرثیہ یادگار انیس میں نقل کیا ہے۔ اس کا پہلا بند یہ ہے۔

ہے روایت شترا سوار کسی کا تھا رسول ایک جا شہر رینہ میں ہوا اس کا نزول

جس محلے میں کہ بستے تھے حسین ابن بتول ایک لڑکی کھڑی دروازے پہ بیار و ملول

یہ بھی لکھنؤ میں رہتے تھے۔ انھیں کی طرف سے مرزا سوداؔ نے میر ضاحک مرحوم کی ہجو کہی تھی۔ جس کا مفصل ذکر آب حیات میں ہے .... ایک مسدس مختصر سوداؔ مرحوم کے کلیات میں بھی ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

کس سے اے چرخ کہوں جاکے تری بیدادی

مگر وہ کتاب میں مقید ہے اور سکندر کا مرثیہ تمام ہندوستان میں پڑھا جاتا ہے فقیر تک گلیوں میں پڑھتے پھرتے ہیں[1]۔ سوداؔ سکندرؔ کے معاصر ضرور تھے مگر سکندرؔ صرف بحیثیت مرثیہ گو مشہور تھے۔ ان وجوہ سے مرثیہ کو بطور مسدس کہنے کا سہرا میرے نزدیک سکندر کے سر ہے یا کم سے کم جب یہ بات مشتبہ ہے کہ دو معاصرین میں سے اول کس نے کہا تو سکندرؔ اور سوداؔ دونوں کو موجد ماننا چاہیئے[2]۔

مطبوعہ کلیات سوداؔ میں مرثیوں کی تفصیل یہ ہے۔ مربع ۶۱، مربع مستزاد ۱، منفردہ ۸، منفردہ مستزاد ۱، مسدس ۱، مسدس ترکیب بند ۲، مسدس ترجیع بند ۱،

خط یہ کہتی تھی پردے سے لگی زار و نزار

ادھر آ تجھ کو خدا کی قسم اے ناقہ سوار (یادگار انیس، ص ۱۶)

۱۔ آثر لکھنوی بھی سکندر کے اس مرثیے کی مقبولیت تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قدیم مرثیہ نگاروں میں ایک میاں سکندر تھے۔ ان کا ایک مرثیہ ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول، پیکر سوز و گداز ہے اور کچھ برس ادھر تک اتنا مقبول تھا کہ فقیر اسے پڑھتے ہوئے پھیری لگاتے تھے۔

(انیس کی مرثیہ نگاری، ص ۶)

۲۔ حیاتِ دبیر، ص ۱۱۵

مثلث ۱، مثلث مستزاد ۱، مخمس ۱، مخمس ترجیع بند ۴، مخمس ترکیب بند ۲، مسدس دوہرہ بند ۲، مسدس مع دوہرہ پنجابی ۱، مسدس مع دوہرہ پوربی ۲، منزدہ بزبان دکھنی ۱، دوازدہ مصرع مع دوہرہ ۱، کل مرثیے = ۹۱

ان میں تیرہ مرثیوں کے مقطع میں مہربان تخلص آیا ہے، جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ مہربان خاں رند کے مرثیے ہیں اور غلطی سے اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ لیکن گمانِ غالب یہ ہے کہ یہ مہربان کے مرثیے نہیں۔ کسی اور نے ان کے نام سے لکھے تھے۔ مہربان خود شاعر نہیں تھے۔ جسے عام طور پر مہربان کا دیوان سمجھا جاتا ہے۔ وہ کلکتہ میں موجود ہے مگر اس میں تمام غزلیں میر سوز کی ہیں۔ میں نے یہ نسخہ خود نہیں دیکھا۔ مجھے یہ اطلاع اپنے دوست صدیق الرحمٰن صاحب قدوائی سے حاصل ہوئی ہے۔

قاضی عبدالودود مراثی سودا پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "دیوانِ ہفتم (کلیاتِ سودا مطبوعہ مطبع مصطفائی) دیوان مرثیہ ہے۔ جس کا آغاز ایک فارسی دیباچے سے ہوتا ہے۔ جو عجب نہیں کہ اصلح الدین کا لکھا ہوا ہو۔ اس کے بعد سودا کی مثنوی "سبیل ہدایت" ہے۔ جس میں سید محمد تقی اکبر آبادی (میر نہیں) کے ایک سلام پر اعتراضات ہیں۔ مثنوی کے بعد اسی شاعر کے ایک مرثیے کی تنقید مربعات کی شکل میں ہے۔ جس سے پیشتر سودا کی اردو نثر بطور تمہید ہے۔ خود سودا کے مرثیے اور سلام اس کے بعد آتے ہیں۔ کلیاتِ سودا کے بہت کم مخطوطات میں مراثی اور سلام شامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

۱۔ دیوانِ زہرہ کے نسخہ ۔۔۔۔ کا یہ حال ہے کہ غالباً اس میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو سوز کے کسی نسخے میں نہ ہو۔ سویرا، ۲۹، ۱۹۶۱ء، ص ۵۵)

ان کا ایک الگ مجموعہ تھا جس کا ایک نسخہ بقول (قاسمی) سراج الدولہ (حیدرآباد) کے کتب خانے میں تھا (تاریخ جلد ۶، ص ۷۰) ...... وہ مراثی جن میں "مہربان" یا "مہربان خاں" بطور قافیہ آیا ہے۔ یقیناً جس نے بھی لکھے ان (مہربان خاں رند) کی طرف سے لکھے۔ وہ بھی، جن میں نام بطور قافیہ نہیں، ممکن ہے کہ انھیں کے نام سے کہے گئے ہوں ...... شواہد اس پر دال ہیں کہ مہرباں خاں خود شعر نہیں کہتے تھے، دوسروں کے اشعار اپنی طرف منسوب کر لیا کرتے تھے۔ یہ مراثی سودا کے ہیں یا کسی اور شاعر کے؟ اس کے متعلق کوئی فیصلہ کُن بات اس وقت نہیں کہی جا سکتی"!

سوداؔ کو مرثیہ نگاری سے اظہارِ فن مقصود نہیں تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ فن کے تمام اصولوں کو نظرانداز کر دیا جائے۔ وہ مرثیہ گوئی کو آمدنی کا ذریعہ بھی نہیں بنانا چاہتے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے خود ایک شعر میں کہا ہے۔ ؎

یہ روسیاہ تو ایسا نہیں۔ جسے ہووے
تلاش مرثیہ گوئی سے دام و درہم کا

ان کا عقیدہ تھا کہ اگر کربلا کے دردانگیز اور غم ناک واقعات کی یاد دلا کر وہ اپنے سامعین کو رُلا سکیں تو یہ کارِ ثواب ہے۔ اس کا اجر قیامت کے دن انھیں ملے گا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

زیادہ اس سے نہ کر اب تو سوداؔ طول کلام
درود بھیج شہیدوں پہ کر سخن کو تمام

۱۔ سویرا، ۲۱-۲۲، ۱۹۵۶ء، ص ص ۵۷-۵۸

جزا بہر دو جہاں اس کی تجھ کو دیں گے امام
سخن تو تیرا رلاتا ہے شکل ابر مطیر

ایک اور مرثیہ کا آخری بند ہے۔

سودا اب چشمِ محباں کو ہے یہ نظم جلا
پاوے گا اس کا محمد سے تو محشر میں صلا
تجھ کو جنت میں ہر اک بیت پہ گھر دیں گے ولا
سننے سے جس کے یہ اشک آنکھوں سے آتا ہی چلا
سن کے اس مرثیے کو بزم میں جو رووے گا
آبِ چشم اس کا گناہوں کو ترے دھووے گا

سودا کو شہدائے کربلا سے بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ انھوں نے واقعاتِ کربلا کے بیان میں غم ناکی اور درد انگیزی پیدا کرنے کی پوری کوشش کی ہے مگر وہ ایک دردمند دل نہیں رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کی بنیاد دلسوزی اور خستگی پر نہیں بلکہ ہنرمندی پر ہے۔ وہ الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ اس لیے ہر طرح کے مضامین کے اظہار پر قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن کلام میں اثر انگیزی کے لیے کچھ اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے جن سے سودا محروم تھے۔ اگرچہ میر نے سودا کے مقابلے میں بہت کم مرثیے کہے ہیں (غالباً مراثی میر کی تعداد اکتالیس سے زیادہ نہیں) لیکن میر کے مرثیوں میں وہ نشتریت ضرور ہے جو عقیدت مندوں کو رونے پر مجبور کر دے۔ شیخ چاند سودا کے مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اس میں شبہ نہیں کہ سودا کے مرثیوں میں مرثیت بڑی حد تک مفقود ہے۔ مرثیے کی بڑی غرض و غایت غم انگیز مضامین کو رقت خیز پیرائے میں بیان کر کے رلانا ہے۔ سودا کے مراثی میں یہ جوہر نہیں[1]۔" سید صفدر حسین میر اور سودا کے مرثیوں کا

۱۔ سودا، ص ۲۸۹

موازنہ ان الفاظ میں کرتے ہیں "سودا کے برخلاف میر کا مرثیہ سوز و گداز سے لبریز ہے۔ میر کی دل برشتگی وہ میدان ہے جہاں سودا گرد ہو جاتے ہیں[1]" سودا کے مرثیوں پر مزید بحث کرنے سے قبل بہتر ہے کہ مرثیے کے اجزائے ترکیبی بیان کر دیئے جائیں۔ تاکہ ان کی روشنی میں مراثی سودا کا جائزہ لیا جا سکے۔

مرثیے کے اجزائے ترکیبی حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ چہرہ۔ صبح کا منظر، رات کا سماں، دنیا کی بے ثباتی، باپ بیٹے کے تعلقات، سفر کی دشواریاں، اپنی شاعری کی تعریف، حمد، نعت، منقبت مناجات، وغیرہ تمہید کے طور پر۔

۲۔ سراپا۔ مرثیے کے ہیرو کے قد و قامت، خط و خال وغیرہ کا بیان۔

۳۔ رخصت۔ ہیرو کا امام حسین سے جنگ کی اجازت لینا اور میدانِ جنگ میں جانے کے لیے عزیزوں سے رخصت ہونا۔

۴۔ آمد۔ ہیرو کا گھوڑے پر سوار ہو کر شان و شوکت کے ساتھ رزم گاہ میں آنا۔ آمد کے سلسلے میں ہیرو کے گھوڑے کی تعریف بھی لکھی جاتی ہے۔

۵۔ رجز۔ ہیرو کی زبان سے اپنے نسب کی تعریف، اپنے اسلاف کے کارناموں کا بیان اور فنِ جنگ میں اپنی مہارت کا اظہار۔

۶۔ جنگ۔ ہیرو کا کسی نامی پہلوان سے یا دشمن کی فوج سے بڑی بہادری کے ساتھ لڑنا۔ جنگ کے ضمن میں ہیرو کے گھوڑے اور تلوار کی بھی تعریف کی جاتی ہے۔

۱۔ نگار (جنوری فروری ۱۹۵۷ء) ص ۱۰۵

۷ - شہادت - ہیرو کا دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر شہید ہونا۔

۸ - بین - ہیرو کی لاش پر اس کے عزیزوں بالخصوص عزیز عورتوں کا رونا ۔(۱)

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اُردو میں بہت کم ایسے مرثیے ہوں گے جو ان اجزائے ترکیبی کی جملہ شرائط پوری کرتے ہوں۔ عام طور پر مرثیوں میں یہ اجزا پائے جاتے ہیں لیکن بعض مرثیوں میں ان میں سے کچھ اجزا نہیں ہوتے اور بعض میں ترتیب مختلف ہوتی ہے۔ اردو میں اور خاص طور پر سودا کے ہاں ایسے مرثیوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ جن میں صرف حضرت امام حسین کی شہادت پر اظہار غم کیا گیا ہے۔

چہرہ :- سودا سے قبل عام طور پر چہرے یا تمہید کا رواج نہیں تھا۔ مرثیہ گو براہِ راست واقعاتِ کربلا بیان کرنا شروع کر دیتا۔ مگر سودا نے اکثر مرثیوں کی ابتدا تمہید سے کی ہے۔ مثلاً ایک مربع مرثیے کے ابتدائی چار بند بطور تمہید کہے گئے ہیں۔ پہلا بند ملاحظہ ہو۔

نہیں ہلال فلک پہ مہ محرم کا
چڑھا ہے چرخ پہ تیغا مصیبت و غم کا
دل اس طرح سے یہ گھائل کریگا عالم کا
کہ واں نہ لگ سکے ٹانکا نہ پھاہا مرہم کا

ایک اور مرثیے کا صرف پہلا بند تمہید کا ہے۔

۱ - (ا) یہ تفصیل روحِ انیس (ص ص ۲۰، ۱۱) سے لی گئی۔

(ب) مزید مطالعے کے لیے ملاحظہ ہو۔ اردو مرثیہ۔ ص ص ۲۱ - ۷۶

احوالِ روزگار مورخ لکھا کیا
کوئی پڑھا کیا اسے کوئی سنا کیا
تحریر جب سے واقعۂ کربلا کیا
محمد کہیں ہیں پڑھ کے ملاعین نے کیا کیا

سودا نے ایک مرثیے کی جو تمہید باندھی ہے وہ "چہرے" کی جملہ شرائط پر پوری اترتی ہے۔ انھوں نے موسم گرما کا حال حضرت امام حسین کے سفر کی دشواریاں چھ بندوں میں بیان کی ہیں۔ یہاں تین بند نقل کیے جاتے ہیں۔

کہا اساڑھ نے یوں جیٹھ کے مہینے سے
طپش یہ پوچھ نبی کے سرور سینے سے
کیا ہے بادیہ پیما فلک نے کینے سے
جسے نکال کے اس دھوپ میں مدینے سے

جو چارپایہ ہے جنگل میں ہپ ہپاتا ہے
پنکھیرو پاتوں میں رو کھونکے منہ چھپاتا ہے
گھر ان دنوں کوئی چیونٹی سے بھی چھڑاتا ہے
ہوا ہے کیا یہ عمل سرزد اس کمینے سے

غرض میں کیا کہوں اس شکل سے شہِ مظلوم
کرے تھا قطع منازل کٹانے کو حلقوم
وہ رو رو واں گیا آخر جہاں رہا محروم
تن اُس غریب کا چالیس دن دفینے سے

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ سودا کے "چہرے" ان کے تمام معاصرین سے

بہتر ہیں۔

پتا نہیں شبلی نے کیسے لکھ دیا کہ "چہروں" کی جدت ضمیر کی ہے۔[1] حالانکہ سودا سے قبل مرثیہ گو شعرا کے ہاں "چہرے" کے محض ابتدائی نقوش ملتے ہیں اور سودا نے مکمل چہرے لکھے ہیں۔

سراپا :۔ سودا نے اس طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ ایک مرثیے میں حضرت امام حسینؑ کے متعلق لکھتے ہیں۔

بڑا کیا تھا محمد نے جس کو گود میں پال
پھرے تھا ساقیٔ کوثر کے دوش پر مہ و سال

ایک اور مرثیے میں حضرت حسینؑ کی شہادت کے بعد ان کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں۔

راکب دوش کا محمدؐ کے
آج نوکِ سناں پہ سر ہے سوار
دھوتے جن گیسوں کو پیغمبر
سو وہ آلودہ ہیں بگرد و غبار
آج فرزند ساقیٔ کوثر
تشنہ دریا کے جا موے بکنار
آہ افسوس آج عبد حرم
ہو گئے رن میں شامیوں کے شکار
جن کی خاطر بنا ہے ارض و سما
دو جہاں چشم میں ہے ان کی تار

۱۔ موازنۂ انیس و دبیر، ص ۲۰

خاک و خوں میں پڑا ہے میرا لال
کہیں ہیں فاطمہ پکار پکار
بدن نازنیں پہ اس کے آج
لگے تیغ ستم کے وار پہ وار
ہوئے وہ گیسو برچھی کے بھبّا
جن کو دھوتی تھی میں سنوار سنوار

رخصت :۔ بعض مرثیوں میں سودا نے درد انگیز اور غمناک الفاظ میں رخصت کا منظر پیش کیا ہے۔ دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ شدید گرمی کا موسم ہے۔ حرم کے تمام افراد کا پیاس سے بُرا حال ہے۔ تمام کوششوں کے باوجود جب پانی فراہم نہیں ہو سکتا تو حضرت عباسؑ حضرت امام حسینؑ سے رخصت طلب کرتے ہیں تاکہ پیاسے مرتے ہوئے بچوں اور عورتوں کے لیے پانی لا سکیں۔ اس واقعہ کو سودا کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے۔

طلب کی رخصت اُ بھائی سے کر میداں کی تیاری
کیا عرض اب جسے چاہو اسے سونپو عملداری
یہی آئی ہے دل میں لہر سن عورات کی زاری
دیا سر یا تو میں دریا پہ جا یا مشک بھر لایا

سنا عباس سے جب اس کو شاہ دین و دنیا نے
کروروں در کروروں اشک آنکھوں سے لگے آنے
کہا جانِ برادر اپنے جیتے جی نہ دوں جانے
کہے گی خلق سر بھائی کا آگے دے کے کٹوایا

غرض رخصت پہ یکدیگر میں یہ الحاح وزاری تھی
کبھو جوں ابر باہم منہ پہ منہ رکھ اشکباری تھی
کبھو مانند برق آپس میں ان کو بے قراری تھی
مرخص اس طرح سالار دین نے اس کو فرمایا

آمد : سوداؔ کے ہاں آمد کے مضامین بہت کم ہیں۔ حضرت عباسؑ گھوڑے پر سوار ہو کر دریا کا رخ کرتے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی دشمن کی فوج صف آرا ہو جاتی ہے۔ سوداؔ لکھتے ہیں۔

چلا عباس جب قربوس زیں پر مشک کو دھر کر
تو لائے رو بہ میداں کافر اس کے قصد پہ اکثر
رکھا جن نے قدم تک آگے اپنا چھوڑ کر لشکر
جہنم کو اسے وہیں اجل کے ہاتھ بھجوایا
جگہ سے اپنی کوئی خوف کے مارے نہ ہلتا تھا
چلے تھا نیزہ اس جا سے جہاں سے تیر چلتا تھا

اگرچہ یہ بند آمد کی کوئی اچھی مثال نہیں ہے۔ لیکن مراثی سوداؔ میں اس سے بہتر اور کوئی مثال بھی نہیں۔

رجز : رجز کے مضامین سوداؔ کے ہاں بالکل نہیں ہیں۔

جنگ : سوداؔ کو رزمیہ لکھنے پر پوری قدرت حاصل تھی۔ جس کا ثبوت وہ قصیدہ ہے جو انھوں نے نواب شجاع الدولہ بہادر کی شان میں کہا تھا۔ اس قصیدے میں سوداؔ نے جنگ کا مکمل نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ لیکن مرثیوں میں انھوں نے اس طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ اسی لیے شبلی نے مرثیوں میں رزمیہ کا سہرا بھی ضمیرؔ کے سر باندھا ہے! لیکن ہمارا خیال ہے کہ رزمیہ

۱۔ موازنۂ انیس و دبیر، ص ۲۰

کے ابتدائی نقوش سودا کے ہاں مل جاتے ہیں۔ حضرت عباسؑ فرات سے مشک بھر چکے ہیں اور اب اہلِ بیت کے خیمے کی طرف آنا چاہتے ہیں کہ دشمنوں نے انھیں گھیر لیا۔ اس موقع پر حضرت عباسؑ اور دشمنوں کی جنگ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

نہ مانا جب تو پیٹھا فوج میں وہ اشجع عالم
لگی تب صف بہ صف لشکر کی ہونے درہم و برہم
جدھر کو رخ کیا کشتوں کے پشتے واں ہوئے اسدم
ادھر خوں کے بہے نالے جدھر اس کا پڑا سایا
کہوں کیا جس طرح چھایا تھا ابر آہن کا اس جا پر
سناں پر تیغ برسے تھی پڑی اور تیغ پر خنجر
نہ جانے آہ وا ویلا کہ اس میں کن نے واں آکر
حوالے تیغ کی اس کے کہ دستِ چپ لٹک آیا

بعد کے مرثیہ نگاروں نے اہلِ بیت کے گھوڑوں، تلواروں، نیزوں وغیرہ کی تعریف میں جو زورِ بیان صرف کیا ہے۔ اس کی مثال کسی اور صنفِ سخن میں نہیں ملتی۔ اُردو قصیدوں میں اس قسم کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ اس جوشِ بیان، فنی مہارت اور جزئیات نگاری سے محروم ہیں۔ سودا کے قصیدوں میں بھی اس قسم کے بیشتر مضامین ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ممدوحین کے آلاتِ حرب، گھوڑے اور ہاتھی وغیرہ کی تعریف کی ہے۔ مثلاً سیف الدولہ احمد علی خاں بہادر کے قصیدے میں سودا کہتے ہیں۔

سید میں کیا بیاں کروں تیری کماں کا زور
سینہ عدو کا توڑ کے نکلے ہے جب خدنگ

بیٹھے زمین پہ تو اسے پھر نہ پائیے
گر سو کرّوڑ کوس تلک کھودیے سرنگ
خلقت کا بر و بحر کی ہیبت سے ہو یہ حال
شمشیر گر علم کرے اپنی تو روزِ جنگ
رہنے نہ دے صفائے برش اس کی تیغ کی
باقی کسو ہی طرح سے ضارب کے دل میں زنگ
گر پشت آسماں پہ وہ آئے تو بہرِ حکم
ہو خرق و التیام فلک دیکھ کر کے دنگ

روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں اور نواب شجاع الدولہ میں جنگ ہوئی۔ جس میں حافظ رحمت خاں مارے گئے۔ سودا نے ایک قصیدے میں اس جنگ کے حالات اس طرح بیان کیے ہیں کہ یہ قصیدہ اُردو کا بہترین رزمیہ ہوگیا ہے۔ شکست خوردہ فوج کا ایک سپاہی جنگ کے حالات سُنا رہا ہے

تھی سامنے ہمارے جو فوج ہراولی
ہوں گے وہ دس ہزار تلک پیادہ و سوار
سنتے ہیں اب ہر ایک سے اس فوج کی یہی
سرکردہ تھے سمیت فرنگی کے پانچ چار
ایدھر سے بان و رہکلا و توپ متصل
پڑتی تھی پر وہ بڑھتے ہی آتے تھے سرگزار
بڑھ بڑھ کے آخرش وہ لگے توپیں داغنے
اس پلے پر جہاں سے جزائر کے ہوئے مار
تھیں کرتیاں تلنگوں کی مانند لالہ زار
تھا دود توپ ابرِ سیاہ تگرگ بار

توپیں جو داغتے تھے فتیلوں سے آن آن
زنجک مثال برق چمکتی تھی بار بار
گنجال مثل رعد کے کڑکے تھی دمبدم
آواز شتر نال تھی طاؤس کی جھنگار
بارود و گولہ توپ میں تھا یا وہ باد تھی
جن نے کہ قوم عاد اوڑائی تھی جوں غبار
ہر ایک جا یہی نظر آیا ہر ایک کو
گھوڑا ادھر جو تڑپے ہے اودھر پڑا اسوار

لیکن مرثیے میں اس قسم کے مضامین نہیں ہیں۔ یہ ضمیر اور ان کے بعد کے مرثیہ گو شعرا کی جدّت ہے۔

شہادت :۔ سوداؔ نے جہاں کہیں بھی شہادت کے مضامین باندھے ہیں۔ بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ کبھی ایک بند اور کبھی صرف ایک شعر ہی پر اکتفا کیا ہے۔ البتہ چند مرثیوں میں واقعۂ شہادت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا ذکر ملاحظہ ہو۔

یہ کہہ کے شہِ دیں نے کیا گھوڑے کو رخصت — خیمے کی طرف کو
من بعد نصیب اس کے ہوا جام شہادت — از دستِ جفاجو
واں سے جو گیا اسپ سوئے پردہ عصمت — مل چہرے میں لہو
پھر کیا کہوں تھا حق ہی اس احوال سے محرم — گزرا جو انھوں پہ

آیا جو نظر خانۂ زیں شاہ سے خالی — میں کیا کہوں اس آں
وحشت ہوئی اک وحشت محشر سے نرالی — از نالہ و افغاں

خاک اتنی سرو شکل پہ ہر ایک نے ڈالی کربال پریشاں
پہچانے تھا کوئی نہ کسی کے تیئں باہم از عترتِ اطہر

حضرتِ عباس کی شہادت کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

جو تھامی مشک دانتوں سے تو کی بوچھار تیروں کی
لگی چاروں طرف سے ہونے مارا مار تیروں کی
ستم کیشوں نے کی پیکان اپنی پار تیروں کی
کہ اس کو مشک سے اک پل میں کر غرباں دکھلایا

سبب زخموں کے حالت اس پہ جب طاری ہوئی غش کی
ندا کرتے ہوئے کی یا اخا ادرکنی ادرکنی(؟)
صدا جوہیں یہ شاہِ کربلا کے کان میں پہونچی
بسانِ ابر گہریاں آپ کو اُس پاس پہونچا یا

پر اس احوال کو راوی نے یوں اخبار میں لکھا
کہ جب تک پہونچے ہی پہونچے سرورِ سینۂ زہرا
بہ طعنِ نیزہ تن کا گوشت اس کے لے گئے اعدا
نشاں جز استخواں اس کا نہ شاہِ دیں نے کچھ پایا

کہیں کہیں سودا نے تخیل کی مدد سے "شہادت" کو اور بھی درد انگیز بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ایک مرثیے میں حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے وقت ان کے اور شمر کے خنجر کے مکالمے دکھائے ہیں۔

قضا کی تیغ کا جب سب کو کھا چکا جوہر
رہا نہ اُس شہِ مظلوم کا کوئی یاور
زباں نکال کے بولا یہ شمر کا خنجر

کہ میں ہی اب تو ہوں اک آشنا ترے دم کا

کہے جو تو تجھے جد کے کنے میں لے جاؤں
جو مرضی ہووے تو والد کے پاس ٹھلاؤں
ترا اخی جو ہے کہہ اس کے ساتھ ملواؤں

ملاپ چاہے جو تو اس شہِ مکرم کا

سخن یہ سُن کے لگا کہنے وہ شہِ آفاق
انھوں کا دل کو مرے اس قدر نہیں ہے فراق
رضائے حق کی ملاقات کا ہوں میں مشتاق

جو ہووے ایسے میں تو ہو ملاپ باہم کا

بین : یہ سوداؔ کا اصل میدان ہے۔ ان کے اکثر مرثیے صرف "بین" ہیں جن کا مقصد لوگوں کو واقعاتِ کربلا یاد دلا کر رلانا ہے۔ سوداؔ نے تشبیہات و استعارات کا سہارا لے کر ان واقعات کو شدید درد انگیز بنانے کی کوشش کی ہے۔ عام طور پر اہلِ حرم کے مصائب سوداؔ کے موضوع سخن ہوتے ہیں۔ حضرت امام حسینؑ، حضرت عباسؑ وغیرہ کی شہادت پر بھی اظہارِ غم و افسوس کیا گیا ہے لیکن نسبتاً کم۔ حضرت امام کی شہادت پر "بین" ملاحظہ ہو۔

کریں نہ اہلِ جہاں کس طرح سے شیون و شین
سروں کو اپنے نہ پیٹے سو کیوں وہ کر کے بین
ہوا ہے آج کے دن قتل کربلا میں حسینؑ

یہ تعزیہ ہے رموزِ خدا کے محرم کا

بڑا کیا تھا محمدؐ نے جس کو گود میں پال
پھرے تھا ساقیِ کوثر کے دوش پر مہ سال

گیا جہان سے پیاسا وہ فاطمہ کا لال
عطش ہے تن سے ہوئی روح کی سبب رم کا

ایک مرثیے میں سودا حضرت عابدؑ کی زبانی ان اندوہ ناک واقعات پہ بین کرتے ہیں۔

عابدین کہتے ہیں اے پروردگار
ایک بھائی کو بھی رکھتا روزگار
یکدگر اس وقت ہوتے غمگسار
روتے آپس میں گلے لگ زار زار

بے برادر تا پدر عم ابن عم
غرق لوہو میں پڑے ہیں یک قلم
بہہ گئی دریائے خوں میں ہے ستم
کشتیٔ آل نبی آ مانجھ دھار

جا چچا نے بر لب آب فرات
آب کی خاطر کیا قطع حیات
باپ کے سقّے نے کاٹے پاؤں ہات
پانی کی تو بھی نہ پہونچی منہ میں دھار

باپ کو میرے محمد یک زماں
دیکھتے تنہا نہ زیر آسماں
ذبح کر ڈالا یہ بیکس کرکے واں
جس جگہ کوئی نہ یاور ہے نہ یار

بین دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو اہلِ بیت میں سے کسی فرد کی شہادت

پر اس کے اعزہ بین کرتے ہیں اور دوسرے تمام مخلوق۔ یعنی حیوانات، جمادات اور نباتات اس ظلم وستم پر اظہارِ غم کرتے ہیں۔ سودا کے ہاں بین کی دونوں قسمیں ملتی ہیں۔ اگرچہ دوسری قسم کی مثالیں بہت کم ہیں۔ ایک مرثیے کے ابتدائی تین بند یہ ہیں۔

میں تم سے کیا کہوں یارو یہ کیا سحر ہے آج
کہ زیرِ چرخ جسے دیکھو چشم تر ہے آج
ہر ایک سمت جہاں میں یہی خبر ہے آج
سیوم نبی کے جگر کا نگر نگر ہے آج

جو پھول باغ میں ہیں آج سو ہیں اس کے پھول
ہے نرگس آج پیالے کا ارگجی کے اصول
صلواۃ بھیجے ہے بوٹی بھی اس پہ ہو کے ملول
چمن میں جو کوئی بلبل ہے نوحہ گر ہے آج

روئے ہے رنگ سے سرمار آبشار چمن
جگر کے خون سے لبریز ہے کلی کا دہن
سوائے نالہ نہیں باغباں کے لب پہ سخن
ثمر نہالِ محمد کا خاک پر ہے آج

دعا: عام طور پر مرثیے کے آخر میں مرثیہ نگار خدا سے کچھ دعا مانگتا ہے بعد کے مرثیہ نگاروں کے اکثر مرثیے دعا پر ختم ہوتے ہیں۔ سودا ایک مرثیے کا اختتام اس طرح کرتے ہیں۔

اس ارادے پہ تو کر ختم اے سودا یہ کلام
کہ تجھے حشر میں بخشائے وہ مظلوم امام

شام سے صبح تلک، صبح سے لے کر تا شام

سن کے عالم میں اسے عالمیاں روتے ہیں

ان کے علاوہ بھی اور بہت سے موضوعات ہیں۔ جو مرثیوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں اہلِ حرم کے مصائب، حضرت عابد کی بیماری، اور حضرت قاسم کی شادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان موضوعات پر جو کچھ مرثیہ گو شعرا نے کہا ہے۔ ان میں سے بیشتر کی تصدیق تاریخ سے نہیں ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعر کے ذہن اور تخیل کی پیداوار ہیں۔ شاعر نے ایک معمولی سی بات پر واقعات کی پوری عمارت تعمیر کرلی ہے چونکہ اردو شاعر عرب کی پہلی صدی ہجری کی تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھے۔ اس لیے مرثیہ کے تمام افراد اپنے لباس، طور طریق اور عادات و اطوار کے اعتبار سے ہندوستانی ہیں۔ ان کے اسلحۂ جنگ بھی اکثر وہی ہیں جو اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں تھے۔ سودا بھی اس عیب کا شکار ہیں انھوں نے حضرت قاسم کی شادی پر بہت سے مرثیے کہے ہیں۔ ان مرثیوں میں شادی کی جتنی رسوم بیان کی گئی ہیں۔ وہ سو فیصدی ہندوستانی ہیں مثلاً مشاطہ کا رقعۂ نسبت لانا، دلھن کے مہندی لگانا، منگنی کا نشان آنا، ساچق چوتھی، شادی پر شہنائی کا بجنا، آتشبازی، آرسی مصحف، پان کھانا وغیرہ۔

سوداؔ نے بعض مرثیوں میں جدّت سے کام لیا ہے۔ مثلاً ان کا ایک مرثیہ "محرم کی چاند رات" پر ہے۔ پندرہ اشعار کے اس مرثیے میں وہ تاثرات بیان کیے گئے ہیں جو محرم کی چاند رات کو ہی پیدا ہوتے ہیں ایک مرثیے میں مسلمان اور نصاریٰ کے مکالمے ہیں۔ جن میں نصاریٰ کربلا

کے واقعات یاد دلا کر مسلمانوں کو شرم دلاتا ہے اور شکر ادا کرتا ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ ایک مرثیہ میں حضرت امام حسینؑ کی لاش اپنے اعزّہ کو وصیّت کرتی ہے اور کربلا کے واقعات پر تبصرہ کرتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سوؔدا کا کوئی مرثیہ ایسا نہیں ہے جس میں مرثیے کے مذکورہ بالا تمام اہم اجزا ایک جا ہوں۔ لیکن یہ عیب سوؔدا کا نہیں تمام مرثیہ گو شعرا کا ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ کے ہاں بھی مرثیے کے یہ سارے اجزا نہیں ملتے۔ ان کے صرف چند مرثیے ہی ہر اعتبار سے مکمل کہے جا سکتے ہیں۔ مرثیہ نگاری کی تاریخ میں سوؔدا کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے سراپا، تمہید رزمیہ وغیرہ کی ابتدا کی۔ مرثیہ کو مسدس کی شکل میں مقبول بنایا۔ سوؔدا سے قبل یہ فن ایسے شاعروں تک محدود تھا کہ ذی علم طبقہ اس کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا۔ سوؔدا اور میر تقی میرؔ ہی نے اس فن کو آبرو بخشی اور یہ ثابت کیا کہ ہر مرثیہ گو کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ بگڑا شاعر بھی ہو۔

شہر آشوب ہیئت کے اعتبار سے شہر آشوب کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ کسی عہد میں کوئی پابندی نہیں رہی۔ رباعی مخمس، مثنوی اور مسدّس وغیرہ سب ہی میں شہر آشوب ملتے ہیں۔ شمالی ہند کے ابتدائی شاعروں نے جو شہر آشوب کہے ہیں۔ ان میں مختلف طبقات کی اقتصادی بدحالی کا بیان ہے۔ کسی سیاسی حادثے کا ذکر کیا گیا ہے یا ماضی کی خوش حالی، عیش و عشرت، مالی آسودگی اور ذہنی سکون کا ماتم ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ شہر آشوب کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "دراصل کسی نظم کا شہر آشوب کی صنف میں شامل ہونا اس بات پر موقوف

ہے کہ اس میں چند بنیادی اوصاف اور شرائط موجود ہوں۔ اولین شرط اس نظم کی یہ ہے کہ اس میں کسی شہر (یا ملک) کے مختلف طبقوں کا تذکرہ ہو علی الخصوص کاری گروں اور پیشہ وروں کا ذکر، دوسری صفت اس نظم کی یہ ہے کہ اس میں اقتصادی اختلال یا کسی حادثے کی وجہ سے سیاسی اور مجلسی پریشانی کا ذکر ہو، ابتدائی زمانے کے شہر آشوبوں پر پہلی صفت غالب تھی۔ مگر بعد میں دوسری صفت بھی شہر آشوب کے ساتھ لازم سی ہو گئی۔[۱]

فارسی میں ابتدائی شہر آشوب رباعیوں اور قطعوں کی صورت میں لکھے گئے جن میں مختلف طبقوں اور پیشوں کے لڑکوں کے حسن و جمال کی تعریف کی جاتی تھی۔ مسعود سعد سلمان کے کلیات میں ایسے بانوے قطعے موجود ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب کا خیال ہے کہ سلمان کو شہر آشوب کے موجد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مسعود صاحب نے نقوش، لاہور (شمارہ ۱۰۲) میں شہر آشوب کے ارتقا پر تفصیلی بحث کی ہے۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل حکومت میں جو زوال آیا تھا جس نے عوام کی زندگی کو اجیرن کر دیا تھا اور جس پر تفصیلی بحث پہلے باب میں کی گئی ہے۔ سودا کے شہر آشوب اس زوال کی مکمل تصویر ہیں۔ ایک شہر آشوب میں سودا نے مختلف پیشہ وروں اور امرا و روسا کی اقتصادی بدحالی کی عکاسی کی ہے۔ بقول سودا کوئی پیشہ ایسا نہیں ہے جس میں آمدنی کی صورت ہو۔ سپاہ گری معزز ترین پیشوں میں سے ایک ہے۔ مگر اس عہد میں اس پیشے کا بہت برا حال تھا۔ اگر سپاہی گھوڑا لے کر کسی کا ملازم بھی ہو جائے تو گھوڑے کے کھانے کے لیے کہاں سے لائے۔ گھوڑے کو ہر حال میں

۱۔ سید عبداللہ، بحث و نظر، لاہور، ۱۹۵۲، ص ص ۲۸۔۲۹

خوراک چاہیے۔ سپاہی اپنے ہتھیار گروی رکھ کر علف و دانہ حاصل کرتا ہے۔ تنخواہ کبھی نہیں ملتی۔ اس لیے وہ ہتھیار واپس نہیں آتے۔

گھوڑا اے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے
گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر
شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یاں ہے

امرا اور رؤسا کی خود مالی حالت خراب ہے۔ وہ تنخواہ دیں تو کیسے؟ لیکن جن ملازموں کے جسم میں جان ہے۔ وہ دھونس دیتے ہیں اور مختلف حربے استعمال کرتے ہیں اور تنخواہ وصول کر لیتے ہیں لیکن بیچارے کمزوروں کی کوئی نہیں سنتا۔ اگر انسان کسی کی مصاحبت کرے تو اور مصیبت ہے۔ وہ امیر اگر رات بھر جاگے تو مصاحب کو بھی جاگنا پڑتا ہے۔ نیند کے مارے بُرا حال ہے مگر اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے۔ طبابت کے پیشے میں بھی کچھ اور پریشانیاں ہیں۔ نواب جو چاہتا ہے کھا لیتا ہے۔ پیٹ میں تکلیف ہونے پر طبیب موردِ الزام ہوتا ہے۔ اگر نواب کو چھینک آجائے تو اس کی ذمہ داری بھی طبیب ہی پر عائد ہوتی ہے۔ گویا ان امرا کے طبیب علاج کرنے والے نہیں بلکہ موت سے لڑنے والے سپاہی ہیں۔ انسان اگر سوداگری کرنا چاہے تو یہ بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ

سوداگری کیجیے تو ہے اس میں یہ مشقت
دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے
ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ سطے کیجیے منزل
ہر شام بہ دل وسوسۂ سود و زیاں ہے

لیجا جو کسی عمدہ کی سرکار میں دے جنس
یہ درد جو سنیے تو عجب طرفہ بیاں ہے
قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث
سمجھے ہے فروشندہ پہ دزدیکا گماں ہے

غرض بڑی مشکل سے بھاؤ تاؤ ہوتا ہے۔ امیر ایک پروانہ عامل کے نام لکھ کر دے دیتا ہے۔ مگر ان کے خزانے میں پیسے ہی کہاں؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چیز واپس ملتی ہے اور نہ پیسہ۔ اگر کھیتی باڑی شروع کی جائے تو ہر وقت بارش نہ ہونے کی فکر اور قرقی کا خوف کھائے جاتا ہے۔ مختلف پیشوں کی تباہی کے ذکر کے بعد سودا شاعروں کا حال بیان کرتے ہیں۔

شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
مشتاق ملاقات انھوں کا کس و ناکس
ملنا انھیں ان سے جو فلاں ابن فلاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھے جا کے دوگانہ
نیّت قطعۂ تہنیت خانِ زماں ہے
تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر
گر رحم میں بیگم کے سنے نطفۂ خاں ہے
اسقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

شہر آشوب کے آخر میں سودا کہتے ہیں کہ انسان اگر بالفرض ہفت ہزاری بھی ہو جائے تو ذہنی آسودگی اور سکون ممکن نہیں۔ بلکہ دنیا ہی کیا

عقبیٰ میں بھی آسودگی نہیں مل سکتی

بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری
یہ شکل بھی مت سمجھیو تو راحت جاں ہے
ٹک دیکھنا منصور علی خاں جی کا احوال
چھاتی پہ کڑک بجلی ہے اور شیر دہاں ہے
آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال
جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام
عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے
سو اوس پہ تیقن کسی کے دل کو نہیں ہے
یہ بات بھی گوینده ہی کا محض گماں ہے
یاں فکر معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر
آسودگی حرفیست نہ یاں نہ وہاں ہے

دوسرے شہر آشوب میں سودا نے مغل حکومت، اس کے بادشاہ شہزادے امرا اور روسا کی زبوں حالی کا مرثیہ کہا ہے۔ ان کے سیاسی اقتدار کے کھو جانے، جھوٹی عزت و وقار اور اقتصادی بدحالی کا ماتم کیا ہے۔ سودا زندگی بھر جاگیردار طبقہ سے متوسل رہے۔ اس لیے انکی ہمدردیاں سماج کے اس طبقے کے ساتھ ہیں۔ انھیں اس طبقے کی بربادی کا بہت صدمہ ہے۔ انھوں نے اس طبقے کے مختلف افراد اور اشیا کا مضحکہ اڑایا ہے اور اپنے طنز کے تیز نشتر ایک ایک ناسور پہ چلائے ہیں سودا خود کو اس طبقے کا ایک فرد سمجھتے ہیں۔ اس لیے یہ ناسور خود ان کی زندگی

کے ناسور ہیں۔

مخمس کے پہلے بند میں سودا اب بے روزگاری کی شکایت کرتے ہیں۔ اگر انسان گھوڑا خرید بھی لے تو ملازمت کس کی کرے۔ نوکری ڈھیریوں یا تول تو بکتی نہیں جو بازار جا کر خرید لی جائے۔ پہلے امیر دولت مند نوکر رکھتے تھے اب جاگیر سے ان کی آمد بند ہو چکی ہے۔ مدتوں سے ملک میں سرکشوں کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ پہلے جو ایک شخص بائیس صوبوں کا خاوند تھا۔ اب وہ کول (علی گڑھ) کا فوجدار بھی نہیں رہا۔ کئی بندوں میں سودا نے جاگیردار کی بدحالی کا نقشہ کھینچا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ طبقہ جو صاحب حل و عقد تھا۔ جس کے دم سے ملک کی سیاست چلتی تھی۔ سیاست سے بیزار ہو گیا اور بقول سودا ؎

جو کوئی ملنے کو ان کے انھوں کے گھر آیا
ملے یہ اس سے گر اپنا دماغ خوش پایا
جو ذکر سلطنت اس میں وہ درمیاں لایا
انھوں نے پھیر کے اودھر سے منہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

مغل زوال کا اثر فوج پر براہ راست پڑا تھا۔ وہ سپاہی جن کی جاں بازیوں کے کارنامے سنہرے لفظوں سے لکھے گئے تھے۔ اب تلوار بھی اُٹھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ سودا نے سپاہیوں کی بزدلی کو ذرا مبالغے کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پڑے جو کام انھیں تب نکل کے کھائی سے
رکھیں وہ فوج جو موتے بھری لڑائی سے

پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے
سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے الول

مغل خزانہ خالی پڑا تھا۔ تمام صوبے خود مختار ہو چکے تھے۔ خالصہ بہت مختصر تھا اور جو تھا اس سے بالکل آمدنی نہیں تھی۔

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری
سپاہی تا متصدی سبھوں کو بیکاری
اب آگے دفتر تن کی میں کیا کہوں خواری
سوال دستخطی کو پھاڑ کر کے بنساری
کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کٹول

شہزادے قلعہ معلیٰ میں فاقوں مر رہے تھے لیکن کوئی ان کی چیخ پکار سننے والا نہیں تھا۔ قلعہ کا خزانہ خالی تھا۔ قیمتی اشیا نادر شاہ اور ابدالی کے حملوں کی نذر ہو چکی تھیں۔ اور مغل شہنشاہ کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا کہ شہزادوں کو صرف ایک وقت ہی کھانا کھلا سکتا۔

مچا رکھی ہے سلاطینوں نے یہ توبہ دھاڑ
کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریباں پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آوے دے مارتا ہے کواڑ
کوئی کہے جو ہم ایسے ہیں چھائے ہیگی پہاڑ
تو چاہیے کہ ہمیں سب کو زہر دیجیے گھول

شہر دہلی جو کبھی عالم میں انتخاب تھا۔ اجڑا پڑا تھا۔ جہاں کبھی عیش و عشرت کی محفلیں سجتی تھیں، اب وہاں گیدڑ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ جس

شہر کی حسین اور خوب صورت عمارتوں پر جنّت کو بھی رشک آتا تھا۔ جہاں ایک ایک گھر چمن اور سبزہ زار تھا۔ آج وہاں کمر کمر گھاس ہے۔ عمارتیں شکستہ پڑی ہیں۔ کہیں کہیں مکان کا ستون نظر آتا ہے اور کہیں مرغول۔ جس شہر کے چراغاں کو دیکھ کر آسمان کے مہ و انجم حسد سے جلے مرتے تھے آج وہاں کی تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا۔ ؎

سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز
تو اس کو سن کے کریں ہوش چند کے پرواز
نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز
کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہر نماز
تو واں چراغ نہیں ہے بجز چراغ غول
خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوکھ اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس
بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول
یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم
نجانے کن نے رکھا یاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو صنوبر وہاں اُگے ہیں زقوم
مچی ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھیں کلول

یہ حالات تھے جن سے تنگ آکر اربابِ فن اور اہلِ شہر نے ترکِ وطن

کیا۔

غرض مآل ہے اس گفتگو سے یہ میرا
کہ بے زری نے جب ایسا گھر آن کر گھیرا
تو کوئی قصد کرے نوکری کا بہتیرا
نہیں یہ فائدہ کچھ تا وہ چھوڑ کر ڈیرا
کرے نہ عزم سوئے اصفہان و استنبول

گھوڑا دراصل فوجی طاقت کا نشاں ہے کیونکہ اس عہد میں فوج کی شکست و فتح کا بہت زیادہ دارومدار گھوڑے پر تھا۔ انوری نے فارسی میں گھوڑے کی ہجو کہی ہے۔ سودا نے بھی اس زمین میں گھوڑے کی ہجو کہی۔ دراصل یہ ہجو گھوڑے کی نہیں بلکہ مغل حکومت کے فوجی نظام کی ہے جو افسانوی انداز میں کہی گئی ہے۔ سودا نے اس ہجو یہ قصیدے کا نام تضحیکِ روزگار رکھا ہے۔

سودا نے تب قصیدہ کہا سن یہ ماجرا
ہے نام اس قصیدے کا تضحیکِ روزگار

سودا کے ایک دوست تھے۔ جو سو روپے کے ملازم تھے۔ چوں کہ ایماندار تھے اس لیے اوپر کی آمدنی نہیں تھی۔ ان کے پاس ایک گھوڑا تھا۔ گھوڑے کو دانہ اور گھاس نہیں ملتی تھی۔ سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔

ناطاقتی کا اس کے کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار
مانند نقشِ نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اُٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

اس مرتبہ کو بھوک سے پہونچا ہی اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار
قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد
امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار
ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن
پہلے وہ ریگِ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے ز روے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنّت سے ہو سوار
اک دن گیا تھا مانگے پہ گھوڑا برات میں
دولھا جو بیاہنے کو چلا اوس پہ ہو سوار
سبزے سے خط سیاہ و سیہ سے ہوا سفید
تھا سرو سا جو قد سو ہوا شاخِ بار دار
پہونچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجواں
شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گذار

سوداؔ نے چالیس اشعار میں طرح طرح سے گھوڑے کی حالت بیان کی ہے اور اس کی کمزوری اور لاغری کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اس تعریف کے بعد قصہ شروع ہوتا ہے۔ ایک دن نقیب نے مالک سے آکر کہا مرہٹے دہلی تک آپہنچے اور تم ابھی تک آرام سے بیٹھے ہو۔ اُن کو بہت شرم آئی۔ اس لیے فوراً میدانِ کارزار کی تیاری کی۔ تمام ہتھیار سے لیس ہوئے اور اسی گھوڑے پر جا بیٹھے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کے بیان کرنے میں سوداؔ نے کمال کر دکھایا ہے۔ وہ صرف اپنے زورِ تخیل

سے ایک واقعہ پیدا کرتے ہیں اور بہت ہی ظریفانہ انداز میں اس واقعہ کی تمام تفصیلات سناتے ہیں۔ اس ظرافت میں طنز کے تیز نشتر بھی چھپے ہوتے ہیں جو ہمارے ناسوروں پر کام کرتے ہیں۔ سودا نے گھوڑے کے پرشے میں اس فوج کا مذاق اُڑایا ہے جو دہلی کو حملہ آوروں کے ہاتھوں مٹتے دیکھتی رہی اور کچھ نہ کر سکی۔ نادر شاہ، ابدالی، روہیلے، جاٹ اور سکھ دہلی کو لوٹ رہے تھے۔ قتل و غارت گری کر رہے تھے۔ تمام مال و دولت جمع کر کے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے مگر مغل فوج بے بس اور لاچار بنی سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتی رہی اور کچھ نہ کر سکی۔ اب اُن کے میدان جنگ میں جانے کا قصّہ سنیے۔

ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اس پہ زین
ہتھیار باندھ کر میں ہوا جا کے پھر سوار
جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا کہوں
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ
تک تک سے پاشنہ کے مرے پاؤں تھے فگار
آگے سے توبڑا اوسے دکھلائے تھا سئیس
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار
اس مضحکے کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار
پہیے اسے لگا دُکہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھو پون کے دو اختیار

کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار

بہر حال خدا خدا کر کے میدانِ جنگ پہ پہنچے۔ وہاں جو حال ہوا، وہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

یہ کہہ کے میں خدا سے ہوا مستعد بجنگ
اتنے میں مرہٹہ بھی ہوا مجھ سے آ دو چار
گھوڑا تھا بسکہ لاغر و پست و ضعیف و خشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقتِ کارزار
جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو حریف پر
دوڑوں تھا اپنے پاؤں پہ جوں طفلِ نے سوار
جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں اب بندھی ہے شکل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار
دھر دھمکا واں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف
القصّہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

اس سلسلے کی چوتھی ہجو سیدی فولاد خاں کوتوال شاہجہاں آباد کی ہے۔ جس میں سودا نے دہلی کی بد انتظامیوں کا مذاق اڑایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان بد انتظامیوں کا ذمّہ دار فولاد خاں ہے۔ جو چور اچکّوں سے ملا ہوا

۱۔ فولاد خاں دہلی کا کوتوال تھا۔ ۹ ربیع الثانی کو فولاد خاں کسی سبب سے گرفتار کیا گیا۔ اور وزیر الممالک (عماد الملک) کے دیوان خانۂ خاص میں محبوس ہوا۔ کوتوالی اس کی جگہ سیدی بلال کو ملی۔ اسی ماہ کی ساتویں کو "تشدّد بسیار" کے بعد بندِ زنداں سے نجات پائی۔ اور

ہے۔ فولاد خاں اور اس کے دو لڑکے ڈاکہ اندازی میں خود حصّہ لیتے تھے جس

پچاس ہزار روپے بطور مال اماں مقرر ہوئے۔ لیکن "موکلان وزیر الممالک" کی کشاکش سے نہ چھوٹا تھا کہ تیرہویں شعبان کو راہی عدم ہوا۔ فولاد خاں نے ۱۱۷ سال کی عمر پائی۔ لیکن دیکھنے میں پچاس ساٹھ سال سے زیادہ کا نظر نہ آتا تھا۔ سلک دنداں باہم چناں منتظم بود کہ اصلا احتجاج بہ خلال میفتاد۔ روشنی چشم بدستور و خواب و خورش بے فتور و قوتِ رجولیت برقرار و پشتش بآئین جوانان نو خاستہ استوار بود و ایں خوارق روزگار است، (خانِ مذکور حبش کا رہنے والا تھا۔ اس نے سات بار حج کیا تھا) چندے بامر تجارت اشتغال ورزید و پس از آنکہ واردِ ہندوستان شدہ۔ در سلک ملازمان .... محمد شاہ .... منتظم گشتہ، پیوستہ برفاہ و فراغت اوقات بسر می برد۔ مدت سی و چہار سال بخدمت کوتوالی رکاب سعادت قیام ورزیدہ نظم ونسق شائستہ پدید آورد۔ تاریخ شاہ عالم گیر ثانی (مصنّف نامعلوم۔ قلمی) بحوالہ معاصر، حصہ ۲، ص ۱۱۶ (قاضی عبدالودود نے ایک قلمی تاریخ سے فولاد خاں کا حال نقل کیا ہے۔ یہ تاریخ مجہول الاسم ہے۔) " دریں ولا حاجی فولاد خاں بگفت کسے بطور خود زاہد بیگ وصالح بیگ مغلاں را کہ سرخیل ڈاکہ اندازاں بودند قابو دیدہ دستگیر کردہ آورد و در چبوترہ بہ حبس سخت محبوس نمودہ، حکم پادشاہ حاصل نمودہ، گشت۔ چوں قت عجیبے می گذرد و رفقاے او بہ وزیر الممالک عرض کردند کہ دریں شہر مگر ہمیں دو کس ڈاکہ اندازی می کردند دیگرے نیست .... فولاد خاں خود ڈاکہ ہا میزند و ہر دو پسرانش آنچہ افعال غارتیدن از ڈاکہ اندازی و دزد افشاری وغیرہ دارند در ہمہ عالم ظاہر است۔ ازیں معنی وزیر الممالک مردم خود بکثرت نزد فولاد خاں فرستاد کہ بیارند۔ سوم ربیع الاول یک پاس گذشتہ بذلت تمام پیادہ پا بدستور گنہگاراں کشیدہ بردند۔

معاصر، حصہ ۲، ص ۱۲۷

شہر کے کوتوال کا یہ حال ہو۔ اس کا خدا ہی حافظ ہے۔ یہ بدانتظامی اور کوتوال کی دیدہ دلیری مغل بادشاہ کی کمزوری اور لاچاری کی وجہ سے تھی۔ سودا نے حسبِ عادت ان واقعات کو مبالغے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہجو کی ابتدا میں سودا اُن دنوں کو یاد کرتے ہیں جب شہر میں نظم و نسق تھا۔ لیموں کے چور کا بھی ہات کاٹا جاتا تھا۔ جب کوتوال کو رشوت سے کوئی سروکار نہ تھا اور اس لیے شہر میں چور اچکّے نہیں ہوتے تھے اور اب تو یہ حال ہے۔

دیکھی ہم نے جو راہ چاوڑی کی
پشم ہے رہزنی تلاوڑی کی

فولاد خاں جب سے کوتوال ہوا ہے. شہر سے امن و امان مفقود ہو گیا ہے۔

کس طرح شہر کا نہ ہو یہ حال
شیدی فولاد اب جو ہے کوتوال
چور کب اُس کا زور مانے ہے
بال، کالادہ اس کو جانے ہے
ان سے رشوت لیے یہ بیٹھا ہے
اس کے دل میں یہ چور بیٹھا ہے
بعضوں کا مسفدوں کے زور ہے یہ
چور کا بھائی گٹھی چور ہے یہ

شہر کے تمام چور فولاد خاں سے ملے ہوئے ہیں جو روز صبح کو اس کا حصہ بھیج دیتے ہیں۔ شہر میں ہر طرف خوف و ہراس ہے۔ لوگوں نے

رات کو سونا بند کر دیا ہے۔ محفلِ عیش و طرب ہو یا میخانہ، عبادت گاہ ہو یا بزم ہاؤ ہو۔ ہر جگہ لوگ ہوشیار بیٹھے رہتے ہیں۔

بزم میں شب ہر ایک پیر و جواں
بیٹھے ہیں کر کے رزم کا ساماں
شام سے صبح تک یہی ہے شور
دوڑیو گٹھری لے چلا ہے چور
بے خطر ڈر سے اب کوئی نہ رہا
اہلِ میخانہ میں بھی ہے ہو ہا
نہ عبادت کو جاگتا ہے شیخ
ڈر یہی چور آ نہ مارے میخ

لطف یہ ہے کہ ان چوروں نے خود فولاد خاں کا بھی یہی حال کر رکھا ہے۔

خلق جب دیکھ کر کے یہ بیداد
کرتے ہیں کوتوال سے فریاد
بولے ہے وہ کہ میں بھی ہوں ناچار
گرم ہے چوٹٹوں کا اب بازار
کرتے ہیں مجھ سے اب بجا کر ڈھول
میری پگڑی کا میرے سر پہ مول

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ سودا کے یہ شہر آشوب اس عہد کی سیاسی اور سماجی زندگی کا آئینہ ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سودا کے زور بیان اور قوت متخیلہ نے ان میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ آمیزی کی ہے۔ لیکن

ہجو گوئی کی بنیاد اسی مبالغہ پر ہوتی ہے۔

مثنوی نگاری

اصطلاح میں اُن اشعار کو مثنوی کہتے ہیں جن میں دو دو مصرع باہم مقفّٰی ہوں[1]۔ اگرچہ لفظ "مثنوی" عربی ہے لیکن بحیثیت صنفِ سخن اس کی ایجاد فارسی میں ہوئی۔ اُردو نے اسے فارسی ہی سے مستعار لیا۔ ان دونوں زبانوں میں مثنوی ایک اہم صنفِ سخن ہے۔ اس میں جن پریوں کے قصّے اور مافوق الفطرت واقعات سے لے کر عام انسانوں کے حسن وعشق کی وارداتوں، خوشیوں اور غموں، میدانِ کارزار کے ہنگاموں، بزمِ طرب کی دلآویزیوں، شادی اور موت کی رسموں، اخلاقی قصّوں، تصوّف کے مسئلوں اور مذہبی تعلیم کا بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں غزل کی سادگی، سوز وگداز، قصیدے کا جوش وخروش، ہجو کی ظرافت نگاری، مرثیے کا نوحہ وغم وغیرہ سب ہی کچھ ہوتا ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ کسی عہد کے سیاسی وسماجی حالات معاشرت، رسم ورواج، رہن سہن کے طریقے، لباس وزیورات وغیرہ کے مطالعے کے لیے اس دوَر کی مثنویوں کا مطالعہ سب سے زیادہ اہم ہیں۔

فارسی میں شاہ نامہ، سکندر نامہ، حملۂ حیدری، یوسف زلیخا، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں اور مثنوی مولانا روم ایسی مثنویاں ہیں جنھوں نے اپنے مصنفین کو بقائے دوام کے دربار میں جگہ دلائی ہے۔

اُردو میں مثنوی نگاری کی ابتدا دکنی ہی سے ہوگئی

۱۔ نجم الغنی، بحرالفصاحت، لکھنؤ، ۱۹۲۶ء، ص ۱۰۴

تھی۔[1] نویں صدی ہجری میں میراں جی شمس العشاق کی مثنوی شہادت التحقیق یا شہادت الحقیقت، خوش نامہ، خوش نغز، مرغوب القلوب ملتی ہیں۔ ان تمام مثنویوں میں تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ اسی دور کے ایک شاعر نظامی کی عشقیہ مثنوی پدم راؤ کدم بھی دریافت ہوئی ہے۔ دسویں صدی ہجری کے شروع میں سید شاہ اشرف بیابانی نے مثنوی "نوسرہار" تصنیف کی۔ اسی زمانے میں برہان الدین جانم نے ارشاد نامہ، وصیت الہادی، حجت البقا، نسیم الکلام اور منفعت الایمان مثنویاں لکھیں۔ ایک اور شاعر فیروز بھی اسی عہد کا ہے۔ اس نے ایک مثنوی توصیف نامہ میراں محی الدین لکھی۔

گیارھویں صدی ہجری کی مثنویوں میں عبدل کی ابراہیم نامہ، وجہی کی مثنوی قطب مشتری، غواصی کی سیف الملوک اور بدیع الجمال، طوطی نامہ اور چندا اور لودک، نصرتی کی گلشن عشق، ابن نشاطی کی پھول بن وغیرہ مشہور ہیں۔

بارھویں صدی ہجری کے آغاز میں شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ اور ہمیں ابتدا ہی سے اچھی مثنویوں کے نمونے ملنے لگتے ہیں جعفر زٹلی کے کلیات میں ظفر نامہ اورنگ زیب اور طوطی نامہ مثنویاں موجود ہیں۔ نواب صدر الدین فائز دہلوی کے کلام میں بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں مل جاتی ہیں۔ شاہ مبارک آبرو نے بھی ایک مثنوی کہی تھی۔ شاہ حاتم کے

۱۔ دکنی مثنویوں سے متعلق تمام معلومات، دکنی مثنویاں، محمد اکبر الدین صدیقی مجلہ عثمانیہ، دکنی ادب نمبر ۱۹۶۳ء۔ ۶۶۴-۶۶۲ سے لی گئی ہیں۔

دیوان زادے میں پانچ مثنویاں بھی شامل ہیں۔

سودا اور میر دونوں اساتذۂ فن نے اس طرف توجہ دی لیکن یہ صنفِ سخن سودا کو راس نہ آسکی![1]

میر نے اگرچہ مختلف موضوعات پر مثنویاں لکھی ہیں مگر شہرت اور مقبولیت عشقیہ مثنویوں کو سب سے زیادہ ملی۔ قائم، مصحفی اور راسخ عظیم آبادی نے میر کی عشقیہ مثنویوں ہی کی تقلید کی۔ جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میر کی غزل میں جو دروں بینی، سوز وگداز، خستگی و برشتگی، درد و غم کی دھیمی دھیمی آنچ ہے وہی کچھ مثنوی میں بھی موجود ہے۔ سودا اس شدید داخلیت سے محروم رہے تھے۔ اس لیے وہ کوئی قابلِ تقلید مثنوی تصنیف نہ کرسکے[2]۔

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے سودا کی مثنوی نگاری کے بارے میں رائے دی ہے: "مرزا از اقسامِ شاعری در مثنوی فکرِ معقول نداشت[3]"۔ تقریباً یہی بات عبدالغفور نساخ نے ان الفاظ میں لکھی ہے: "سوائے

۱۔ امیر احمد علوی لکھتے ہیں: "مرزا رفیع سودا نے چوبیس مختصر مثنویاں لکھیں۔ لیکن وہ قصیدہ گوئی اور ظرافت نگاری کے بادشاہ تھے۔ مناظر کی مصوری، جذبات کی نقاشی میں ناموری نہ حاصل کرسکے۔" نگار، جنوری فروری ۱۹۵۷ء، ص ۶۳

۲۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں: "اگر میر کی مثنویوں میں خلوص، سچائی اور الم انگیزی کے یہ نقوش نہ ہوتے تو ان کی مثنویوں اور سودا کی مثنویوں میں کچھ فرق نہ ہوتا۔" نقدِ میر دہلی، ص ۲۴۱

۳۔ گلشنِ بے خار، ص ۱۰۰

مثنوی کے جمیع اصنافِ سخن پہ قادر تھے ۱۔"
سودا کی مثنویاں مختلف موضوعات کے تحت تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

ہجویہ :-

۱۔ مثنوی در ہجو پیل راجہ نرپت سنگھ
۲۔ مثنوی در ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال شاہ جہاں آباد
۳۔ مثنوی در ہجو امیر دولت مند بخیل
۴۔ مثنوی در ہجو میر ضاحک
۵۔ مثنوی در ہجو حکیم غوث
۶۔ مثنوی بطور ساقی نامہ در ہجو میاں فوقی
۷۔ مثنوی حکایت ڈومنی
۸۔ مثنوی در ہجو کوکی یعنی دخترِ دایہ

کلیاتِ سودا مرتبہ آسی میں آخری دو کے علاوہ باقی سب شامل ہیں۔ غالباً آسی نے اپنے کلیات میں ان دو مثنویوں کو اس لیے شامل نہیں کیا کہ یہ ضرورت سے زیادہ فحش ہیں۔ لیکن یہ مطبع مصطفائی کے نسخے میں شامل ہیں۔ ہجو دخترِ دایہ ۳۱ اشعار پہ مشتمل ہے۔ مثنوی کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

واسطے طفل کے جو بہتر ہے
شیر اگر ہے تو شیرِ مادر ہے
نہ کہ ہر ایک کنجڑی بھٹیاری
ایک خصم جس کا سو جگہ یاری

۱۔ سخن شعرا، ص ۲۲۳

مزید چار شعروں میں تمہید بیان کر کے سودا اصل موضوع پر آتے ہیں۔

ایسی ہی ایک چنانچہ دائی ہے
خام پارہ ایک اس کی جائی ہے
جب وہ لڑکوں میں کھیلنے جاتی
اس کی ماں ڈھونڈ کر پکڑ لاتی
پیٹ کر سر وہ تب یہ کہتی تھی
یہی کہہ کے چپ ہو رہتی تھی
بیاہی جب یہ چھنال جاوے گی
آگ سسرال میں لگاوے گی
لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے
نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنڈ پیلے[۱]

۱۔ اس شعر سے فائدہ اُٹھا کر مولانا محمد حسین آزاد نے ایک لطیفہ بنا دیا۔ لکھتے ہیں " آصف الدولہ مرحوم کی انا کی لڑکی خورد سال تھی۔ نواب فرشتہ سیرت کی طبیعت میں ایک تو عموماً تحمل اور بے پروائی تھی۔ دوسرے اس کی ماں کا دودھ پیا تھا۔ ناز برداری نے اس کی شوخی کو شرارت کر دیا۔ ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ نواب سوتے تھے۔ ایسا غل مچایا کہ بدخواب ہو کر جاگ اُٹھے۔ بہت جھنجھلائے اور خفا ہوتے ہوئے باہر نکل آئے۔ سب ڈر گئے کہ آج نواب صاحب کو غصہ آیا ہے خدا خیر کرے۔ باہر آ کر حکم دیا کہ مرزا کو بلاؤ۔ مرزا اسی وقت حاضر ہوئے۔ فرمایا کہ بھئی مرزا اس لڑکی نے مجھے بڑا حیران کیا ہے۔ تم اس کی ہجو کہہ دو۔ یہاں تو ہر وقت مسالہ تیار تھا۔ اسی وقت قلمدان لے کر بیٹھ گئے اور مثنوی تیار کر دی کہ ایک شعر اس کا لکھتا ہوں۔

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے   نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنڑ پیلے

یہ تو اس لڑکی کے بچپنے کا ذکر تھا۔ اب سوداؔ اس کی جوانی کا بیان کرتے ہیں۔

بچپنے میں تو اس کا تھا یہ حال
اب جوانی کا سنیے قال و مقال
نہ جوان چھوڑے ہے نہ یہ بالا
کام کے دیو نے اسے پالا

اس کے بعد سوداؔ فحش باتوں پر اتر آتے ہیں۔ دوسری مثنوی "حکایت ڈومنی" چھ شعر کی ہے۔ ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے۔

حکایت یہ ایک ڈومنی سے ہے یاد
بڑھاپے میں اوس کو ہوئی چھل زیاد
جواں کوئی کرتا نہ تھا اوس کو یار
کہ تقویم پارینہ ناید بکار

بعد کے چار شعر بہت فحش ہیں۔ باقی ہجویہ مثنویوں پر تبصرہ "ہجوگوئی" کے تحت کیا گیا ہے۔

بعض بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ دلّی میں نالہ پر ایک دکان میں بھٹیاری رہتی تھی۔ وہ آپ بھی لڑاکا تھی مگر لڑکی اس سے زیادہ چنچل ہوئی۔ آتے جاتے جب دیکھتے لڑتے ہی دیکھتے۔ ایک دن کچھ خیال آگیا۔ اس پر یہ ہجو کہی تھی۔ (آب حیات، ص ۱۷۰)

پوری مثنوی پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں واقعات آزادؔ کے ذہن کی اختراع ہیں۔ مثنوی اتنی فحش اور مبتذل ہے کہ اُس معصوم بچی کی ہجو نہیں ہو سکتی۔ جس کی ماں کا آصف الدولہ نے دودھ پیا تھا۔ ابتدائی اشعار میں صاف طور پر دائی اور اس کی دختر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے بھٹیاری والا قصہ بھی غلط ہے (خ۔ا)

مدحیہ:-

مثنوی در تعریف دیوان و اشعار مہربان خاں

مثنوی در تعریف شکار کردن نواب آصف الدولہ بہادر

مثنوی در مدح

پہلی مثنوی کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے۔

صاحبا سیر کے ہیں یہ ابیات
فکر عالی کی آپ کی کیا بات
یہ سفینہ ہے رشکِ ابرِ بہار
ہر ورق اس میں قطعۂ گلزار

اس کے بعد دیوان کی جلد اور شیرازہ کی تعریف بہت ہی انوکھے انداز میں کی ہے۔

اس کے پٹھوں پہ جلد کی یہ بہار
در باغِ بہشت کے ہیں کوار
صرف شیرازہ جو ہوا تیار
ہے رگِ جانِ عاشقانِ زار

مہربان خاں کے کلام کی تعریف میں سودا نے حسب معمول مبالغے سے کام لیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

لعل سفتہ لب و دہن تیرا
درِ شہوار ہے سخن تیرا
ہر غزل ہے تری کمالِ سخن
نمک شوخی غزالِ سخن

پڑھے دنگل میں جب رباعی تو
چوکڑی بھول جائے شاعر کو

اسی مثنوی میں سودا نے مہربان خاں کے استاد میر سوز کی تعریف کی ہے۔

شعر کے بحر میں ترا استاد
کشتیٔ ذہن کو ہے بادِ مراد
ایک خدمت میں تیری اتنی عرض
کرنی اس خیر خواہ کو ہے فرض
اس کو ہر طرح تو غنیمت جان
پھر ملے گا نہ سوز سا انسان

مثنوی کے اختتام پر سودا نے مہربان خاں کو دعا دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اس مثنوی لکھنے سے ہرگز یہ مدعا نہیں ہے کہ انھیں کچھ صلہ چاہیے۔

مثنوی شکار نامہ فنی لحاظ سے بہت کمزور ہے۔ میر کے شکار نامے اس سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ سودا کا شکار نامہ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تصنیف زبردستی کی ہے۔ پوری مثنوی میں کہیں شکار کا کوئی منظر نظم نہیں ہوا۔ صرف اس انداز کی مبالغہ آرائی ہے۔

جہاں تولے وہ اپنی شمشیر کو
تو روباہ سمجھے ہے وہ شیر کو
بجز زیر تیغ اس کے پاوے نہ اور
ہرن پاڑھے چیتل چکارے نے ٹھور
ہوئے شیر بیشوں ہیں اتنے شکار
کہ باہر پڑے تھے ز حد بے شمار

درندوں سے جب صاف جنگل کیا
تو خیمے میں تشریف فرما ہوا
رہے دیکھ حیراں صغیر و کبیر
جب آ گئے سے اٹھ بھاگے قالی کے شیر

نواب اس شکار میں کچھ زندہ ہاتھی گرفتار کر کے لائے تھے۔ یہ سب ہاتھی بہت خوب تھے۔ لیکن بقول سودا

پر اک پیل کا ان میں ایسا جمال
زباں وصف میں جس کے میری ہے لال
کبھو پیل ایسا بچشم جہاں
نہ آیا نظر زیر نہ آسماں
وہ ہے قد و قامت میں اتنا بلند
لگا کہنے دیکھ اس کو ہر ہوش مند
بدانست اپنے یہ ہاتھی نہیں
ہوا دیکھ اس کو مجھے بالیقیں
رہے جب نہ واں صید سو سو گروہ
تو زنجیر کر کھینچ لائے ہیں کوہ

تیسری مثنوی میں سودا نے کسی کی انگوٹھی کی تعریف کی ہے۔ جس پر مہر بنوائی گئی تھی۔ سات شعروں کی اس مثنوی میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ پہلا شعر یہ ہے۔

کھدا تیرے خاتم پہ جب تیرا نام
سند اس سے پانے لگے خاص و عام

اخلاقیہ :-

مثنوی در ہجو طفل ضائع روزگار لکڑی باز

مثنوی (اس کا کوئی عنوان نہیں دیا گیا۔)

پہلی مثنوی میں سودا نے ایک لڑکے کا قصہ بیان کیا ہے۔ یہ ایک غریب باپ کا بیٹا تھا۔ جھونپڑی میں رہتے ہوئے خواب محلوں کا دیکھتا تھا۔ ایک دن اپنے باپ سے کہنے لگا۔

موٹے جامے سے مجکو ذوق نہیں
چھوٹے چھیرے کا دل کو شوق نہیں
پٹکا گاڑھے کا کب تلک باندھوں
موٹی شلوار تا کجا پہروں
جوتی چمڑے کی مجکو نہیں بھاتی
سو کھر کر یاد دل میں نہیں آتی

پھر لڑکا اپنے لباس، ہتھیار، گھوڑے وغیرہ کی فرمائش کرتا ہے۔ یہ مثنوی اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں عہد سودا کے نوجوان کے لباس اور زیب و آرائش کے تمام ساز و سامان کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب لڑکے نے بہت کڑوی کسیلی باتیں کہیں تو باپ نے جواب دیا۔

تب کہا باپ نے اے میری جان
حق نے قسمت کیا ہے سو ہے ندان
ہم غریبوں کی دال روٹی ہے
گاہ پتلی ہے گاہ موٹی ہے
گر مزے چاہتی ہے تیری زبان
حق نے دی ہے تجھے یہ نذر کی کان

اپنے اوپر کسی کو کر عاشق
یا ہو وہ پاکباز یا فاسق
نخرے سے اس کی گود میں جا لیٹ
کھول چھاتی کو اور دکھا کر پیٹ

غرض باپ بیٹے میں جھگڑا اتنا بڑھا کہ لڑکا گھر سے نکل آیا۔ اسی محلے میں ایک پہلوان رہتے تھے۔ جو اسی قسم کے لڑکوں کی تاک میں رہتے تھے۔ یہ لڑکا کشتی کے بہانے سے ان کے پاس گیا۔ پہلوان زور کرانے کے لیے اکھاڑے میں لے گئے۔ یہاں سوداؔ نے پہلوانی کی بہت سی اصطلاحیں نظم کی ہیں، جو زبان پر کام کرنے والوں کے لیے بہت اہم ہیں۔ کشتی کے بعد جب لڑکا اکھاڑے سے آیا۔ تو اس نے اپنی اس نئی روش سے توبہ کر لی اور بقول سوداؔ "شعر پڑھتا یہ اپنے گھر کو چلا"۔

سنو اے لڑکو ہو نہ راہ سے گم
اس نصیحت کو گوش جاں سے تم
باپ کے گھر کی چاٹ کے چٹنی
کرو گذران یار و تم اپنی

اس مثنوی کا قصہ بہت کمزور اور غیر دل چسپ ہے۔ اندازِ بیان میں بھی کوئی خوبی نہیں۔ البتہ اس کی صرف یہ خوبی ہے کہ اس میں اُس دور کے لباس وغیرہ اور پہلوانی کی اصطلاحات کا ذکر آیا ہے۔

دوسری مثنوی میں بھی ایک قصہ بیان کر کے اخلاقی درس دیا گیا ہے۔ مگر پہلی مثنوی کی طرح اس کا قصہ بھی بہت کمزور ہے۔ البتہ یہاں سوداؔ کا اپنا اندازِ بیان قائم ہے۔ مثنوی شروع اس طرح ہوتی ہے۔

ایک مشفق ہیں ہمارے مہرباں
خوب صورت خوب سیرت نوجواں
ناگہاں اک روز ہم سے مل گئے
دیکھتے ہی شکل جوں گُل کھل گئے

سودا نے غور سے دیکھا تو ان کی صحت بہت خراب تھی۔ اور بقول سودا

دیکھتا کیا ہوں کہ عالم اور ہے
گرد رخساروں کے خط کا دور ہے

مزید سات شعروں میں سودا نے ان کی خستہ حالی کا بیان کیا ہے۔ پھر سودا اس کی بربادی اور تباہی کی وجہ دریافت کرتے ہیں۔ وہ بتاتا ہے۔

کدخدائی کا ہے جب سے اتفاق
زندگانی ہو گئی ہے جی پہ شاق
ہو جیو مشاطہ کا خانہ خراب
ہاتھ سے جس کے ہے اپنا جی کباب
ایسا بدصورت ملا یا آدمی
کہیے کیا اپنی ہے قسمت کی کمی
بیاہ کی رات اور مجھ پہ یوں کٹھن
چاند کوں لگتا ہے جیسے کہ گہن
آرسی مصحف لگا جب دیکھنے
آسماں اوپہ لگا تب دیکھنے
جو ہیں پڑتی ہے مری اوس پہ نگاہ
ہے گویا اک پارۂ ابرِ سیاہ

کوئی اوس صورت کا دیکھانے منا
دیکھتے ہی میں نے سر اپنا دھنا

سودا نے اس لڑکی کی بدصورتی اور دوست کی تباہ حالی کا ذکر ان اشعار میں کیا ہے۔ جب وہ دوست اپنا پورا قصہ سنا چکا۔ تو سودا اُسے نصیحت کرتے ہیں۔

تب کہا میں عقل سے یہ دور ہے
کونسا اے یار یہ مذکور ہے
جب سے دنیا میں ہے انساں کی سرشت
کوئی روئے خوب ہے اور کوئی زشت
ماٹی کی مورت بناوے ہے کمہار
کوئی بدصورت کوئی ہے تاجدار
دیکھ بدصورت کو مت ہنس کھلکھلا
اس میں ہوجاتا ہے صانع کا گلا
گنج کوئی مار سے خالی نہیں
دامنِ گل خار سے خالی نہیں
صورت اور سیرت کا باہم اتفاق
ایسا ہوتا ہے بہت کم اتفاق
کیجیے صورت کا بس کیا اعتبار
کوئی دن ہے یہ بھی جوں فصلِ بہار

اس کے بعد سودا نے اپنے عہد کے کچھ حسینوں کا ذکر کیا ہے۔

خوب صورت یار بھی اپنے گئے
مونس و غم خوار بھی اپنے گئے

بچے جیسے عبد الحی تاباں ہو چکا
ساتھ اس کے اک سلیماں ہو چکا
یوسفِ مصری سے مصری کم نہ تھا
تلخیٔ دوراں سے جس کو غم نہ تھا
نام تھا اک خوب صورت کا عزیز
جان سے زیادہ ہمیں وہ تھا عزیز
ہو چکا مالک بھی ملک حسن کا
تھا وہ بخشی الممالک حسن کا
میر قطبی قطب تارا ہو چکا
کیا کہوں میں زور پیارا ہو چکا
سانوروں میں اک گمانی زور تھا
ہند میں جس کے نمک کا شور تھا

اس کے بعد سودا بے ثباتیٔ دنیا کا ذکر کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہر چیز ناپائیدار ہے۔ کیسی کیسی صورتیں خاک میں مل گئیں۔ کیسے کیسے لوگ تہِ خاک چلے گئے۔ انساں کب تک اور کس کس کا ماتم کرے اور آخر میں نصیحت کرتے ہیں کہ ان تمام باتوں کا مدعا یہ ہے کہ دنیا سے دل مت لگا۔

آدمی کو چاہیے وارستگی
صورتِ فانی سے کیا دل بستگی
زندگانی کا نہ ہو جب اعتبار
شکل و صورت کا تو ہے کب اعتبار
پائداری ہے ادمی کی ذات کو
بس ہے سودا، نفی کر اثبات کو

خطوط :-

مثنوی بطور خط

مثنوی بطور خط

ان دونوں مثنویوں میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ خط کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ سودا کے دوستوں نے انھیں جو خطوط لکھے، یہ مثنویات ان ہی کے جواب کے طور پر لکھی گئیں۔

تنقیدی :-

مثنوی دربیان معانی بیت مثنوی مولوی روم۔

سبیل ہدایت

مولوی روم کا ایک شعر ہے۔

ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ام
ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام

بظاہر اس شعر کا مطلب یہی ہے کہ مولوی روم آواگون کے فلسفے کو تسلیم کرتے تھے جو اسلامی نقطۂ نظر سے کفر ہے۔ اس شعر پر کافی بحث و مباحثہ ہو چکا ہے اور ہر شخص نے اپنے اپنے انداز سے اس کی تشریح کی ہے۔ سودا نے بھی اس کی تشریح ان اشعار میں کی ہے۔

مدعا اگنے سے ہے نشو و نما
ہر جگہ کرنا خودی سے ہو فنا
ہے غرض قالب سے دل ہر ایک کا
خلقت خالق میں بد اور نیک کا
لے کے انسانات سے تا وحش و طیر
دیکھنی قالب سے مطلب اون کی سیر

یوں کلام مولوی دے ہے خبر
یعنی میں جس دل میں دیکھا بیٹھ کر
کچھ نظر آیا نہ غیر از اوس کی ذات
اس قدر پایا محیط کائنات
معنی ہم اس شعر کے سمجھے ہیں یوں
اور کی فہمید میں کچھ اور ہوں

ظاہر ہے کہ اس شرح میں سودا نے زبردستی کی ٹھونس ٹھانس کی ہے۔ ورنہ مطلب وہی ہے جس پر لوگوں کو اعتراض ہے۔ دوسری مثنوی پر ہجو گوئی کے تحت تبصرہ کیا جا چکا ہے۔

منظر نگاری :-

مثنوی موسم گرما

اس موضوع پر کلیاتِ سودا میں صرف ایک مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں وہی مبالغہ آرائی ہے جو سودا کے قصیدوں اور ہجوؤں میں ملتی ہے اسی لیے زبان و بیان کے لحاظ سے اعلیٰ درجے کی ہوتے ہوئے بھی حقیقت سے دور ہے۔ پھر بھی اس مثنوی کی یہ اہمیت ہے کہ موسم بہار کے علاوہ فطری منظر نگاری پر سودا کی پہلی کوشش ہے۔ غالباً اس مثنوی کو اچھی خاصی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ کیونکہ سودا کے شاگرد قائم نے اسی طرح موسم سرما پر ایک نظم کہی۔ بعد کے شاعروں نے مرثیوں میں فطرت نگاری کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔ خاص طور پر موسم گرما کا حال بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثنوی کی ابتدا میں سودا موسمِ بہار کی کیفیت بیان کرتے ہوئے یہ شکایت کرتے ہیں کہ اس دفعہ تو بہار کا

موسم بھی اتنا گرم ہے کہ

یہ پٹاخا چٹکتی وقت گلاب
کف نرگس پہ چھٹتی ہے مہتاب
دستۂ گل کا کیا کہوں میں رنگ
اس میں ہت پھول کے سے ہینگے ڈھنگ
غنچے کھلتے ہیں یوں ہو آتشبار
گویا پھٹتا ہے داغنے میں انار
نہیں گیندوں کے یہ چمن میں درخت
دی ہے آتش ستاروں کو یک لخت

گرمی کی شدت اس طرح بیان کی ہے۔

ہے حرارت گلوں کو اب یاں تک
نہیں شبنم یہ نکلی ہے چیچک
پانی کو بلبلیں پھریں بھٹکی
طفل غنچوں کو لگ گئی چٹکی
گیا تالاب میں ہر ایک کنول
کنول کاغذی کی طرح سے جل
بوند کو دل صدف کا ترسے ہے
ابر نیساں سے آگ برسے ہے
ہے پسینے سے منجوروں کا یہ حال
باد گویا ہے آب در غربال

اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی تشبیہات و استعارات ہیں۔

فطرت نگاری کے لحاظ سے یہ مثنوی اعلیٰ درجے کی نہ ہو۔ لیکن سوداؔ کے قادر الکلام ہونے کا ثبوت ضرور ہے۔

عشقیہ :-

مثنوی قصۂ درعشق پسر شیشہ گر بزرگر پسر بطور ساقی نامہ و دیگر حکایات شیخ و دعاء پادشاہ

مثنویاتِ سوداؔ میں یہ واحد مثنوی ہے جس میں عشقیہ قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ سوداؔ کا یہ میدان نہیں ہے۔ مثنوی کی ابتدا حمدِ خدا سے ہوتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مرا دل نام پر اوس کے ہے شیدا
کیا ہے جن نے حسن و عشق پیدا
کہیں نورِ چراغِ خانہ ہے وہ
کہیں سوزِ دلِ پروانہ ہے وہ
کسو کے دل میں پاتا ہوں اسے درد
کسی سینے میں تاثیرِ دمِ سرد
کسی جاگہ میں عیسیٰ کا ہو وہ دم
کسی جا ہو سموم آکر پہ از سم

سوداؔ خدا سے دعا مانگتے ہیں۔

خدایا دے تو اپنے عشق کا درد
عنایت کر دل گرم و دم سرد
محبت کا دے اپنے داغ دل پر
بغیر از شمع ہے تاریک یہ گھر

خم دل میں شرابِ درد بھر دے
پیالی چشم کی لبریز کر دے
تعشق میں کر اپنے اس قدر غرق
نہ مجھ سے کفر و دیں میں ہو سکے فرق

مناجات اور دعا کے بعد بیس شعروں میں نعت ہے جس کے چار شعر یہ ہیں۔

محمدؐ باعثِ ایجاد افلاک
محمدؐ علتِ غائی لولاک
محمدؐ ہے مشیرِ عالمِ غیب
محمدؐ راز دارِ حق ہے لاریب
محمدؐ عادل و کامل و عاقل
محمدؐ ہے جو کچھ تھا اوس کے قابل
اوسی کی ذات سے اثباتِ حق ہے
کہ اوس کی ذات عینِ ذاتِ حق ہے

اس کے بعد منقبت میں حضرت علیؑ کی تعریف کی گئی ہے۔

علی برحق امام رہنما ہے
علی ہی جانشینِ مصطفےٰ ہے
علی ہی شہسوارِ راہِ دیں ہے
علی مہرِ نبوت کا نگیں ہے
کروں کیا مرتبے کی اوس کے تقریر
کہ تابع جس کی مرضی کے ہے تقدیر

۷۷ اشعار میں ساقی سے خطاب اور موسمِ بہار کا بیان کر کے سودا

اصل قصے پر آتے ہیں۔

حکایت ہے کہ اک عابد بآفاق
عبادت کرنے میں تھے حق کے وہ طاق
خدا کی یاد میں رہتے تھے دن رات
نماز و روزہ میں گذرے تھے اوقات

ان بزرگ کے زہد، عبادت گذاری، نیکی اور شرافت کی بہت زیادہ تعریف و توصیف کے بعد سودا کہتے ہیں۔

ملے اک روز سودا سے وہ ناگاہ
کہا مجکو ہے قصد کعبۃ اللہ
نجات اپنی اگر تجکو نظر ہے
تو آمرزش کا موجب یہ سفر ہے
یہ بہتر ہے کہ چل ہمراہ میرے
جرائم عفو واں سب ہوں گے تیرے

سودا اُن کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔ اُن بزرگ اور سودا نے سامانِ سفر تیار کیا۔ سازو سامان اور گھوڑا لے کر یہ لوگ روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ اس بزرگ کے مرید بھی تھے۔ کوئی ان کا عصا لیے ہوئے تھا۔ کسی کے ہاتھ میں مورچھل تھا۔ کسی کے پاس حضرت کا رومال تھا۔ کوئی پیکدان لیے ساتھ چل رہا تھا۔ کسی نے سر پر مصلا رکھا ہوا تھا۔ غرض اس طرح قافلہ روانہ ہوا۔ ابھی دو چار منزلیں طے کی تھیں کہ شومئ قسمت سے ڈاکوؤں نے گھیر لیا اور سارا سازو سامان لوٹ لیا۔ یہاں سودا نے طنز نگاری سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر ان بزرگ کی پارسائی اور زہد کا مذاق اُڑایا ہے۔

پیادے کس طرح یہ کاٹتے راہ
عصا گر رہ گیا پاس ان کے سو آہ
نظر کر بعد غارت راہ کا رنج
لگے کرنے دل اپنے میں ششش و پنج
نہ زادِ راہ پاس ان کے نہ مرکب
اب ان سے عزم کعبے کا بندھے کب
توکل پر چلیں کعبے یہ کیا ذکر
انھیں اسباب کی اپنی پڑی فکر
کبھو عمامے کے جانے کا مذکور
کبھو تھا فکرِ پیراہن سے دل چور
سلیمانی کی گہ یاد آتی تسبیح
ہوئی جاتی تھی جس کے غم سے تشریح
کبھو کہتے کہ یارو کیا عصا تھا
بڑے حضرت کے میرے ہاتھ کا تھا
عقیق سرخ کا جو ناسداں تھا
اگر بکتا تو قیمت میں گراں تھا

اس بے سر و سامانی کے عالم میں انھوں نے حج کا ارادہ ملتوی کر دیا۔
جب انھوں نے سوداؔ کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو

جواب ان کو دیا سوداؔ نے سنکر
جو فرماتے ہو تم ہووے گا بہتر
پر اب اس حال سے گھر کیونکہ جاؤں
بھلا واں جاکے منہ کس کو دکھاؤں

کہا حضرت نے سن کر تم ہو گمراہ
نہیں مسلے مسائل سے کچھ آگاہ
حرم کا فرض ہے مقدور پر طوف
گیا یاں مال آگے جان کا خوف

مریدوں اور اُن بزرگ نے یہ ہی طے کیا کہ واپس چلنا چاہیے۔ واپسی پر ایک منزل پہ ٹھہرے۔ چونکہ سامان وغیرہ کچھ تھا نہیں۔ اس لیے سونے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اُن بزرگ نے سوداؔ سے فرمائش کی کہ وہ کوئی قصہ سنائیں۔

سوداؔ حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ حلب میں اک شیشہ گر کا لڑکا تھا۔

حلب میں تھا پسر اک شیشہ گر کا[1]
نہایت لاڈلا مادر پدر کا
بنایا حق نے سب سے دور اوس کو
پری پہنچے نہ ہرگز حور اوس کو
پدر سے سیکھتا تھا شیشہ سازی
نہ تھا کچھ کام اوسے با عشق بازی
قضا کا کیا کہوں آگے ہیں نیرنگ
کہ مارا اوس پہ ناگہ عشق نے چنگ
ہوا مائل وہ اک زرگر پسر پر
دیا آئینۂ دل اک نظر پر

۱۔ سوداؔ نے یہ قصہ تقریباً ۲۳۴ اشعار میں بیان کیا ہے۔ میں نے یہاں صرف وہ اشعار نقل کیے ہیں جن سے پورا قصہ سمجھا جا سکتا ہے۔ (خ۔۱)

رہے وہ صبح سے تا شام بخواب
کہ جیسے چودھویں شب کا ہو مہتاب
نہ فکر روزی اور نے خواہش قوت
ہوا زرگر پسر کو دیکھ مبہوت
کہ یک شب پھاڑ کر اپنا گریباں
برنگ گل وہ گل روتا ہدا ماں
چلا اس طرح گھر سے بے سرو پا
کہ جاتا ہوں کدھر جا کر کروں کیا
کٹی جب اس طرح سے وہ شب تار
ہوئی عالم میں صبح اوس دم نمودار
پدر بالیں تلک اوس کے جو آیا
تو بستر خالی اوس کا اوس نے پایا
پھرا گھر گھر میں وہ حیران و خاموش
گرا بستر پہ اوس کے ہو کے بیہوش
کٹے رمال کے یاں دن کو اوقات
منجم کے پڑے رہتے تھے گھر رات
انھوں کو ایک دن رحم ان پہ آیا
عمل اپنے سے ان کو یوں بتایا
نہ ہو تم زندگی سے اوس کی مایوس
طرف مشرق کے یاں سے ہے وہ سو کوس
پر ایسے اک بیاباں میں کہیں ہے
گذر انسان کا جس جا نہیں ہے

باپ اپنے کچھ دوستوں کو لے کر اس صحرا کی طرف چلا۔

غرض پہونچے یہ جوں توں بعد یک ماہ
نواحی بیچ اس صحرا کے ناگاہ
نظر آیا عجب صحرا لق و دق
کہ دیکھے سے جگر ہو شیر کا شق
بیاباں تھا وہ ایسا وحشت انگیز
کہ وحشت جس کی تھی عالم میں خونریز
کہ ناگہ اک نسیم آئی اودھر سے
جہاں بیٹھا تھا وہ آوارہ گھر سے
نظر آیا اسے یوں اس کا دلبند
کہ اوس میں وحشت اوس صحرا سے وہ چند
لگا کہنے کہ سن لے اے مری جاں
میں تیرے روم روم اوپر سے قرباں
کہے گا تو جو کچھ وہ ہی کروں گا
رضا میں تیری جیوں گا مروں گا
پر اب بہر خدا چل گھر کو یاں سے
مجھے بیزار مت کر میری جاں سے
یہ کہہ کر اوس کے قدموں پر گرا جب
ہوا راضی وہ گھر کے چلنے کو تب

لڑکا گھر تو واپس آگیا۔ لیکن اس کی حالت وہی رہی۔ آخر

جب آیا تنگ وہ گھبرا کے اک روز
چلا پھر گھر سے بھرتا آہِ جاں سوز

چلے ساتھ اوس کے سب روتے ہوئے زار
کہ جوں شبنم سے ٹپکیں گرد گل خار

اس وقت لڑکے کے ہمدرد، ہوا خواہ اور والدین سب اُس کے ساتھ تھے۔ شہر شہر گلی گلی یہ قافلہ اُس لڑکے کے پیچھے چلتا رہا۔ آخر تنگ آ کر

تھکے جب سو طرح کی کر کے تدبیر
کیا ناچار اس وحشی کو زنجیر

لیکن اس کے جنون میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ایک دن وہ زنجیروں سمیت فرار ہو گیا اور حُسنِ اتفاق سے راستے میں اُس کا محبوب مل گیا۔

سنی زنجیر کی جب اون نے آواز
کھلا ہے دل پہ اوس کے پردۂ راز
ہوا سنتے ہی شوق اوس کو دوبالا
قدم پہ اوس کے سر جاتے ہی ڈالا
لگا کہنے کہ میری جان عاشق
میں سر تا پا ترے قربان عاشق
اب اوٹھ کر یاں سے تو چل گھر کو میرے
کروں شانہ میں بالوں بیچ تیرے

اس کے بعد شاہ عالم اور نواب وزیر الممالک آصف الدولہ کی مدح میں اشعار ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ غیر دل چسپ مثنوی ہے۔ بعض مقامات پر سودا نے ناقابلِ یقین بلکہ مضحکہ خیز اشعار کہے ہیں۔

واسوخت

مختلف اصناف کی طرح واسوخت بھی اُردو شاعری میں فارسی ہی سے آئی ہے۔ وحشی یزدی کے بارے میں

کہا جاتا ہے کہ فارسی میں پہلا واسوخت اُس نے کہا تھا۔ مگر واسوخت کی اصطلاح اُردو میں وضع ہوئی ہے۔ فارسی میں وحشی نے اس کا عنوان مسدس اور مثمن دیا تھا۔ اُردو میں واسوخت نگاری کی ابتدا پہلے ہوئی اور اس کا نام واسوخت بعد میں پڑا۔ شاہ مبارک آبرو کی واسوخت کا عنوان "جوش و خروش" ہے۔ حاتم نے "سوز و گداز" کے عنوان سے ایک ترکیب بند کہا ہے جو دراصل واسوخت ہے۔ غالباً میر پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اس صنف کو واسوخت کا نام دیا۔[1]

واسوخت کے اجزاے ترکیبی قصیدے اور مرثیے کی طرح مخصوص ہوتے ہیں جو اس طرح ہیں۔

۱۔ ابتدا میں عشق کی تعریف ہوتی ہے۔ یہاں شاعر یہ بھی بتاتا ہے کہ پہلے وہ عشق و محبت کی دنیا سے بہت دُور تھا۔

۲۔ پھر اپنے آغازِ عشق کا قصّہ بیان کرتا ہے۔

۳۔ اُن دنوں کا ذکر کرتا ہے جب اُسے وصلِ یار نصیب تھا۔

۴۔ محبوب کے حسن کے ساتھ اس کی معصومیت، سادگی اور بھول پن کی تعریف کرتا ہے۔

۵۔ اس کے بعد اُس کی بے وفائی کا شکوہ اور اپنی خستہ حالی کا بیان کرتا ہے۔

۱۔ میں نے اس باب کے لکھنے میں اپنے عزیز شاگرد انیس حسن لیکچرار دہلی کالج کے غیر مطبوعہ مقالہ "اُردو میں واسوخت نگاری" سے استفادہ کیا ہے۔ جس کے لیے میں اُن کا شکر گزار ہوں۔ اُن کا مقالہ بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ (خ۔ ا)

۶۔ آخر میں شاعر محبوب کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ بعض اوقات اس کی بدصورتی کا بیان کر کے ایک نئے محبوب کی تعریف کرتا ہے اور پھر اُس سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتا ہے۔

دکنی شاعری میں واسوخت کے اشعار ضرور مل جاتے ہیں لیکن مکمل واسوخت نہیں ملتا۔ غالباً بحیثیت صنفِ سخن واسوخت کی ابتدا شمالی ہندوستان ہی میں ہوئی۔ دورِ ایہام گویان میں آبرو اور حاتم دونوں کے ہاں واسوخت ملتے ہیں۔ چونکہ آبرو عمر میں بڑے تھے۔ اس لیے قیاس یہی کہتا ہے کہ وہ اُردو کے پہلے واسوخت نگار تھے۔

سودا نے بھی ایک واسوخت کہا تھا لیکن اس کے اجزائے ترکیبی وہ نہیں ہیں جو اوپر بیان کیے گئے۔ نہ صرف سودا بلکہ اس عہد کے کسی بھی شاعر کے ہاں ایسا واسوخت نہیں ملتا جس میں یہ تمام اجزائے ترکیبی موجود ہوں۔ ان اجزا کا تعین غالباً بعد کے زمانے میں ہوا ہے۔

سودا نے واسوخت کے پہلے بند میں خدا سے دعا مانگی ہے کہ اُسے "زلفِ خوباں" کے جنجال سے نکال دے۔

یا الٰہی کہوں اب کس سے میں اپنا احوال
زلفِ خوباں کی مرے دل کو ہوئی ہے جنجال
یارب اس پیچ سے مرے دلِ شیدا کو نکال
کاش اب موت ہو یا دُور ہو یہ سر سے وبال
تجھ سوا غیر سے میں کیونکہ کہوں دل کا حال
تیری ہی ذات سے میرا یہی ہر دم ہے سوال
ساز آباد خدایا دل ویرانے را
یا مدہ مہر بتاں ہیچ مسلمانے را

اس کے بعد شاعر دل کو برا بھلا کہتا ہے جو لاکھ سمجھانے کے باوجود گرفتارِ محبت ہو کر رہا۔ پھر شاعر خود کو یہ کہہ کر سمجھاتا ہے۔

کیا کرے دل بھی برا ہے یہ محبت کا فسوں
کب تلک دل سے میں اس کاوشِ بیجا کو کروں
اس غم و درد و بلا بیچ کہاں تک میں مروں
آتشِ غم سے طرح شمع کے رو رو کے جلوں
اب نہیں تاب زباں کو جو میں خاموش رہوں
کیونکہ احوالِ دل اس شوخ سے جا کر یہ کہوں

شرح ایں آتشِ جانسوز نگفتن تاکے
سوختم سوختم ایں راز نہفتن تاکے

شاعر اپنے محبوب سے پوچھتا ہے کہ وہ وعدے کیا ہوئے۔ یہ عہد شکنی کیوں؟ اور

سچ کہو کس سے تمھاری نئی لاگی ہے لگن
کیا ہوا کس کو ٹھگا کس کا لیا ہاتھ میں من

تم کو حسین اور خوب رو ہم ہی نے تو بنایا ہے ورنہ

خوبرویوں میں تجھے کن نے بنایا سجدار
ورنہ خوباں میں نہ کرتا تھا کوئی تجکو شمار
بلکہ پھرتا تھا تو ہر ایک کے گھر سو سو بار
اپنی مجلس میں نہ دیتا تھا کوئی تجکو بار

ایں زماں جائے تو در دیدۂ مردم شدہ است
روے زیبائے تو از دیدۂ من گم شدہ است

پھر سودا اپنے محبوب کو بتاتے ہیں کہ حسینوں کی دنیا میں کمی نہیں ہے۔

شیشۂ دل کو مرے سنگِ ستم سے پھوڑا
دل نے میرے بھی منہ اب تیری طرف سے موڑا
تم جو کچھ ساتھ کیا میرے نہیں وہ تھوڑا
مجکو بھاتا نہیں ہر دم کا ترا بکتوڑا
خوبرویوں کا جہاں بیچ نہیں کچھ توڑا
شعر وحشی کا دل اپنے پہ یہ میں لکھ چھوڑا

میدہم جائے دگر دل بدل آرائے دگر
بچشم خود فرش کنم زیر کفِ پائے دگر

پھر سودا اُن غیروں کو بُرا بھلا کہتے ہیں جن کی صحبت میں رہ کر ان کا محبوب بگڑا ہے اور آخر میں اُس سے التجا کرتے ہیں۔

اس قدر کس لیے بیزار ہے مجھ زار سے تو
مت چھپا منہ کو سجن اپنے خریدار سے تو
چشم پوشی تو نہ کر عاشقِ بیمار سے تو
مجکو محروم نہ رکھ لذّتِ دیدار سے تو
سُن لے یہ بات میاں اپنے گرفتار سے تو
دیکھ ایدھر بھی کبھی ایک نظر پیار سے تو

نگہے جانب سودا گہہ وگاہے کافی است
بلکہ از لطف بادنیم نگاہے کافی است

یہ واسوخت اُردو واسوخت نگاری کے ابتدائی نقوش میں سے ہے اور اسی بناپر اہمیت رکھتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں اتنے اعلیٰ درجے

کے واسوخت لکھے گئے ہیں کہ اُن کے مقابلے میں یہ بہت معمولی اور سطحی سی تصنیف ہے۔

رباعیات

فارسی اور اُردو شاعری میں رباعی ایک اہم صنف ہے لیکن اسے وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جو غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کو رہی ہے۔ حالانکہ بیشتر بڑے شاعروں کے کلیات میں کچھ نہ کچھ رباعیاں مل جاتی ہیں۔ بہت کم شاعر ایسے ہیں جن کا سرمایۂ شعری صرف رباعیات ہی ہو۔ فارسی میں ابوسعید ابوالخیر، عمر خیام اور شاہ سرمد کی شہرت کی بنیاد رباعیوں پر ہے۔ فریدالدین عطار اور حافظ کے دیوان میں رباعیات کی تعداد اچھی خاصی ہے۔

دکنی اُردو میں محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی، غواصی، شاہی، نصرتی، ولی اور سراج اورنگ آبادی وغیرہ کے ہاں رباعیاں ملتی ہیں[۱]۔ شمالی ہند میں اٹھارویں صدی کے بیشتر شعرا کے دواوین میں رباعیاں موجود ہیں۔

سودا نے بھی اس صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلیات مطبوعہ مطبع مصطفائی میں ۸۰ رباعیاں ہیں۔ اس میں غزل کے دو اشعار کو بھی رباعی کی طرح شامل کر دیا گیا ہے اور احسن اللہ خاں بیان کی بھی ایک رباعی آ گئی ہے۔ بعض مقامات پر رباعی کی مقررہ بحروں سے بھی انحراف نظر آتا ہے[۲]۔

رباعیوں میں سودا کا موضوعِ سخن وہی ہے جو عام طور پر ان کے پیشروؤں کی رباعیوں کا ہے۔ یہاں الگ الگ عنوانات کے تحت ان رباعیات کا

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی، رباعیاتِ اُردو، لکھنؤ، ۱۹۶۳ء
۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "سودا کا الحاقی کلام"۔

جائزہ لیا جاتا ہے۔

عشقیہ :-

سودا نے سب سے زیادہ عشقیہ رباعیاں کہی ہیں۔ ان رباعیوں کے موضوعات وہی ہیں جو سودا کی غزل کے ہیں۔ یعنی یہاں بھی کوئی خاص بات نہیں کہی گئی۔ ان رباعیوں کی خوبی صرف سودا کا اندازِ بیان ہے۔ ایک تشبیہ ملاحظہ ہو۔

ہے فوج سے غمزہ کے نہایت بیداد
نت اُٹھ ہے مرا خرمن طاقت برباد
یہ حال رہے ہے دل کا جیسے دہقاں
لٹتے ہوئے کھیت کی کرے ہے فریاد

اس رباعی میں تکرارِ الفاظ نے حسن پیدا کر دیا ہے۔

آیا ہوں بتنگ دُور رہتے رہتے
لوگوں سے تھکا پیام کہتے کہتے
روتا ہوں کہ سیلِ اشک جاری ہووے
پہونچوں میں گلی میں اس کی بہتے بہتے

متصوفانہ :-

متصوفانہ رباعیوں میں سودا نے مذہبی رواداری، بے ثباتیٔ دنیا قناعت اور صبر و استقلال کے مضامین باندھے ہیں۔ سودا کا عقیدہ ہے کہ خدا دیر و حرم میں نہیں خود انسان میں ہے۔ اسے خود سے باہر تلاش کرنا بے سود ہے۔

ایک رباعی ہے۔

ہر سو تری تحقیق میں تھے ہم سرگرم
تھا گاہ یقیں کعبے پہ گہ دیر پہ بھرم
پایا غرض آپ ہی میں سب تجھے پر اون کو
سجدہ جو کیجے تو نہیں رہتی شرم

ایک رباعی میں سودا شیخ کو طعنہ دیتے ہیں کہ تیرا حرم میں جاکر طوف کرنا جلاہے کے تانے بانے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

اے شیخ حرم تک سبھے جانا آنا
یہ طوف جلاہے کا ہے تانا بانا
پہچانے گا واں کیا اوسے حیراں ہوں میں
جس کو حرم دل میں نہ تیں پہچانا

ایک رباعی میں سودا کہتے ہیں کہ وہ لوگ تو خدا کا شکر ادا کرتے ہی ہیں جنھیں اُس نے زر و مال اور دولت و اقبال دیا ہے لیکن شاکر تو وہی ہے جو ہر حال میں خدا کا شکر کرے۔

کتنوں کا جہاں میں زر و مال ہے شکر
کتنوں کا ہی با دولت و اقبال ہے شکر
یوں شکر تو سب کرتے ہیں لیکن سودا
شاکر ہے وہی جس کو بہر حال ہے شکر

صوفی شاعروں کا یہ محبوب موضوع ہے کہ دنیا چند روز کی ہے۔ اس سے دل لگا کر کسی کو کچھ نہیں ملا۔ عقلمندی یہی ہے کہ اس فاحشہ سے اپنا دامن چھڑا لیا جائے۔

دنیا ہمیں کہتی ہے کہ دل مجھ سے موڑ
مجھ فاحشہ پر تو نہ یہ جی جامہ توڑ
داڑھی کی سیاہی پہ سفیدی دوڑی
اب رات نہیں صبح ہوئی ہے بس چھوڑ

اس موضوع پر سودا کی یہ رباعی بہت مشہور ہے۔

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نا کہ تا دنیا ہو
بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

اسی موضوع پر ایک مستزاد رباعی ہے۔

بولی سے میں دنیا کی کہا یوں جا کر — سن اے بے پرد
اب ایک کی ہو رہ نہ پھرا کر گھر گھر — تیں صورت زرد
بولی کہ جو کوئی مرد ہے سو تو مجکو — رکھتا ہی نہیں
باندھی ہے جنھوں نے مرے رکھنے پہ کمر — سو ہیں نامرد

مذہبی :-

دو تین رباعیاں ایسی بھی ہیں جو مذہبی مسائل اور موضوعات پر کہی گئی ہیں۔ مثلاً

مجکو ہر چند نہیں شیعہ و سنّی سے کام
پر یہ سمجھا ہوں کہ اس دور میں تھے بارہ امام
اُن سوا ہو جو کوئی نہ ہے وہ امامِ تسبیح
اُس تلک جائے سے موقوف ہو اللہ کا نام

ایک اور رباعی ملاحظہ ہو۔

جس ذات کو آفاق میں کہتے ہیں احد
وہ اور امام ایک ہیں نزدِ خرد
گر ہندسہ داں ہے تو سمجھ لے تعداد
کتنے ہیں احد کے بحسابِ ابجد

اخلاقی :

اگر کوئی شخص کسی پر مہربانی کرے تو اسے مغرور نہیں ہونا چاہیے اُس کا فرض ہے کہ اگر کسی کو کچھ دے تو اس طرح کہ سیدھے ہاتھ کی اُلٹے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔

افسوس کریموں میں نہیں یہ دستور
مفلس پہ کرم کرکے نہ ہوویں مغرور
جھکتا ہے اگر شاخِ ثمردار کا ہاتھ
پھل دے کے وہیں آپ کو کھینچے ہے دور

اسی طرح ایک رباعی میں سوداؔ نے یہ تعلیم دی ہے کہ تو اگر بلندی میں چاند سے بھی دس گنا زیادہ ہے تو اپنے سے پست لوگوں کو دیکھ کر خرسند نہ ہو۔

گر مہ سے بلندی میں ہوا تو وہ چند
پستوں کی طرف دیکھ کے مت ہو خرسند
جتنے کہ بلندوں کی ہیں نظروں میں پست
پستوں کی بھی نظروں میں ہیں اُتنے ہی بلند

مدحیہ :-

چونکہ سوداؔ قصیدے کے شاعر ہیں۔ اس لیے ان کے قصیدوں کی طرح

مدحیہ رباعیاں بھی کامیاب ہیں۔

ایوانِ عدالت میں تمھارے اے شاہ
کیا ظلم کو ہے دخل عیاذاً باللہ
شیشے کا جو واں طاق سے پڑتے ہے پاؤں
پتھر سے نکلتی ہے صدا بسم اللہ

اگرچہ رباعی میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے لیکن اندازِ بیان ایسا ہے کہ اس مبالغے پر حقیقت کو بھی قربان کیا جاسکتا ہے ۔ ایسی ہی ایک رباعی اور ملاحظہ ہو۔

تجھ پاس گدا کب آکے ایسا بولا
جس کو نہ جواہر میں تو لے کر تولا
یاں تک تو ترے ہاتھ نے بخشے یاقوت
جب طشت نے وقت فصد دامن کھولا

ہجویہ :۔

سوداؔ نے ندرتؔ اور ساجدؔ کی ہجو میں رباعیاں بھی کہی ہیں۔ جو "ہجوگوئی" کے تحت نقل کی گئی ہیں۔ تین ہجویہ رباعیاں فحش ہیں۔ جو مطبع مصطفائی کے نسخے میں شامل ہیں۔ آسیؔ نے دو رباعیاں تو بالکل ہی نقل نہیں کیں اور ایک رباعی لفظ کی ترمیم کے ساتھ نقل کی ہے۔

تعلّی :۔

تین رباعیاں ایسی بھی ہیں ۔ جن میں سوداؔ نے تعلّی سے کام لیا ہے۔ ایک رباعی میں سوداؔ نے خود کو پیغمبر اور خدائے سخن بتایا ہے۔

سوؔدا شعرا میں ہے بڑائی تجھ کو
تشریفِ سخن عرش سے آئی تجھ کو
عالم تجھے اس فن میں پیمبر سمجھا
پوجا جہلا نے بہ خدائی تجھ کو

ایک اور رباعی میں سوؔدا خود کو "خاقانی ثانی" اور "نطق کا خلاق معانی" بتاتے ہیں۔

سوؔدا بہ جہاں اپنی زبانی تو ہے
آفاق میں خاقانی ثانی تو ہے
گو نطق کا ہر چند نہیں تو خالق
پر نطق کا خلاق معانی تو ہے

سوؔدا کی رباعیاں دوسرے اور تیسرے درجے کی ہیں۔ ان میں وہی باتیں کہی گئی ہیں جو سوؔدا غزل میں کہتے ہیں۔

پہیلیاں

ہندوستانی ادب میں پہیلی کہنے کا رواج بہت قدیم ہے۔ اس کی قدیم ترین مثالیں ویدوں میں ملتی ہیں۔ جن میں بعض کہانیوں اور پہیلیوں کو برہمودیے ब्रह्मोदय کہا جاتا تھا۔[1] سنسکرت میں پہیلی کو پرہیلیکا प्रहेलिका اور پہیلی کہنے کے فن کو پرہیلی प्रहेलि کہا جاتا ہے۔ اردو لفظ پہیلی اسی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ہندوستان کی بعض زبانوں میں اسے بوجھوّل بھی کہا جاتا ہے۔ مگر اردو میں صرف پہیلی ہی رائج ہے۔

1. Monier Williams, Sanskrit-English Dictionary, England, 1899. P. 741.

پہیلی میں

۱ - ایسا ایک لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے کئی معنی ہوں ۔

۲ - یا ایک ہی لفظ کو دو بار مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے ۔

عہد قدیم کے ایک نقاد دنڈی दण्डी نے اپنی کتاب काव्यदर्श میں پہیلی کی تیس قسمیں بتائی ہیں ۔ دنڈی سے پہلے صرف سولہ قسمیں مانی جاتی تھیں[۱] ۔

چھٹی صدی کے ایک نقاد بھاما भामह نے काव्यालंकार میں لکھا ہے کہ رام شرما چیوت پہلے شاعر ہیں جنھوں نے پہیلی کہی[۲] ۔

بظاہر پہیلی کا مقصد بچّوں کی تفریح طبع کے لیے کچھ سامان فراہم کرنا ہے ۔ انھیں جواب تلاش کرنے میں بہت لطف آتا ہے[۳] ۔

پہیلی کی اہمیت یہ ہے کہ ایک مخصوص سماج کی تہذیب و تمدن، لباس عام استعمال کی چیزیں، رہن سہن وغیرہ کے مطالعے کے لیے پہیلیوں سے بہت مدد ملتی ہے ۔ مثلاً سودا نے بورانی، مسّی، ارگجا، گلگیر، شمشیر، سپر، باز، انار آتشبازی، حمام، گھڑیاں، ستار و طنبور، پاپڑ، ہرت پھول، بندوق، طبلہ مردنگ وغیرہ کی پہیلیاں کہی ہیں ۔

1. धीरेन्द्र वर्मा, हिन्दी साहित्य कोश, बनारस, १९५८, पृ० ४६२ — ३ वही ।

2. रामधन शर्मा कूटकाव्य, दिल्ली। १९६३, पृ० १२—१३ ।

3. कृष्णलाल हंस, निमाड़ी और उसका साहित्य, इलाहवाद, १९६०। पृ० ३११—३१२ ।

کلیات سوداؔ مرتبۂ آسی میں ایک سو نو پہیلیاں ہیں۔ جن میں فارسی اور عربی کے ساتھ ٹھیٹھ ہندی الفاظ کا برجستہ استعمال کیا گیا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ سوداؔ کو ہندی زبان پر اچھا خاصا عبور تھا۔ یہ پہیلیاں ایک شعر سے لے کر چھ اشعار تک کی ہیں۔ چند دلچسپ پہیلیاں ملاحظہ ہوں

۱۔ گال پھولائے لینا تا کے
جب منہ کھولے سر کو کاٹے

(گلگیر)

۲۔ آدھا انار سارا ہاتھی
جن دیکھا اُن لایا چھاتی

(ارگجا)

۳۔ رات سمیں اک میوہ آیا
پھولوں پاتوں سب کو بھایا
آگ دے وہ ہووے روکھ
پانی دیوے وہ جاوے سوکھ

(انار آتشباری)

۴۔ ایک پرکھ میں ایسا دیکھا
سیس کم سے واکا لیکھا
شاہ و گدا ہیں واکا ناؤں
بوجھ پہیلی یا چھانڈو گاؤں

(تکیہ)

سوداؔ تذکرہ نگاروں اور نقّادوں کی نظر میں

سوداؔ ان خوش نصیب فن کاروں میں ہیں جو اپنی زندگی ہی میں شہرت اور مقبولیت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ ہند و پاک اور بعض غیر ملکی لائبریریوں میں کلامِ سوداؔ کے لاتعداد قلمی نسخے ملتے ہیں۔ اُردو شاعروں میں جتنے قلمی دیوان و کلیات یقینؔ اور سوداؔ کے ملتے ہیں شاید کسی اور کے نہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان دونوں کو دوسرے شعرا کی نسبت زیادہ مقبولیت حاصل رہی۔ یقینؔ کی شہرت ایک مخصوص زمانے تک رہی۔ لیکن سوداؔ کا شمار آج بھی ایوانِ اُردو کے اہم ستونوں میں ہوتا ہے۔

شاید "گلشنِ گفتار" جنوبی ہند کا پہلا تذکرہ ہے جس میں سوداؔ کا ذکر آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک جنوبی ہند میں سوداؔ سے بہت کم لوگ واقف تھے اور کم از کم تذکرے کے مولف خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی کو تو سوداؔ کے حالات کا بہت کم علم تھا۔ انھوں نے لکھا ہے۔

"…. سوداؔ …. منصب دار بودہ۔ متوطن شاہ جہاں آباد۔ مردِ سودا مزاج و کم سخن[1]"

گلشنِ گفتار کا سنِ تالیف ۱۱۶۵ھ ہے۔ اسی سال میرؔ کے نکاتِ الشعرا

۱۔ گلشنِ گفتار، ص ۳۰

کی اشاعت ہوئی۔ میر نے جن الفاظ میں سودا کی تعریف کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ حقِ دوستی بھی ادا کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

" ..... غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید سر آمد شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گو است۔ بلا گردان ہر شعرش طرف لطف دستہ دستہ، درچمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ۔ ہر مصرع برجستہ اش را سرو آزاد بندہ، پیش فکر عالیش طبع عالی شرمندہ، شاعر ریختہ، چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ اورا شاید[1]"

سید فتح علی حسینی گردیزی نے "تذکرہ ریختہ گویان" میں لکھا ہے۔

"نکتہ دانِ بے ہمتا میرزا محمد رفیع سودا مردے است سپاہی پیشہ و درست اندیشہ، حقا کہ رتبہ شعرش عالی است و سخن دردمندانہ اش حالی، امروز درمیدانِ گفتگو گوے سبقت از اقران و امثال خود می رباید و دادِ معنی یابی و رنگین خیالی می دہد[2]"

شیخ محمد قیام الدین قائم کو سودا سے تلمذ تھا۔ وہ سودا کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"عندلیب خوش نغمہ گلشن روزگار گل سرسبد محافلِ اشعار یگانہ کشور افضل نقادۂ دودمان کمال انتخاب نسخہ صاحب کمالے .... بالفعل بخطاب ملک الشعراے کہ مہین پایۂ سخنوران است اعزاز و امتیاز دارد[3]"

۱۔ نکات الشعرا، ص ۳۱

۲۔ تذکرہ ریختہ گویان، ص ۶۷

۳۔ مخزن نکات، ص ۳۵۔۳۶

لگ بھگ اسی زمانے میں جنوبی ہند میں ایک اور تذکرہ "ریاض حسنی" لکھا گیا اس کا مولف خواجہ عنایت اللہ خاں فتوت بھی سودا کے حالات سے کچھ زیادہ واقف نہیں معلوم ہوتا۔ اس نے لکھا ہے۔

معنی یاب بے ہمتا مرزا محمد رفیع سودا، فخر سخن گویانِ جہاں آباد است بلبل طبعش از آئینہ نمائے محمد میر تیر گویا بندہ، چنانچہ می سراید

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو تیر سے استاد کی طرف[1]

اس شعر سے فتوت کو دھوکا ہوا۔ یہاں تیر سے مراد میر تقی تیر سے ہے جو سودا کے استاد نہیں ہم عصر ہیں۔

لچھمی نرائن شفیق نے اپنا تذکرہ ۱۱۷۵ھ میں تالیف کیا۔ اس وقت تک تیر اور گردیزی کے تذکرے جنوبی ہند میں پہنچ چکے تھے۔ انھیں تذکروں سے شمالی ہند کے شعرا کو وہاں مقبولیت حاصل ہوئی۔ شفیق نے ان دونوں تذکروں سے استفادے کا اعتراف بھی کیا ہے۔ وہ شمالی ہند کے شاعروں میں سب سے زیادہ مداح یقین کے ہیں۔ یقین کے بعد جن شاعروں کی عظمت کے وہ معترف ہیں۔ ان میں سودا بھی ہیں۔ سودا کے ترجمے میں انھوں نے لکھا ہے۔

.... صیاد غزالان سخن و سر آمد نکتہ سنجان این فن است۔ شاہین زبان ناقص بیان را کہ یارۂ طے بیش نیست، چہ جرأت کہ بہ ہوائے توصیف آن ہمائے اوج نازک خیالے، چنانکہ باید، بال کشاید ..... و طوطیان ہندوستان شکر بیانی از ان آئینہ دل آموختہ۔ گویا نزاکت مضامین دلچسپ

۱۔ ریاض حسنی (قلمی) سینٹرل ریکارڈ آفس، حیدر آباد۔ ص ص ۱۲۰ - ۱۲۱

چوں حسن بے یوسف بذاتش حسن اختتام پذیرفتہ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر صریر کلکش را ہمدم اعجاز مسیحا انگارم بجا، کہ دل مردگاں را حلول جان تازہ ازاں متصور۔ و اگر چشمۂ خضر در ظلمات الفاظ نوایش پندارم روا ۔ ۔ ۔ ۔ !

میر حسن کے والد میر ضاحک سے سوداؔ کا زبردست معرکہ ہوا تھا۔ دونوں طرف سے خوب خوب ہجویں کہی گئی تھیں۔ بلکہ سوداؔ نے جو میر ضاحک کی ہجویں کہی تھیں۔ ان میں بعض ہجویں تو انتہائی فحش ہیں۔ اس سب کے باوجود میر حسن پر اس معرکہ کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ انھوں نے کھلے دل سے سوداؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

" استادِ استادان کامل و قادر، سرآمد شعرائے زماں، درمیدانِ نزاکتِ بیان نکرہ ‌ش چوں مہر گرم تازست، و در عرصۂ لطافت و قدرت و متانتِ سخن بازوے فطرتِ او چوں تیر راست انداز ست ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ استاد شعرائے عصر و مقتدائے بلغائے دہر، میدانِ بیان او وسیع و طرزِ معانی او بدیع ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در قصیدہ و ہجو ید بیضا دارد۔ قصائد عذب و دل آویز و بیان ہجو بلند۔ نظمش طرب انگیز است، مردے ست از مغتنماتِ روزگار، خوش خلق و نیک خو دیار باش ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در علم موسیقی نیز ماہرست و تصانیف بسیار در نفسیہ ہم دارد۔ تا حال مثلِ او در ہندوستانِ جنّت نشاں کسے بر نخاستہ۔"[۲]

اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی نے "گل عجائب" میں سوداؔ کی بہت تعریف کی ہے۔ مگر اس تعریف میں انشا پردازی کو زیادہ دخل ہے۔ وہ

۱۔ چمنستانِ شعرا، ص ص ۳۲۷، ۳۲۸

۲۔ تذکرہ [illegible] رائے اردو، ص ص ۸۲ - ۸۳

لکھتے ہیں۔

"نکتہ سنج دانش دستگاہ، خوش ذہنِ والا جاہ، دانشورِ یکتا مرزا محمد رفیع سودا۔ در معنی پروری و مضمون گستری ممتاز است وصافی ذہن وجودتِ طبعش بے انباز، .....[1]"

شورش عظیم آبادی لکھتے ہیں۔

"شعرا بخوبی تمام می گوید و مضامین تازہ و الفاظ بہ فصاحت و رنگین ادا می نماید، غرض قصائد و مثنوی و غزلیات و مخمس و رباعی ہمہ خوب می گوید۔ اگر ملک الشعراے ریختہ گویان خیال کنم رواست وگر پہلوان الشعرا گویم بجاست[2]۔"

مولوی قدرت اللہ شوق رام پوری نے لکھا ہے۔

"از اکمل و اشہر شعراے ریختہ گوے ہندوستان ست در ریختہ گوئی عدیل و نظیر خود درخطۂ ہندوستان نداشت و دم استادی و ملک الشعرائی می زند۔ در غزل و مثنوی و رباعی یکتاے وقت خود بودہ، خصوصاً در قصیدہ گوئی بے مثل و بے عدیل بود[3]۔"

حسین قلی خاں عاشقی نے لکھا ہے کہ تمام ریختہ گو انھیں امام فن اور پیغمبر سخن مانتے ہیں۔ قصاید سودا کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ عرفی کے قصیدوں سے پہلو مارتے ہیں۔ انھوں نے سودا کے ذکر میں لکھا ہے۔

۱۔ اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی، گل عجائب، اورنگ آباد، ۱۹۳۶، ص ۵۷

۲۔ دو تذکرے (شورش) ص ۳۷۹

۳۔ تکملۃ الشعرا (قلمی) ص ۲۹۶

"....جمیع ریختہ گویانِ ہندوے را امام این فن و پیغمبرِ سخن می دانستند۔ اگرچہ جملہ طرز کلام را استادی بود حاوی الا در مدح و قدح کہ مراد از ہجو و قصیدہ باشد اعجاز بکار بردہ و قصائد ریختہ بر قصائد ملا عرفی شیرازی پہلو بہ پہلو گفتہ ..... مثل او کسے ریختہ گو را ایں مرتبہ دست ندادہ۔ وکسانیکہ دم ریختہ گوئی می زنند و زبان بایں دعوے میکشایند خوشہ چین و راہ نمودہ اویند کہ بر آں قدم می نہند[1]۔"

شیخ محمد وجیہہ الدین عشقیؔ نے اپنے تذکرے میں سوداؔ کی مدح میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔ اُن کا بیان ہے۔

"..... مردے مغتنم الوجود، ازیکہ تا زان میدان سخنوری بود، تا حال در ہندوستان میلونشان چنین شاعرے زبردست در فنِ ریختہ پیدا نگر دیدہ و چنیں صاحب جوہرے از کتم عدم سر بہ عرصۂ شہود نکشیدہ طبع بلند آہنگش کمند فکر را بہ کنگرہ کیوان رسانیدہ و بنائے ریختہ را چوں دیوار ریختہ اوج استحکام بخشیدہ بے شائبہ ریب اگر اورا سر آمد ایں فن خوانم رواست و اگر قصائد اورا ہم پلہ قصیدہ مرصع کہکشاں دانم بجا۔ دیوانش مطبوع طبایع جمیع سخن سنجان رنگین کلام است و کلامش وردِ زبانِ ہر خاص و عام[2]۔"

شاہ حمزہ نے سوداؔ کو دادِ سخن ان الفاظ میں دی ہے۔

"..... غزل و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ خوب می گوید۔ علی الخصوص

۱۔ نشترِ عشق (قلمی) ص ۶۶۶

۲۔ دو تذکرے (عشقی)، ص ۳۸۰

در قصیدہ گوئی بازارِ سحر سامری می کشد و قصائدش با قصائد عرفی پہلو می زنند[1]"

گلشنِ سخن کے مولف مردان علی خاں مبتلا اُن کی مدح میں رقم طراز ہیں۔

"عجوبۂ زماں و سرخیل ریختہ گویانِ ہندوستان بودہ، در جمیع فنونِ نظم، خاصہ در قصائد وقت بسیار بکار بردہ، بر زبان نکتہ سنجان بہ مسلم الثبوتی مشہور.... الحق مرتبہ ریختہ گوئی بجائے رسایندہ کہ شاہباز بلند پرواز فکرت بہ پیرامون اونمی تواند پرید.....[2]"

حکیم قدرت اللہ قاسم کو بھی سودا سے بہت عقیدت ہے۔ وہ ترجمۂ سودا میں لکھتے ہیں۔

"..... وے شاعرے بود فصاحت بیان شیریں مقال بلاغت نشاں، عدیم المثال معنی یاب فصاحت آئین نکتہ پیرا بلاغت آگیں فارس میدان سخنوری شہسوار مضمار ہنر گستری عندلیب خوش نوائے گلستانِ سخن طرازی، بلبلِ دبستان سرائے بوستان نکتہ پردازی قادر، ہر گونہ سخن ماہر بیشترے از اصول فن جم غفیرے از زبان دانان اہل سخن استفادہ نمودہ از گفتار شعر خوبی شعارش کیفتے وارد کہ سامعہ نکتہ پرداز صاحب فراست داند طرز کلام صحت انتظامش حلاوتے دارد کہ ذائقہ طبع سخن سنج صاحب گفتار شناسد....[3]"

مصحفی نے سودا کے ذکر میں اُن کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف تو کیا ہے۔

۱۔ نص الکلمات (قلمی) ورق ۱۴۱، الف

۲۔ گلشن سخن (قلمی) ورق ۵۶ ب

۳۔ مجموعہ نغز، ۱، ص ۳۰۴

لیکن کچھ ٹیڑھی ترچھی باتیں بھی کی ہیں۔ اسی وجہ سے مصحفی اور شاگردانِ سودا میں زبردست معرکہ ہوا تھا۔ جس کا تفصیلی ذکر "ہجو گوئی" کے باب میں کیا جا چکا ہے۔ مصحفی نے جہاں سودا کو صائبِ وقت اور خاقانی لکھا ہے وہاں اُن پر جہل اور سرقہ کا بھی الزام لگایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"شیر بیشۂ سخندانی مرد میدان پہلوانی .... در عصر خویش سرآمد شعرائے ریختہ گو گذشتہ، بعضے او را دریں فن بہ ملک الشعرائی پرستش می کنند، بعضے بہ سببِ دریافتِ اغلاطِ صریح و توارد صاف در بعضے اشعارش بہ جہل و سرقہ اش نیز نسبت می دہند، غرض ہر چہ بود در روانی طبع نظیر خود نداشت۔ غزلہائے آبدار و قصیدہ ہائے سحر کار و ہجوہا و مثنویہائے متعددہ وغیر ہم نگاشتہ۔ خامۂ خیالش بر صفحہ روزگار یادگار است۔ دیوانش بہ فرنگ و صفاہان رسیدہ، دیگرے ایں شہرت در خواب ندیدہ۔ اگر در مثال بندیٔ اشعارِ غزل صائبِ وقتش گویم بجا است و اگر در علّو مراتب معانی ابیاتِ قصیدہ خاقانی گویم روا۔ نقاش اول نظم قصیدہ در زبانِ ریختہ اوست حالا ہر کہ گوید پیرو و تتبعش خواہد بود .... و بہ سبب آگاہی علم موسیقی مرثیہ و سلام کہ گفتہ بر سوز نہادن آنہا نیز قادر۔ غرض کہ شخص جامع الکمالات بود ہر جا کہ می رفت عزت و حرمتِ تمام می یافت [1]۔"

شاید ہی کوئی تذکرہ نگار ایسا ہو جس نے سودا کی قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی کی تعریف نہ کی ہو۔ بلکہ بعض مورخین نے بھی سودا کے اس فن کی تعریف کی ہے۔

۱۔ تذکرہ ہندی، ص ص ۱۲۵ - ۱۲۶

سلطان علی حسینی صفوی نے اپنی تاریخ "معدن السعادت" میں لکھا ہے۔

"۔۔۔۔ شعر ہندی خوب می گفت، خصوصاً مدح و ذم کہ دراں باب یگانۂ روزگار گشتہ آخر رفتہ رفتہ بدرجہ ملک الشعرائی رسید[۱]۔"

سید احمد علی خاں یکتاؔ نے بھی سوداؔ کی قصیدہ گوئی کے بارے میں وہی کچھ کہا ہے جو مصحفی نے لکھا تھا۔ ان کا بھی خیال یہی ہے کہ اوستادانِ فارسی کے طرز پر اُردو میں قصیدہ نگاری کی بنیاد سوداؔ نے رکھی تھی۔ یکتاؔ سوداؔ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"۔۔۔۔ رفتہ رفتہ لطافت ایں صناعت بہ تحقیق و تدقیق افصح الفصحاو ابلغ البلغا، خاقانئ عصر، فردوسئ زماں، انوری دہر، عرفئ دوراں، وحید زمانہ، محقق یگانہ، ملک الشعراے ہند، سلطان ہر ظریف و رند ۔۔۔۔ بہ مرتبۂ کمال رسید۔ تاآنکہ شانِ لطافت وصفاے آں بہ مذاق متاملان منصف بر شوکت فارسی چربیدہ۔ چراکہ صورت قصائد را بطرز اوستادانِ فارسی اول کسے کہ بزبانِ ہندی بہ لوح ہستی حسن جلوہ دادہ، ہمیں نقاش معانی بودہ است ۔۔۔۔۔ بالجملہ آنچہ از محققان بہ تحقیق پیوستہ اینست کہ مبصرئ جواہر کلمات و نقادئ نقود الفاظ، از مردود و مقبول و متین و سخیف و مروج و متروک، بہ قید کثرتِ محاورہ وصحتِ لغت کہ بر زبان شرفا و نجبا و اعزہ جاری باشد و تالیفِ شعر بہ متانت تمام بہ طور قصائد اساتذہ از فارسی گویان، تعلق بہ مرزا محمد رفیع دارد[۲]۔"

۱۔ سلطان علی حسینی صفوی، معدن السعادت (قلمی) کلکتہ، ۴، ورق ۳۴۶ ب

۲۔ دستور الفصاحت، ص ص ۶۔۷

یکتا کو سودا سے بہت زیادہ عقیدت ہے۔ انھوں نے دیباچے میں بھی سودا کا ذکر کیا ہے۔ اوپر کا اقتباس دیباچۂ دستور الفصاحت ہی سے لیا گیا ہے۔ تذکرے کی ابتدا سودا کے ترجمے سے ہوتی ہے۔ انھوں نے سب سے زیادہ شاید سودا ہی کی تعریف کی ہے![1]

کچھ تذکرہ نگاروں نے غزلوں سے زیادہ سودا کے قصیدوں کی تعریف کی ہے۔ جس کا مطلب ہے بعض ناقدین سودا کے قصیدوں کو غزلوں سے بہتر سمجھتے تھے نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کی رائے مختلف ہے۔ انھوں نے لکھا ہے۔

"..... با فنونِ شاعری مناسبت تام دارد و بر اصناف سخن قدرت تمام و آنکہ بین الانام شہرت پذیر است کہ قصیدہ اش بہ از غزل است حرفیست مہمل بزعم فقیر غزلش بہ از قصیدہ است و قصیدہ اش بہ از غزل اگر گوئی کہ غزل از اشعار رکیکہ کن حملہ است و قصیدہ ازاں خالی زیادہ ازیں چہ تواں گفت کہ قباحت ایں تحقیق پیر نظارگیاں دیوانش حالی و دخلۃ السرآنست کہ قدما را مانند فصحاے متاخرین پیرامون خاطر و جا گزین دل نہ ایں بود کہ ہر شعر دلپذیر آید و ہر بیت خاطر نشیں لہٰذا در کلام ایشاں رقص الجمل واقع شدہ، چہ در قصیدہ و چہ در غزل مع انہم الاولون و الموجدون والاخاطر بہ جمیع فنون ہا متعذر للمتقدمین و للّٰہ در من قال العلم للمتاخرین پس بنا بریں مقدمات بدیں بزرگان دار و گیر زنہار سزاوار نیست[2]"

۱۔ ملاحظہ ہو۔ دستور الفصاحت، ص ص ۱۴ - ۱۸

۲۔ گلشن بے خار، ص ص ۹۹ - ۱۰۰

کچھ تذکرہ نگاروں نے سودا کی زبان کی غلطیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔
مثلاً عبدالقادر چیف رام پوری نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے۔

"مرزا رفیع السودا بہ قصیدہ گوئی و مضامین تازہ در مدح و قدح سر آمد روزگار خود بود، مگر پابند صحتِ الفاظ زبانِ دیگر نبود" "اتاوا" بجاے آفتابہ "محل" بسکون دوم بجاے متحرک و "مبرہن" بسکون با و فتح را، بجاے فتح با و سکون را آوردہ است[1]"

کچھ اسی قسم کے اعتراضات انشا نے بھی کیے ہیں۔ وہ دریاے لطافت میں لکھتے ہیں۔

"..... و ملک الشعراے زبانِ اُردو مرزا محمد رفیع متخلص بہ سودا در قصیدہ لیک و چھیک لفظ کٹک را بہ معنی لشکر براے ضرورت قافیہ ایراد نمودہ و کٹک ہرگز لفظِ اردو نیست ..... و لفظ تھوڑا کہ بہ معنی اندک آید بارا ہندی صحت دارد و ہم چنیں تھوڑی کہ مونث آں باشد مرزا مذکور خلاف بازا بستہ۔ یا گوری کہ بہ معنی چیز سفید روشن مونث باشد قافیہ کردہ شعر

ساقِ سیمیں کو ترے دیکھ کے گوری گوری
شرم سے شمع ہوئی جاتی ہے تھوری تھوری

دبا واد مجہول بغیر ہا گفتن ایں لفظ از تبیل تصرف ایں صاحبان است براے قافیۂ شعر خود، والا در اصل تھوڑا و تھوڑی باشد مثل ہاتھ بہ معنی دست کہ قافیہ ساتھ باشد، در اصل آں ہا، در تا پنہاں است ایں صاحبان قافیہ بات و ہیہات سازند و ہا، را خلافِ تلفظ جمہور کنند[2]"

ا۔ عبدالقادر چیف رام پوری، روزنامچہ عبدالقادر (قلمی) رام پور، ورق ۴۷ الف
۲۔ انشا، اللہ خاں انشا، دریاے لطافت، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۱۶ء، ص ص ۳۲۔۳۳

سعادت یار خاں رنگینؔ نے بھی سوداؔ کی زبان پر اعتراضات کیے ہیں۔ بلکہ انھوں نے بھی "گوری گوری" اور "تھوری تھوری" والے شعر پر اعتراض کیا ہے۔ مجالسِ رنگینؔ میں انھوں نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ ایک دفعہ رنگینؔ بنارس میں نواب نصیر الدین خاں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اس وقت کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ بقول رنگینؔ۔

" .... ہر یک در سخن گوئی دستگاہ خوب داشت، نواب موصوف ذکر شاعری مرزا رفیع بر آوردند و تعریف می کردند شخصے درآں میاں کہ از بندہ کدورتے داشت سخن تا بایں جا رسایند کہ مثل اوشاں ممکن نیست کہ پیدا شود گفتم کہ شاعرانِ سابق وحال دردِ سرِ ناحق پیدا کردہ اند گفت۔

حریفاں بادہا خوردند و رفتند

تہی خم خانہا کردند و رفتند

گفتم ایں را ایں طور شنیدہ ام۔

حریفاں بادہا خوردند و ہستند

تہی خم خانہا کردند و مستند

گفت کجا اند چوں مکرر تکرار کرد ایں شعر سعدی خواندم

جہاں را اندازند بے کتخندا

یکے چوں رود دیگر آید بجا

گفت ایں در حق پادشاہاں ست گفتم ایں در حق شاعراں باشد۔

ہنوز اں ابر رحمت دُر فشاں ست

خم وخم خانہ با مہر و نشاں ست

گفت در کلام اوشاں غلطی محاورہ وخلل الفاظ اصلا نیست ولہجہ اردوئے معلیٰ را

جان دادہ اند و ملک الشعرا گذشتہ و حکم آیت و حدیث دارد و در اشعار ہائے دیگر شاعراں چند نقصان ست، گفتم مقدمہ شاعری بسیار مشکل و رطب یابس در کلام ہمہ است،

شعر گر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست

در ید بیضہ ہمہ انگشتہا یک دست نیست

گفت ایں سوائے مرزا رفیع در حق شاعراں دگر ست۔ ازیں سخن تاب نیاوردم و گفتم کہ مطلع و مقطع غزل اوشاں یاد دارم

نگر آباد ہیں بسے ہیں گانو

تجھ بن اجڑے پڑے ہیں اپنے بھانو

قیس و فرہاد کا نہیں کچھ ذکر

اب تو سودا کا باجتا ہے نانو

قطع نظر از لفظ نگر و تجھ بن و بھانو قافیہ مقطع را باید دید کہ نام را نانو گفتہ اند پس ایں کلام عربی و ترکی نیست کہ در فہم نیاید زبان روزمرہ است گفت کہ اگر در دیوان در یک غزل از غلطی سہو شدہ، گفتم شعر دیگر یاد دارم

ساقِ سیمیں کو تری دیکھ کے گوری گوری

شمع مجلس میں ہوئی جاتی ہے تھوری تھوری

گفتم بر قافیہ غور باید کرد گفت در زبان بھاکا ڑے را رے می گویند و بدل می کنند گفتم دروغ گو را حافظہ نہ می باشد اوشاں در زبان ریختہ غزل می گفتند یا در بھاکا مشق می کردند مطلع دیگر یاد دارم

عاشق تو نامراد ہیں بس اس قدر کہ ہم

دل کو گنوا کے بیٹھ رہے صبر کر کے ہم

گفتم بر قافیہ ایں غور باید کرد ولے؛

یہاں تو رنگین نے اشعارِ سودا پر صرف اعتراضات کیے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ خود کو سودا سے بڑا شاعر سمجھتے تھے۔ انھوں نے امتحانِ رنگین میں شاعروں کی چار قسمیں بتائی ہیں۔

۱۔ شاعر

۲۔ استاد

۳۔ ملک الشعرا

۴۔ علامہ

اُردو میں شاعروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ درد، میر، انشا، میر سوز جرأت مصحفی، میر حسن، نصیر اور ناسخ استاد ہیں۔ کیونکہ یہ سب صاحبِ طرز ہیں۔ سودا ملک الشعرا ہیں۔ کیونکہ وہ ایک سے زیادہ طرز پر قادر ہیں اور علامہ صرف رنگین ہیں کیونکہ (۱) انھوں نے تمام یعنی ستائیس اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ (۲) سترہ زبانوں میں شعر کہے ہیں (۳) اور گیارہ بحروں میں مثنویاں کہی ہیں[۲]۔ تقریباً اسی قسم کے دعوے مصحفی نے کیے ہیں۔ انھوں نے تذکرہ ہندی میں سودا کو غزل میں صائب اور قصیدے میں خاقانی کہا ہے۔ لیکن اس سے پہلے عقدِ ثریا میں انھیں "مردِ کم علم[۳]" بتا چکے ہیں۔ نظم میں کبھی انھوں نے سودا کی فوقیت کو تسلیم کیا ہے اور کبھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ

۱۔ مجالس رنگین، ص ص ۴۸۔ ۵۰

۲۔ امتحانِ رنگین بحوالہ سعادت یار خاں رنگین، ص ص ۳۴۵۔ ۳۴۶

۳۔ عقدِ ثریا، ص ۳۳

ان کا قصیدہ سودا سے نغزتر ہے۔ ایک قصیدے میں کہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ سودا نہیں اس عہد میں ہے ہے
یہ حرف بھی کیا محض غلط رکھتا ہے تشہیر
سودا جو نہیں ہے تو نہ ہو میں تو ہوں بیٹھا
سودا کی طرح مسند معنی پہ بہ توقیر
پر دیدۂ انصاف زبس کور ہیں مجھ کو
دردی کش سودا بھی سمجھتے نہیں بے پیر
سودا سے قصیدہ میں کہا نغز یہی نا
کچھ اس کے سوا اور تو میری نہیں تقصیر[1]

ایک قصیدے میں یہ شعر بھی ہے۔

سودا تو یہاں کھیت رہا آدھی ہی رہ میں
طے ہو نہ سکا اس سے بھی صحرائے طبیعت

ایک اور قصیدہ میں خود کو میر اور مرزا پر ترجیح دی ہے۔

تلتا ہیں اس کے پلے میں ہوتا اگر انوری
مرزا و میر سے مجھے کیا ہے برابری

مصحفی نے تذکرہ ہندی میں جو سودا کے بارے میں لکھا تھا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے سعادت خاں ناصر لکھنوی نے لکھا ہے۔

ایسے استاد مسلم الثبوت کو میاں مصحفی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ بسبب عدم دریافت اغلاطِ صریح دارد خیر ہر چہ بود در روانی طبع نظیر نداشت

۱۔ اردو ادب، اکتوبر ۱۹۵۰ء، ص ص ۱۶۱۔۱۶۲

سعدی کیا خوب کہتا ہے۔

نام نیکو رفتگاں ضایع مکن
تا بماند نام نیکت یادگار

چند محاورے ٹھیٹھ ہندی کے جو اس کے کلام میں واقع ہیں سبب ان کا اور اہلِ زبانِ اردو کے ہیں۔ اور کتنے روزمرے ایسے ہیں کہ ہنوز دلی والے وہی بولتے ہیں چنانچہ لفظ شہر ان کی السنہ پر اب بھی مذکر ہے۔ اس صورت سے الزام انکا متقدمین پر عائد نہیں ہو سکتا۔[۱]

شاید اب حیات پہلا تذکرہ ہے جس میں کلام سودا پر اتنی تفصیل سے تنقید کی گئی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے تحقیق میں ضرور بے شمار غلطیاں کی ہیں لیکن اس سے انکار مشکل ہے کہ وہ ایک باکمال سخن فہم تھے۔ آب حیات کے تمام صفحات ان کے فہم و ادراک اور تنقیدی شعور کا ثبوت ہیں۔ وہ سودا کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"واسوخت، مخمس، ترجیع بند، مستزاد، قطعہ، رباعیاں، پہیلیاں وغیرہ اپنی اپنی طرز میں لاجواب ہیں۔ خصوصاً تاریخیں بے کم و کاست ایسی برمحل و برجستہ واقع ہوئی ہیں کہ ان کے عدم شہرت کا تعجب ہے۔ غرض جو کچھ کہا ہے اسے اعلیٰ درجۂ کمال پر پہنچایا ہے..... کُل اہلِ سخن کا اتفاق ہے کہ مرزا اس فن میں استاد مسلم الثبوت تھے وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے جو شعر اور فن انشا ہی کے واسطے پیدا ہوئی تھی..... ان کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کِھلا رہتا تھا۔ اس پر سب رنگوں میں ہم رنگ

۱۔ تذکرہ معرکہ خوش زیبا (قلمی) لکھنؤ

اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ۔ جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز۔ نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے اور کہیں رکے نہیں۔ چند صفتیں خاص ہیں جن سے ان کا کلام جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے جیسے آگ کے شعلہ میں گرمی اور روشنی۔ بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولایتی طپنچے کی چابیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اور یہ خاص ان کا حصّہ ہے۔ چنانچہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں۔ شعر مزا ہی نہیں دیتا۔ خیالات نازک اور مضامین تازہ باندھتے ہیں۔ مگر اس باریک نقاشی پر ان کی فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے۔ تشبیہ اور استعارے ان کے ہاں ہیں مگر اسی قدر کہ جتنا کھانے میں نمک یا گلاب کے پھول پر رنگ۔ رنگینی کے پردے میں مطلب اصلی کو گم نہیں ہونے دیتے ۱۔"

مولانا حالی نے سودا کے ایک شعر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"نظیری کا شعر ہے۔

بوے یارِ من ازیں سست وفا می آید
گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

سودا کہتے ہیں۔

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

۱- آب حیات، ص ص، ۱۵۷-۱۵۸

اس میں شک نہیں کہ سودا نے اپنے شعر کی بنیاد نظیری کے مضمون پر رکھی ہے. بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔ لیکن بلاغت کے لحاظ سے سودا کا شعر نظیری سے بہت بڑھ گیا ہے۔ دوست کے یاد آنے سے بھی ممکن ہے کہ عاشق از خود رفتہ ہو جائے لیکن ساغر شراب کو دیکھ کر معشوق کی نشیلی آنکھ کے تصور سے بے خود ہو جانا زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس کے سوا " از کار شدم " میں وہ تعمیم نہیں ہے جو اس میں ہے کہ " چلا میں " نہیں معلوم کہ آپ سے چلا یا دین و دنیا سے چلا۔ یا جگہ سے چلا یا کہاں سے چلا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ "چلا میں" ہمیشہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب آدمی مدہوش و بدحواس ہو کر گرنے کو ہوتا ہے۔ اور " از کار شدم " میں یہ بات نہیں ہے۔ معطل ہونے معزول ہونے، اپاہج اور نکمے ہونے کو بھی " از کار شدم " سے تعبیر کرتے ہیں [۱]۔"

لالہ سری رام لکھتے ہیں ۔

" شکوہِ الفاظ، بلندی مضامین، رفعتِ خیال، نادر استعارات، بے بدل تشبیہات جس قدر سودا کے دفتر میں ہیں اُس رنگا رنگی سے میر کا کلام محروم ہے۔ مرزا زبردست الفاظ کے سرمایہ دار ہیں۔ جن کی مدد سے وہ مبتذل اور پیش پا مضامین کو بھی رنگینیٔ الفاظ سے مرصع بنا دیتے ہیں اور معمولی شعر میں بھی انتہا کا جوش پیدا کر دیتے ہیں ..... اُردو میں قصیدہ گوئی کا موجد اگر کسی کو کہہ سکتے ہیں۔ تو وہ صرف مرزا ہی کی ذات ہے۔ جن کے زورِ قلم نے عالمِ سخن میں دھاک بٹھا دی ..... [۲]"

۱۔ خواجہ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، علی گڑھ، ص ص ۱۶۱ - ۱۶۲

۲۔ خم خانۂ جاوید، ۴، ص ۲۶۴

رام بابو سکسینہ نے "تاریخِ ادب اُردو" میں لکھا ہے۔

"مرزا نے اکثر ہندی الفاظ کی درشتی کو دور کر کے فارسی کی آمیزش سے زبان میں شیرینی اور حلاوت پیدا کی۔ میر اور سودا ہی نے زبان کو ادبی زبان بنایا۔ اس کو ریختہ کا مرتبہ بخشا...... شاعری کی صناعیوں سے اس میں طرح طرح کی لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں۔ فارسی سے بہ کثرت الفاظ و محاورات، استعارے اور تشبیہیں، طرزِ تخیل اور تلمیحات زبان اُردو میں داخل کیے..... اس کے علاوہ نئی نئی ترکیبیں اور محاورے فارسی کی روش پر ایجاد کیے۔ جن میں سے بعض تو مقبول ہوئے اور بعض کو آئندہ نسلوں نے ناپسند اور متروک کیا..... ان کے اُردو قصائد بڑے بڑے فارسی استادوں کے قصائد کے ٹکر کے ہیں اور بعض تو عرفی و خاقانی کے معرکہ آلارا قصیدوں کو بھلا دیتے ہیں۔ نزاکتِ خیال اور طرفگیٔ مضامین میں وہ اکثر اہلِ عجم سے گوے سبقت لے گئے ہیں!"

مولوی محمد یحییٰ تنہا نے قصائدِ سودا کی تعریف کی ہے۔ لیکن ان پر کچھ اعتراضات بھی کیے ہیں۔ جن کی بنیاد مولانا حالی کے خیالات پر معلوم ہوتی ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے قصیدے میں مبالغہ کو ناپسند کیا ہے۔ تنہا لکھتے ہیں۔

"..... سودا پہلا شخص ہے جس نے قصائد کو درجۂ تکمیل پر پہنچایا۔ اس سے پیشتر بھی دیگر شعرا نے قصائد لکھے لیکن سودا نے جس عمدگی اور خوبی کے ساتھ اپنا اظہارِ خیال کیا ہے۔ اور دشوار قوافی اور مشکل ردیفوں میں جس آسانی کے ساتھ اپنے مطلب کو بیان کیا ہے اس کی نظیر متقدمین

۱۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اُردو، مترجمہ مرزا محمد عسکری، لکھنؤ، ۱۹۵۲ء، ص ص ۱۱۲ - ۱۱۵

شعرائے اُردو کے کلام میں کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ
سودا کے قصائد میں جہاں خوبیاں ہیں، نقائص بھی ہیں اور مبالغہ جو بدقسمتی
سے شاعری کی جان سمجھا جاتا ہے وہ ان کے ہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔
تاہم زبان پر قدرت اور ذہن رسا کی طباعی اور برّاقی ان سے ہویدا ہے
.... نقائص سے قطع نظر آپ کے قصائد میں خوبیاں بھی بے حد ہیں۔ زورِ
کلام، جوش اور روانی ایک دریائے زخّار کی طرح آپ کے قصائد میں
موجزن ہیں ....[1]"

مولوی محمد مبین کیفیؔ چریاکوٹی نے لکھا ہے کہ سودا ایسے مسلم الثبوت تھے کہ
جن پر فنِ شاعری کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ ان کی ہمہ گیری نے کسی صنف سخن کو نہیں
چھوڑا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"مرزا جب قصیدہ پیش کرتے ہیں تو شکوہِ الفاظ کے ڈنکے بجا دیتے ہیں۔
غزل سناتے ہیں تو دلوں میں چٹکیاں لیتے ہیں۔ مرثیہ پڑھتے ہیں تو سامعین
کو خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ ہجو کرتے ہیں تو حریفوں پر ہستی تنگ کر دیتے
ہیں۔ اردو شاعری اس جامعیت کا کوئی دوسرا شاعر پیش نہیں کر سکتی۔
بہرحال مرزا سودا اُن مسلم الثبوت اساتذہ میں ہیں جن پر فن شاعری کو
ہمیشہ ناز رہے گا۔
مرزا کی ہمہ گیری نے کسی صنف سخن کو نہیں چھوڑا۔ قصیدے، غزلیں
مثنویاں، رباعیاں، قطعے، مستزاد، تاریخیں، پہیلیاں، ترجیع بند،
مخمس، مرثیے، ہجویں سب کچھ کہیں اور خوب کہیں[2]"

۱۔ محمد یحییٰ تنہا، مرآۃ شعرا، لاہور، ص ص ۱۶۹۔ ۱۷۰
۲۔ محمد مبین کیفی چریاکوٹی، جواہر سخن، الہ آباد، ۱۹۳۵ء، ص ص ۲۴۳

رشید احمد صدیقی نے اُردو میں طنز و مزاح کی تاریخ کی ابتدا سودا سے کی ہے۔ انھوں نے سودا کی ہجو گوئی کو ان کی باقی تمام شاعری پر ترجیح دی ہے رشید صاحب لکھتے ہیں۔

"سودا کو اُردو ہجو و ہجا میں نہ صرف فضل تقدم حاصل ہے بلکہ ان کے کلام سے طنزیات کی بہترین صلاحیت و استعداد بھی نمایاں ہے، لیکن جیسا کہیں عرض کیا گیا ہے بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔ اس معیار پر سودا کی ہجویں تمام و کمال پوری نہیں اترتیں۔ تاہم اس خارستان میں بھی طنز و مضحکات کے ایسے نمونے ملتے ہیں جن سے ان کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کا ہمیں پوری طرح معترف ہو جانا پڑتا ہے۔

سودا نے شعر و شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کو جو خصوصیت ایک ہجو گو ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے وہ سب پر فوق ہے اور یہی ان کا طغرائے امتیاز ہے [۱]"

کلیم الدین احمد لکھتے ہیں۔

"..... سودا میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ایک بلند پایہ ہجو گو کے لیے ضروری ہیں۔ وہ زندہ دل اور شگفتہ طبیعت واقع ہوئے تھے۔ بقول آزاد ان کے دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ وہ خود ہنستے تھے اور دوسروں کو ہنسا سکتے تھے۔ لیکن اس زندہ دلی کے باوجود جب وہ برہم ہوتے تو پھر ان کی برہمی کی انتہا نہ ہوتی۔ ان کی برہمی سے اُن کے معاصرین آشنا تھے۔

۱۔ طنزیات و مضحکات اُردو، ص ۴۶

اور اس سے خائف رہتے تھے کیونکہ ان کے ترکش میں طنز کے ہزاروں تیر تھے جن کی چوٹ بے پناہ تھی۔ لوگ اُن سے خائف رہتے تھے لیکن وہ کسی سے ہراساں نہ ہوتے۔ ان کا تخیل تیز رو اور بلند پرواز تھا وہ ایک لمحہ میں بوقلموں تصویریں مرتب کر سکتے تھے۔ ایک سے ایک رنگین و مضحکہ خیز......!"

شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ سودا کے ہاں تمسخر زیادہ اور طنز کم ہے ان کی ہجوؤں میں مضحکہ، پھکڑپن، گالی گلوچ سب ہی کچھ ہے۔ انھوں نے ہجو کے ذریعے اپنے دشمنوں سے انتقام لیا ہے۔ شوکت صاحب لکھتے ہیں۔

"سودا اُردو کے پہلے طنز نگار شاعر ہیں۔ لیکن اُن کے یہاں تمسخر زیادہ اور طنز کم ہے۔ سودا کی طنزیہ شاعری کا تمام تر سرمایہ ان کا ہجویہ کلام ہے۔ ویسے ہجو بھی طنز ہی ہے لیکن ہجو اور طنز میں ایک بنیادی فرق ہے۔ طنز صلاح و اصلاح ہے اور ہجو جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا۔ سودا کے ہجویات اسی رنگ میں ہیں۔ ان میں استہزا، تمسخر، مضحکہ، پھکڑپن گالی گلوچ سبھی کچھ ہے۔ ان میں سودا نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ اپنے دشمنوں سے انتقام لیا ہے۔ اُن کا مقصد اصلاح نہیں اس لیے ان کو طنز نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں کسی کو رسوا کرنے کا جذبہ کارفرما ہے۔ لیکن سودا کی ہجویات دو طرح کی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جن میں کسی فرد واحد مثلاً فاخر مکین یا میر ضاحک کی خبر لی گئی ہے۔ یہ تمسخر کی حد میں آتی ہیں۔

۱۔ نقوش، طنز و مزاح نمبر، ص ۵۳

چند ایسی بھی ہیں جن میں شکایتِ روزگار یا اہلِ روزگار ہے یا جن میں پورے معاشرے یا اس کے کسی طبقے کو ہدف مطاعن بنایا گیا ہے۔ ان میں طنز ہے اور بڑا گہرا اور شوخ قسم کا۔ اور شاید سودا کے اسی کلام کی وجہ سے اس کو اُردو کے طنز نگاروں میں شمار کیا گیا ہے [۱]۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ نے میر اور سودا کے شہر آشوبوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"..... اس لحاظ سے میر اور سودا کے شہر آشوب اپنے زمانے کی سیاسی فضا کی کامیاب عکاسی کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جزئیات میں مبالغے کا رنگ ضرور پیدا ہو گیا ہے۔ مگر واقعات اور حادثات کی عام تصویر اصل کے قریب قریب ہے۔ سودا کا شہر آشوب جوش کے اعتبار سے میر کے شہر آشوب سے افضل ہے۔ سودا کے شہر آشوبوں کا میدان وسیع تر ہے۔ اثر کو دیرپا اور گہرا کرنے کی خاطر سودا نے جزئیات میں رنگا رنگی پیدا کی ہے اور اثر آفرینی کے ذریعے پڑھنے والے پر حالات کا وہی اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے خود شاعر کا دل بھرپور ہے۔ میر کے ہاں سادگی اور خلوص ہے مگر میدان قدرے تنگ اور جزئیات کم ہیں تاہم میر بھی اپنے طور پر اس شہر آشوب میں کامیاب ہوئے ہیں۔

غالباً یہ خیال غلط نہ ہوگا کہ اردو میں شہر آشوب کی صنف کو زندگی

۱۔ شوکت سبزواری، اُردو شاعری میں طنز، علی گڑھ میگزین، طنز و ظرافت نمبر ۱۹۵۳ء ص ۳۵

اور بقا بخشنے والے میر اور سودا ہی تھے۔ ان سے پہلے اس صنف میں جو کچھ لکھا گیا اس میں قوت اور جان نہ تھی۔ ان کے بعد جو کچھ اس موضوع پر تصنیف ہوا وہ بیشتر نقالی تھی[1]۔"

سودا کی خوش نصیبی ہے کہ انھیں جو مقبولیت اور شہرت اپنی زندگی میں حاصل ہوئی تھی۔ وہ آج تک باقی ہے۔ سودا نے بیشتر اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی کے وہ امام اور خاتم ہیں۔ ممکن نہیں کہ ان اصناف سخن پر کتابیں لکھی جائیں اور ان میں سودا پر علیحدہ باب قائم نہ کیے جائیں۔ بلکہ شمالی ہند میں سب سے پہلے سودا ہی کا ذکر آتا ہے۔

۱۔ بحث و نظر، ص ۵۹

سوؔدا کی تصانیف

سوؔدا بہ جہاں اپنی زبانی تو ہے
آفاق میں خاقانیٔ ثانی تو ہے
گو نطق کا ہرچند نہیں تو خالق
پر نطق کا خلّاقِ معانی تو ہے

نثر

۱۔ تذکرہ

قدرت اللہ قاسم واحد تذکرہ نگار ہیں۔ جن کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ سودا نے اُردو شاعروں کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا۔ قاسم نے مجموعہ نغز میں دو مقام پر اس تذکرے کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو خانِ آرزو کے ترجمے میں ایک شعر کے بارے میں لکھا ہے۔

"مرزا محمد رفیع سودا ایں بیت را در تذکرہ خود بایں طور ثبت نمودہ[1]"

دوسرے سعدی کے ترجمے میں قاسم نے لکھا ہے۔

"... مظنہ بیشترے از سخن پیرا خصوص سر آمد شعراے فصاحت آما مرزا رفیع سودا نظر بر اتحاد تخلص آنکہ ایں سعدی ہموں سعدی شیرازی است قدس سرہ کہ واردِ دیارِ دکن، شدہ و شعر ریختہ از طبع وقادِ آں نقاوہ متنزلان ریختہ چنانچہ در تذکرہ خود اشعار ایں سعدی دکنی را عفی اللہ عنہ بہ شیخ شیراز علیہ الرحمۃ و الغفران نسبت نمودہ[2]"

ان بیانات سے یہی پتا چلتا ہے کہ سودا نے تذکرہ لکھا تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ کسی اور تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ جبکہ یہ ممکن نہیں تھا کہ سودا تذکرہ لکھتے۔ اور ہم عصر تذکرہ نگار اس کا حوالہ نہ دیتے۔ قاضی عبدالودود لکھتے

۱۔ مجموعہ نغز، ۱، ص ۲۹۰

۲۔ ایضاً

ہیں " میرا خیال ہے کہ سوداؔ نے تذکرہ لکھا ہی نہیں۔ اس کے حق میں جو شہادت ہے وہ بالکل ناکافی ہے "[1] مجھے قاضی صاحب کے خیال سے بالکل اتفاق ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ سوداؔ نے کسی بیاض میں کچھ شاعروں کے اشعار نقل کیے ہوں۔ جو قاسم کے ہاتھ آگئی۔ ورنہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ سوداؔ جیسا مقبول و مشہور شاعر تذکرہ لکھے اور قاسم کے علاوہ کوئی اور اس کا ذکر تک نہ کرے۔ قاسم سے بعد کے کچھ تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ تو ان کا آخذ مجموعۂ نغز ہی ہے۔ کیونکہ کسی نے یہ نہیں لکھا کہ اس نے یہ تذکرہ خود دیکھا ہے۔

۲۔ شعلۂ عشق

تذکرہ کی طرح شعلۂ عشق کا وجود بھی مشکوک ہے۔ کیونکہ غالباً مولانا محمد حسین آزاد واحد تذکرہ نگار ہیں۔ جو ہمیں بتاتے ہیں کہ سوداؔ نے میرؔ کی مثنوی شعلۂ عشق کو نثر میں لکھا تھا۔ سوداؔ کی اردو نثر پر رائے دیتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں۔

> مرزا کی زبان کا سال نظم میں تو سب کو معلوم ہے کہ کبھی دودھ ہے کبھی شربت۔ مگر نثر میں بڑی مشکل ہوتی ہے۔ فقط مصری کی ڈلیاں چبانی پڑتی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ نثر اردو ابھی بچہ ہے۔ زبان نہیں کھلتی۔ چنانچہ شعلۂ عشق کی عبارت سے واضح ہے کہ اردو ہے مگر مرزا بیدل کی نثر فارسی معلوم ہوتی ہے۔ کتاب مذکور اس وقت موجود نہیں۔ لیکن ایک دیباچہ میں انھوں نے تھوڑی سی نثر بھی لکھی ہے۔ اس سے افسانہ مذکور کا انداز معلوم ہو سکتا ہے[2]"

۱۔ قاضی عبدالودود، دلی کا دبستانِ شاعری، ہماری زبان، علی گڑھ، یکم مارچ ۱۹۵۹ء، ص ۸
۲۔ آب حیات، ص ۱۵۰

ایک اور مقام پر آزاد نے اس مثنوی کا ذکر کیا ہے۔

"میر کی مثنوی شعلۂ عشق کے مضمون کو بھی مرزا رفیع نے نثر میں لکھا ہے۔ افسوس کہ اس وقت موجود نہیں [1]۔"

میرا خیال ہے کہ آزاد دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہے۔ بلکہ انھیں غلط فہمی ہوئی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ سودا کی اس نثر کا وجود مشکوک ہے۔ کیونکہ وہ نثر کیسی بھی ہوتی۔ لیکن اہلِ اُردو کے لیے بہت اہم تھی۔ اور یہ ممکن نہ تھا کہ ہم عصر تذکرہ نگار اسے نظر انداز کر دیتے۔

۳۔ دیباچہ سبیل ہدایت

مثنوی سبیل ہدایت پر سودا نے ایک مختصر سا اُردو دیباچہ بھی لکھا تھا۔ جو مثنوی کے درمیان میں ہے۔ اس نثر کی اہمیت یہ ہے کہ اُردو نثر کے بالکل ہی ابتدائی نمونوں میں ہے۔

تنقید

۱۔ عبرت الغافلین

اس رسالے پر تفصیلی بحث ہجو گوئی کے باب میں "سودا اور مکین" کے تحت کی گئی ہے۔

۲۔ سبیل ہدایت

اس مثنوی پر بھی ہجو گوئی کے باب میں "سودا اور میر تقی" کے تحت بحث کی گئی ہے۔

۱۔ آب حیات، ص ۲۳

کلیاتِ سوداؔ

سوداؔ کے کلیات میں غزلیں، قصیدے، ہجویں، شہر آشوب، مثنویاں مرثیے، رباعیاں، قطعے، پہیلیاں، ایک واسوخت اور فارسی کلام موجود ہے۔ کلیاتِ سوداؔ کے قلمی نسخے بہت زیادہ ملتے ہیں۔ لیکن بیشتر نسخوں میں الحاقی کلام شامل ہوگیا ہے۔ البتہ دو نسخے ایسے ہیں جن میں الحاقی کلام بالکل نہیں۔ ایک تو آزاد لائبریری علی گڑھ کے حبیب گنج سیکشن کا نسخہ (نسخۂ حبیب) اور دوسرا انڈیا آفس لائبریری کا نسخہ جسے رچرڈ جونس کو پیش کیا گیا تھا۔ (نسخۂ رچرڈ جونس)

نسخۂ حبیب

کلیاتِ سوداؔ کے اب تک جتنے بھی قلمی نسخے ملتے ہیں۔ اُن میں سب سے قدیم نسخہ یہی ہے۔ اس میں کلام کی ترتیب اس طرح ہے۔

۱۔ قصیدے ۲۶

۲۔ غزلیں ۲۳۳

۳۔ مخمس ۱۲

۴۔ ہجویں ۷

۵۔ رباعیاں ۱۱

۶۔ مطلعات ۱۲

ترقیمے کی عبارت سے پتا چلتا ہے کہ صادق مرزا نے حافظ نظارت خاں کی فرمائش سے اس نسخے کی کتابت اُس وقت کی تھی جب دہلی میں شاہ درّانی اور مرہٹوں کے حملے ہو رہے تھے۔ ۱۷ ربیع الثانی ۱۱۷۴ھ کو اس

کی کتابت مکمل ہوئی۔

نسخۂ رچرڈ جونسن

یہ وہ نسخہ ہے جسے سوداؔ نے رچرڈ جونسن کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ محترمی قاضی عبدالودود نے ماہنامہ "صبا" (جلد ۵، شمارہ ۱۱، ۱۲) میں لکھا ہے: "یہ وہ نسخہ ہے جو سوداؔ نے رچرڈ جونسن، نائب ریذیڈنٹ اودھ کو اپنی موت سے دو چار سال قبل دیا تھا۔" شاید قاضی صاحب قبلہ کی نظر سے وہ قطعۂ تاریخ نہیں گزرا جو سوداؔ نے راجہ ٹکیٹ رائے کے باغ پر کہا تھا۔ اس شعر سے تاریخ نکلتی ہے ؎

سر عدوے بہارش بریدم و گفتم
بگلشن تو الٰہی گزند دے نرسد

۱۲۶۳ - ۷۰ = ۱۱۹۳ھ

یہ قطعہ نسخہ جانسن میں موجود ہے۔ سوداؔ کا انتقال ۱۱۹۵ ہجری میں ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ کلیاتِ سوداؔ ۱۱۹۳ھ اور ۱۱۹۵ھ کے درمیان مرتّب ہوا۔

کلیات میں سب سے پہلے سوداؔ کی ایک قلمی تصویر ہے۔ جس میں سوداؔ کے ایک ہاتھ میں کاغذ ہیں۔ دوسرے ہاتھ سے حقّہ پی رہے ہیں اور پیچھے ملازم کھڑا ہے۔ یہ تصویر شیخ چاند کی "سودا" میں بھی شامل ہے۔ تصویر کے بعد دو صفحے خالی ہیں۔ پھر ایک صفحہ کے بالکل اوپر انگریزی میں یہ عبارت لکھی ہے کہ رچرڈ جونسن کو مصنف مرزا سودا کا تحفہ۔

اس کے بعد جانسن کی شان میں قصیدہ شروع ہوتا ہے۔ جس کے تیس اشعار ہیں۔ قاضی عبدالودود نے یہ قصیدہ "صبا" جلد ۵، شمارہ ۱۱، ۱۲ میں، اور

امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے اُردو ادب کے کسی شمارے میں شائع کرا دیا ہے۔ اُس صفحے سے اگلے صفحے پر یہ عبارتیں ہیں۔

دیوان مرزا رفیع سودا گزرانیدہ میر حسین صاحب در بلدۂ لکھنؤ، داخل کتب خانہ سرکار شد

دیوان سرکار نواب صاحب ممتاز الدولہ مفتخر الملک حسام جنگ مسٹر رچرڈ جانسن صاحب بہادر دام اقبالہ،

پہلی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سودا نے خود نہیں بلکہ میر حسین نے پیش کیا تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ سودا نے براہ راست نہیں بلکہ میر حسین کی معرفت گزرانا تھا۔ میرے اس خیال کا ثبوت جانسن کی شان میں قصیدہ اور انگریزی عبارت ہے۔

یہ کلیات سودا کے معتبر ترین نسخوں میں ہے۔ اس میں وہ تمام الحاقی کلام نہیں ہے جو نسخۂ مصطفائی اور نسخۂ آسی میں ہے۔ لیکن سودا کے شاگرد فتح علی شیدا نے فدوی لاہوری کی ہجو کہی تھی جو اس میں شامل ہے۔ یہ ہجو مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ مطبوعہ نسخوں میں یہ شعر اس طرح ملتا ہے۔

سب پہ کرے ہے وہ طعن جتنے کہ استاد ہیں
شعر پہ میرے بھی اب ان کو یہ ایراد ہیں

نسخۂ جانسن میں اس کی بدلی ہوئی شکل ہے۔

حضرت سودا تلک جو میرے استاد ہیں
شعر پہ اون کے بھی اب ان کو یہ ایراد ہیں

اس طرح نسخۂ جانسن میں یہ مقطع بھی موجود ہے۔

بس چل اب آگے نہ کہہ کچھ انھیں شیدا خاموش
کیجیے اس سے سخن ہووے جسے عقل وہوش

کلیاتِ سودا کے مطبوعہ نسخے

قاضی عبدالودود لکھتے ہیں :" گارساں دتاسی نے اپنی تاریخِ ادبیات (جلد۳، ص ۷۰) میں Primitiae Orientalis جلد ۳ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۱۸۰۳ء میں اعلان ہوا تھا کہ کلکتہ میں کلیاتِ سودا تین جلدوں میں زیرِ طبع تھا۔ میر کا کلیات وفاتِ میر کے کچھ ہی بعد کلکتہ سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اہلِ کلکتہ کو اگر کلیاتِ سودا کی اشاعت کا خیال آیا ہو تو تعجب کی بات نہیں۔ میر شیر علی افسوس نے جو اُس زمانے میں کلکتہ میں تھے، لکھا ہے کہ میرا کچھ وقت کلیاتِ سودا کی تصحیح میں صرف ہوا۔ مگر یہ نہیں بتاتے کہ اس کی ضرورت کیا تھی۔ دتاسی کا بیان ہے کہ افسوس، جوآن اور محمد اسلم کا تصحیح کیا ہوا انتخاب کلیاتِ سودا ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا امکان ہے کہ تصحیح کلیات سے اسی کی طرف اشارہ ہو۔ وہ کلیات جس کی طرف دتاسی نے اشارہ کیا ہے کہیں نہیں ملتا۔ یا تو ارادہ مطلقاً قوت سے فعل میں نہ آسکا۔ یا بعض اجزا چھپے جو محفوظ نہ رہ سکے[1]۔" اس کے شواہد موجود ہیں کہ کلیاتِ سودا فورٹ ولیم کالج سے تین جلدوں میں شائع ہو رہا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کونسل کی ایک رپورٹ مرتبہ ۴ر اپریل ۱۸۰۳ء کے مطابق جو پانچ کتابیں مطبع میں بھیجی جا چکی تھیں۔ ان میں کلیاتِ سودا بھی تھا۔ جو تین جلدوں میں مرتب کیا گیا تھا[2]۔ اگر یہ کلیات شائع ہو گیا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دنیا میں اس کا کوئی نسخہ محفوظ نہ رہتا۔ یا کم از کم کوئی شخص اس کا مدعی نہ ہوتا کہ اس نے مطبوعہ

۱۔ سویرا، ۲۹، ص ۴۸

۲۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۹۷

کلیات دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے پریس بھیجا ضرور گیا تھا۔ مگر چھپ نہیں سکا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی کتابوں کی تیاری اور طباعت پر بہت زیادہ روپیہ خرچ ہو رہا تھا۔ اور اس خرچ کا ذمہ دار خود گلکرسٹ تھا جو پوری تن دہی سے اس کام میں مصروف تھا لیکن کالج کے ذمہ داران اتنا روپیہ خرچ کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ اس کی پوری تفصیل محمد عتیق صدیقی نے "گلکرسٹ اور اس کا عہد" میں دی ہے۔ ۲۴ر فروری ۱۸۰۴ء کو گلکرسٹ فورٹ ولیم کالج کی ملازمت سے مستعفی ہو گیا[1] اس کے رخصت ہونے کے وقت تک کلیاتِ سوداؔ کی طباعت کا کام شروع ہی نہیں ہوا تھا یا کچھ اجزا چھپے ہوں گے۔ بعد میں اس کے جانشینوں نے اس کام کو رکوا دیا۔ بالکل ایسا ہی قرآن شریف کے ترجمے کے ساتھ ہوا تھا۔ البتہ ۱۸۱۰ء میں کلیاتِ سوداؔ کا ایک انتخاب شائع ہوا۔ جو میری نظر سے نہیں گزرا۔

نسخۂ مصطفائی

کلیاتِ سوداؔ کے اب تک جتنے مطبوعہ نسخے ملتے ہیں۔ ان میں قدیم ترین نسخہ یہی ہے۔ اس کلیات کی طباعت ۲۹ر ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ کو شروع ہوئی اور ۱۰ر جمادی الثانی ۱۲۷۲ھ کو پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یہ $12\times7\frac{1}{2}$ کے سائز پر ۴۸۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ قدیم انداز پر شائع ہوا تھا یعنی حاشیہ پر بھی اشعار دیے گئے تھے۔ پہلے صفحے پر مصحح کا نام میر عبدالرحمن متخلص بہ آہیؔ شاگرد رشید مومن خاں مرحوم دیا گیا ہے۔ مطبع کے متعلق لکھا گیا ہے۔ "در مطبع مصطفائی محمد حسین خاں طبع نمود"۔ صفحہ ۲ اور ۳ پر ظہور علی ظہورؔ کا لکھا ہوا

۱۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۸۶

فارسی دیباچہ ہے۔ اسی دیباچے میں ایک قطعہ تاریخ بھی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ طباعت کا کام ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ کو شروع ہوا تھا۔ صفحہ ۳ کی آخری سطروں سے سوداؔ کے ایک شاگرد کا دیباچہ شروع ہوتا ہے جو عبرت الغافلین پر لکھا گیا ہے۔ یہ دیباچہ کلیاتِ سوداؔ مرتبہ آسی میں بھی شامل ہے (ص ص ۳۳۶ - ۳۳۷)۔ ص ۴ سے شاگردِ سوداؔ[1] کا قصیدہ شروع ہوتا ہے۔ جس کا مطلب ہے۔

کیا حضرتِ سوداؔ نے کی اے مصحفی تقصیر
کرتا ہے جو ہجو اوس کی تو ہر صفحے میں تحریر

صفحہ ۱۸ سے رسالہ عبرت الغافلین شروع ہوتا ہے۔ صفحہ ۱۵ سے قصائد شروع ہوتے ہیں۔ صفحہ ۱۱۷ سے مثنویوں کا آغاز ہوتا ہے۔ فارسی دیوان کی ابتدا صفحہ ۱۷۵ سے ہوتی ہے۔ صفحہ ۱۸۸ سے غزلیات شروع ہوتی ہیں۔ صفحہ ۳۰۶ سے قطعے شروع ہوتے ہیں۔ صفحہ ۳۱۶ سے پہیلیاں اور پھر مخمس دیے گئے ہیں۔ ۳۶۹ صفحے سے دیوان مرثیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اختتام پر خاتمہ الطبع کی عبارت ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ ۱۰ رجمادی الثانی ۱۲۷۲ھ کو غلام احمد کے نسخے کے مطابق طبع ہوا۔ غلام احمد نے جو کلیات مرتب کیا تھا اُس کا دیباچہ حسب ذیل ہے۔

"بعد شکر ایزد واہب العطیات و نعت سید الموجودات بندہ غلام احمد کہ مولف کلیات ہذا ست میگوید کہ دیوانہاے افضل المتاخرین مرزا رفیع المتخلص بہ سوداؔ بہ شوق تمام ذوق مالا کلام محنت و دماغ سوزی

ا۔ "ہجو گوئی" کے باب میں اس شاگرد کے نام سے بحث کی جا چکی ہے۔

از چند جا بہم رسانیدہ بہ ترتیب دل پذیر مرتب ساختہ یادگار روزگار گذاشت، چون این کلیات جامع تر از دیگر دواوین مشہور است، اکثر عزیزاں و صاحبانِ شوق بہ قیمت صد روپیہ طالب نسخہ بودند، لیکن دوری آں قبول طبع خاکسار نیفتاد و خدا شاہد این مقالست۔"

نسخۂ مصطفائی اب بہت کم ملتا ہے۔ اس کا ایک نسخہ دہلی یونی ورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

نسخۂ نول کشوری

مجھے اس کا علم نہیں کہ مطبع نول کشور سے کلیاتِ سودا کا پہلا ایڈیشن کب شائع ہوا تھا۔ میرے پیشِ نظر چوتھا ایڈیشن ہے جو مئی ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دیباچہ نگار کا نام نہیں پتا چلتا۔ دیباچے میں بتایا گیا ہے کہ یہ کلیات مطبع نول کشور کانپور میں چھپا ہے۔ اس کلیات کی ترتیب بالکل وہی ہے جو نسخۂ مصطفائی کی ہے۔ صرف سائز کا فرق ہے۔ یہ ۱۰$\frac{1}{2}$×۶$\frac{1}{2}$ سائز پر ہے اور ۶۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

نسخۂ آسی

یہ نسخہ عبدالباری آسی کا مرتب کیا ہوا ہے۔ پہلے کلیاتِ سودا ایک جلد میں شائع ہوا تھا۔ آسی نے ترتیب بھی بدل دی اور دو جلدوں میں کر دیا۔ یہی وہ نسخہ ہے جو آج کل ہر لائبریری میں ملتا ہے۔ ایسے اشعار کی تعداد اچھی خاصی ہے جو نسخۂ مصطفائی میں تو ہیں لیکن آسی میں نہیں۔ ان کے بارے میں آسی نے دیباچے میں لکھا ہے۔

"ان کا کلیات جہاں تک مجھے معلوم ہے پہلے مطبع مصطفائی میں طبع ہوا تھا۔ مگر وہ بہت زیادہ غلط ہے۔ پھر بھی رطب و یابس فحش اور غیر فحش

کلام کا مجموعہ ہے۔ غالباً اوسی کو دیکھ پہلی مرتبہ مطبع ہذا میں بھی طبع ہوا۔ کیونکہ پہلا چھپا ہوا دیوان نہ صرف حرف بہ حرف اُس سے ملتا ہے بلکہ سائز کی حیثیت سے بھی اوس کے برابر ہے۔ البتہ بعد کو ضرورت کا اقتضا سمجھ کر کسی مصحح نے حکماً یا بلاحکم اس میں سے وہ شعر نکال دیے جو فحش اور قابلِ گرفت ہیں۔ جس دیوان کی تصحیح کا مجھے اتفاق ہوا وہ یہی نسخہ تھا۔ جس کو ان کانٹوں سے پاک کر دیا گیا تھا۔"

آسی کا یہ بیان درست ہے کہ انھوں نے جس نسخے کی تصحیح کی ہے وہ کانٹوں سے پاک تھا۔ کیوں کہ جتنے اشعار نسخہ نول کشوری میں نہیں ہیں۔ وہ آسی کے ہاں بھی غیر حاضر ہیں۔ حسب ذیل قصیدہ، ہجویں، قطعے رباعیاں، مثنویاں اور مخمس نسخۂ مصطفائی میں موجود ہیں۔ لیکن نسخۂ نول کشوری اور نسخۂ آسی میں نہیں۔

۱۔ قصیدہ در ہجو مولوی ساجد متوطن کٹھیر کہ سخت متعصب بود

ساجدا کیوں نہ یہ پرواز کرے تا بہ فلک
پہنچی پشتین سے یوں نطفے کی حلّت جس تک

۲۔ در ہجو طفل پتنگ باز

ایک لونڈا پتنگ کا ہے کھلاڑ
دور میں اوس کے ..... ہیں ہزار

۳۔ ہجو کوکی یعنی دختر دایہ

واسطے طفل کے جو بہتر ہے
شیر اگر ہے تو شیر مادر ہے

رباعیاں

۴۔ لیتا ہے نشغ جو دے دمڑی کا سوت (کذا)

۵۔ اے ساجدِ ملعون خدا سے ڈر تو

۶۔ بچّا بلبل کا ہے یہ ساجدِ ملعون

قطعے

۷۔ کیا شیخ مخنّث میں ہے عنوانِ دیانت

۸۔ شاعر ہوا ہے فدوی کیا شاعروں کا تلّا

۹۔ ہئی جو سودا دے کن یہ گل کہ فدوی جس کول جاوندا ہے

مثنوی

۱۰۔ مولوی جی سے جو رد بھٹکی ہے

قطعہ

۱۱۔ ہرگز ڈرا نہ مجھ سے تو اے بے شعور بھڑ دے (کذا)

مخمس

۱۲۔ کہتا ہے یہ سودا کہ اے خلّاقِ مقدّر

۱۳۔ ندرت ہے ایک بھڑوا کا شو ہے ایک پدنا

مثنوی

۱۴۔ حکایت ڈومنی

ممکن ہے کچھ اور اشعار بھی غیر حاضر ہوں۔

دیکھا نہ جائی اس سی کسی کا کلاہ پر رنگ — غنچی کی بہی دہن سی ہی چشم زمانہ تنگ

شیشہ نہ توڑی شہ کی تئی عیش کا فقط — کاسہ یہ ہی گدا کی یہہ وارد کری ہی سنگ

گر خاک سی اوٹھا کی یہہ دیوی کسیکو اوج — سو یون کہ جیسی چیونٹی کو پر دیے ہی یہہ کو ڈہنگ

اسکی حسد کی تلخی کا اب کیا کرون بیان — پہنچی جو شہد لب تئین کر دی اوسی تر نگ

شـ ـت مین قطرہ کو کرتا ہی یہہ گہر — جویا کو بہیجی اوسکی سوئی کلۂ نہنگ

جو دلولہ ہی اسکا سو فتنہ ہی اوسکی ساتہہ — خالی نہین فساد سی اسکی ہی جو ترنگ

پہنچاتی یہہ کری نہ فلک تک کسیکو دیر — اور اسکو کچہہ بہکتی زمین پر نہین درنگ

ہی یہہ زمانہ اور جو اہل زمانہ ہین — اونکا جہان مین چشم مروت کا ہی یہہ رنگ

مفلس پدر ہوا اور پسر جسکا ہو غنی — بیتی کو باپ کی علت سی آئی ننگ

پس اب کوئی کسو سی رکہی کسطرح امید — بیتی کا باپ سی ہو بدانی مین جب یہہ ڈہنگ

ہی اب مگر وہ ایک کہ جسکا یہہ ہی خطاب — ممتاز دولہ فخر جہان و حسام جنگ

پایا ہی شکل یہہ کہ اوسکی سم ہلال — سینی پہ آئینی کی اگر چہار پا ہو زنگ

نسخۂ رچرڈ جونسن کے ---------

جوہری کو یہ چار ہی عنصر کی سب بین خلق — جلوی کو اوسکی دکھہ بین جوہر شناس دنگ

دل مدح غائبانہ سی حاصل نہین سرور — مت کر حضور جا کی ثنا کرنی مین درنگ

تیری وہ ذات کو تو نہین ہی شریک ونگ
عرسی مین تیری پایہ اورنگ کا ہی ڈہنگ

باعث یہہ تیری دست کرم کا ہی دہر مین — خالی جو درسی لیکی چمن سی ہین تا لمنگ

خونمین عدو کی تیغ کی تیری شناوری — ہی اسطرح کہ بحر مین تیری ہی جیسی نہنگ

سائی تلی سپر کی تیری جسکو ہو پناہ — اودہر نہ رو کمان فلک کا کری خدنگ

سرعت یہہ باد پا کی تیری جسکی سامہنی — موج ہوا ہی آپ ہوا کی قدم مین لنگ

تو وہ حلیق لذت شہد آتی کام مین — جکہی بیان خلق مین تیری اگر شرنگ

شائق کی جای ہر بن مو چشم ہو اگر — تب اوسکی دل سی نکلی تیری دید کی اومنگ

دور از ادب ہی طول سخن اسکی اب عوض — سودا نکال دل کی دعائیہ سی اومنگ

یارب تمام دوست ہین تجہسی فیضیاب
جاری ہی جبتلک کہ جہان بیچ آب گنگ ....

------------- دو صفحے

نسخۂ رچرڈ جونسن اور نسخۂ حبیب کا اِشاریہ

چونکہ نسخۂ رچرڈ جونسن ۱۱۹۳ھ اور ۱۱۹۵ھ کے درمیان مرتب ہوا تھا۔ اس لیے اس میں نسخۂ حبیب کے مقابلے میں زیادہ کلام ہے۔ یہ دونوں کلیات سَودا کے معتبر ترین نسخے ہیں۔ نسخۂ رچرڈ جونسن میں فتح علی شیدؔا کی کہی ہوئی ہجو فدوی شامل ہے لیکن ہجو میں شیدؔا ہی کا تخلص ہے۔ غزل کے تین اشعار اور ہیں جو ان دونوں نسخوں میں ملتے ہیں اور دیوان یقیںؔ میں بھی موجود ہیں۔ اس پر تفصیلی بحث " الحاقی کلام " کے تحت کی گئی ہے۔ یہاں دونوں نسخوں کا اشاریہ دیا جاتا ہے۔ اختلافِ نسخ کو عام طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ نسخۂ رچرڈ جونسن بنیاد ہے۔ جس مصرع کے آگے " حبیب " لکھا گیا ہے اس کا مطلب ہے کہ وہ غزل یا قصیدہ وغیرہ نسخۂ حبیب میں بھی موجود ہے۔ بعض وجوہ سے کلام کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔ نسخۂ رچرڈ جونسن میں ترتیب اس طرح ہے۔ قصیدے، غزلیں، مخمس، رباعیاں، فردیات، غزلیاتِ ناتمام، مثنویاں، قطعے، فارسی کلام۔

غزلیں

۱۔ مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا (حبیب)

۲۔ ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا (")

۳۔ دامن صبا نہ چھو سکے جس شہسوار کا (")

یہ شعر دونوں نسخوں میں نہیں۔ لیکن آسی میں ہے۔

چشمِ کرم سے عاشقِ وحشی اسیر ہو

الفت ہے دام آہوے دل کے شکار کا

۴۔ ٹوٹے تیری نگہ سے اگر دل حباب کا (حبیب)

۵۔ نجانے حال کس ساقی کو یاد آتا ہے شیشے کا (حبیب)

۶۔ ہر مژہ پر ہے تیرے لخت دل اس رنجور کا (")

۷۔ رطوبت داغ دل میری کی ہے گرداب آتش کا (")

رچرڈ جونسن اور آسی میں مقطع ہے

جلاتی ہے جگر بن یار آتنا مے خوری سودا
پیے ہیں جام گویا بزم میں احباب آتش کا

حبیب میں اس مقطع کے بجائے دوسرا مقطع ہے۔

ہواے رنگ پر میرے نہ چھوٹے کیوں کے اے سودا
جلے ہے داغ دل ایسا کہ جوں مہتاب آتش کا

۸۔ تو ہی اسے رات سن اب سوز ٹک اس چھاتی کا (حبیب)

۹۔ گلہ لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا (حبیب)

۱۰۔ کھینچا نہ میں چمن میں آرام یک نفس کا (حبیب)

آسی اور رچرڈ جونسن میں جو مقطع ہے وہ حبیب میں نہیں۔ اس کے بدلے یہ ہے۔

سودا کے سوزِ دل کو بے سوزِ دل نہ سمجھے
پروانے کا سمجھنا کیا ہوش ہے مگس کا

۱۱۔ چمن ہے کس کی گرفتار زلف و کاکل کا

۱۲۔ ہوا یہ دیوانہ مرید اس زلف چھٹ کس پیر کا (حبیب)

۱۳۔ جی مرا مجھ سے یہ کہتا ہے کہ ٹل جاؤں گا (حبیب)

۱۴۔ اسے دیدہ، خانماں تو ہمارا ڈبو سکا (حبیب)

۱۵- تیرے کوچے سے جو میں آپ کو چلتا دیکھا
۱۶- نہ کھینچ اے شانہ ان زلفوں کو یہاں سودا کا دل اٹکا (حبیب)
۱۷- دل مت پٹک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا (حبیب)
۱۸- کعبہ جا وے پوچھتا ہے کب چلن آگاہ کا
۱۹- سالہا ہم نے صنم نالۂ شب گیر کیا (حبیب)
۲۰- دل میں تیرے جو کوئی گھر کر گیا (حبیب)
۲۱- قاصد اشک آ کے خبر کر گیا (حبیب)
۲۲- دل میرا بند کو نہ سمجھے گا
۲۳- بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہو گیا
۲۴- قابو میں ہوں میں تیرے گو اب جیا تو پھر کیا (حبیب)
۲۵- چمن میں صبح جب اس جنگجو کا نام لیا (حبیب)
۲۶- کہاں نطقِ فصیح از طبع ناہنجار ہو پیدا
۲۷- آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا (حبیب)
۲۸- ملک آئین جب سے تیں لوٹا (حبیب)
۲۹- تجھ قید سے دل ہو کر آزاد بہت رویا (حبیب)
۳۰- بے وجہ نہیں ہے آئینہ ہر بار دیکھنا (حبیب)
۳۱- کب دل شکستگاں سے کر عرضِ حال آیا (حبیب)
۳۲- رنگ اڑتا ہے دیکھ اس کے تئیں لالہ رخاں کا
۳۳- سحر جو باغ میں دلدار ایک بار آیا
۳۴- اسیری کی جو لذت سے پڑا ڈھب آشنائی کا
۳۵- اجل نے عہد میں تیرے ہی تقدیر سے یہ پیغام کیا

۳۶۔ جنھوں کی نظروں میں ہم سبک ہیں، دیا انھیں کو وقار اپنا
۳۷۔ دل یار کی ہرگز نہ سرِ زلف سے چھوٹا
۳۸۔ سیہ کاری ہے مانند نگیں ہر چند کام اپنا (حبیب)
۳۹۔ زخم کا دل کے تر و تازہ ہے انگور سدا (حبیب)
۴۰۔ سودا غزل چمن میں تو ایسی ہی کہہ کے لا (حبیب)
۴۱۔ طبیعت سے فرومایہ کی شعر تر نہیں ہوتا
۴۲۔ نگاہِ مست نے ساقی کی عالم کو چھکا ڈالا
۴۳۔ پھرے ہے شیخ یہ کہتا کہ میں دنیا سے منہ موڑا (حبیب)
۴۴۔ قاتل کا ہاتھ ہرگز ہتھیار تک نہ پہنچا
آسی میں یہ مطلع زائد ہے۔

افسوس کام غم کا اظہار تک نہ پہنچا
یہ لخت دل بھی چشم خونبار تک نہ پہنچا

۴۵۔ ساقی چمن میں چھوڑ کے مجھ کو کدھر چلا
۴۶۔ جو گذری مجھ پہ مت اس سے کہو ہوا سو ہوا (حبیب)
۴۷۔ اب تلک اشک کا طوفاں نہ ہوا تھا سو ہوا (حبیب)
۴۸۔ وہ ہم نہیں جو کریں سیر بوستاں تنہا (حبیب)
۴۹۔ اعمال سے میں اپنے بہت بے خبر چلا
۵۰۔ حالِ دل سے میرے جب تک وہ خبردار نہ تھا (حبیب)
۵۱۔ جب بزم میں بتاں کی وہ رشک مہ گیا تھا (حبیب)
۵۲۔ جگہ تھی دل کو تیرے دل میں اک زمانہ تھا
۵۳۔ میں دشمن جاں ڈھونڈ کے اپنا جو نکالا (حبیب)

۵۴۔ بلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا (حبیب)

۵۵۔ والہ کو تری چشم کے آزار ہی رہا (حبیب)

۵۶۔ آنکھوں سے اشک جتنا آتا تھا شب نہ آیا

۵۷۔ جو چلن چلتے ہو تم کیا اس سے حاصل ہوئیگا

۵۸۔ چھٹنا ضرور مکھ پہ ہے زلفِ سیاہ کا

۵۹۔ پایا وہ ہم اس باغ میں جو کام نہ آیا

۶۰۔ نورا خذِ ہنر کرنے میں دل کا میں گنوایا

۶۱۔ باغ میں جس دم خرام اس سروِ قامت نے کیا

۶۲۔ دل اپنا چاہتا ہے وہ جنوں از غیب ہو پیدا

۶۳۔ نہ شکوہ یار کا لب تک دلا پیرانہ سر لے جا

۶۴۔ باہر رکھوں نہ بزم سے اسے رشکِ باغ پا

۶۵۔ ترکش اولینڈ سینہ عالم کا چھان مارا

۶۶۔ ڈروں ہوں بہہ نہ جاوے شہر، بندھا گر تار رونے کا

۶۷۔ شب کو جو چھپا مہ تو سحر کہنے یہ لاگا

۶۸۔ کیا جانیں کس کی خاک ہو رکھ ہوش نقشِ پا

۶۹۔ یاں پھر اس شرم سے عیسیٰ نے گذارا نہ کیا

۷۰۔ کرتا ہوں سیر جب سے باغ جہاں بنایا

۷۱۔ جام خالی سے جو ساقی نے مجھے ڈھکایا

۷۲۔ نالہ سینے سے کرے عزم سفر آخر شب

۷۳۔ ٹک جاگ لے تو چھوڑ کے غافل پلنگ و خواب (حبیب)

۷۴۔ مجھ اشک میں جوں ابر اثر ہوے گا یا رب (حبیب)

۷۵۔ بھنگ پی بھنگ خیال اس کا ہے افلاک پرست

۷۶۔ بزم غم خونِ جگر پہ مرے مہمان تھی رات

۷۷۔ ہندو ہیں بت پرست مسلماں خدا پرست

۷۸۔ نظر آجائے ہے جیسی کہ ہندوستان میں صورت (حبیب)

۷۹۔ عشق اپنے کی فلک نے جہاں میں پڑائی بات

۸۰۔ مانے ہے کسے واقف اسرارِ محبت

۸۱۔ لاگے ہے کس کے منہ پہ بایں زور پشت دست

۸۲۔ سودا گرفتہ دل کو نہ لاؤ سخن کے بیچ (حبیب)

۸۳۔ یار وہیں کیا عہد اسے مانیو تم سچ

۸۴۔ شمع میں ہر چند ہے سر سے گزر جانے کی طرح (حبیب)

۸۵۔ آہ کس سرو میں قمری ہے قدِ یار کی طرح (حبیب)

۸۶۔ تجھ بن بہت ہی کٹتی ہے اوقات بے طرح

۸۷۔ لطف نشاط بادہ و حسن ظہور صبح

۸۸۔ لے آئے در پہ ترے جو ستم کشاں فریاد (حبیب)

۸۹۔ کھینچ کر پوست کرے گردشِ ایام سفید

۹۰۔ اشک کو کب ہے شناسائی گھر سے پیوند

۹۱۔ خرمی پھرتی ہے یوں دل پہ مرے غم سے دور (حبیب)

۹۲۔ بلبل کو کیا تڑپتے میں دیکھا چمن سے دور (حبیب)

۹۳۔ جوش سے میرے جنوں کے کیا خوش آتی ہے بہار (حبیب)

۹۴۔ دیکھا جو ادھر خدا سے ڈر کر (حبیب)

۹۵۔ یہ نہ ہو مہر کہ تا شب رہے گھر سے باہر

۹۶۔ کام آیا نہ کچھ اپنا تن زار آخر کار
۹۷۔ باندھی جھنجھلا کے کمر شوخ نے کیں میرے پر
۹۸۔ بکھرائی ہے وہ زلفِ سیہ فام جہاں پر
۹۹۔ گر دم سے جدا تن کو رکھا دیہ ہوا پر
۱۰۰۔ پھینکے جو کماں دار مرا تیر ہوا پر
۱۰۱۔ دی بیچ دل کو سادہ لوح اس زلف نے پاکر
۱۰۲۔ تو بسے حیا ہے وہ یارب تجھ سے ہو بیباک تر
۱۰۳۔ دل نا آشنائے نالہ سے صد رہِ جرس بہتر
۱۰۴۔ دل نہ کر منّت ز راہِ بے قراری بیشتر
۱۰۵۔ سمندر کر دیا نام اس کا ناحق سب نے کہہ کہہ کر
۱۰۶۔ منزل کے پہنچنے سے ورے قافلہ دے چھوڑ
۱۰۷۔ دیکھا میں نخلِ وادیٔ ایمن ہر ایک جھاڑ (حبیب)
۱۰۸۔ بے خبر دردِ محبت سے ہے وہ یار ہنوز
۱۰۹۔ انکار قتل سے تو کرے ہے سجن ہنوز (حبیب)
۱۱۰۔ شبنم کرے ہے دامن گل شستشو ہنوز
۱۱۱۔ کس کے ہیں زیر زمیں دیدۂ نمناک ہنوز (حبیب)
۱۱۲۔ بے ہودہ اس قدر نہیں آتا ہے کام ناز
۱۱۳۔ ماہِ نو تجھ یادِ ابرو میں ہے سینے کا خراش

نرائن میں ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

رہتا ہے تیرے غم میں دل زار زار زار
نکلے ہے آہ آہ شرر بار بار بار

قاضی عبدالودود نے بھی اسے سودا ہی کی تسلیم کی ہے۔ (سویرا، ۲۹ ص ۶۲) لیکن یہ میر سوز کی ہے اور اُن کے دیوان میں موجود ہے۔

۱۱۴- دوری ہے تری اپنے دلِ زار کو آتش

۱۱۵- دیں شیخ و برہمن نے کیا یار فراموش

۱۱۶- سینے میں ہوا نالہ و پہلو میں دل آتش

۱۱۷- گو آپ نے نہ مجھ غریب کے بالیں تک آئی شمع (حبیب) (کذا)

۱۱۸- لطف اس چہرے کے آگے کوئی یاں رکھتی ہے شمع (حبیب)

۱۱۹- سرد مہری سے بتاں کی مٹ گیا ہے سوزِ داغ (حبیب)

۱۲۰- کس طرح دل میں چھپاؤں تجھ کو ہیں سینے میں داغ

۱۲۱- اے لالہ گو فلک نے دیے تجھ کو چار داغ (حبیب)

۱۲۲- دیکھوں ہوں یوں میں اس ستم ایجاد کی طرف (رچرڈ جونسن میں دو اور آسی و حبیب میں سات شعر ہیں)

۱۲۳- بلبل نہ چمن ہے گلِ گلزار کا عاشق

۱۲۴- خط آچکا پہ مجھ سے وہی ڈھنگ اب تلک (حبیب)

۱۲۵- پھونکدی ہے عشق کی تپ نے ہمارے تن میں آگ (حبیب)

۱۲۶- کب لگ سکے ہے اوس سے کوئی رنگ اور نمک

۱۲۷- کرتی ہے میرے دل میں تری جلوہ گری رنگ (حبیب)

۱۲۸- رہنے اس فصل ہم اے بلبل و گل ناتواں یاں تک

۱۲۹- شاعروں میں کب رکھے ہے شیر کی تقریر جنگ

۱۳۰- عدو سے ہے دوری سے ایک اور خمار ہے ایک

۱۳۱- سخنِ عشق نہ گوشِ دلِ بیتاب میں ڈال (حبیب)

۱۳۲- یکدست اگر زمانہ جہاں میں لٹائے گل (حبیب)
۱۳۳- کھینچ شمشیر جاؤ دل کے نکال (حبیب)
۱۳۴- اس چمن کی سیر میں آ یار پیویں مِل کے مُل
۱۳۵- قاتل کے دل سے آہ نہ نکلی ہوس تمام (حبیب)
۱۳۶- نہ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے کام (حبیب)
۱۳۷- مبدأ جو بلا کا ہے سو ہے وہ نظر چشم
۱۳۸- اب اس طرف تری دل گرمی شعلہ خو معلوم (حبیب)
۱۳۹- کیا مچائی ان نے میرے دل کے کاشانے میں دھوم (حبیب)
۱۴۰- عاشق تو نامراد ہیں پر اس قدر کہ ہم (حبیب)
۱۴۱- ہیں صفائے بادہ و دردِ تہ پیمانہ ہم (حبیب)
۱۴۲- دھن کے سر بولا گئے جب یار کے کاشانے ہم (حبیب)
۱۴۳- لے دیدۂ تر جدھر گئے ہم (حبیب)
۱۴۴- تو کیوں جیتی رہی بلبل چمن میں دیکھ کر شبنم (حبیب)
۱۴۵- ملائم ہو گئیں دل پہ برہ کی ساعتیں کڑیاں (حبیب)
۱۴۶- نہ غنچے گل کے کھلتے ہیں نہ نرگس کی کھلیں کلیاں (حبیب)
۱۴۷- بلبل چمن میں کس کی ہیں یہ بدشرابیاں (حبیب)
۱۴۸- باتیں کدھر گئیں وہ تیری بھولی بھالیاں (حبیب)
۱۴۹- نہ اشک آنکھوں سے بہتے ہیں نہ دل سے اٹھتی ہیں آہیں
۱۵۰- تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں (حبیب)
۱۵۱- نہ اپنا سوز ہم تجھ سے بیاں جوں شمع کرتے ہیں (حبیب)
۱۵۲- عاشق فنا میں اپنی بہبود جانتے ہیں

۱۵۳- سمجھ کے باندھا تھا آشیاں ہم رہے گا آب وتاب گلشن

۱۵۴- یار آزردہ ہوا رات جو مے نوشی میں

۱۵۵- باتیں کتنی ہی نہیں منہ لگنے سے منظور ہمیں (حبیب)

۱۵۶- ڈرتے ڈرتے جو تیرے کوچے میں آجاتا ہوں (حبیب)

۱۵۷- واشد ہو خرمی سے یہ کیا حساب تجھ بن

۱۵۸- نگرم آباد ہے بسے ہیں گاؤں (حبیب)

۱۵۹- گلشن میں یار بن مجھے شرب مدام ہیں (حبیب)

۱۶۰- گر کیجیے انصاف تو کی زور وفا میں

۱۶۱- عقل اس نادان میں کیا تیرا جو دیوانہ نہیں

۱۶۲- بچتی اٹھ کر میں تجھے رات کروں یا نہ کروں

۱۶۳- پونچھ کر چشم کریں ہم جو فشار دامن

۱۶۴- غم کی مے ہم نے جو شب دل کی بھری شیشے میں (حبیب)

۱۶۵- ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں (حبیب)

۱۶۶- سجدہ کیا صنم کو میں دل کے کنشت میں (حبیب)

۱۶۷- مژہ اوس چشم کی کھٹکے ہے دل مفتوں میں (حبیب)

۱۶۸- عاشق کی کہے چشم روسے بن تر ہوں میں

۱۶۹- چشم تر میرے سے کیا رکھتی ہے مطلب آستیں (حبیب)

۱۷۰- بلبل تصویر ہوں جوں نقش دیوار چمن (حبیب)

۱۷۱- غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں (حبیب)

۱۷۲- اسباب سے جہاں کے کچھ اب پاس گو نہیں (حبیب)

۱۷۳- کہے ہے توبہ یہ زاہد کہ تجکو دین تو نہیں (حبیب)

۱۷۴- پیارے تمھارا پیار کس انسان پہ نہیں (حبیب)

۱۷۵- جو کچھ ہو سو ہو مجھے بھاگنا تیرے در سے کار نکو نہیں (حبیب)

۱۷۶- جی تک تو دے کے لوں کہ تو ہو کار گر کہیں (حبیب)

۱۷۷- نے بلبل چمن نہ گل نو دمیدہ ہوں (حبیب)

۱۷۸- کیوں میں تسکین دل اے یار کروں یا نہ کروں

۱۷۹- اسی کو بہ چھپا کہیے جو یہ قلقل ہے شیشے میں

۱۸۰- چمن کا لطف سیر اور رونق محفل ہے شیشے میں

۱۸۱- تجھ بن یہ چمن ہر خس و ہر خار پریشاں

۱۸۲- خانۂ دل کہ ہو خون ہونے کا آئیں جس میں

۱۸۳- گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں

۱۸۴- لختِ جگر آنکھوں سے ہر آن نکلتے ہیں

۱۸۵- خوبوں میں دل دہی کی روش کم بہت ہے یاں

۱۸۶- شکل گل ہم نے تمام اپنا کیا تن دامن

۱۸۷- مستِ سحر دتو بہ کن شام کا ہوں میں

۱۸۸- تیرے پہلو سے جو مجلس میں ہٹے جاتے ہیں

۱۸۹- زندگی محجوب۔ کیا کیا اس میں ہیں محجوبیاں

۱۹۰- کوسوں کا نہیں فرق وجود اور عدم میں

۱۹۱- لازم ہے بزم میں وہ سخن بر زبان زبوں

۱۹۲- چیز کیا ہوں جو کریں قتل وہ انکھیاں مجھ کو (حبیب)

۱۹۳- ظلم کے تیرے ہیں گواہ خانہ بہ خانہ کو بہ کو (حبیب)

۱۹۴- محتسب آیا بزم میں ساقی لے آ شراب کو

۱۹۵- کیجے نہ اسیری میں اگر ضبط نفس کو (جبیب)

۱۹۶- خط اوس کے سادہ لوحوں کے پرستاروں سے مت پوچھو (جبیب)

۱۹۷- شیخ نے اوس بت کو جس کوچے میں دیکھا شام کو

۱۹۸- آلودہ زقطرات عرق دیکھ جبیں کو

۱۹۹- بادشاہت دوجہاں کی بھی جو ہووے مجھ کو

۲۰۰- بس ہو تو رکھوں آنکھوں میں اوس آفت جاں کو

۲۰۱- مرے نامے کے خاطر مرغ جاں سے کون بہتر ہو (جبیب)

۲۰۲- خواہی رہ صد سالہ ہو تو خواہ یہیں ہو (جبیب)

۲۰۳- اس دل کو دے کے لوں دوجہاں یہ کبھو نہ ہو (جبیب)

۲۰۴- دلدار اوس کو خواہ دل آزار کچھ کہو (جبیب)

۲۰۵- غیر یہ نت ہے کرم ہم پہ ستم واہ واہ (جبیب)

۲۰۶- آ پہنچ ساقی کہ پھر ایام کب آتے ہیں یہ (جبیب)

۲۰۷- شیخ تو کعبے کو پہنچے ہے کرامات کی راہ

۲۰۸- یاں نہ ذرہ ہی چمکتا ہے فقط گرد کے ساتھ (جبیب)

۲۰۹- شیخی تھی جام کی سو گئی جانِ جم کے ساتھ (جبیب)

۲۱۰- مجھ سے یہ لیے پھرنا تلوار بہت تحفہ (جبیب)

۲۱۱- جب خوش ہو تو دے گالی ایک بار سو یہ تحفہ (جبیب)

۲۱۲- تجھ حسن کا یوں مجکو میری جان ہے شعلہ

۲۱۳- حسن سے اس کے اسے دے ہے خبر آئینہ (جبیب)

۲۱۴- میکدہ ہی میں نہ اے بادہ کشاں ہے شیشہ (جبیب)

۲۱۵- ہے زلف میں دل میرا مت کیجیو تو شانہ (جبیب)

۲۱۶- خلقت کے نہ خلق اپنا پایا میں پسندیدہ

۲۱۷- غم کا ہے پسر خواندہ اور درد کا پالیدہ

۲۱۸- ہوں سرمۂ کوری سے وہ چشم ترآلودہ (حبیب)

۲۱۹- کہاں وہ نور کا شمس و قمر میں ہے شعلہ

۲۲۰- نیم جاں ہیں یہ تیری چشم کے بیمار کئی (حبیب)

۲۲۱- ہمارے کفر کے پہلو سے دین کی راہ یاد آوے

۲۲۲- غنچے سے مسکرا کے اسے زار کر چلے

۲۲۳- سودا کی مرے جس کو تدبیر نظر آئی

۲۲۴- جو طبیب اپنا تھا دل اوس کا کسی پہ زار ہے

۲۲۵- جھڑکی تو مدتوں سے مساوات ہو گئی (حبیب)

۲۲۶- تو ہی کچھ اپنے سر پہ نہ یاں خاک کر گئی (حبیب)

۲۲۷- اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی چلے گئے (حبیب)

۲۲۸- مارے کو تیری زلف کے لاکھوں جتن کیے (حبیب)

۲۲۹- دلا تو یار کو شمس و قمر لگا کہنے

۲۳۰- نہیں ہے بحث کا طوطی ترا دہن مجھ سے

۲۳۱- آتش جو عشق کی ہے سو نور بصر میں ہے

۲۳۲- کچھ یہ بھی پیش وحشت کامل زمین ہے

۲۳۳- صورت میں تو کہتا نہیں ایسا کوئی کب ہے

۲۳۴- جدی جدی یہ جہاں آن بان ہے سب کی

۲۳۵- فکر میں ہجر کی دل وصل کا دن کھوتا ہے

۲۳۶- ہم ہیں وارستہ محبت کی مدد گار ہی سے

۲۳۷- جب اپنے بند قبا تم نے جان کھول دیے (حبیب)

۲۳۸- ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے (حبیب)

۲۳۹- وعدۂ لطف و کرم گر نہ وفا کیجیے (حبیب)

۲۴۰- ہر سحر قتل تری چشم کا اک مفتون ہے (حبیب)

۲۴۱- سرو گلشن ہے نہ کچھ مفتون ہے (حبیب)

۲۴۲- جب ان آنکھوں کا غمزہ بر سر بیداد آتا ہے

۲۴۳- گوہر کو جوہری اور صراف زر کو پرکھے

۲۴۴- تیری آنکھوں نے نرگس سے چمن میں یار ایسی کی

۲۴۵- خورشید ومہ نے پیارے تجھ پہ یہ بیتوائی

۲۴۶- گر تجھ میں ہے وفا تو جفا کار کون ہے (حبیب)

۲۴۷- دل لے کے ہمارا جو کوئی طالب جاں ہے (حبیب)

۲۴۸- میری آنکھوں میں تو بستا مجھے تو کیوں رلاتا ہے (حبیب)

۲۴۹- اس قدر سادہ و پرکار نہیں دیکھا ہے

۲۵۰- کیا جانیے کہ کس کے دل کا لہو پیا ہے (حبیب)

۲۵۱- ارض وسما شفق نے لہو میں بھر دیا ہے (حبیب)

۲۵۲- نسیم ہے تیرے کوچے میں اور صبا بھی ہے (حبیب)

۲۵۳- سودا جو سنا ہے کسی کا نام یہی ہے (حبیب)

۲۵۴- جو گل ہے یاں سو اس گل رخسار ساتھ ہے

۲۵۵- لینا جو شیشۂ دل منظور ہے تو یہ ہے

۲۵۶- چہرہ مریض لب کا ترے زرد ہے سو ہے (حبیب)

۲۵۷- درد میرے استخواں کا کیا ترے دم ساز ہے (حبیب)

۲۵۸۔ ہمیں کسی سے گر اظہار درد آتا ہے (حبیب)
۲۵۹۔ مجھے تجھ زلف کے سنبل سمجھنے میں تامل ہے
۲۶۰۔ اس چال کے نبھنے کا کچھ اسلوب نہیں ہے
۲۶۱۔ نہیں جوں گل طلب ابر سیاہ لگا ہے
۲۶۲۔ جس دن تری گلی کی طرف ٹک پون بہے (حبیب)
۲۶۳۔ کسی کا درد دل پیارے تمہارا ناز کیا سمجھے
۲۶۴۔ کہوں میں کس سے کہ مطلب میرا روا کیجے (حبیب)
۲۶۵۔ مونہہ لگا وے کون مجکو گر نہ پوچھے تو مجھے (")
۲۶۶۔ سود جوں شمع نہیں گرمیٔ بازار مجھے (")
۲۶۷۔ اس قدر اب کے ہوا ست ہے ویرانے کی (")
۲۶۸۔ نہ تاب لا سکے خورشید عشق کی تپ کی (")
۲۶۹۔ جو بادہ تو نہ پیے جام لالہ ہو نہ سکے (")
۲۷۰۔ ممکن ہے تیر خوردہ تڑپ کر سنبھل سکے (")
۲۷۱۔ ماریں گے ایک دو کو یا آپ مر رہیں گے (")
۲۷۲۔ نے ضرر کفر کو نے دین کا نقصاں مجھ سے (")
۲۷۳۔ تصور میں تیرے کہیو صبا اوس لاابالی سے (")
۲۷۴۔ تخمِ گلِ امید چن اس شورہ زار سے (")
۲۷۵۔ مرجاں کا نخل ہوں نہ پھلوں برگ و بار سے (")
۲۷۶۔ شکوہ ہے دور ظالم کہ نامردتوں سے (")
۲۷۷۔ گو دخترِ رز عشق میں یاروں کے پکی ہے (")
۲۷۸۔ کوئی کرتا رہے اوس سے جو یہ مذکور بہتر ہے (")

۲۷۹- بلبل نالاں و دردِ عشق کچھ معقول ہے

۲۸۰- خشک رہنے سے ہمارا دیدۂ تر پاک ہے (حبیب)

۲۸۱- عارضی سامان حرمت کب ہمیں درکار ہے

۲۸۲- قاتل سے کیوں جھگڑتے ہو کیا مجھ سے بیر ہے (حبیب)

۲۸۳- خاک پر بھی تیرے دیوانے کی یہ تدبیر ہے (،،)

۲۸۴- گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی (،،)

۲۸۵- نہ مجھ سے کہہ کہ چمن میں بہار آئی ہے (،،)

۲۸۶- بہار بے سپرِ جام و یار گزرے ہے (،،)

۲۸۷- اس دل کی تفِ آہ سے کب شعلہ بر آوے (،،)

۲۸۸- انھی کو یہ طاقت ہے کہ اوس سے بہ سر آوے (،،)

۲۸۹- نسیم گر قدم دوستی بجا لاوے (،،)

۲۹۰- الٰہی بزم بتاں سے وہ شمع ٹل جاوے (،،)

۲۹۱- گو غنچہ ساں گرہ میں دنی جمع زر کرے (،،)

۲۹۲- بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے (،،)

۲۹۳- ساقِ سیمیں تری شب دیکھ کے گوری گوری (،،)

۲۹۴- کافر جو ہو مجھ سا اوسے دل اپنے میں جاوے (،،)

۲۹۵- دل میں بسنے کی تری مجکو نپٹ ہے شادی (،،)

۲۹۶- تجھ تیغ تلے کہہ تو ستم سے کہ سر دھر دے (،،)

۲۹۷- خط نقص صفائی رخ دلدار نہ ہووے (،،)

۲۹۸- جس دم وہ صنم سوار ہووے (،،)

۲۹۹- بھر نظر تجکو نہ دیکھا کبھو ڈرتے ڈرتے (،،)

۳۰۰- اے آہ تیری قدر اثر نے تو نجانی (حبیب)
۳۰۱- برہمن بتکدے گے شیخ بیت اللہ کے صدقے (")
۳۰۲- اے لالچی تو کیسہ غیروں کا مت ٹٹولے (")
۳۰۳- جوں غنچہ تو چمن میں بند قبا کو کھولے (")
۳۰۴- خاتم کے جوں نگیں ہمیں کس کام کے لیے
۳۰۵- نکل نہ چوکھٹ سے گھر کی پیارے جو پٹ کے اجھل ٹھٹک رہا ہے
۳۰۶- تیری واسوخت سے خالی میں نہ پایا کوئی
۳۰۷- ہم آج ایک صنم میں غرور دیکھا ہے
۳۰۸- وہی جہاں میں رموز قلندری جانے
۳۰۹- تجھ عشق سے سودا کا انکار نظر میں ہے
۳۱۰- کس سے جا اٹکا ہے دل میرا عجب دیوانہ ہے
۳۱۱- عارض پہ حسن خط سے دمک کیا ہے نور کی
۳۱۲- یاں صورت و سیرت سے بت کون سا خالی ہے
۳۱۳- بولو نہ بول شیخ جی ہم سے کڑے کڑے
۳۱۴- مگر وہ دید کو آیا تھا باغ میں گل کی
۳۱۵- میرے ملنے کی اوس کو تب ہوس ہووے اگر ہووے
۳۱۶- خوب واقف ہیں محبت کے وہ سررشتے سے
۳۱۷- دل اس سینے میں ہے یا قطرۂ سیماب ہے
۳۱۸- نہیں وہ بولتے اونمیں خبر جن کو ہے کچھ دہر کی
۳۱۹- چاہنا بزم تعیش کا ہوسناکی ہے
۳۲۰- عاشق کو نہ کر پیار جی سے

۳۲۱ - کچھ تازہ تعلق نہیں اس دل کو الم سے
۳۲۲ - غفلت میں زندگی کو نہ کھو گر شعور ہے
۳۲۳ - پنبہ کو دور کر مرے سینے کے داغ سے
۳۲۴ - جب نظر اس کی آن پڑتی ہے
۳۲۵ - زمانہ تجھ سے اگر ہو ناساز کر تو اس سے زمانہ سازی
۳۲۶ - ہر لحظہ اب بہ نشو و نما خط یار ہے
۳۲۷ - دل کسی سے کہ جب پلٹتا ہے
۳۲۸ - درد دل کس کو کہوں میں وہ کہاں ہے تو ہے
۳۲۹ - ہم سے لالچ پہ ارادہ کچھ اگر اسکا ہے

متفرقات غزلیات ناتمام

۳۳۰ - مسیحا سن کے اٹھ جاوے جو کہیے کچھ دوا کیجے
۳۳۱ - تو ٹک جگر تو مرے مرغ نامہ بر کا دیکھ
۳۳۲ - اگر دنیا میں اب یونہیں سجن رسم وفا ہو گا
۳۳۳ - ساقی ہماری توبہ تجھ پہ ہے کیوں گوارا
۳۳۴ - کیا تاب ہے جو مونہہ پہ تیرے آوے آفتاب (حبیب)
۳۳۵ - نہ جائے سر سے میرے تا ابد ہوائے شراب (”)
۳۳۶ - کیوں اسیری پہ میری صیاد کو تھا اضطراب (”)
۳۳۷ - کیا خوشی ہم کو کہ اپنی ہے یہ حیرانی کی طرح
۳۳۸ - یہ زندگی میری وحشت کا ننگ ہے صیّاد
۳۳۹ - جام گل تیرے سے اب بلبل کو مستی ہے بہار ۲
۳۴۰ - شیخ ٹک چشم عشق سے کر سیر ۲

۳۴۱ - ساقی گئی بہار رہی دل میں یہ ہوس (رچرڈ جونسن اور آسی میں دو اور حبیب
میں ایک شعر ہے)

۳۴۲ - آشیاں کو مت اجڑا اکر کے فریاد و خروش (حبیب اور رچرڈ جونسن میں دو
اور آسی میں تین شعر ہیں)

۳۴۳ - ابھرے ہے کیا حباب نمط اے حریر پوش ۲ (حبیب، رچرڈ جونسن دو شعر)

۳۴۴ - گو آپ نہ مجھ غریب کے بالیں تک آئی شمع ۴

۳۴۵ - پروانہ رات شمع سے کہتا تھا رازِ عشق (حبیب، رچرڈ جونسن دو شعر)

۳۴۶ - رخ سے دیکھوں ہوں میں اوس زلف سیہ فام تلک ۳

۳۴۷ - ہووے نہ ملک عشق سے کم رسمِ داغِ دل (حبیب، رچرڈ جونسن دو شعر)

۳۴۸ - تیرے ہی دیکھنے کے نہ آوے جو کام چشم (حبیب، رچرڈ جونسن میں دو شعر
اور آسی میں پوری غزل ہے)

۳۴۹ - کس کس طرح کی دیکھیں اس باغ کی فضائیں (رچرڈ جونسن، حبیب دو شعر)

۳۵۰ - خلش کروں نہ کسی سے اگرچہ خار ہوں میں ۲

۳۵۱ - عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں (حبیب تین شعر، رچرڈ جونسن دو شعر)

۳۵۲ - موسمِ گل ہے ولے کچھ یہ دل اب شاد نہیں (حبیب، رچرڈ جونسن دو شعر)

۳۵۳ - ظاہر میں دیکھنے کا کچھ اسباب ہی نہیں ۲

۳۵۴ - مجکو نہیں ہے دل میں تیری راہ کیا کروں ۲

۳۵۵ - الٰہی ہے سکت نعم البدل کی تجکو دینے کی
مجھے اس کے عوض تو کچھ نہ دے پہ پھیرے دل کو ا

۳۵۶ - اب دردِ دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو (حبیب، رچرڈ جونسن، دو شعر)

۳۵۷ - تجھ بن تو دو جہاں سے کچھ اپنے تئیں نہ ہو ۲ (حبیب، رچرڈ جونسن، دو شعر)

۳۵۸- بوؤں میں تخمِ دل کو جہاں وہاں زقوم ہو (حبیب، رچرڈ جونسن، دو شعر)

۳۵۹- اے نالہ مت سبک ہو نکل کر جگر سے تو (حبیب، رچرڈ جونسن، دو شعر)

۳۶۰- لٹی مے، اُٹھ گیا ساقی میرا ابھی پر ہو پیمانہ ۲

۳۶۱- تیری اون الفتوں کے زمانے کدھر گئے ۲ (حبیب، رچرڈ جونسن، دو شعر)

۳۶۲- جو ہے جلا جلوں کا ہے غم خوار وہ کوئی ۲

۳۶۳- ہمت کہاں کہ منت دوناں نہ لیجیے ۳ (حبیب، رچرڈ جونسن، تین شعر)

۳۶۴- مرے گر عاشق بےکس تو ماتم دار دشمن ہو (حبیب، رچرڈ جونسن، تین شعر)

۳۶۵- اٹھایا کوہ رستم نے اگر تو سخت ناداں ہو ۲ (حبیب، رچرڈ جونسن، تین شعر)

۳۶۶- حیراں ہوں شمع کس کے لیے سوزناک ہے (حبیب، رچرڈ جونسن، دو شعر)

حسب ذیل ناتمام غزلیں صرف حبیب میں ہیں

۳۶۷- قاصد کو اپنے ظالم جو کچھ میں دوں بجا ہے

۳۶۸- یہاں چشمِ سرمہ سا کا مارا کوئی جیا ہے

۳۶۹- نہیں ممکن اسیر دل کی کوئی فریاد کو پہنچے (تین شعر)

۳۷۰- مرے خونِ ناحق کی دے کر گواہی (دو شعر، آسی میں یہ شعر رباعیات کے تحت دیئے گئے ہیں)

۳۷۱- سودا یہ کرے گا نت اس طرح کا رونا

۳۷۲- عشق کی خلقت سے آگے تیرا دیوانہ تھا

۳۷۳- بال و پر ہونے نہ پائے تھے نمودار ہنوز

۳۷۴- کیا کیجے کہ ہم سے کچھ بات نہیں بن آتی (دو شعر)

۳۷۵- وہی ہیں دن وہی راتیں وہی فجر وہی شام

۳۷۶- خانہ بر در، دِ چمن ہیں آخر اے صیاد ہم

۳۷۷۔ کرے ٹک منفعل کوئی میرے بیدرد قاتل کو
۳۷۸۔ بہار باغ ہو مینا ہو جام صہبا ہو
۳۷۹۔ اب شہدِ زندگی کی نہیں ہے ہوس مجھے
۳۸۰۔ سینے کو دشمنوں کو نگہ تیری توڑ دے (دو شعر)

فردیات

۳۸۱۔ دیدۂ پُرآب سے تجھ بن ہمیں کیا کم ہے جام
۳۸۲۔ جب تک ہے جہاں میں گل وگلزار سلامت
۳۸۳۔ میکشاں روح ہماری بھی کبھی شاد کرو
۳۸۴۔ کون کہتا ہے نہ اوروں سے ملا کر مجھ سے مل
۳۸۵۔ اوس دل پہ تجھے رحم جفاکار نہیں ہے
۳۸۶۔ میں کہتا ہوں دل اپنے کو کہ ننگ و نام سے گزرے
۳۸۷۔ تبسم دیکھ تیرا کیوں نہ دل بیتاب ہو جاوے
۳۸۸۔ یار ہے بے قدر جب ہو آشنا دس بیس کا
۳۸۹۔ خط مرغ نامہ بر نے تجھے کون سا دیا
۳۹۰۔ فائدہ کیا خط تجھے لکھ لکھ اگر روتا ہوں میں
۳۹۱۔ سن کے یہ کہتا ہے میرے نالۂ جانکاہ کو

مخمس

۱۔
۲۔ بہر جامی روم از خویش می جوشد تماشائے
۳۔ کہ در موے نہ گنجید ز بسیاری دل
۴۔ کہ سر بجوہ دبیابان تو درد ہ مارا

۵- سوزم گرت نہ بینم، میرم چو رُخ نمائی
۶- مخمس بر غزلِ میر۔ تو بھی ہم غافلوں نے آکے کیا کیا کیا کچھ
۷- کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے
۸- مخمس بر غزل تاباں ۔تیرے پاس عاشق کی عزت کہاں ہے
۹- مخمس بر مصرع خود ۔ طاقت نہیں رہی ہے مجھے انتظار کی
۱۰- مخمس بر غزل خود۔ جھڑکی تو مدتوں سے مساوات ہو گئی
۱۱- گویا چمن میں جز دمِ عیسیٰ صبا نہیں
۱۲- مخمس بر غزلِ خود ۔ ہونے سے دوستوں میں بہم پیار رہ گئے
۱۳- مخمس در ویرانی شاہ جہاں آباد۔ بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول
۱۴- دیکھنے کے مجھے مانع ہیں طبیبان گل و صبح
۱۵- ہر کہ عیب دگراں پیشِ تو آورد و شمرد
۱۶- عینک بھی جوڑے ساتھ منگاتے ہیں شیخ جی
۱۷- کہتے ہیں حور و ملک شیخ جی تم زور بنے
۱۸- ایک مسخرا یہ کہتا تھا کوّا حلال ہے
۱۹- مخمس در ہجو ندرت ۔ گھوڑے کو دو نہ دو لگام منہ کو تنک لگام دو
۲۰- مخمس در ہجو ندرت ۔ آبروے ریختہ از جوش سودا ریختہ
۲۱- مخمس در ہجو ندرت ۔ لو لو کرا نچھو لچ لچ وے یا رے یا رے مدنا
۲۲- مخمس در تعریض بعض شعرا ۔ مونہہ پہ ورش شانہ میں تو ہو موسل
۲۳- مخمس در ہجو فدوی ۔ کہ فدوی جگ میں کہاتا ہے الو بنیئے کا
۲۴- مخمس در ہجو ضاحک ۔ روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر
۲۵- مخمس در ہجو ضاحک ۔ بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا

۲۶۔ مخمس در ہجو ضاحک ۔ جا صبا زاہد سے کہہ بعد از سلام

مثنویاں

۱۔ میرا دل نام پر اُس کے ہے شیدا
۲۔ مثنوی در بیانِ شدت گرما (حبیب)
۳۔ مثنوی در ہجو فیل (")
۴۔ مثنوی در بے نسقیٔ شاہجہاں آباد (")
۵۔ مثنوی در ہجو بخیل
۶۔ مثنوی در ہجو بسیار خوار کہ عبارت از ضاحک باشد
۷۔ مثنوی در ہجو فوقی (حبیب)
۸۔ مثنوی در تعریف دیوان مہربان خاں
۹۔ مثنوی در ہجو فدوی (یہ شیدا کی تصنیف ہے)
۱۰۔ مثنوی در ہجو حکیم غوث (حبیب)

یہ مثنویاں رچرڈ جونسن میں نہیں ہیں حبیب میں ہیں

۱۔ ہے خدا کا یہ ایک شمہ نور
۲۔ ہجو کودک ابتر وضائع روزگار

رباعیات

۱۔ خاوند وہ ایسا ہے کہ عالم کو دے
۲۔ ہر سو تیری تحقیق میں تھے ہم سرگرم
۳۔ ایوانِ عدالت میں تمھارے یا شاہ (حبیب)
۴۔ مومن نہیں زنار سے میرے آگاہ (")
۵۔ سودا جو کوئی ہے مے وحدت سے مست

۶۔ سایا تیرا اے نخلِ امید کہہ و مہ

۷۔ نادیدنی از بسکہ ہے روئے عالم (حبیب)

۸۔ تجھ پاس گدا کب آکے ایسا بولا (”)

۹۔ دکھ تفرقہ کا یاروں کے کچھ مت پوچھو

۱۰۔ آنکھوں سے پڑا اشک مرے ڈھلتا ہے (حبیب)

۱۱۔ کوتاہ نہ عمرِ ہے پرستی کیجے (”)

۱۲۔ آنکھیں کہیں بھوؤں سے کہ حصہ کیجیے (”)

۱۳۔ ہرنوں کو اے آخون تشکاری میرے (”)

۱۴۔ دتو کہے آخون بلاؤ مجھ کو (”)

۱۵۔ گر ہجو پہ سودا کی ادسے رغبت ہے (”)

۱۶۔ سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک

۱۷۔ ہے فوج سے غمزے کی ہمیشہ بیداد

۱۸۔ مونہہ پھیرے ہے گو دیکھ کے ہم کو عالم

۱۹۔ ہے زیرِ فلک جتنے کہ یہ موجودات

۲۰۔ گر مہ سے بلندی میں ہوا تو دہ چند

۲۱۔ اے نفس دنی حرف تو میرا کر گوش

۲۲۔ دنیا ہمیں کہتی ہے کہ دل مجھ سے موڑ

۲۳۔ اے دوست تجھے دل میں تو پاتا ہوں سرور

۲۴۔ افسوس کہ ہموں میں نہیں یہ دستور

۲۵۔ ہستی یہ تیری وہم کا اک ریشہ ہے

۲۶۔ سودا شعرا میں ہے بڑائی تجکو

۲۷۔ سوداؔ بجہاں اپنی زبانی تو ہے
۲۸۔ اس باغ پر از میوہ میں جو آیا ہے
۲۹۔ سوداؔ دہن یار کے ہوتے رکھ ہوش
۳۰۔ باریک وطویل اتنا ہوا کس کے پوت
۳۱۔ سوداؔ کی ہے یہ عرض یقین اس کو جان
۳۲۔ اے داب قوانین جہاں کے دستور
۳۳۔ ناطق تو نہ تھا جب تو سنے تھا تب کچھ
۳۴۔ اے شیخ حرم تک تجھے آنا جانا
۳۵۔ ہے حرص دہوا تن کے ترے ہر مو میں
۳۶۔ میں دیر وحرم ڈھونڈ کے یارو ہارا
۳۷۔ چاہی تھی بتوں کی آشنائی ہم نے
۳۸۔ کتنوں کا جہاں میں بہ زر و مال ہے شکر
۳۹۔ جب سے چمن حسن میں تو در آیا
۴۰۔ اوس چشم و مژہ سے دل دیا تھا اٹکا
۴۱۔ اوس آتشیں خو سے دل یہ کس کا اٹکا
۴۲۔ کیا جانے بسا ہے آج کس کے جا کر
۴۳۔ کل آگئے جنھوں کے دکھ سے وقفا پایا
۴۴۔ تیشہ سے جو کوہکن نے سر کو پٹکا
۴۵۔ دکھ دل کا کوئی جو تجھ سے کہہ کہہ روے
۴۶۔ دلی سے میں دنیا کی کہا یوں جا کر

قطعات

۲۱ - تاریخِ ولادت - صبح دم آج دل خلائق کا
۲۲ - تہنیت عید الضحیٰ - جہاں میں شادی عید الضحیٰ ہے آج کے دن
۲۳ - کھیت رہنے سے یار و حافظ کے
۲۴ - چل قلم کہہ حسن رضا خاں سے
۲۵ - تہنیت عید الضحیٰ - خوشی جہاں میں ہے عید الضحیٰ کی آج کے روز
۲۶ - مجکو ہر چند نہیں شیعہ و سنّی سے کام (حبیب میں یہ قطعہ رباعیات کے تحت دیا گیا ہے -)
۲۷ - در عذر دوست داشتنِ سگ - ایک عاقل نے یہ سودا سے کہا از سرِ پند
۲۸ - قصیدہ و تاریخ بنائے مسجد - با عندلیب گلشنِ ایماں برابر است
۲۹ - تاریخ تولد - مبارک باد ایں فرزند دلبند
۳۰ - قطعہ تعریف چاہ - چشمہ از حکم آصف الدولہ
۳۱ - قطعہ تعریف چاہ - شد بہ حکم آصف الدولہ بنا
۳۲ - ٹکیٹ رائے مہاراجہ ساخت بستانے

قصیدے

۱ - قصیدہ در مدح رچرڈ جونسن
دیکھا نہ جائے اس سے روئے گلرخاں پہ رنگ (یہ قصیدہ کسی مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں -)
۲ - قصیدہ در نعت حضرت رسالت علیہ السلام
ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی (حبیب)
۳ - قصیدہ در نعت و منقبت
چہرہ مہر وش ہے ایک سنبل مشکفام دو (حبیب)

۴ - قصیدہ در منقبت امیر المومنین

بسانِ دانۂ روئیدہ ایکبارہ گرہ (حبیب)

۵ - قصیدہ در منقبت امیر المومنین

سنگ کو اتنے لیے کرتا ہے پانی آسماں (حبیب)

۶ - قصیدہ در منقبت امیر المومنین

یار و مہتاب و گل و شمع بہم چاروں ایک

۷ - قصیدہ در منقبت امیر المومنین

اوٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل

۸ - در منقبت سید الشہدا علیہ السلام

سوائے خاک نہ کھینچوں گا منت دستار (حبیب)

۹ - در منقبت کاظمین علیہ السلام

ہے پرورش سخن کی مجھے اپنی جاں تلک (حبیب)

۱۰ - در منقبت امام رضا

اگر عدم سے نہ ہو ساتھ فکر روزی کا

۱۱ - در منقبت امام عسکری

عیب پوشی ہو لباس چرک سے کیا ننگ ہے (حبیب)

۱۲ - در منقبت صاحب الزماں

جوں غنچہ آسماں نے مجھے بہرِ عرض حال (حبیب)

۱۳ - قصیدہ در مدح عالم گیر ثانی

رکھے ہمیشہ تری تیغ کارِ کفر تباہ (حبیب)

۱۴۔ در مدح عالم گیر ثانی

ہے اشتہار تجھ سے میرا اے فلک جناب

۱۵۔ در مدح عالم گیر ثانی

کہے ہے کاتبِ دوراں سے منشیٔ تقدیر (مصطفائی اور آسی میں یہ قصیدہ عماد الملک کی مدح میں ہے جو ٹھیک معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس قصیدے میں یہ شعر بھی ہے۔

سنا نہیں ہے کہ غازی دیں عماد الملک
جو میر بخشی تھا واں کا سواب ہوا ہے وزیر

۱۶۔ در مدح نواب عماد الملک

فجر ہوتے جو گئی آج میری آنکھ جھپک (حبیب)

۱۷۔ در مدح نواب شجاع الدولہ

خوں میرے دل میں نہیں تشنہ ہے گو تیرا ناز

۱۸۔ در صفت تیر اندازی

احکام پر تیرے نہ کرے کیوں کے کام تیر

۱۹۔ در مدح نواب شجاع الدولہ

آیا عمل میں تیغ سے تیرے وہ کارزار

۲۰۔ در مدح آصف الدولہ

تیرے سائے تلے ہے تو وہ نہنت

۲۱۔ در مدح آصف الدولہ

کیا تجکو سجی مسند دیوان وزارت

۲۲- در مدح نواب مرحوم

اشجار کا بستانِ جہاں کے ہے عجب ڈھنگ

۲۳- قصیدہ بہاریہ در مدح نواب سیف الدولہ

برجِ حمل میں بیٹھ کے خاور کا تاجدار (حبیب)

۲۴- در مدح نواب سیف الدولہ

ہفجوش کا ہو دل تو یہ ہے دہر سے بتنگ (حبیب)

۲۵- در مدح نواب سیف الدولہ

ہے سخن سنج اک جوانِ متین (حبیب)

۲۶- در مدح نواب وزیر آصف الدولہ

کیا قلم کو رقم سے ہے منظور

۲۷- در مدح نسبت خاں

کل حرص نام شخصے سودا پہ مہرباں ہو (حبیب)

۲۸- در مدح نسبت خاں

تاثیر گردش آج کواکب کے صبح کو (حبیب)

۲۹- در مدح آصف الدولہ

گر فلک اب یہ مہرباں ہووے

۳۰- در مدح نواب آصف الدولہ

سودا پہ جب جنوں نے کیا خواب و خور حرام

۳۱- در نعت

زخمی ہیں ترا اور گلستاں ہے برابر

۳۲- در تعریض بہ یکے از معاصرین و مدح شاہ خراسان
مستغنیٔ ذاتی نہ ہوس کے ہوں تسخیر

۳۳- در نعت
منکر خلا سے کیوں نہ حکیموں کی ہو زباں

۳۴- شہر آشوب
اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے (حبیب)

۳۵- ہجو مولوی ساجد خارجی
سنا ہے میں یہ کسی نے بہ مدعائے فساد

۳۶- در ہجو اسپ
ہے چرخ جب سے ابلق ایام پہ سوار (حبیب)

۳۷- ہجو مولوی ساجد خارجی
ساجدا کیوں نہ وہ پرواز کرے تا بہ فلک (مصطفائی میں یہ ہجو ہے لیکن آسی میں نہیں)

۳۸- در مدح طبیب
علم ظنی ہے طبابت تو یہ سن رکھ ہمدم

غزلیاتِ فارسی

۱- زد شعلہ بہ دل از نفس سرد دماغِ ما
۲- چوں دل نتواند کہ کند ترکِ وفا را
۳- گر بہ لکنت وا کند یار آں دو لعل بستہ را
۴- اے کہ در چشم بہر صورت تو منظوری بیا
۵- من بساط عیش خود را بر نچینم تا کجا

۶۔ کس بروں زاں کوچہ نتواں کرد ایں دلدادہ را
۷۔ تنہا نہ موج خندہ زند بر بقائے ما
۸۔ آں شعلہ کہ در خرمن موسیٰ شرر اوست
۹۔ غم ز ایّام جوانی یادگار ماندہ است
۱۰۔ سخن ز ما بجہاں وز دیگراں گہر ست
۱۱۔ سدّ رہش زمانہ چو جا نہا نمی گذاشت
۱۲۔ دانم کہ عشق ہم چہ منے قابل تو نیست
۱۳۔ جوہر آئینہ از تاب رخش سوختہ است
۱۴۔ ساختم از حالِ دل آگاہ و یار از دست رفت
۱۵۔ افسوس پائے عیش جہاں را قیام نیست
۱۶۔ بہ چہرہ راہ خط مشکبار نتواں بست
۱۷۔ عشق تو ز پروانۂ ما تا نہ مگس سوخت
۱۸۔ در پردہ بہ ما ناز سزاوارِ تو باشد
۱۹۔ در کشوری کہ ناز و ادا می فروختند
۲۰۔ شادم اگر بہائے دلم یار بشکند
۲۱۔ مشہور دلم چہ بہ ہمدم دو چار نالہ و گریہ
۲۲۔ ہر یکے خواہاں دل از جنس خوباں می شود
۲۳۔ گردنم را چو باں تیغ سرو کار افتد
۲۴۔ دردم ز دوائے تو فزوں شد شدہ باشد
۲۵۔ تا کارِ من دل شدہ با سلسلہ افتاد
۲۶۔ آنانکہ بدست تو دلِ زار فروشند

۲۷۔ نے گُلے در باغ رنگ و بُوے او در خواب دید

۲۸۔ ...ے ازیں جہانِ خرابی ندید کس

۲۹۔ زاں دید کہ برد جلوۂ صیاد در قفس

۳۰۔ در میکدۂ ما چو رسیدی ز حرم باش

۳۱۔ جان ستم رسیدہ من دادخواہ دل

۳۲۔ گہہ کعبہ راز کوے تو بہتر نہ گفتہ ام

۳۳۔ بچشم مرداں از رہگذار سرمہ می آیم

۳۴۔ دل را کشید جاناں تا در بر تبسّم

۳۵۔ در قتل گہم آئی و من روے تو بینم

۳۶۔ ہرگز بجہاں ما غم دستار نداریم

۳۷۔ از دلم چوں آہ آتشناک می آید بدرد ل

۳۸۔ لالہ بے دود چراغست چہ می بینی تو

۳۹۔ دارم من آشنائی کز روز آشنائی

سودا کا الحاقی کلام

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مطبوعہ کلیاتِ سودا میں بہت سا کلام دوسرے شاعروں کا ہے۔ یہاں سودا کے تمام الحاقی کلام کی نشان دہی کی گئی ہے۔

مندرجۂ ذیل غزلیں میر سوز کی ہیں[۱]

۱۔ دلا دریائے رحمت قطرہ ہے آب محمد کا
۲۔ جب خیال آتا ہے اس دل میں ترے اطوار کا
۳۔ مل کے اُس بدخو سے اے دل جب تو رسوا ہوے گا
۴۔ قدرداں بن ہے بہت حال برا شیشے کا
۵۔ لگے ہے جام جو منہ دل ہے آب شیشے کا
۶۔ تہی لانا مجالس میں نہیں دستور شیشے کا
۷۔ کریں شمار بہم دل کے یار داغوں کا

۱۔ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ میں دیوانِ سوز کے تین قلمی نسخے ہیں۔ جن کے نمبر حسب ذیل ہیں

۸۹۱۶۵۵۱۱	۸۹۱۶۵۵۱۱	۸۹۱۶۵۵۱۱
س ۴۲ د س	س ۴۲ د س	س ۴۲ د س
ن ۱	ن ۲	ن ۳

ان تینوں نسخوں سے کلیاتِ سودا مرتبۂ آسی کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اردوے معلیٰ کے "میر سوز" نمبر اور قاضی عبدالودود کے ایک مقالے "کلیات سودا کا پہلا مطبوعہ نسخہ" (سویرا، ۲۹) سے بھی مدد لی گئی ہے۔

۸۔ عشق تھا یا کیا تھا جس سے دل اٹکتا ہی رہا
۹۔ چہرے پہ نہ یہ نقاب دیکھا
۱۰۔ جب بادہ خونِ دل ہو تو سیرِ چمن کُجا
۱۱۔ نہ دانہ ساتھ لے صیاد تیں نے دام لیتا جا
۱۲۔ افسوس تم اوروں سے ملو رات کو تنہا
۱۳۔ عشاق تیرے سب سے پر زار تھا سو میں تھا
۱۴۔ دیکھ کر جو مر گئے ہیں تیری پوروں پہ حنا
۱۵۔ کہتی ہے میرے قتل کو یہ بے وفا حنا
۱۶۔ نے رستم اب جہاں میں نے سام رہ گیا
۱۷۔ نہیں پیکاں یہ جوہر نامہ اُن نے تیر پہ لکھا[1]
۱۸۔ موتی کو بھی ترا کرے احیا پیامِ لب
۱۹۔ کھولی گرہ جو غنچے کی تو نے تو کیا عجب
۲۰۔ کر حذر میرا نہیں ہے شیشہ خالی محتسب
۲۱۔ ہوئے ہیں غنچوں کے دل بے قرار تیرے ہات
۲۲۔ دین و کفر آنکھوں نے تیری کر دیا اے یار مست

۱۔ کلیاتِ سودا مرتبہ آسی میں یہ شعر بھی شامل ہے

اسی مضمون سے معلوم اس کی سرد مہری ہے
مرا نامہ جو اس نے کاغذِ کشمیر پر لکھا

لیکن یہ شعر دیوانِ سوز کے کسی نسخے میں نہیں ہے۔ مجموعۂ نغز (جلد ۱، ص ۶۵) ۔ عمدۂ منتخبہ (ص ۱۰۶) اور سخن شعرا (ص ۳۰۷) میں اعظم خاں اعظم شاگرد محمد نصیر الدین نصیر سے منسوب ہے۔

۲۳- رہتے تھے ہم تو شاد نہایت عدم کے بیچ

۲۴- جان عشاق کی لے چھوڑے یہ کر پیار کے بیچ

۲۵- ہوا ہے داغ مرا دل انار کے مانند

۲۶- لذتِ بے رنج ملنی ہے زمانے سے بعید

۲۷- میں چاہتا نہیں دنیا میں عز و جاہ بلند

۲۸- مجھ ساتھ تری دوستی جب ہو گئی آخر

۲۹- صبا حریف لے آئی ہے تو مرے دل پر

۳۰- پیوں ہوں خونِ دل اتنا، تجھے گماں ساغر

۳۱- تپ جائے کیونکہ عشق کی اے یار تجھ بغیر

۳۲- کاٹتے دل کو ہیں ابرو یار کے تلوار وار

۳۳- کرتا ہوں ترکِ عشق میں یوں پیش و پس ہنوز

۳۴- کب ہم کو ہے بہار میں گلزار کی ہوس

۳۵- بلبل کو ہے ترے سرِ دیوار کا ہلاس

۳۶- یوں دیکھ مرے دیدۂ پُر آب کی گردش

۳۷- رکھتے ہیں تیری زلف کے ہر تار کا خلش

۳۸- آرام پھر کہاں ہے جو ہو دل میں جا ے حرص

۳۹- دیکھ لینا ہم کو تیرا یار ہے جب تب غرض

۴۰- سرسبز حسن رکھتی ہے تیرا بہارِ خط

۴۱- تیری آنکھوں کی طرح سے نہ رکھے جام نشاط

۴۲- سمجھے تھے ہم جو دوست تجھے اے میاں غلط

۴۳- اشک کے قطرے سے نیساں کا اثر رکھتی ہے شمع

۴۴۔ مژگاں کی گر خلش کا بدل ڈھنگ ہے وسیع
۴۵۔ آتش ہے مرا بوجھ، سمندر نہ ورے داغ
۴۶۔ نالے سے میں اپنے نہیں اے رشکِ پری داغ
۴۷۔ عشق کی ہووے تو ہو ہم کو اسیری کا دماغ
۴۸۔ اب ہو تو نہ ہرگز رہے کنعاں میں یوسف
۴۹۔ میں بتاؤں تم کو یارو گر کرو تدبیر ایک
۵۰۔ سنبل و زلف سیہ کاکل و شب چاروں ایک
۵۱۔ رونے سے میرے تا بہ کجا دل سے آئے اشک
۵۲۔ مرا لگتا نہیں اے باغباں تیرے چمن میں دل
۵۳۔ جب تو چمن سے گھر کو چلا کر کے دید گل
۵۴۔ جاتا ہے دل تو جائیو ہشیار آج کل
۵۵۔ سنا ہے اب تو خط آیا ہے، کس اسلوب دیکھیں ہم
۵۶۔ پیتا ہوں یادِ دوست میں ہر صبح و شام جام
۵۷۔ کرے ہے عشق کی گرمی سے دل آنند آتش میں
۵۸۔ لڑیں ہیں کیوں ترے مژگاں و ابروِ یار آپس میں
۵۹۔ قیس کی آوارگی ہے دل میں سمجھو تو کہوں
۶۰۔ عاشق ترے ہم نے کیے معلوم بہت ہیں
۶۱۔ کر دے ہے مہر بد کیں افلاک ایک پل میں
۶۲۔ آپ کو تو گو سمجھتا ہے کہ وہ دانا نہیں
۶۳۔ اتنا ستم نہ کیجے مری جان جان جان
۶۴۔ جاتا ہوں ترے در سے بس اے یار رہا میں

۶۵ - بہار اس کی نہیں لگتی ہے اک پاسنگ آنکھوں میں

۶۶ - امید ہوگئی کچھ گوشہ گیر سی دل میں

۶۷ - دل کو یہ آرزو ہے صبا کوے یار میں

۶۸ - بلبل کہیں، پتنگ کہیں اور ہم کہیں

۶۹ - مت پھر تو ساتھ غیر کے، آ مان، ہر کہیں

۷۰ - یاد میاں اب دل میں تیری وے باتیں نہیں آتی ہیں

۷۱ - آنکھوں کو ٹک سنبھالو یہ مارتی ہیں راہیں

۷۲ - چاہ کے غرق تجھے ہے یہ گماں ترتے ہیں

۷۳ - اس سرو قد کی دوستی میں کچھ ثمر نہیں

۷۴ - امیدِ وصل جز طمع خام کچھ نہیں

۷۵ - مجھے معلوم یوں ہوتا ہے میری بھی پھنسی آنکھیں

۷۶ - دماغ اصلاح دینے کا نہیں کہہ دو ہلالی کو

۷۷ - چہ بے گنہ چہ گنہگار یہ نہ ہو وہ ہو

۷۸ - یوں نہ چاہے گا دلِ آگاہ یہ ہو وہ نہ ہو

۷۹ - حالِ دل پوچھے ہے کیا مجھ سے مرا اے یار تو

۸۰ - لہو اس چشم کا پوچھے سے ناصح بند کیوں کر ہو

۸۱ - کر دکھا تیغِ نگہ نے دل فگار آئینے کو

۸۲ - تمھارے فہم میں پیارے جو ہم ہیں غیر یوں سمجھو

۸۳ - لینے لگا ہے اب تو مرا نام گاہ گاہ

۸۴ - نہ وے عاشق نہ وے معشوق جن میں ہو نہ کچھ خامی

۸۵ - بولا وہ جسے تیری تصویر نظر آئی

۸۶۔ یار کا جلوہ مرے کیا شہرۂ آفاق ہے
۸۷۔ سنگ پہ جبیں کو ٹپکو گر صدا منظور ہے
۸۸۔ میں تجھ سے کہہ نہیں سکتا سخن اے یار نازک ہے
۸۹۔ کیا کہیے جو اس شوخ کی اوقات ہوئی ہے
۹۰۔ محیطِ دل ہوئی اے شوخ تیری چاہ پھرتی ہے
۹۱۔ جرم کے عفو کی تدبیر بہت اچھی ہے
۹۲۔ عاشق تھا کبھی تجھ پہ پھر دل تو وہی ہے
۹۳۔ کیا کہیے اپنا حال جو کچھ ہے سو ہے سو ہے
۹۴۔ گزشتہ حسن کا اب تک نشان باقی ہے
۹۵۔ کیا کہیے وہ بت آہ کس آئین تمکیں ہے
۹۶۔ دل جنسِ فروشندۂ بازارِ ہنر ہے
۹۷۔ پھوٹے وہ آنکھ جس میں نہ ذرہ بھی نم رہے
۹۸۔ ناصح جفائے عشق اگر میں سہی سہی
۹۹۔ بیمار کی آج اپنے سرِشام خبر لے
۱۰۰۔ اے تڑپ جبین تو بسمل کو کہیں تل بھر دے
۱۰۱۔ دنیا تمام گردشِ افلاک سے بنی
۱۰۲۔ جب اس چمن سے چھوڑ کے ہم آشیاں چلے
۱۰۳۔ جاتے ہیں لوگ قافلے کے پیش دیس چلے
۱۰۴۔ یار جس سے خوش رہے مجکو وہ آئیں چاہیے
۱۰۵۔ یا تو جاتے رہے اے یار ہمیں دنیا سے
۱۰۶۔ نہ تیرے پاٹ دامن کا نہ اس کی آستیں ڈوبی

۱۰۷۔ بیوفائی کیا کہوں دل ساتھ تجھ محبوب کی

۱۰۸۔ معتقد ہرگز نہیں ہیں کفر اور اسلام کے

۱۰۹۔ کہوں کیا بات اس بے پیر دل کی

۱۱۰۔ صورت ہمیں اُس مہر کی پہچان اگر آوے

۱۱۱۔ لاکھ طوفاں بجہاں ہم کو فلک دکھلاوے

۱۱۲۔ وہ غل ہے جس کا موجب تو ہے ورنہ شور بہتیرے

۱۱۳۔ یارب کہیں سے گرمیٔ بازار بھیج دے

۱۱۴۔ جب سے کہ چشم خلق صنم تجھ سے جا لگی

۱۱۵۔ مری آنکھوں میں یار و اشک ایسا موج مارے ہے

۱۱۶۔ ہم کو حنا جو قتل کر اور آپ بچ رہی

۱۱۷۔ "مطلعات" کے تحت کلیات سودا مرتبہ آسی میں یہ مطلع بھی ہے۔

کسو نے روم لی قسمت میں کوئی شام لے آیا
ہمیں لے کچھ نہ آیا ایک تیرا نام لے آیا

قائم کا شعر

نسخۂ آسی میں یہ شعر بھی شامل ہے۔

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

یہ شعر نسخۂ رچرڈ جونسن میں نہیں۔ جبکہ پوری غزل موجود ہے۔ یہ شعر دراصل محمد قیام الدین قائم کا ہے۔ انھوں نے مخزنِ نکات میں اپنے ترجمے میں یہ شعر نقل کیا ہے!

۱۔ مخزنِ نکات، ص ۷۹

اور ان کے دیوان میں بھی یہ شعر موجود ہے[1]۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ نسخۂ حبیب میں بالکل اسی مفہوم کا یہ شعر ہے۔

کعبہ ڈھا تو غم نہ کر اے شیخ بت شکن،
دل برہمن کا ہے کہ بنایا نہ جائے گا

یہ شعر کسی اور مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخے میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ میرا خیال ہے کہ قائم کے شعر کی مقبولیت دیکھ کر سودا نے اپنا یہ شعر قلم زد کر دیا ہوگا۔

مجذوب کا کلام

کچھ اشعار ایسے ہیں جو مطبوعہ کلیات سودا میں بھی ملتے ہیں اور بعض تذکرہ نگاروں نے انھیں میرزا غلام حیدر مجذوب سے منسوب کیا ہے۔ مطبوعہ نسخۂ سودا میں یہ غزل ہے۔

ہم نے بھی دیر و کعبہ سے دن چار کی ہوس

یہ غزل سودا کے کسی معتبر دیوان میں نہیں ہے۔ میر حسن نے اس غزل کا ایک شعر

گھر امن کا اسی کو ملا آسماں تلے
جس نے جہاں میں آن کے مسمار کی ہوس

مجذوب کے نام سے درج کیا ہے[2]۔ جس کا مطلب ہے کہ یہ غزل مجذوب کی کی ہے۔ مگر یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ مجذوب کا دیوان کہیں نہیں ملتا۔

۱۔ دیوان قائم، مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام، دہلی، ۱۹۶۳، ص ۷

۲۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۷۱

وہ غزل جس کا مطلع ہے۔

خاک وخوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں
اے فلک باتیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں

میر حسن[۱]، قاسم[۲] اور سرور[۳] نے یہ غزل مجذوب سے منسوب کی ہے۔
مطبوعہ کلیاتِ سودا میں یہ دو شعر ہیں۔

چاہو مدد جو غیر سے اغیار کے لیے
تو میں بھی یار کم نہیں دو چار کے لیے
طوبیٰ تلے میں بیٹھ کے روؤں گا زار زار
جنت میں تیرے سایۂ دیوار کے لیے

میر حسن[۴]، قاسم[۵]، سرور[۶] اور قدرت اللہ شوق[۷] نے یہ دونوں اشعار مجذوب کے نام سے درج کیے ہیں۔

کب کسی دل سوختہ سے ساز کرتی ہے حنا
ان دونوں ہاتھوں پہ تیرے ناز کرتی ہے حنا

۱۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۱۷۱
۲۔ مجموعۂ نغز، ۲، ص ۱۵۵
۳۔ عمدۂ منتخبہ، ص ۶۶۴
۴۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۱۷۰
۵۔ مجموعۂ نغز، ۲، ص ۱۵۵
۶۔ عمدۂ منتخبہ، ص ص ۶۶۴ - ۶۶۵
۷۔ طبقات الشعرا (قلمی) ورق ۱۶۸ ب

یہ غزل نسخۂ حبیب اور نسخۂ رچرڈ جونسن دونوں میں نہیں ہے۔ قدرت اللہ شوق نے اس غزل کے دو اشعار مجذوب کے ترجمے میں نقل کیے ہیں۱ جس کا مطلب ہے یہ غزل مجذوب کی ہے۔

فتح علی شیدا

مطبوعہ کلیات میں غزل جس کا مطلع ہے

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

سودا کے ایک شاگرد فتح علی شیدا کی ہے۔ میر حسن نے شیدا کے نمونۂ کلام میں اس غزل کا مطلع اور ایک شعر نقل کیا ہے۲ عشقی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ میر حسن یہ غزل شیدا کی بتاتے ہیں۔ لیکن بعض اہل سخن ذوقی سے منسوب کرتے ہیں۳ ان دونوں میں سے یہ کس کی غزل ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ البتہ یہ سودا کی نہیں ہے۔ کلیاتِ سودا میں ایک اور غزل ہے۔

میں تو ملوں گا ناصح باتیں یہ تینوں جان کے
گو کہ عدو ہیں خوبرو دل کے جگر کے جان کے

قاسم نے یہ غزل مجذوب سے منسوب کی ہے اور لکھا ہے کہ میں نے یہ غزل کلیاتِ سودا میں بھی دیکھی ہے۔ اغلب ہے کہ غلطی سے اس میں شامل ہو گئی ہو یا ممکن ہے کہ واقعی سودا کی ہو۴

۱۔ طبقات الشعرا (قلمی) ورق ۱۶۸ ب

۲۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۹۷

۳۔ دو تذکرے (عشقی)، ۲، ص ۲۸

۴۔ مجموعۂ نغز، ۱، ص ۳۵۶

انعام اللہ خاں یقین

مطبوعہ کلیات سودا میں ایک غزل ہے۔ جس میں یہ تین شعر بھی شامل ہیں۔

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے
اپنا ہی تو فریفتہ ہووے، خدا کرے
قاتل ہماری لاش کی تشہیر ہے ضرور
آیندہ تا کوئی نہ کسو سے وفا کرے
خلوت ہو اور شراب ہو، معشوق سامنے
زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

ان تینوں شعروں کے ساتھ بہت دلچسپ معاملہ ہے۔ کلیاتِ سودا میں نو شعروں کی غزل ہے۔ جس میں یہ اشعار ہیں۔ دیوان یقین میں پانچ شعروں کی غزل میں یہ اشعار ہیں۔ دونوں کے پہلے دو شعر بالکل اسی طرح ہیں البتہ تیسرے شعر کا پہلا مصرع سودا کے ہاں اس طرح ہے۔

گر ہو شراب و خلوت و محبوب خوب رو

میر نے نکات الشعرا میں یہ شعر "بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے" سودا کے ذکر میں نقل کیا ہے۔[1] فتح علی حسینی گردیزی نے سودا کے ترجمے میں اس غزل کے چار شعر دیے ہیں جن میں دو شعر یہ بھی ہیں: "قاتل ہماری نعش کی تشہیر ہے ضرور" اور "گر ہو شراب و خلوت و محبوب خوب رو"[2]، نسخہ حبیب

۱۔ نکات الشعرا، ص ۳۹

۲۔ تذکرہ ریختہ گویان، ص ۷۹

میں یہ پوری غزل موجود ہے۔ مگر نسخۂ رچرڈ جونسن میں نہیں۔ سودا نے ایک مخمس میں اس غزل کو تضمین کیا تھا جس میں یہ تینوں شعر بھی موجود ہیں۔ اور یہ مخمس کلیاتِ سودا میں شامل ہے۔ یہ تمام شہادتیں اس حق میں ہیں کہ یہ تینوں اشعار سودا کے ہیں۔ اس کے برعکس یہ تینوں اشعار یقین کی ایک غزل میں بھی موجود ہیں! یقین پانچ اشعار کی غزل کہتے تھے۔ یہ غزل بھی پانچ اشعار کی ہے۔ مطبوعہ دیوان کے علاوہ میں نے دیوانِ یقین کے جتنے بھی قلمی نسخے دیکھے ہیں ان میں یہ اشعار موجود ہیں۔ مزید برآں یہ کہ لچھمی نرائن شفیق نے تینوں شعر یقین کے نام سے درج کیے ہیں۲ اور لکھا ہے کہ فتح علی خاں نے یہ دو شعر اور میر نے مطلع سودا کے ترجمے میں لکھا ہے مگر میں نے یقین کے اکثر دیوانوں میں یہ اشعار دیکھے ہیں۔ واللہ اعلم۔ لیکن "یک بستگی" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار یقیناً یقینؔ کے ہیں۔ جو کوئی ان دونوں صاحبان کی طرزِ سخن گوئی سے واقف ہے وہ دونوں کی زبان پہچانتا ہے۔ (فارسی سے ترجمہ)۳

میر تقی میر

مطبوعہ کلیاتِ سوداؔ میں مطلعات کے تحت یہ مطلع بھی دیا گیا ہے۔

اعجاز منہ تکے ہے ترے لب کے کام کا
کیا ذکر ہے مسیح علیہ السّلام کا

۱۔ دیوانِ یقین، مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ، علی گڑھ، ۱۹۳۰ء، ص ۴۹

۲۔ چمنستانِ شعرا، ص ۱۹۵

۳۔ ایضاً

یہ مطلع میر تقی میر کا ہے اور ان کے دیوانِ سوم میں موجود ہے!

شیخ قلندر بخش جرأت

کلیاتِ سودا میں "افراد" کے تحت جو اشعار دیے گئے ہیں۔ اُن میں مطلع جرأت کا ہے۔

کل جو بیٹھا پاس میں اک جا ترے ہم نام کے
رہ گیا بس نام سنتے ہی کلیجہ تھام کے[۲]

قصائد

۱۔ نسخۂ آسی میں ایک قصیدہ "مثنوی در تعریف چاہ مومن خاں" بھی شامل ہے۔ یہ قصیدہ احسن اللہ خاں بیاؔن شاگرد مرزا مظہر جانجاناں کا ہے۔ میری نظر سے دیوانِ بیان کے دو قلمی نسخے گزرے ہیں۔ یہ قصیدہ دونوں میں موجود ہے[۳]۔

ہجویات

۲۔ "مثنوی در ہجو فدوی متوطن پنجاب کہ در اصل بقالِ بچہ بود" کلیاتِ آسی میں شامل ہے۔ میر حسن[۴]، علی لطف نے اس کا مصنف میر فتح علی شیدا کو بتایا ہے۔ ابوالحسن امیر الدین نے شیدا کے ترجمے میں لکھا ہے کہ انھوں نے

۱۔ کلیات میر، مرتبہ عبدالباری آسی، لکھنؤ، ۱۹۴۸ء، ص ۳۷۴

۲۔ کلیات شیخ قلندر بخش جرآت، لکھنو، ۱۸۸۳ء، ص ۱۵۲

۳۔ دیوان بیان (قلمی) آصفیہ اور دیوانِ بیان (قلمی) سالار جنگ

۴۔ تذکرہ شعراے اردو، ص ۱۲۰

۵۔ تذکرہ گلزارِ ابراہیم مع تذکرہ گلشن ہند، ص ۱۹۰

سودا کے حریف فدوی لاہوری کی ہجو میں ایک مثنوی لکھی ہے۔ جو فدوی کے ترجمے میں نقل کی جائے گی[1]۔ لیکن فدوی کے ترجمے میں یہ ہجو نہیں دی گئی۔ بظاہر ابوالحسن کا اشارہ اسی ہجو کی طرف ہے۔ شیخ چاند نے بہت تفصیلی بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ یہ مثنوی فتح علی شیدا کی ہے[2]۔ لیکن مصحفی اسے سودا ہی کی تصنیف بتاتے ہیں[3]۔ قاضی عبدالودود کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ سودا کی تصنیف ہے[4]۔ یہ مثنوی رچرڈ جونسن میں بھی شامل ہے اور اس میں یہ دو شعر اس طرح ہیں۔

حضرت سودا تملک جو مرے استاد ہیں
شعر پہ ان کے بھی اب ان کو یہ ایراد ہیں

بس چل اب آگے نہ کہہ کچھ انھیں شیدا خاموش
کیجے اس سے سخن ہووے جسے عقل و ہوش

یہ دونوں شعر اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ یہ مثنوی فتح علی شیدا ہی کی ہے۔

۳۔ مثنوی در ہجو تخ میرزا فیضو"
جس کا پہلا شعر ہے۔

۱۔ تذکرہ مسرت افزا بحوالہ معاصر، حصہ ۷، ص ۱۱۵

۲۔ سودا، ص ص ۱۱۱ - ۱۱۲

۳۔ تذکرہ ہندی، ص ۱۶۶

۴۔ سویرا، ۲۹، ص ۵۱

آہ واویلا ز دستِ روزگار
توش خانوں میں یہ غم ہے روبکار

یہ ہجو سودا کے کسی معتبر کلیات میں نہیں۔ لیکن کریم الدین نے سودا کے ترجمے میں نقل کی ہے[1]۔ جو غلط ہے۔ دراصل اس کے مصنف احسن اللہ خاں بیآن ہیں۔ یہ ہجو اُن کے قلمی دیوان میں موجود ہے[2]۔

بعض تذکرہ نگاروں نے احسن اللہ خاں بیآن کے ترجمے میں اس مثنوی کا ذکر کیا ہے[3]۔

۴۔ "مسدس در ہجو مرزا علی" اس کا پہلا بند ہے۔

اک قصہ میں سنا تھا مردم سے یہ قضا را
بیت الخلا گیا تھا مرزا علی بچارا
ناگاہ کھڈی اوپر گیدڑ نے جا پچھاڑا
تب رو کے اُس جگہ پر لونڈی کے تئیں پکارا

دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدا را
دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

کلیاتِ سودا کے مطبوعہ نسخے میں اس مخمس کے تین بند موجود ہیں۔ لیکن یہ میر حسن کا مخمس ہے اور ان کے قلمی دیوان میں پورا نقل ہوا ہے[4]۔

۱۔ طبقات الشعرا، کریم الدین، ص ۱۰۳

۲۔ دیوان بیان (قلمی) سالار جنگ

۳۔ مثلاً تذکرۂ شعرائے اُردو، ص ۲۷ — مجموعۂ نغز، ۱، ص ۱۲۴ وغیرہ

۴۔ دیوان میر حسن (قلمی) رام پور

۵۔ مخمس جس کا پہلا مصرع ہے۔

نشو و نمائے باغ جہاں سے رمیدہ ہوں

سودا کا نہیں۔ اگرچہ مطبوعہ کلیات میں شامل ہے۔ نسخۂ حبیب اور نسخۂ رچرڈ جونسن میں بھی یہ مخمس نہیں ہے۔ قیام الدین قائم نے سودا کے شاگرد بندرابن راقم کے ترجمے میں اس مخمس کے سات بند نقل کیے ہیں[1]۔ غالباً غلط فہمی کی وجہ سے سودا کی غزل ہے جسے راقم نے اس مخمس میں تضمین کیا ہے۔

۶۔ مخمس جس کا پہلا مصرع ہے

ہے کشو بجشو ہو کیوں مجھ دل افگار کے ساتھ

اس میں قائم کی غزل تضمین کی گئی ہے لیکن مقطع میں سودا کا نام ہے۔ اس مخمس کا مصنف کون ہے یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ نسخۂ حبیب اور نسخۂ رچرڈ جونسن دونوں میں یہ مخمس نہیں ہے۔ جب تک کسی معتبر ذرائع سے تصدیق نہیں ہو جاتی۔ اسے سودا کی تصنیف نہیں کہا جا سکتا۔

رباعیات

۷۔ یہ رباعی احسن اللہ خاں بیان کی ہے۔

کیا زلف میں اس شوخ کے تھی دیکھی صبح
جوں شام سے ہوتی ہے کسی شب کی صبح
جب زلف کو میں ہاتھ لگایا ادھر
ہمسایہ پکارا کہ ہوئی کب کی صبح

یہ رباعی نسخۂ حبیب اور نسخۂ رچرڈ جونسن میں نہیں۔ جبکہ دیوانِ بیاںؔ

۱۔ مخزن نکات، ص ص ۵۷، ۵۸

میں موجود ہے![1]

۸۔ افسوس کہوں میں کس سے اپنے گھٹ کی
قالب سے پھرے ہے روح بھٹکی بھٹکی
اس آنکھ نے جین جی سے کھویا سوداؔ
یہ خانہ خراب جس سے اٹکی اٹکی

یہ رباعی بھی دونوں قلمی نسخوں میں نہیں ملتی جبکہ مطبوعہ نسخے میں شامل ہے۔ قدرت اللہ شوقؔ نے اسے غلام حیدر مجذوبؔ کے ترجمے میں نقل کیا ہے۔[2]

مثنویاں

۹۔ مثنوی تعریف چھڑی۔ جس کا پہلا شعر ہے۔

ہوتی ہے دنیا میں جو کچھ تحفہ چیز
سب سے ہے سوداؔ کو یہ لاٹھی عزیز

میر حسن اسے فضل علی ممتازؔ شاگردِ سوداؔ کی تصنیف بتاتے ہیں۔ انھوں نے ممتازؔ کے ترجمے میں لکھا ہے "یک مثنوی مسمّیٰ بہ لاٹھی نامہ خوب گفتہ کہ سلسلۂ او را تا بہ عصائے کلیم رسانیدہ" اور اس مثنوی کے کچھ اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ پہلا شعر اس طرح ہے۔

ہوتی ہے دنیا میں جو کچھ تحفہ چیز
سب سے ہے ممتازؔ کو لاٹھی عزیز[3]

۱۔ دیوان بیاںؔ (قلمی) سالار جنگ

۲۔ طبقات الشعرا، ورق ۱۶۷ الف

۳۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۶۰

علی ابراہیم مستانہ کے کلام کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں "مثنوی در تعریف لاٹھی بہ بحر مخزن اسرار گفتہ، نکرش استوار ست"۔ ابراہیم نے بھی مثنوی کے اشعار نقل کیے ہیں[1]!

قیام الدین قائم کی سات مثنویاں کلیات سودا میں شامل ہو گئی ہیں۔ دیوان قائم[2] کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور اور ایک انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔ میں نے صرف رام پور کا نسخہ دیکھا ہے۔ جس میں یہ تمام مثنویاں موجود ہیں۔ انڈیا آفس لائبریری کے نسخے کے لیے نثار احمد فاروقی کے ایک مقالے سے استفادہ کیا گیا ہے[3]۔ یہ تمام مثنویاں قائم کی ہیں۔

۱۰۔ مثنوی در ہجو موسم سرما

سردی اب کی برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

۱۱۔ حکایت

سلف کے زمانے کا تاریخ داں
یہ لکھتا ہے احوالِ وارفتگاں

۱۲۔ حکایت

سنا ہے کہ اک مرد آزادہ طور
جز اپنے نہ رکھتا تھا اسباب اور

۱۔ گلزار ابراہیم مع گلشن ہند، ص ۲۳۶

۲۔ دیوان قائم (قلمی) رامپور

۳۔ مثنویات قائم چاندپوری، نقوش، لاہور، دسمبر ۱۹۶۱ء، ص ص ۲۵۳-۲۶۱

۱۳- حکایت

سنا جائے ہے ایک بوہس کا حال
کہ رکھتا تھا نت کیمیا کا خیال

۱۴- حکایت

الٰہی شعلہ زن کر آتشِ دل
تپ دل دے بقدر خواہشِ دل

۱۵- در ہجو طفل پتنگ باز

ایک لونڈا پتنگ کا ہے کھلاڑ
دور ہیں اوس کے ...... ہیں ہزار

یہ مثنوی نسخۂ مصطفائی (ص ص ۱۴۷ - ۱۴۸) میں شامل ہے۔ لیکن آسی میں نہیں۔

۱۶- حکایت

سنا ہے کہ ایک مردِ اہلِ طریق
نہایت ہی واقع ہوا تھا خلیق

یہ مثنوی بھی نسخۂ مصطفائی (ص ص ۱۶۰ - ۱۶۱) میں شامل ہے۔ لیکن آسی میں نہیں۔

آسی میں اٹھارہ مرثیے ایسے ہیں جن میں مہرباں خاں نام بطور مصنف آیا ہے۔ بظاہر یہ مہرباں خاں رند ہیں۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ میر سوز ان کو اشعار کہہ کر دیا کرتے تھے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں دیوانِ رند کا ایک نسخہ ہے۔ جس میں وہ تمام اشعار ہیں جو دیوان میر سوز میں موجود ہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ سودا نے مہربان خاں کے نام سے مرثیے کہے ہوں اور بعد میں اپنے دیوان میں شامل کر لیے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور نے کہے ہوں اور

غلطی سے کلیاتِ سودا میں شامل ہو گئے۔ بہرحال مزید تحقیق کے بغیر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ مرثیے کس کے زائیدۂ فکر ہیں۔ زیر بحث مرثیے یہ ہیں۔

۱۔ کہتا ہے غم ہمیں نہ کسی دم سے پوچھیے
۲۔ لگا وطن سے جو ہونے رواں حسین غریب
۳۔ کرتی ہیں بانو یہ زاری یا رسول
۴۔ غم ہے مجنوں حسین و دل عالم وادی
۵۔ گیا گودی میں جب مرجھائے اصغر
۶۔ مقبول حق ہے جس کو کچھ غم حسین کا ہے
۷۔ ہائے وے حیدر کے پیارے کیا ہوئے
۸۔ سن اے گردوں اگر تو دوں نہ ہوتا
۹۔ ہے ایک روایت ز روایات پُر از غم
۱۰۔ کافراں آلِ محمد پہ ستم کیا کیتا
۱۱۔ اے قوم ٹک سنو تو بھلا ہائے ہائے
۱۲۔ بانو یوں کہتی ہیں سرور کیا ہوا
۱۳۔ ماں اصغر کی کہتی ہے رو رو بچے کے سو جانے کو
۱۴۔ کیوں مضطرب الحال نسیم سحری ہے
۱۵۔ بنتِ نبی فاطمہ کہتی ہیں اے ذوالجلال
۱۶۔ رو وے وہ آل نبی سے جسے محبت ہے
۱۷۔ دل خیر النسا جس دم کراہا
۱۸۔ دل جو پوچھا میں اپنے کیوں نہیں ہے تجکو چین

سوداؔ کا غیر مطبوعہ کلام

اس عنوان کے تحت سوداؔ کا ایسا کلام یکجا کیا گیا ہے جو نسخۂ حبیب اور نسخۂ رچرڈ جونسن میں موجود ہے لیکن کسی مطبوعہ کلیات میں نہیں ملتا۔ اس میں مزید دو قلمی نسخوں کے زائد اشعار بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ ان دونوں نسخوں کا تعارف قاضی عبدالودود نے کرایا ہے۔ پہلا نسخہ ۱۲۱۲ فصلی میں کتابت ہوا تھا۔ اس پر قاضی صاحب کا مضمون (سویرا، ۲۹) میں شائع ہوا تھا۔ اس نسخے کا حوالہ "نراین" کے نام سے دیا گیا ہے۔ دوسرا نسخہ خدابخش لائبریری پٹنہ کا ہے (خدابخش) اس پر قاضی صاحب کا مضمون (نوائے ادب، جولائی ۱۹۶۱ء) شائع ہوا تھا۔ میں نے اصل نسخے نہیں دیکھے بلکہ انھیں مضامین سے استفادہ کیا ہے۔

اشعارِ غزلیات

۱۔ سونپا ہے کیا جنوں نے گریباں کو مرے
لیتا ہے اب حساب جو یہ تار تار کا (حبیب، رچرڈ جونسن، خدابخش)

۲۔ جو کہ ظالم ہو وہ ہرگز پھولتا پھلتا نہیں
سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کبھو شمشیر کا (حبیب، رچرڈ جونسن، خدابخش)

۳۔ آتی ہے تجھ گلی سے پریشاں صدائے آہ
شاید کسی کا شیشۂ دل چور ہو گیا (رچرڈ جونسن، حبیب میں یہ غزل نہیں)
مصطفائی اور آسی میں اسی قافیے کا دوسرا شعر ہے جو رچرڈ جونسن

میں نہیں۔ شعر یہ ہے۔

جا ہی بھرا تھا اس صفِ مژگاں سے دل مرا
پر زخم یہ اٹھائے کہ بس چور ہو گیا

۴۔ کن نے دیکھا نہ تجھے یوں کہ گلی میں تیری
ہاتھ اپنے وہ سروسینہ پہ مارا نہ کیا (رچرڈ جونسن، حبیب میں یہ غزل نہیں)

مصطفائی اور آسی میں ایک غزل کا مقطع ہے

جلاتی ہے جگر بن یار اتنا مے خوری سودا
پیے ہیں جام گویا بزم میں احباب آتش کا

حبیب میں یہ مقطع دوسرا ہے۔

۵۔ ہوا ے رنگ پہ میرے نہ چھوٹے کیوں کے اے سودا
جلے ہے داغ دل ایسا کہ جوں مہتاب آتش کا (حبیب)

مصطفائی اور آسی میں ایک مقطع ہے۔

پروانہ شمع رو پہ کیونکر نہ ہووے سودا
شعلے کے گرد پھرنا کب کام ہے مگس کا

حبیب میں اسی قافیے کا دوسرا مقطع ہے۔

۶۔ سودا کے سوزِ دل کو بے سوزِ دل نہ سمجھے
پروانے کا سمجھنا کیا ہوش ہے مگس کا (حبیب)

۷۔ اگر دنیا میں اب یوں نہیں سجن رسم وفا ہوگا
تو کس امید پہ کوئی کسی سے آشنا ہوگا (رچرڈ جانسن، حبیب)

جو یہ منظور ہے تم کو مرا دل لے کے جی لینا،
گیا ایک مجھ سا دنیا سے تیرے صدقے گیا ہوگا (رچرڈ جانسن، حبیب) (کذا)

۸۔ یہاں تک میرے مشہد سے ہے تشنہ لبی پیدا
اوس سمت جو ہو گذرا جلاد بہت رویا (حبیب)

۹۔ نخلِ حیات اپنا گلشن میں باغباں نے
بویا تو تھا ہوس کر، لیکن نہ بار آیا (حبیب)

۱۰۔ کعبہ ڈھا تو غم نہ کر اے شیخ بت شکن
دل برہمن کا ہے کہ بنایا نہ جائے گا (حبیب)

۱۱۔ سودا سے یہ کہا میں "دل اس طرح سے کھونا؟"
کہنے لگا کہ "ناداں، کیا پوچھتا ہے ہونا؟" (نراین)

۱۲۔ گر سلطنت سلیماں ہے گی محیطِ عالم
ہم نے بھی اپنے دل کا گھیرا ہے ایک کونا (نراین)

حسبِ ذیل غزلیں صرف نراین میں ہیں۔

۱۳۔ لہو ہے جوش میں، خونخوار سے یہی کہنا
اجل تو یار کی تلوار سے یہی کہنا

۱۴۔ عیب ڈرے ہے، بہر وجہ رو بہ صحت ہے
طبیبِ عشق کے بیمار سے یہی کہنا

۱۵۔ صبا میں کیا کروں؛ نہیں چھوڑتا مجھے صیاد
قفس میں بند ہوں، گلزار سے یہی کہنا

۱۶۔ نہ جی کو امن، نہ دل کو ہے چین اے قاصد
پیام جا کے مرے یار سے یہی کہنا

۱۷۔ غرورِ حسن سے گر اپنے وہ سنے نہ یہ بات
تو اس کے تو در و دیوار سے یہی کہنا

۱۸- بہار جاتی ہے ساقی پہنچ تو مے لے کر
زبانی سودا کے خمار سے یہی کہنا

۱۹- پہلو سے میرے صبح وہ دلدار اٹھ گیا
روزِ وصال کرکے شبِ تار اٹھ گیا

۲۰- آہ و فغاں کی آج جو آتی نہیں صدا
شاید ترا جہاں سے یہ بیمار اُٹھ گیا

۲۱- لائق نہ تھا یہ سینہ ترے زخمِ تیغ کا
پر اس طرف بھی ہاتھ ترا یار اُٹھ گیا

۲۲- بدنام تو عبث مجھے کرتا ہے ناصحا
مدّت ہوئی بتوں سے سروکار اُٹھ گیا

۲۳- تو رہ جہاں میں اے گل گلزار کیا ہے غم
مجھ سا جو تیرے کوچے سے اک خار اٹھ گیا

۲۴- غیروں کو دیکھ بیٹھے ہوئے بزم میں تری
جب کچھ نہ بس چلا تو میں ناچار اُٹھ گیا

۲۵- وعدے سے پھیر دینے کو دل لے گیا تھا شوخ
سودا نے جب کہ مانگا کر انکار اُٹھ گیا

۲۶- تمنا کی انکھیاں نے سجن ہمنا کا دل جھٹ پٹ لیا
کیونکر ملے ہمنا کو وہ اب ظالماں نے بٹ لیا

۲۷- دستا نہیں کوئی اور سو ہمنا کو ست کاں جائیں ہم؟
سب جگ کے اب خوباں ننیں ہمنا ننن کو چھٹ لیا

۲۸- ہمنا کو ناصح مت ڈرا جیو جان کے جانے سیتی
جب اس گلی میں پگ رکھا پہلے ہمن سر کٹ لیا

۲۹۔ وہ دل کہ قیمت جس کی میں ملتا تھا ہمنا کو دو جگ
افسوس ظالم نے نپٹ مولاں میں ہم سے گھٹ لیا
۳۰۔ مستی ہمن کو اس سبب زیادہ رقیباں سے ہوئی
جب لے چکا پیالہ سجن اس کا ہمن تلچھٹ لیا
۳۱۔ مجلس میں عشاق کی اس شوخ نے مدھ کی جگہ (کذا)
دل کے رکت کا گھونٹ پر گھونٹ آن کر غٹ لیا (کذا)
۳۲۔ زلفاں کو ساجن کی ہمن سودا یہ دل دیتے بنی
وہ بالکاں کیا تھے ہیں آخر اسے کر لٹ لیا
۳۳۔ آنکھوں سے جب کہ آنسو گلرنگ ہو کے نکلا
سینے سے میرے نالہ دل تنگ ہو کے نکلا
۳۴۔ کیا دل پر اپنے سختی ایام کی کہوں میں
سمجھا تھا جس کو شیشہ وہ سنگ ہو کے نکلا
۳۵۔ یاں تک خیال دل میں اس زلف کا گٹھا ہے
آنسو تلک زمیں سے شبرنگ ہو کے نکلا
۳۶۔ دشمن جو اس کلا ہے، اس دلربا کا کوچہ
آیا جو اس گلی میں چت بھنگ ہو کے نکلا
۳۷۔ راہ طلب میں ماندا چل دو قدم ہوا یہ
گویا کہ میں ہزاروں فرسنگ ہو کے نکلا
۳۸۔ زاہد بہت ہی نازاں تھا صومعے پر اپنے
میخانہ دیکھ میرا وہ دنگ ہو کے نکلا
۳۹۔ کہتے تھے ہم تو، سودا کر پاس آبرو کا
آخر تو اس کے گھر سے بے ننگ ہو کے نکلا

۴۰۔ سانجھ کو آئے تھے گلشن میں، سویرا نہ لیا
باغباں باغ میں، ہم تیرے بسیرا نہ لیا
۴۱۔ عشق لایا تھا دل و دیں تلک اس کی نذر
جی سوا حسن نے کچھ یار کے میرا نہ لیا
۴۲۔ پہنچ کر منزلِ مقصود کو تو نے افسوس
آسرا دیکھ کے دیوار کا ڈیرا نہ لیا
۴۳۔ غیرتِ عشق میں دل دے کے کوئی لیتا ہے؟
ہم سے گو یار نے سو بار اسے پھیرا، نہ لیا
۴۴۔ آج کس منہ (سے) تو کرتا ہے بڑائی سودا
ان نے اب تک تو کبھی نام بھی تیرا نہ لیا
۴۵۔ اوس مکھڑے کے حضور کسے بھاوے آفتاب
یہ دل لگو نہیں، گرمی کہاں پاوے آفتاب (حبیب، رچرڈ جانسن
خدابخش، نرائن)

یہ غزل صرف نراین میں ہے اور کسی نسخے میں نہیں۔

۴۶۔ آہِ سوزاں نے کیا داغ جگر آخرِ شب
شمع کا تا بہ قدم پہنچے ہے سر آخرِ شب
۴۷۔ پوچھتے کیا ہو مرے دیدہ تر کا احوال
شام کو اشک ہے تو خون جگر آخرِ شب
۴۸۔ خون ہوں رشک سے ظالم کہ ترے کو میں نسیم
کرے ہے بھر کے دمِ سرد گزر آخرِ شب
۴۹۔ ساقیا جام کو دے غسل کہ ہے صبح کو عید
پہنچی اس ماہ کی آ مجھ کو خبر آخرِ شب

۵۰۔ یار سودا سے کہے ہے تیں ہوں کس طرح، کہ وہ (کذا)
گھورے ہے مجھ کو باندازِ دگر آخرِ شب[۱]

۵۱۔ بہا دریائے خوں مجھ چشم سے یاں تک کہ مژگاں کی
لگی ہے ملنے یارو پنجہ مرجان بیں صورت (حبیب، نراین)

۵۲۔ جب تک ہے جہاں میں گل و گلزار سلامت
یارب وہ رہے گوشۂ دستار سلامت (حبیب، خدابخش)

یہ تین شعر صرف نراین میں ہیں۔

۵۳۔ ہاتھ سے جس کے گریباں ہے مرا چاک پرست
آستیں اس کی نہیں دیدۂ نمناک پرست

۵۴۔ اس قدر داد طلب کس کی ہے خو سے ظالم
کہ گریباں ہے شعلے کا سدا چاک پرست

۵۵۔ ناتوانی کا ہماری نہ ہو جہاں شرح و بیاں
برق واں آن کے ہووے خس و خاشاک پرست

یہ غزل صرف خدابخش میں ہے۔

۵۶۔ کرتا ہوں تیرے ظلم سے ہر بار الغیاث
یکبار تیرے دل میں نہیں کار الغیاث

۱۔ اس زمین میں میر سوز کی بھی غزل ہے۔ مقطع کا دوسرا مصرع سوز اور سودا دونوں کے ہاں موجود ہے۔ میر سوز کا مقطع ہے۔

سنیو کہتا ہے رہوں سوز کے گھر کیونکر واہ
گھورے ہے مجھ کو بہ اندازِ دگر آخرِ شب

۵۷- تیری نگہ کو دیکھ کے گردش میں آسماں
کرتا پھرے ہے شعبدہ دور الغیاث (کذا)

۵۸- مغرور حسن کا ہے تجھے یہ کہاں خبر
یعنی کہ کون ہے پسِ دیوار الغیاث

۵۹- سودا میں کہتا ہوں کہ یہ پرہیز عشق سے
رسوا ہے کیوں تو کوچہ و بازار الغیاث

۶۰- ترکِ خوباں کیوں کہ ہو مجھ سے کہ ان کا ناصحا
رشتۂ الفت جگر میں ہے سلیمانی کی طرح (رچرڈ جونسن)

۶۱- پاؤں پڑنے میں ہے کیا لطف کسی کے خونخوار (کذا)
سر پہ رہ خلق کے ہو کر گل و گلزار کی طرح (حبیب)

۶۲- شور رہتا ہے میرا کوچے میں تیرے چار فصل
یہ جنوں کب ہے بہاری اور دیوانے کی طرح (حبیب)

۶۳- نوخطاں کی ہے سدا حق میں ہماری یہ دعا
کیجو یارب تو اس آغاز کا انجام سفید (رچرڈ جونسن، نراین)

۶۴- چاندنی دیکھے جو وہ کر کے در و بام سفید
ماہ بھی بزم میں اس کی ہو پھر اک جام سفید (نراین)

۶۵- یہ زندگی میری وحشت کا ننگ ہے صیاد
قفس مجھے ترے جنگل سے تنگ ہے صیاد (حبیب، رچرڈ جونسن، نراین[۱])

۱- قاضی عبدالودود نے نسخۂ نراین سے تین شعر نقل کیے ہیں۔ اس میں یہ مطلع بھی ہے۔

اشکِ گلگوں کو نہیں لعل و گہر سے پیوند وہ رکھے ننگ سے نسبت یہ گہر سے پیوند

یہ غزل سودا کی نہیں بلکہ مرزا احسن علی احسن کی ہے۔ کیونکہ یہ مطلع گلشن بے خار (ص ۲۱) عمدۂ منتخبہ (ص ۵۷)

۶۶۔ ٹک اس برس تو کر آزاد، پھر سمجھ لینا
چمن میں اب کے عجب آب و رنگ ہے صیّاد (حبیب، رچرڈ جونسن، نراین)

۶۷۔ شیخ ٹک چشمِ عشق سے کر سیر
کعبہ سے کم نہیں ہمارا دیر (حبیب، رچرڈ جونسن)

۶۸۔ دیوے تھا غیر کو زکوٰۃِ حسن
میں کہا کیا ہے کہنے لاگا خیر (حبیب، رچرڈ جونسن)

یہ تین شعر صرف نراین میں ہیں۔

۶۹۔ کی تھی تجھ پاس نہ آنے کی تو تدبیر بزور
پر لے آئی مجھے آخر کو یہ تقدیر بزور

۷۰۔ یہ خدا ساز ترا صفحۂ رو ہے، ورنہ
کب مصور سے کھنچے ناز کی تصویر بزور

۷۱۔ سخت بیدل ہوں کہ جکڑی ہے تری الفت کی
عشق ظالم نے مرے پاؤں میں زنجیر بزور

یہ اشعار صرف نراین میں ہیں۔

۷۲۔ دھوم سے سنتے ہیں اب کے سال آتی ہے بہار
دیکھیے کیا کچھ ہمارے سر پہ لاتی ہے بہار

۷۳۔ شاید عزمِ یار کی گلشن میں پہنچی ہے خبر
گل کے پیراہن میں پھولی نہیں سماتی ہے بہار

اور سخن شعرا (ص ۱۳) میں احسن کے ترجمے میں نقل ہوا ہے۔ کلیاتِ سودا کے کسی معتبر نسخے میں یہ غزل نہیں ملتی۔

۷۴۔ دیکھنے دے باغباں اب گلستاں اپنا مجھے
خانۂ زنجیر میں ہمساں بلاتی ہے بہار
۷۵۔ شور یہ غنچوں کی واشد کا نہیں اے عندلیب
اب چمن میں طمطراق اپنا دکھاتی ہے بہار
۷۶۔ کیوں پھنسا گلشن میں یوں جاکر عبث اے عندلیب
میں نہ کہتا تھا کہ اے وہ دیکھ آتی ہے بہار
۷۷۔ جھومتی گلشن میں اب کے سال آتی ہے بہار
سبزی خط سے تری شاید کہ ماتی ہے بہار
۷۸۔ آج آتی ہے صبا سیتی مجھے بوئے گلاب
کیا کسی بلبل کا دل شاید جلاتی ہے بہار
۷۹۔ ہر گھڑی ٹپکے ہے شبنم برگ برگ گل سیتی (کذا)
کر دوانا ہم کو اب لشوے بہاتی ہے بہار
۸۰۔ ہر پرِ بلبل پہ جلوہ ہے پرِ طاؤس کا
اب کے کیا نیرنگ گلشن میں دکھاتی ہے بہار
۸۱۔ کس کی آنکھوں کے نشے سے آج ماتی ہے بہار
اس برس نرگس پہ کیا دھومیں مچاتی ہے بہار
۸۲۔ سیج پر پھولوں کی ظالم مجھ کو ہو ہے بے کلی
گل نہیں، تجھ بن انگاروں پہ لٹاتی ہے بہار
۸۳۔ دل پرویا تو ہے تجھ زلف میں ہم نے لیکن
تاب گوہر کی نہ لاوے گا یہ تار آخر کار (رچرڈ جونسن)
آسی میں ایک غزل کا مقطع ہے۔

نسیم اس باغ میں سودا نہیں پاتی گذر اب تو
رکھے ہے رخت گل کو غنچہ بغچے بیچ تہ تہ کر
لیکن رچرڈ جونسن میں یہ مقطع اس طرح ہے
۸۴۔ بہار اس باغ سے رکھتی ہے کیا عزم سفر سودا
جو رخت اپنا چمن میں غنچہ نے رکھا ہے تہ تہ کر
۸۵۔ آہ کیوں کرتے ہو اس کے تئیں ناحق تہِ تیغ
آخر اے سنگدلاں سمجھو تو جاں رکھتی ہے شمع (حبیب)
یہ غزل رچرڈ جونسن اور خدابخش دونوں میں ہے۔
۸۶۔ خط کے آنے پہ بھی وہ ملتا نہیں ہو سینہ صاف
گرد سے ہوتا تو ہے یارب ہر اک آئینہ صاف
۸۷۔ خوش کوئی ناداں ہوا، دوراں سے تو کیا گو کہ ہو
غم سے دل طفل دبستاں کا شب آدینہ صاف
۸۸۔ چشم کم سے تیرہ بختوں کی نہ دیکھ افتادگی
سایہ چڑھ جاتا ہے تا بام فلک بے زینہ صاف
۸۹۔ جمع زر کرنے سے اپنی سربلندی تو نہ چاہ
لے گیا قاروں کو تا تحت الثریٰ گنجینہ صاف
۹۰۔ عکس خوب و زشت جوں یکساں ہے آئنہ کے بیچ
دوست و دشمن سے ہے یوں اپنا دل بے کینہ صاف
۹۱۔ گو کیا ہم آپ کو دنیا کے او بھیڑے سے پاک
یہ گلھڑی جو یار کی دل میں ہے وہ تو کی نہ صاف

۹۲۔ شیخ کی داڑھی کو سودا رند تو کہتے ہیں پشم
مجھ کو اون کے منہ پہ آتا ہے نظر پشمینہ صاف

۹۳۔ اس کارواں کا بار ہے گویا کہ دردِ دل
آواز ہر جرس کی ہے جوں آہِ سردِ دل (حبیب، خدابخش)

۹۴۔ کرتی ہے قطع مزرعہ امید تیغِ یاس،
اے تف ہے فلک تجھے کچھ بھی ہے دردِ دل (حبیب، خدابخش)

۹۵۔ چشمِ خورشید کو غرفے سے تیرے دن سروکار
رات ہے دیدۂ شبنم کو لبِ بام سے کام (حبیب)

۹۶۔ تیرے آگے اوسے خورشید کا مونہہ خوش نہیں آتا
چمن سے ورنہ کیوں جاتی رہی وقتِ سحر شبنم (حبیب)

۹۷۔ ظاہر میں دیکھنے کا کچھ اسباب ہی نہیں
آوے مگر وہ خواب میں سو خواب ہی نہیں (حبیب، رچرڈ جونسن، نراین، خدابخش)

۹۸۔ سجدہ کروں نہ کیوں کے تری تیغ کے تلے
ایسی نمازِ عشق کو محراب ہی نہیں (حبیب، رچرڈ جونسن، نراین، خدابخش)

۹۹۔ مجھ کو نہیں ہے دل میں ترے راہ کیا کروں
پر بے اثر ہے عشق مرا آہ کیا کروں (رچرڈ جونسن، نراین، خدابخش)

۱۰۰۔ سن کر ہزار شکل میرا حال یوں کہا
تو تو کسی طرح نہیں دل خواہ کیا کروں (رچرڈ جونسن، نراین، خدابخش)

۱۰۱۔ لہو کا تیرے ہے یہ تشنہ لب کہ ہوئے ہی آبِ رواں کو تب
کوئی بلبلا نہ میں دیکھا اب کہ وہ جوششِ لبِ جو نہیں (حبیب)
یہ غزل صرف خدابخش میں ہے۔

۱۰۲- ہوئیں پشتِ لب پہ جب سے سوار مونچھیں
گلے سے نیزہ بازی کرتی ہیں یار مونچھیں

۱۰۳- جوں کرک سبزہ واری کی ناک پیچ پر ہو
عفت پہ کر رہی ہیں ایسی بہار مونچھیں (کذا)

۱۰۴- زیادہ اس سے تم بڑھا کر اب قہر کیا کروگے
جھینگر کی شکل ہیں تو کاندھوں کی بار مونچھیں

۱۰۵- جتنا کوئی اکھاڑے اکھڑے نہ پشم ان کی
حق نے تمھیں دیے ہیں کیا استوار مونچھیں (کذا)

۱۰۶- کلا نھا تو بنا قد ہے تمام ڈنڈی (کذا)
کھونڑ چہ ہے ناک منہ پر اور ہینگی تار مونچھیں (کذا)

۱۰۷- بائیں سپید رکھو اور داہنے سیہ تم
ہینگی عجب طرح کی لیل و نہار مونچھیں

۱۰۸- نظر آتی ہیں بن ساقی چمن میں تاک کی چھا ہیں
روئیں آ باغباں باہم گلے میں ڈال کے باہیں (حبیب، نراین)

۱۰۹- کشمیر سی جاگہ میں ناشکر نہ رہ زاہد
جنت میں تو اسے گیدی مارے ہے کیوں لاتیں (حبیب)

۱۱۰- تارِ نگاہ و سوزنِ مژگانِ یار بن
اپنا جو دل پھٹے تو کسی سے رفو نہ ہو (رچرڈ جونسن)

۱۱۱- فرصت کہاں کہ ربط کریں گل سے اے نسیم
ہیں اس چمن میں آشنا ایک تیرے دم کے ساتھ (حبیب)

۱۱۲- جو ہے جلا جلوں کا ہے غم خوار وہ کوئی
بالیں پہ شمع رات کو میرے بہت روئی (حبیب، رچرڈ جونسن، نراین)

۱۱۳- تیری صفائے رنگ کو پہنچا نہ ایک برگ
شبنم نے گرچہ عارض گل سے بہت دھوئی (حبیب، رچرڈ سن، نرائن)

۱۱۴- میری آنکھوں میں تو بستا مجھے تو کیوں رلاتا ہے
سمجھ کر دیکھ تو اپنا کوئی بھی گھر جلاتا ہے (حبیب)

۱۱۵- ہم بھی کبھی دکھاویں گے ندیوں کو اپنی موج
جو کچھ بھری ہے دل میں گر آنکھوں کی رہ بہی (حبیب، نرائن)

۱۱۶- خالی خمیں کر اٹھ گئے اس بزم سے حریف
بیٹھے ہیں ایک شیشۂ دل ہم بھرے ہوئے (حبیب)

۱۱۷- افسردگی ہماری مت دیکھ چشم کم سے
شمشیر کی طرح سے یہ دل بجھا ہوا ہے (حبیب)

یہ دو غزلیں صرف نرائن میں ملتی ہیں۔

۱۱۸- ہمیں کسی سے کر اظہار درد دانائی
کہی نفس ہے بہ تقریب سرد دانائی

۱۱۹- کسی کی ہے مہ نو داد خواہ ابرو پر
کہ شہر شہر ملے منہ کو گرد دانائی

۱۲۰- جلوں ہوں رشک سے میں شعلہ ساں گلی میں تری
جو رنگ کاہ نظر مجھ کو گرد دانائی (؟)

۱۲۱- نہ پوچھ حال ہمارا کہ ایسی باتوں کی
کوئی سنے سے ترے دل کو درد دانائی ؟

۱۲۲- خبر دل اپنے کی پوچھے ہے اس سے جا سودا
تری گلی سے جو یہ رہ نورد دانائی

۱۲۳- کشور میں حسن کے ہیں احکامِ شاہ اُلٹے
ہم کرتے ہیں بگنہ یار عذر گناہ اُلٹے ؟

۱۲۴- اثبات خوں پہ میرے، دیتے جو تھے گواہی
منہ دیکھتے ہی اس کا بولا گواہ اُلٹے

۱۲۵- کب بیٹھنے وہ دے ہے محلس میں اپنی ہم کو
گھر سے گئے جو سیدھے، کر یک نگاہ اُلٹے

۱۲۶- رنداں یہ کر رہے تھے افسوس کیا کہے مرد
گھر کو پھر آئے جس دم ہو کر تباہ اُلٹے

۱۲۷- سوداؔ تو اس کی خوبی مت کہہ کسو کے آگے
اپنے لیے بیاد اب تو مت بساہ اُلٹے

اشعارِ ذیل فردیات کے تحت نراین میں دیے گئے ہیں۔ بقول قاضی عبدالودود صاحب ان میں دوسرے شعرا کے بھی اشعار ہیں۔

۱۲۸- کفن میرے پہ یارو یہ لکھانا
کسو سے دل کو کوئی مت لگانا

۱۲۹- دل کو سمجھاؤں ناں، ستاتا ہے
اس کو کچھ مت کہو دوانا ہے

۱۳۰- دل ہوا شوخ سے جا یار خدا خیر کرے
بے طرح کا ہے ستم گار خدا خیر کرے

۱۳۱- سرمہ دے کر نہیں رجھاتے ہو
کیا سجن تو تیا لگاتے ہو

۱۳۲- پیالہ برہ کا جب سے پیا ہم کو پی گیا
اس کے نشے کی بات کہوں کیا کہ جی گیا

۱۳۳۔ دل کو تو ہر طرح سے دلاسا دیا کروں
آنکھیں تو مانتی نہیں ہیں اس کو کیا کروں

۱۳۴۔ ہر ایک کی پاؤں کی آواز سے جیتے ہیں
اس وعدے کی شب ہم کس انداز سے جیتے ہیں

۱۳۵۔ لگ چلنے کو تو آتے ہیں مجھ کو ہنر گئی
پر نازِ خو سے یار کی ہیں دل میں ڈر گئی

۱۳۶۔ چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
حیف ہے یہ زندگی جو تم کہیں اور ہم کہیں

۱۳۷۔ دن تو تیرے ہی تصور میں گزر جاتا ہے
رات کو خواب میں بھی تو ہی نظر آتا ہے

۱۳۸۔ ہم تمھارے ہجر میں، تم غیر پاس
ہم کہاں اور تم کہاں، کیا قہر ہے

مثنوی در قصۂ عشق پسر شیشہ گر بزرگر بطور ساقی نامہ

اسی کا جلوہ حسن زلف مہ رد
اسی کی نافۂ آہو میں ہے بو

اس شعر کے بعد رچرڈ جونسن اور خدا بخش میں یہ شعر زائد ہے

۱۳۹۔ کسی جا خلوت مریم کی ہو شمع
کسی جا بر سر تہمت وہ ہو جمع

مثنوی کا ایک شعر ہے۔

وہ بارہ ہیں ستونِ عرشِ اعظم
رہا ہے سب کچھ ان کی ذات سے تھم

اس شعر کے بعد رچرڈ جونسن اور خدا بخش میں یہ شعر زاید ہے۔

۱۴۰- کروں ایسے ہوں جب حامی محشر
بیاد ساقی و ساغر سخن سر

مثنوی میں یہ شعر ہے۔

تجھے بھی ہو کہیں الفت تو آ دیکھ
یہ تخمِ عشق کی نشو و نما دیکھ

اس شعر کے بعد خدا بخش میں ۱۷ اشعار اور ہیں جو مطبوعہ نسخوں میں نہیں۔

۱۴۱- محبت کا کھلا ہے آخر شس باغ
ہوا گل سے جگر لالے کا یوں داغ

۱۴۲- کہ جیسے آگ لگ کر اک شرر سے
جلے ہے دوسرا گھر ایک گھر سے

۱۴۳- نہ حاصل عشق کی دولت ہو بے رنج
کہ ہے مارِ سیہ کے سامنے گنج

۱۴۴- جب اس نے یہ بلا سر اپنے پر لی
دل زرگر پسر میں تب جگہ کی

۱۴۵- کرشمہ تھا یہ الفت کے اثر کا
کہ دل پگھلا دیا زرگر پسر کا

۱۴۶- گداز ایسا ہوا دل کھا تب و تاب
کھٹائی میں طلا جیسے کہ ہو آب

۱۴۷- نہ دن کو چین اسے نے شب کو آرام
نہ تھا جز نالہ و فریاد کچھ کام

۱۴۸- اسی حالت میں اک دن یہ گیا سو
بہ خواب آیا نظر وہ آئینہ رو

۱۴۹- کہ یوں کہتا ہے وہ اس سے بصد درد
دل گرم اپنے سے بھر کر دم سرد

۱۵۰- محبت کا مری تجھ میں اثر ہے
تجھے کچھ حال سے میرے خبر ہے

۱۵۱- سخن میرا (یہ) شکوے سے نہیں ہے
کہ دور اس امر سے شکوہ کہیں ہے

۱۵۲- کرے گو شمع داغ اس کا سراپا
پتنگے کو شکایت سے نہیں جا

۱۵۳- جو مہ سے ہے جگر ٹکڑے کتاں کا
اسے شکوہ نہیں اپنے زیاں کا

۱۵۴- ہوا ہے یہ گلستاں جب سے ایجاد
ترانہ گل کو ہے بلبل کی فریاد

۱۵۵- وہی اے دوست میرا مدعا ہو
مرے حق میں جو کچھ تیری رضا ہو

۱۵۶- میری زنجیر پا میں جو کڑی ہے
محبت تیری ہی میں یہ گھڑی ہے

۱۵۷- مجھے خاک آپ کو باد سحر جان
جدھر تو چاہے مجھ کو پیشتر جان

قطعات

در مضحکہ مشتمل بر تاریخ (رچرڈ جونسن)

۱۵۸- بچشم و چراغ جن کے ملا کٹھیر کے تھے
نابود کی خدا نے جس دن وہ قوم ساری

۱۵۹- ملا نے وہ جو دشمن تھے آل سے نبی کے
لایا تعصب اون کا سر اون کے پہ یہ خواری

۱۶۰- یوں مومنوں کے دل میں حق کی طرف سے گزرا
مغز ان کا جوتیوں سے جھاڑو کہ ہیں یہ ناری

۱۶۱- تب سات سات جوتی ہر ایک کے لگائی
اور مولوی عمر کو دو اگلی سب سے ماری

۱۶۲- ہاتف نے بہر تاریخ اوس دم پڑھا یہ مصرع
کیا مولوی عمر کو ہوئی ہے کفش کاری

۱۶۳- حسن تو بس پردہ نہانست و نہاں نیست
چوں شعلۂ فانوس عیانست و عیاں نیست

۱۶۴- با سپہاں چنیں روکش نسازم نالہ را
ورنہ ایں از عہدہ افلاک می آید بروں

۱۶۵- ہم نشیں حال دلم از گریۂ من ظاہر است
آستیں تا می نکانم خاک می آید بروں

قصیدے

در منقبت امیر المومنین (رچرڈ جونسن)

۱۶۶۔ جوہری ہوئے جو بازارِ سخن کا سو کہے
قدر و قیمت میں ہیں باہم یہ رقم چاروں ایک

اس شعر کے بعد یہ شعر ہے۔

۱۶۷۔ شیشے موتی سے نہیں کام کسو کے ان کو
ہو کے اس بات پہ کھاتے ہیں قسم چاروں ایک

قصیدہ در مدح حضرت امام ضامن

کہاں سے پردۂ ظلمات بیچ جا کر خضر
شراب عمر ابد سے یہ زندگی پاتا

اس شعر کے بعد یہ شعر ہے۔

۱۶۸۔ شرار آب میں رہتے ہیں گوہر آتش میں
زبسکہ امن تیرے عدل نے جہاں میں کیا

قصیدہ در مدح شجاع الدولہ

حافظ یہ چاہے عہدے سے اوس کے بر آؤں میں
پیادے کو دے کے تین روپے نو روپے سوار

اس کے بعد یہ شعر ہے۔

۱۶۹۔ کہتے تھے اوس کو حافظ زر دوست خلق میں
رکھتا تھا نادہندی میں ایسا وہ اشتہار

در مدح نواب آصف الدولہ (رچرڈ جونسن)

وہ جو تیرے کمان کی ہے سپر
کس کو اس کو اٹھانے کا مقدور

اس کے بعد یہ شعر ہے۔

۱۷۰- یاد میں جس کی تیرگی آوے
کوہ نظروں میں خانۂ زنبور

قصیدہ در مدح نواب آصف الدولہ (رچرڈ جونسن)

اپنی تری جناب میں اتنی ہی عرض ہے
کس کس کا ملتجی ہوں کہا کر ترا غلام

اس شعر کے بعد یہ شعر ہے۔

۱۷۱- مت رکھ روا یہ مجھ پہ کہ عمال کے تئیں
تیری سلامتی میں کروں مجرہ و سلام

ہجوِ ساجد (رچرڈ جونسن)

عدو میرا جو ہوا دشمن خدا ہے وہ
خدا کی دشمنی کرنا تو عین ہے الحاد

اس شعر کے بعد جونسن میں سات شعر ہیں۔

۱۷۲- مگر یہ کہتے ہیں اکثر تمھارے یاں کذّاب
ہوئی ہے اس لیے حضرت سے یہ حدیث ارشاد

۱۷۳- نکاحِ تازہ کی دل میں علی کی خواہش تھی
نبی نے بیٹی کی رنجش کی دیکھ یہ بنیاد

۱۷۴- حدیث یہ کہی تا سن کے اس کو باز رہے
علی اس امر سے اور فاطمہ کا دل ہو شاد

۱۷۵- سو یہ لکھا نہیں اوس جا لکھے جہاں یہ حدیث
پیمبر اپنے یہ بہتاں میں سمجھے ہوں گے خوار

۱۷۶۔ کیا میں فرض جو یوں بھی بقول ان کے ہو
نبی کے حق میں جو کہتے ہیں یہ بغیر اسناد

۱۷۷۔ خدا شعور دے تو وہ اسی کو غور کریں
کہ جب علی کے سنانے کو ہووے یوں ارشاد

۱۷۸۔ تو وائے ان پہ جن اشخاص سے سوائے علی
گیئں ہوں فاطمہ دنیا سے لے کے دل میں عناد

قصیدہ در مدح رچرڈ جونسن

۱۷۹۔ دیکھا نہ جائے اس سے روئے گلرخاں پہ رنگ
غنچے کے بھی دہن سے ہے چشمِ زمانہ تنگ

۱۸۰۔ شیشہ نہ توڑے شہ کی مئے عیش کا فقط
کاسہ پہ بھی گدا کے یہ وارد کرے ہے سنگ

۱۸۱۔ گر خاک سے اوٹھا کے یہ دیوے کسی کو اوج
سو یوں کہ جیسے چیونٹی کو پر دے ہے یہ کوڈھنگ

۱۸۲۔ اس کے حسد کی تلخی کا اب کیا کروں بیاں
پہنچے جو شہد لب تئیں کر دے اسے شرنگ

۱۸۳۔ مشتِ صدف میں قطرہ کو کرتا ہے یہ گہر
جد یا کو بھیجے اس کے سوئے کلّہ نہنگ

۱۸۴۔ جو ولولہ ہے اس کا سو فتنہ ہے اس کے ساتھ
خالی نہیں فساد سے اس کی ہے جو ترنگ

۱۸۵۔ پہنچاتے یہ کرے نہ فلک تک کسی کو دیر
اور اس کو کچھ ٹپکتے زمیں پر نہیں درنگ

۱۸۶- ہے یہ زمانہ اور جو اہلِ زمانہ ہیں
اون کا جہاں میں چشمِ مروت کا ہے یہ رنگ
۱۸۷- مفلس پدر ہو اور پسر جس کا ہو غنی
بیٹے کو باپ کی ولدیت سے آئے ننگ
۱۸۸- پس اب کوئی کسو سے رکھے کس طرح امید
بیٹے کا باپ سے ہو زمانے میں جب یہ ڈھنگ
۱۸۹- ہے اب مگر وہ ایک کہ جس کا یہ ہے خطاب
ممتاز دولہ فخرِ جہاں و حسام جنگ
۱۹۰- پا جائے شکل جو ہر نگہ اس کی سی جلا
سینے پہ آئینے کے اگر چھا رہا ہو زنگ
۱۹۱- جوہر سے گو کہ چار ہی عنصر کے سب ہیں خلق
جلوے کو اوس کے دیکھ ہیں جوہر شناس دنگ
۱۹۲- دل مدح غائبانہ سے حاصل نہیں سرور
مت کر حضور جا کے ثنا کرنے میں درنگ
۱۹۳- تیری وہ ذات، گو تو نہیں ہے شہ فرنگ
کرسی میں تیری پائیہ اورنگ کا ہے ڈھنگ
۱۹۴- باعث یہ تیرے دست کرم کا ہے دہر میں
خالی جو دُر سے لے کے چمن سے ہیں تا بہ گنگ
۱۹۵- خوں میں عدو کی تیغ کی تیری شناوری
ہے اس طرح کہ بحر میں پیرے ہے جوں نہنگ

۱۹۶- سائے تلے سپر کی ترے جس کو ہو پناہ
اودھر نہ رو کمانِ فلک کا کرے خدنگ

۱۹۷- سرعت یہ بادِ پا کی تیری جس کے سامنے
موج ہوا ہے اسپ ہوا کے قدم میں لنگ

۱۹۸- تو وہ خلیق لذّت شہد آئے کام میں
چکھئے بیان خلق میں تیری اگر شرنگ

۱۹۹- شائق کی جائے ہر بن مو چشم ہو اگر
تب اس کے دل سے نکلے تیرے دید کی امنگ

۲۰۰- دور از ادب ہے طول سخن اس کے اب عوض
سودا نکال دل کی دعائیہ سے امنگ

۲۰۱- یارب تمام دوست رہیں تجھ سے فیضیاب
جاری ہے جب تلک کہ جہاں بیچ آبِ گنگ

تہنیت عید (رچرڈ جونسن)

۲۰۲- صباح عید ہے دل ہیں خوشی سے مالا مال
مے طرب سے ہیں سب مست اپنے اپنے حال

۲۰۳- جو کوئی خلقت انساں سے ہے بزیر فلک
مصمم آج کے دن دل میں اوس کے ہے یہ خیال

۲۰۴- کہ پہنچے اس درِ دولت سرا پہ لے کے نذر
جو تجھ جناب میں مقبول ہو خوشا احوال

۲۰۵- کوئی تو سیم، کوئی زر، کوئی گہر، کوئی لعل
ہر ایک ہے شرف اندوز یہاں بایں منوال

۲۰۶- ہوا ہے بندہ بھی حاضر در سخن سے کر
پئے حصول سعادت بدر گہہ اقبال

۲۰۷- اگرچہ تو ہے مسمّی بآصف الدولہ
ترا فزود سلیماں سے بھی ہے جاہ و جلال

۲۰۸- تری تجلّی طالع ہے وہ کہ چرخ اوپر
غلام داغی ہے اختر کا تیرے بدر کمال

۲۰۹- علوئے جاہ کے آگے ترے نہیں کچھ قدر
کسو طرح کا کوئی نذر یہاں کرے زر و مال

۲۱۰- مگر یہ نذر ہے شایاں اس آستاں کے ہی
نشاط عید جو لایا ہے عشرۂ شوال

۲۱۱- یہی جناب میں حق کی دعا ہے سودا کی
جہاں ہو جب تئیں اے میرے قبلہ آمال

۲۱۲- رہے محبّوں پہ سایا ترا سپر کی طرح
سدا بخونِ عدو تیغ جوں شفق میں ہلال

قصیدہ تاریخ بنائے مسجد در فارسی (رچرڈ جونسن)

۲۱۳- باعندلیب گلشن ایماں برابر است
گلبانگ مرغ خامہ ام اللہ اکبر است

۲۱۴- دارم من از لباس حرم صوف در مداد
ہر سو کہ او رواں شود اسلام رہبر است

۲۱۵- بر صفحہ پائے خامۂ من کج نمی فتد
کز رشتۂ محبتِ حق تار مسطر است

۲۱۶- بین السطور او که بهر صفحه نقش زد
از چاک جیبِ صبح سعادت منور است

۲۱۷- حرف زبان کلکِ من از کثرتِ جلا
نخوییست بر ورق چو در آئینه جوهر است (؟)

۲۱۸- در خاطرم چو جلوه دهد شاهدِ خیال
می بینمش که جامۂ احرام در بر است

۲۱۹- چشمم اگر به سبزه خط تباں فتد
بے آهوے حرم به نظر نوک نشتر است

۲۲۰- بازوے شاهباز خیالم که در هواست
بر مرغ رو به قبله نشیں سایه گستر است

۲۲۱- از استماع نظم کلامم دریں مقام
هر رند جبّه در بر و عمّامه بر سر است

۲۲۲- ریشمش ز حدِّ شرع بروں آنقدر که شیخ
او را بدست گیرد و گوید دُم خر است

۲۲۳- زاهد چه دانست تشنۂ حرفم بقول کس
چوں گوش روزه دار بر الله اکبر است

۲۲۴- چوں محتسب سوار شود در رکاب او
سنگے برائے شیشه به دست قلندر است

۲۲۵- شادی غرّه رمضاں زیر آسماں
نزد مغاں ز غرّه شوال خوشتر است

۲۲۶- بینی بہ زیر ابروے پیوستہ بتاں
در چشم خلق جلوۂ محراب و منبر است

۲۲۷- تا بشنود بہ مدرسہ بانگ وصلوٰۃ را
شد در پے معالجہ گر برہمن گر است (؟)

۲۲۸- خواہاں سبحہ بسکہ بود خلق دانہ اش
از دُرِ شاہوار بہ قیمت گراں تر است

۲۲۹- در فکر بوریاست گدا از پئے نماز
مصروف بر عمارت مسجد تونگر است

۲۳۰- دیدیم تازہ مسجد نورانی کرد (کذا)
در اقتباس نور مہ و مہر و اختر است

۲۳۱- آبے کہ ریختند بہ تعمیر آں مکاں
پیداست از صفاش کہ او آب گوہر است

۲۳۲- ہر سنگ او ز عکس کواکب بہ وقتِ شب
در چشم روزگار ز ترصیع بہتر است

۲۳۳- یا رب چہ مسجد است کہ گرد حریم او
ارواح اولیائے مکمل کبوتر است

۲۳۴- فرماں روا مسیح بہ معمار آں بناست
دل را فزاے او کہ چنیں روح پرور است ؟

۲۳۵- آید صدا ز گنبدش از جنبش نسیم
بنگر کہ شان رفعتم از عرش برتر است

۲۳۶- دل را تعجب است کہ گلدستہ ہائے او
ہم در بہار و ہم بہ خزاں تارہ و تر است
۲۳۷- وصف کتابہ اش چہ نویسم کہ در نظر
چوں سر نوشت صاحب ایماں منور است
۲۳۸- حاجت دراں حرم بہ فروغ چراغ نیست
شب تا سحر تجلّی حق شمع منبر است
۲۳۹- فی الفور می رسد بدر خانۂ قبول
آں جا برائے مرغ دعا فیض شہپر است
۲۴۰- بر سطح او مقابل محراب حوض نیست
چشم پر آب جانب ابروئے دلبر است
۲۴۱- دیدم چو عکس قبّۂ زرّینِ او در آب
پنداشتم کہ مہر بہ کوثر شنادر است
۲۴۲- کرسی او ز مرتبہ انبیا بلند
صحنش بہ وسعت کرم حق برابر است
۲۴۳- جاردب صحن شکل خطوط شعاعیست (؟)
جاروب کش بہ صورت سلطانِ خاور است
۲۴۴- ہر چند جاے رفتہ بسے دیدہ ام ولے
دل را ازاں صفا کہ بر و دید باور است
۲۴۵- آیند در شمار نگہہ (کذا) ذرّہ ہائے خاک
عکسے اگر دراں ز ہوائے مکدّر است

۲۴۶- چاہے بایں لطافت وخوبی بہ کنج اوست
آبش چناں قریب کہ با لب برابر است

۲۴۷- مردم بہ گرد او ہمہ وقت از پے وضو
چوں صورت صفِ مژدہ دیدۂ تر است

۲۴۸- نقاشی عمارت آں سجدہ گاہ خلق
در تازگی ز باغِ جناں ہم فزوں تر است

۲۴۹- نقاشِ او کہ رنگ طرازاست چوں بہار
کلکش بہر گلے کہ ز دیوار تا در است

۲۵۰- نوعے کشیدہ کردۂ موج نسیم صبح
بر عارض نگار چو زلف معنبر است

۲۵۱- بیروں ز حد وصف بود دستکاریش
ہر دم بہ کلک صنعتِ او صنع دیگر است

۲۵۲- ازبس دراں احاطہ صفا را بکار برد
مطلع بہ وصف او ز گہر ہم فزوں تر است

۲۵۳- یک سمت نقش لالہ و یک سو صنوبر است
از عکسِ یک دگر بہ قراین برابر است

۲۵۴- آنجا کسے کہ پیش نماز است وصف او
در گوش ہوش از ہمہ اوصاف بر تر است

۲۵۵- در فرض صبح وشام ز ہر سورہ خواندیش
نحوے بہ دل صدائے قرأت موثر است

۲۵۶۔ ہر کس کہ بود منکر قرآں شنید و گفت
لاشک کلامِ حق بہ زبانِ پیمبر است

۲۵۷۔ گویند عرشیاں کہ صدائے موذنش
درگوشِ ما ز نغمۂ داؤد خوشتر است

۲۵۸۔ خوش بلبلیست او کہ سحرگہہ ترانہ اش
در باغ دیں بہ مدح خدا و پیمبر است

۲۵۹۔ خوش لہجہ طوطیست خطبش کہ نطق او
بہر ضیافت صلحا شہد و شکّر است

۲۶۰۔ واعظ چہ واعظست کہ تاثیر حرف او
سدّ رہ صعوبتِ فردائے محشر است

۲۶۱۔ لاریب ہم چو خانہ بود خانۂ خدا
کانجا گدا و شاہ بہ یک سجدہ ہمسر است

۲۶۲۔ ہر کس دراں مقام دو رکعت نماز خواند
فردا با وصواب دو صد حج اکبر است

۲۶۳۔ ہر گہہ دو کعبہ گشت کند رو کدام سو
زیں وجہ مرغ قبلہ نما سخت مضطر است

۲۶۴۔ سوداؔ اگر کسے بہ قسم گوید ایں سخن
در رتبہ آں مکاں ز حرم پایہ کمتر است

۲۶۵۔ شخصے کہ واقفست ز شان بزرگیش
او را کے از زبان کس ایں حرف باور است

۲۶۶- بودم دریں خیال در آنجا کہ ظاہرا
با کعبہ ایں رواق مقدس برابر است

۲۶۷- ناگہ بہ سجدہ از پۓ تاریخ خاجیے (؟)
سر را نہاد و گفت کہ از کعبہ بہتر است

یہ رباعی صرف خدابخش میں ہے۔

۲۶۸- اے دوست پۓ دفع عدو میجوشی
وز غصہ شب و روز تو خوں مینوشی

۲۶۹- تا کشتن نفس خویش ممکن باشد
حیف است کہ بر کشتن دشمن کوشی

یہ پہیلی صرف خدابخش میں ہے۔

۲۷۰- ایک پرکھ کے انچھر تین
تین میں چار اوکن بہر بین

۲۷۱- اوہ اچھر بن من موہ ڈالے
مدھ اچھر بن بن جی کو پالے

۲۷۲- انت اچھر بن دیوے دکھ
سب اچھر سدول کو سکھ

خدابخش لائبریری میں کلیات سودا کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ جس میں فاخر مکیں کی ہجو میں سودا کی ایک مثنوی ہے۔ جو کسی مطبوعہ نسخے میں نہیں ملتی۔ مثنوی اردو میں ہے لیکن تمہید کے طور پر جو نثر ہے وہ فارسی میں ہے۔ قاضی عبدالودود نے اس کے بارے میں لکھا ہے۔

"اس کے ساتھ جو تمہید نثر ہے وہ بھی ظاہرا سودا کی

لکھی ہوئی ہے[1]۔"

برائے تنبیہ مرزا فاخر صاحب: مردم می گویند شخصے نقل می کرد کہ مرزا فاخر صاحب خود را برابر شیخ علی حزیں می شمارند، وتمام وضع نشست دبرخاست او را پیش گرفتہ اند، بلکہ خود را در فضل وکمال از و بہتر می دانند و اکثر اشعار فارسی اورا اصلاح می دہند، چناں چہ ایں بیت مثنوی حسبِ حال ایشانست، مثنوی در ہجو مرزا فاخر مکیں

۲۷۳۔ ایک نقل اس پہ مجھ کو آئی یاد
سچ ہو وہ یا کسی کا ہو ایجاد

۲۷۴۔ ایک ملّا بہ عہدِ شاہ جہاں
نہ تو عالم ہی وہ نہ ہیچ مداں

۲۷۵۔ بین بین اس کو سمجھ کچھ آتا تھا
لڑکے مکتب میں وہ پڑھاتا تھا

۲۷۶۔ بس کہ تھا وہ شعور سے معذور
لڑکے تھے اس سے خرم ومسرور

۲۷۷۔ اس سے دہشت کو بھی نہ دل میں راہ
صحن مکتب تھا ان کی بازی گاہ

۱۔ معاصر، حصہ ۱، ص ۲۷۔ اس مثنوی کے بارے میں قاضی صاحب لکھتے ہیں: "ایک مثنوی ایسی تھی جو کلیات مطبوعہ میں شامل نہیں اور جہاں تک مجھے علم ہے کہیں اور بھی نہیں چھپی۔ دتاسی نے فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ البتہ کیا ہے۔ جو اس کی تاریخ ادبیات ہندی وہندوستانی جلد ۱ (ترجمہ بقا) میں موجود ہے۔" قاضی صاحب کا خیال درست نہیں۔ یہ مثنوی جان شیکسپئر، منتخباتِ ہندی، لندن، ۱۸۲۵ء، ۲، میں شامل ہے۔

۲۷۸۔ ایک جو اُن میں تھا فہیم و ذکی
مصلحت اُن نے لڑکوں سے یوں کی

۲۷۹۔ یارو ہم کھیلے سو طرح کا کھیل
دیکھے ہم نے سبھی وہ بحبا کھیل

۲۸۰۔ کھیل اب میں نیا نکالا ہے
سارے کھیلوں سے وہ نرالا ہے

۲۸۱۔ لڑکے بولے بھائی جی فرماؤ
کیا ہے وہ کھیل تم ہمیں بھی بتاؤ

۲۸۲۔ کہا اس نے کہ بادشاہ و وزیر
لڑکے جو بنتے ہیں صغیر و کبیر

۲۸۳۔ اس میں چنداں تو یارو لطف نہیں
کھیل اس سے یہ خوب تر ہے کہیں

۲۸۴۔ میاں جی کو کسی طرح بھسلاؤ
مل کے شاہِ جہاں سب ان کو بناؤ

۲۸۵۔ ہنس کے وہ بولے ہوئے یہ کس طرح
کہا اس نے کہ تم سنو اس طرح

۲۸۶۔ صبح مکتب میں پڑھنے جو آئے
منہ میاں جی کا تک کے رہ جائے

۲۸۷۔ پوچھیں جو کیا ہے دیکھنے کا سبب
کہے قدرت خدا کی دیکھوں ہوں اب

۲۸۸- ہو گئی شب میں آپ کی صورت
کچھ سے کچھ حق کی ہے یہ کیا قدرت

۲۸۹- کیا کہوں میں کہ آج کیسی ہے
شکل شاہ جہاں کی جیسی ہے

۲۹۰- بحر حیرت میں ہوں یہ دیکھ کے غرق
سرِ مو کچھ رہا نہ باہم فرق

۲۹۱- پر یہ ہے شرط جائے جو اُن کے پاس
کہے کھا کھا قسم بلا وسواس

۲۹۲- تم تو سمجھو ہو ان کا عقل و شعور
بنیں گے جو بناؤ گے بہ سرور

۲۹۳- مطلب ان نے جو کچھ کہ ٹھہرائے (کذا)
لڑکوں سے بات سب وہ بن آئے

۲۹۴- نہ رہا اس کو یہ بنا یاں تک
شکل شاہ جہاں کی ہونے میں شک

۲۹۵- نہ کہ ٹھہرا ہے اس کے دل میں خیال (کذا)
ہو گا شاہ جہاں کا جب کہ وصال

۲۹۶- اس کے ارکاں نہ لا کے تاب فراق
میرے دیدار کو ہو سب مشتاق

۲۹۷- آئیں گے دیکھنے کو میرے گھر
بس مرے واسطے ہے یہ بہتر

۲۹۸- کہ میں پیدا کروں وہ خصلت وخو
خلق شاہ جہاں سمجھ مجھ کو

۲۹۹- کریں مجرا، سلام اور تسلیم
نہ کروں میں فرشتے کی تعظیم

۳۰۰- غرض آفاق میں جسے ہو عقل
سمجھے ان کے مطابق اب یہ نقل

۳۰۱- بنے یہ شیخ اپنے یوں بہ گماں
جیسے ملا بنا تھا شاہ جہاں

۳۰۲- شیخ کے سے نہ بخت ہیں نہ کمال
شیخ ہونا انھیں ہے امر محال[۱]

۱- اس مثنوی کے ساتھ جو تمہیدی نثر فارسی میں ہے۔ جان شیکسپیئر نے اس کا اُردو ترجمہ دیا ہے۔ " لوگ کہتے ہیں کہ ایک شخص نقل کرتا تھا کہ مرزا فاخر مکیں صاحب اپنے تئیں شیخ علی حزیں کے برابر جانتے ہیں اور سب وضع ان کی نشست و برخاست کی اختیار کی ہے بلکہ اپنے تئیں فضل و کمال میں ان سے بہتر جانتے ہیں اور اُن کے اکثر اشعار پر اصلاح کی ہے۔ چنانچہ یہ مثنوی حسب حال مرزا صاحب کے ہے۔" (منتخباتِ ہندی، ۲، ص ص ۱۹۱- ۱۹۲)

سوداؔ کے شاگرد

ہو کے استادِ دبستانِ سخن میں سوداؔ
شعر کے قاعدہ دانانِ جہاں پر آیا

شمالی ہند میں اُردو شاعری کی ابتدا ہی سے استاد کی بہت زیادہ اہمیت رہی ہے۔ ہر شاعر کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے عہد کے کسی استادِ فن کے سامنے زانوے ادب تہ کرے۔ استاد عروض و قوافی کے فن پر اچھا خاصا عبور رکھتا تھا۔ وہ فن شعر گوئی کے اصولوں سے شاگردوں کو واقف کرتا۔ استاد کی یہ اہمیت بیسویں صدی کے آغاز تک رہی۔ اور اس آخری عہد کے اہم ترین استادوں میں داغ، امیر مینائی اور سیماب اکبر آبادی ہیں۔ اٹھارویں صدی اور نصف انیسویں صدی میں تو متمول لوگ گھروں پر بچوں کی تعلیم کے لیے جو اتالیق مقرر کرتے اس کے فرائض میں فن شعر گوئی کی تعلیم بھی شامل تھی۔ کیونکہ اس دور کی تہذیب میں سخن گو ورنہ کم از کم سخن فہم ہونا ضروری تھا۔

اگر کوئی شاعر کسی استاد کا تلمذ اختیار نہ کرتا تو اس کی ادبی زندگی کے آغاز میں اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کے اشعار کم رتبہ اور پایۂ اعتبار سے ساقط سمجھے جاتے۔ ادبی معرکوں میں اسے "بے استادہ" ہونے کا طعنہ دیا جاتا۔ میر نے ذکر میر میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ انھوں نے کسی استادِ فن سے کسب کمال کیا تھا۔ البتہ سعادت علی نامی ایک معمولی سے شاعر کا ذکر کیا ہے جس نے انھیں ریختہ گوئی کی ترغیب دی تھی۔ مگر میر یہ بات اس وقت کہہ سکے تھے جب اُن کی استادی مسلّم ہو چکی

تھی۔ اور ان کا شمار صفِ اوّل کے ریختہ گو شعرا میں ہونے لگا تھا۔ ورنہ جب تک لوگوں کے دلوں پر اُن کی شاعری کا سکّہ نہیں بیٹھا تھا۔ انھیں جبراً و قہراً خانِ آرزو کو اپنا استاد کہنا پڑا تھا۔ تاکہ خان آرزو کے رعب سے مخالفین کے منہ بند رہیں!

ایسا ہی حادثہ غالب کے ساتھ گزرا تھا۔ ادبی معرکہ میں انھوں نے عبدالصمد نامی ایک ایرانی نژاد شخص کو اپنا استاد بتایا ہے۔ لیکن اب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ عبدالصمد کا کوئی خارجی وجود نہیں تھا۔ اس کی اختراع محض مخالفوں کو خاموش کرنے کے لیے کی گئی تھی۔

اٹھارویں صدی میں خان آرزو اور مرزا مظہر جانجاناں دو اہم فارسی شاعر ہیں۔ ان دونوں کی تربیت نے بڑے بڑے اردو استاد پیدا کیے۔ خانِ آرزو کے شاگردوں میں شرف الدین مضمونؔ، شاہ مبارک آبروؔ، غلام مصطفیٰ خاں یکرنگؔ ایسے شاعر ہیں جن کا شمار "دورۂ ایہام گویان" کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اسی طرح مرزا مظہر کے شاگردوں میں انعام اللہ خاں یقینؔ، احسن اللہ خاں بیانؔ، میر باقر حزیںؔ اپنے عہد میں بہت مشہور و مقبول رہے۔ یہ لوگ

۱۔ میر نے نکات الشعرا میں خان آرزو کو اپنا "استاد و پیر و مرشد" لکھا ہے۔ نکات الشعرا، ص ۴۔ لیکن ذکرِ میر میں خانِ آرزو کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "خالوے من بادہ پیماے طمع شد یعنی در لشکر شجاع الدولہ بہ ایں توقع رفت کہ برادرانِ اسحاق خاں شہید آں جا ہستند، نظر بر حقوق سابق رعایتے خواہند کرد۔ جز باد بدستش نیامد۔ لکد زمانہ خورد و ہم آں جا مُرد۔"

(ذکرِ میر، ص ۷۵)

ایہام گوئی کے خلاف تحریک کے علم بردار مانے جاتے ہیں۔ بڑے شاعروں میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کے تلامذہ کی فہرست اچھی خاصی طویل نہ ہو۔

اگر ایک شاعر کے لیے یہ بات قابلِ فخر تھی کہ وہ کسی بڑے استاد کا شاگرد ہے تو استاد کے لیے بھی یہ بات باعثِ افتخار تھی کہ اس کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے۔ حاتم نے "دیوان زادہ" کے دیباچے میں اپنے ۴۵ شاگردوں کے نام درج کیے تھے[1]۔ تلامذہ غالب میں مالک رام صاحب نے ۱۴۶ شاگردوں کا ذکر کیا ہے اور وہ الگ ہیں جن کے نام کتاب شائع ہونے کے بعد تحقیق ہوئے۔

شاہ کمال نے جرأت کے بارے میں لکھا ہے۔

ہفتہ میں دو روز یعنی چہار شنبہ اور یک شنبہ اصلاح کے لیے مقرر تھے۔ تمام شاگرد جمع ہوتے اور اپنی غزلیں پڑھتے۔ ہر ایک کی اصلاح ہوتی۔ ایسی صحبت اور جلسہ شہر میں کہیں نہیں ہوتا تھا۔ (فارسی سے ترجمہ)[2]

مولانا محمد حسین آزاد نے ناسخ کے بارے میں لکھا ہے۔

..... آپ تکیہ سے لگے بیٹھے رہتے تھے۔ شاگرد (جن میں اکثر امیرزادے شرفا ہوتے تھے) باادب بچھونے کے حاشیہ پر بیٹھتے جاتے۔ دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ شیخ صاحب کچھ سوچتے کچھ لکھتے۔ جب کاغذ ہاتھ سے رکھتے تو کہتے ہوں! ایک شخص غزل سنانی شروع کرتا۔ کسی شعر میں کوئی قابلِ تبدیل ہوتا یا پس و پیش کے تغیر سے کام نکلتا تو اصلاح فرماتے۔ نہیں

۱- مجموعہ نغز، ۱، ص ۱۵۵

۲- مجمع الانتخاب، ص ۳

تو کہہ دیتے یہ کچھ نہیں نکال ڈالو یا اس کا پہلا یا دوسرا مصرع اچھا نہیں۔ اسے بدلو۔ یہ قافیہ خوب ہے۔ مگر اچھے پہلو سے نہیں بندھا۔ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ جب وہ شخص پڑھ چکتا تو دوسرا پڑھتا۔ اور کوئی بول نہ سکتا تھا!

استاد اپنے شاگردوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ ان کی تربیت میں پوری کوشش کرتا۔ شاگرد بھی سعادت مندی سے پیش آتے۔ یہ استاد کی محبت کا نتیجہ تھا کہ بعض شاعروں کا تخلص استاد کے تخلص کے ہم وزن یا اُس جیسا ہوتا تھا۔ اس کی مثالیں شاگردانِ جرأت میں بہت ملتی ہیں۔ ان کے بعض شاگردوں کے تخلص تھے۔ اُلفتؔ، غیرتؔ، رخصتؔ، حقیقتؔ، محنتؔ محبتؔ، مروتؔ، قوتؔ اور شوکتؔ وغیرہ۔

ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی شاعر کسی استاد کا شاگرد ہے۔ استاد سے کسی بات پر اَن بَن ہوئی اور اس نے کسی اور کا تلمذ اختیار کر لیا۔ ایسے جھگڑوں میں کبھی کبھی شاگرد اپنے پہلے استاد کی ہجو بھی کہنے سے باز نہ رہتا۔ قائمؔ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سوداؔ کا تلمذ ترک کر کے ان کی ہجو کہی تھی۔ جس کا جواب سوداؔ نے بھی ایک ہجو سے دیا تھا۔

ادبی معرکوں میں یہ شاگرد بہت کام آتے تھے۔ انشاؔ کے شاگردوں ہی نے مصحفیؔ کے خلاف لکھنؤ کی سڑکوں پر جلوس نکالا تھا۔ مصحفیؔ نے سوداؔ کی وفات کے بعد ان پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ جن کا جواب شاگردانِ سوداؔ نے دیا۔ کافی دن تک مصحفیؔ اور شاگردانِ سوداؔ میں معرکہ رہا۔

۱۔ آب حیات، ص ص۔ ۳۵۰-۳۵۱

ایسے معرکوں میں اگر شاگرد میں صلاحیت ہوتی تو وہ خود استاد کے حریف کا مقابلہ کرتا۔ ورنہ استاد اس کے نام سے کہہ کر دیتا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ حریف کو نیچا دکھانے کے لیے استاد اپنے شاگردوں کو اعلیٰ درجے کی غزلیں کہہ کر دیتا۔ جو مشاعرے میں پڑھی جاتیں اور ان شاگردوں کی کامیابی کو حریف استاد کی ناکامی سمجھا جاتا۔ کبھی کبھی استاد اپنے کسی عزیز شاگرد کو باقاعدہ غزلیں کہہ کر دیا کرتا۔ یوں بھی ہوتا کہ اگر کسی نوجوان نے کوئی اچھی غزل پڑھی تو اسے استاد کا کلام تصور کیا جاتا۔ خواہ وہ اس نوجوان کا خونِ جگر ہی کیوں نہ ہو۔ انعام اللہ یقینؔ اور دیا شنکر نسیمؔ پر یہی الزامات ہیں کہ یقینؔ کا دیوان مرزا مظہر کا کہا ہوا ہے اور نسیمؔ کی مثنوی گلزارِ نسیم آتشؔ کی تصنیف ہے۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ صفِ اول کے بیشتر شاعروں کے نام سے ان کے اساتذہ کے نام زندہ ہیں ان شاعروں نے اساتذہ سے تربیت حاصل کی لیکن بہت جلد اُن سے بہت آگے نکل آئے۔ اس کے برعکس یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ جن شاعروں پہ اُردو ادب کو ناز ہے ان کے شاگردوں میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا ہوا ہے جو استاد سے آگے بڑھنا تو کیا استاد کا ہم پلہ ہو۔

سوداؔ کے شاگردوں میں صاحب اقتدار بھی تھے اور غریب لوگ بھی۔ ایسے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی ہے جو صاحبِ دیوان تھے لیکن قائمؔ کے علاوہ ایک بھی ایسا شاعر نہیں جس نے حیاتِ جاوید پائی ہو۔

احسنؔ، مرزا احسن علی

سید علی حسن خاں، اور ضیغم[2] نے انھیں دہلوی لکھا ہے۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ

۱۔ بزمِ سخن، ص ۱۰۱
۲۔ تذکرۂ ضیغم، ص ۱۱

احسن پہلے خواجہ محمد یونس خاں سے متوسل تھے۔ پھر نواب وزیر مرحوم (نواب شجاع الدولہ) کے دربار میں ملازم ہو گئے۔ آج نواب سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں بہادر کی سرکار میں ممتاز ہیں[1]۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ آج نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں ملازم ہیں[2]۔ مصحفی نے نواب آصف الدولہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ جبکہ شیفتہ لکھتے ہیں کہ وہ نواب آصف الدولہ کے دربار میں بہ پیشۂ شاعری پر ملازم تھے[3]۔ نساخ نے بھی یہی لکھا ہے۔ ممکن ہے احسن بہت کم عرصے کے لیے نواب آصف الدولہ کے ملازم رہے ہوں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ان دونوں تذکرہ نگاروں کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ کچھ تذکرہ نگار اُن کی خوش نویسی کی تعریف کرتے ہیں[4]۔ معاصر تذکرہ نگار اُن کے بہت مداح ہیں۔ کمال لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں مرزا حسن رضا خاں صاحب کے سرکار میں اُن سے اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ وہ "جوانِ جوش فکر و خوش خلق و خوش مزاج" ہیں[5]۔ میر حسن انھیں "خوش خلق اور نیک خو" بتاتے ہیں[6]۔

مصحفی ان کی شعر گوئی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "قوتِ شاعری

۱۔ تذکرہ ہندی، ص ۱۷

۲۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص

۳۔ گلشنِ بے خار، ص ۲۱

۴۔ مصحفی انھیں "خوش تحریر" لکھتے ہیں (تذکرہ ہندی، ص ۱۷)۔ شیفتہ لکھتے ہیں: "بحسنِ خط و نیکوے بیان مشہور است"۔ (گلشنِ بے خار، ص ۲۱) مزید ملاحظہ ہو۔ عمدۂ منتخبہ، ص ۵۶۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۱۶

۵۔ مجموعۃ الانتخاب، ورق ۲۶ ب

۶۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۱۶

چنانکہ شاعر را باید در قصیدہ وغیرہ پیدا کرد۔ چوں فی الجملہ طالب علمی ہم دارد شعر را بہ متانت و رزانت تمام می گوید و احتیاطِ محاورہ وصحتِ زبان بسیار می کند"[1]
میر حسن لکھتے ہیں: "قصیدہ وغزل خوب می گوید"[2] مصحفی نے ایک قصیدے میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

میرے شفیق ہیں اول جو میرزا احسن
کمال ساتھ متانت کے ہے انھوں کا کلام

کلیاتِ سودا کے مصطفائی نسخے میں ایک قصیدہ ہے جس کے مصنف کے بارے میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ وہ سودا کا ایک شاگرد ہے۔ قصیدے کا مطلع ہے۔

کیا حضرتِ سودا نے کی اے مصحفی تقصیر
کرتا ہے جو ہجو اس کی تو ہر صفحے میں تحریر

قاضی عبدالودود نے ثابت کیا ہے کہ اس قصیدے کے مصنف احسن ہی ہیں[3]۔ ان کے دیوان کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگالہ کے کتب خانے میں موجود ہے[4]۔

نمونہ کلام:

الٹا سحر صبا نے جو گوشہ نقاب کا
دیکھ اس کو رنگ زرد ہوا آفتاب کا

۱۔ تذکرہ ہندی، ص ۱۷

۲۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۶

۳۔ اردو ادب، اکتوبر ۱۹۵۰ء، ص ۱۷۹

۴۔ ایضاً

کل طلب میں مے کی یوں ہم یار منہ کھولے رہے
نزع میں پانی کو جوں بیمار منہ کھولے رہے
دل کو خواہش ہے یہ کس کے تیر کی یارب کہ اب
شکل پیکاں ہو کے جوں سوفار منہ کھولے رہے
سخت مشکل ہے وہ خوگر منہ پہ رکھنے سے نقاب
اور چاہیں چشم یہ دل دار منہ کھولے رہے
جام مے ساقی کے آگے لائے جوں مجلس کے بیچ
غیروں کو پیہم دیے اور یار منہ کھولے رہے
اکثروں نے پی اور اکثر قطرے کو ترسا کیے
لڑھ گئے دو چار اور دو چار منہ کھولے رہے
خون احسن کا نہ چاٹے جب تلک کب ہو نیام
اژدہے کی طرح وہ تلوار منہ کھولے رہے

دھمکائیے جا اُن کو جو مرگ سے ڈرتے ہیں
ہم ہیں ترے پروانے جی دینے پہ مرتے ہیں
تم غیر کے ہاتھوں سے واں جام چڑھاتے ہو
یاں حلق میں لوہو کے سو گھونٹ اترتے ہیں
ہو دست پہ سر ظالم کب لیں ہیں مرا مجرا
سو نازسے ہاتھ اپنا ٹک سینے پہ دھرتے ہیں
کھلتے ہیں اسیروں کے صد عقدہ غم دل سے
تجھ مکھڑے پہ زلفوں کے جب بال بکھرتے ہیں

پھر فصل بہار آئی جو ہوئے سو ہو احسنؔ
مغ پاس گرو ہم بھی دستار کو دھرتے ہیں

کہا جو میں نے کہ رخ کو ترے قمر نہ لگا
بگڑ کے بولا کہ چل بے ادھر نظر نہ لگا
رہی جو تن میں مرے جان اک رمق باقی
لگا کے زخم کہا حیف کارگر نہ لگا
اسی لیے تو میں تجھ سے خفا ہوں اے احسنؔ
گھڑی گھڑی میرے پاؤں کو چشم تر نہ لگا

ہوس لے آئی تھی، اس جنگ جو کے پاس مجھے
نگہ لڑی تو رہے پھر نہ کچھ حواس مجھے

ہجر میں کیوں کر نہ ہوئے آہ و زاری بیشتر
ہے قرار اس دل میں کم اور بے قراری بیشتر
روزِ ہجراں ہی میں تنہا کچھ نہیں روتے ہیں ہم
وصل کی راتیں کٹیں یوں ہی ہماری بیشتر
کیوں تفکر دین و دنیا دل ہمارا بھول جائے
یاد رہتی ہے ہمیں پیارے تمہاری بیشتر
بیشتر تھی ہم کو اُس سے دوستی اک طرح کی
اب تو بتلا دے ہے تلوار و کٹاری بیشتر

بن کے خاک اب اُس کے کوچے سے بھلا کیونکر اُٹھے
ہے مزاج اپنے میں احسن خاکساری پیشتر

کل بوسے کے سوال پہ کیا کیا نہ کہہ گیا
میں اُس کے آگے اپنا سا منہ لے کے رہ گیا

نہ نالہ ہے دل میں، نہ آہِ حزیں ہے
کوئی دم ہے یاں، سو دمِ واپسیں ہے
گئے دن جو آنکھوں سے بہتے تھے دریا
ادھر دیکھ لو، خشک اب آستیں ہے
گیا دل جو کوچہ میں چیں جبیں کے
نہ پھر واں سے نکلا، عجب سرزمیں ہے
قدم رکھ نہ اپنا مرے دل سے باہر
کہا مان میرا، یہ گھر دل نشیں ہے
نہ کھینچ آسماں پر سر اپنا تو احسن
سمجھ آخرش سب کا مدفن زمیں ہے

یارو وہ صنم کیوں نہ کرے کام خدا کا
رام اس کا خدا ہے وہ نہیں رام خدا کا

دل ہو دیدار سے مایوس تو مسرور نہ ہو
چشم میں روشنیِ طور سے بھی نور نہ ہو

بزم میں اس کی جو ہوتی ہے کبھی سرگوشی
دل دھڑکتا ہے کہ میرا کہیں مذکور نہ ہو

اسد، میر امانی

میر حسن[۲] اور عشقی[۳] نے ایک شاعر یعنی اسد علی اسد شاگردِ سودا کا ذکر کیا ہے۔ غالباً میر امانی اور میر اسد علی دونوں ایک ہی شاعر ہیں۔ کیونکہ میر حسن اور عشقی دونوں نے اسد کی ایک ہجو "ہجو گنجفہ" کا ذکر کیا ہے۔ مصحفی نے میر امانی کے ترجمے میں اس ہجو کی تعریف کی ہے۔ اکثر تذکرہ نگار ان کا نام میر امانی ہی بتاتے ہیں[۴]۔ مصحفی لکھتے ہیں: "اکثر شاہجہاں آباد میں نقیر (مصحفی) کے مشاعرے میں آتے تھے۔ شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ بعض لوگ انھیں اکبر آباد کا بتاتے ہیں۔ ان کے ایک ہمسائے میر ذوالفقار علی سے معلوم ہوا کہ وہ عازم لکھنؤ ہوئے تھے کہ خود کو پورب پہنچا دیں چونکہ ان کی موت نے امان نہ دی، راستے میں سرائے بانکر مئو میں رات کے وقت چوروں کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان کی عمر پچاس سال کے قریب ہوگی۔" (فارسی سے ترجمہ[۵]) ذکا لکھتے ہیں کہ دہلی سے

۱۔ یہ اشعار تذکرہ شعرائے اُردو، تذکرہ ہندی، عیار الشعرا (قلمی) مجموعۃ الانتخاب (قلمی)، گلشنِ بے خار اور گلشن ہند (علی لطف) سے لیے گئے۔

۲۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۱۳

۳۔ تذکرہ عشقی (دو تذکرے)، ص ۵۶

۴۔ مثلاً مجموعۂ نغز (ص ۱، ص ۵۹)، تذکرہ ضیغم (ص ۴۵)، طبقات الشعرائے ہند (ص ۶۴)، عیار الشعرا (ص ۱۵)، تذکرہ آزردہ (ص ۴)، بزم سخن (ص ص ۱۲-۱۳) وغیرہ

۵۔ تذکرہ ہندی، ص ۱۶

لکھنؤ جا رہے تھے کہ راستے میں رہزنوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ لیکن ضیغم لکھتے ہیں "اسد تخلص میرامانی دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں نشو و نما پائی۔ مرزا رفیع سودا کے فنِ شعر میں شاگرد ہوئے تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد مرشد آباد پہنچے۔ وہیں انتقال کیا۔ مگر راقم تذکرہ ہذا کو ایک ناتمام بوسیدہ تذکرہ مولف سراپا سخن کے والد کا لکھا ہوا مل گیا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ آپ ۱۲۰۰ھ سے قبل لکھنؤ کی راہ میں کسی مقام پر رہزنوں کے ہاتھ سے مارے گئے!"[1]

میر حسن نے لکھا ہے کہ "حالات کی خرابی کی وجہ سے مرشد آباد چلے گئے"[2]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسد لکھنؤ پہنچنے سے پہلے مرشد آباد گئے۔ وہاں سے لکھنؤ آتے ہوئے مارے گئے۔ مرشد آباد سے دہلی آئے اور پھر دہلی سے لکھنو کے راستے میں قتل ہوئے۔

اسد کچھ عرصے نواب افضل خاں کے ملازم رہے تھے۔ یہی وہ اسد ہیں جن کا شعر ہے :

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی[3]

[4] اور [illegible] سے جل کر غالب نے اپنا تخلص اسد سے غالب کیا تھا۔ مصحفی ان کے بارے میں بڑی اچھی رائے رکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں "جوانے بود ظریف مزاج و خندہ روے .... دیوانے ضخیم ترتیب دادہ، در قصائد و غزل و مثنوی

۱۔ [illegible] ضیغم، ص ۴۵

۲۔ [illegible] شعرائے اردو، ص ۱۳

۳۔ [illegible] ہندی، ص ۱۶

ماہر خصوصاً مثنوی گنجفہ را بسیار بہ تلاش گفتہ۔"[1] قاسم لکھتے ہیں:" وے جوانے بود خوش طبع شیریں زباں بذلہ سنج طیّب بیاں خلیق و یار باش، خوش فکر پاکیزہ تلاش ....."[2]

کلام

پی کر شراب درد تہِ جام دے گیا
وہ شوخ ہم کو بوسہ بہ پیغام دے گیا
آیا جو میکشی کو چمن میں وہ بادہ نوش
ہر ایک گل کے ہاتھ میں اک جام دے گیا
کل لڑ گیا کہ اور یہ عاشق ہے تو اسد
آیا ہے جب وہ یاں تو ایک الزام دے گیا

تھا بے خبر تو ہم سے ملے تھا وہ شوخ چشم
آئینہ دیکھتے ہی کچھ آنکھیں بدل گیا
جوں توں اسد کو لائے تھے اس کی گلی سے ہم
خانہ خراب راہ میں آ کر مچل گیا

مانے ہے کوئی وہ بت گمراہ کسی کی
گو آ کے سفارش کرے اللہ کسی کی

۱۔ تذکرہ ہندی، ص ۱۶

۲۔ مجموعہ نغز، جلد ۱، ص ۵۹

پروانے پڑے جلتے ہیں روتی ہے کھڑی شمع
یارب نہ شب وصل ہو کوتاہ کسی کی
یکفنس قید میں، گر چاہ میں ہو گرگ کا طعمہ
جو چاہے اسد کر، پہ نہ کر چاہ کسی کی

آدم تو کیا کہ جن و ملک ہیں، ترے اسیر
مارا ہے دام زلف نے تیری جہان پر
اس مہروش کے چہرے پہ چیچک کے داغ سے
دن کو ستارے رہنے لگے آسمان پر
مت دیکھو اپنے مصحف رخسار کی قسم
رکھ جاوے گا ابھی کوئی ہاتھ اس قرآن پر

رقیب مونہہ لگے اور میں نہ کرسکوں پابوس
یہ کیا غضب ہے بس ایسا ہوں میں، گیا گزرا
یہ دوں لگی کہ نیستاں جلے ہے سر تا سر
مگر اسد کوئی صحرا میں دل جلا گزرا

ہوں میں قربان ہر بہانے کے
خوب ڈھب یاد ہیں نہ آنے کے
کیا ہی رہتا ہے زلف سے برسر
ہاتھ اب چوم لیجے شانے کے

رہ آئے ترے سکوں سے اسد
اتفاقات ہیں زمانے کے

بسمل: مرزا محبوب بیگ

بہت غیر معروف شخصیت ہیں۔ دہلی کے رہنے والے اور سپاہی پیشہ تھے۔ اشپرنگر نے ذکا کے حوالے سے لکھا ہے کہ مغل نسل کے تھے اور ایک دیوان ان سے یادگار ہے[2]۔ قاسم ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "... سپاہی پیشہ بہ اندیشہ نیک ذات حمیدہ صفات سخنش مطبوع و دلچسپ و کلامش مرغوب و الفت انگیز است"[3] کریم الدین نے تقریباً قاسم ہی کے الفاظ دہرا دیے ہیں[4]۔

کلام:

نہ ہوتا گر کسو سے آشنا دل
تو کیا آرام سے رہتا مرا دل
اسے ہر وقت خوباں کیوں نہ چاہیں
رکھے ہے آرسی کی سی صفا دل

۱۔ یہ اشعار مجموعۂ نغز، تذکرۂ ہندی اور تذکرۂ شعرائے اُردو سے لیے گئے۔

۲۔ یادگارِ شعرا، ص ۳۷

۳۔ مجموعۂ نغز، ۱، ص ۱۰۶

۴۔ طبقات شعرائے ہند، ص ص ۱۵۵۔۱۵۶

خدا جانے ہوا کیا اس کو بسمل
ابھی تو تھا بھلا چنگا مرا دل[1]

طرزِ سخن کو میرے کہتا ہے سُن وفا سے
آتی ہے بوے اُلفت بسمل ترے سخن سے[2]

جرأت، مرزا مغل

سرور نے ان کا تخلص جمیل لکھا ہے[3] جو بظاہر کاتب کا سہو معلوم ہوتا ہے۔ یہ حمید الدین خاں نبیرہ کے صاحبزادے عبدالباقی خاں کے لڑکے تھے[4] قائم ان کے بارے میں لکھتے ہیں "مردے بود بسیار قابل و نیک کردار نہایت خوش دل و شیریں گفتار[5]" بریلی میں انتقال ہوا[6]

کلام

بھلا تو مجھ سے تو کہہ کیا ہوا تجھے اے دل
جو اس طرح سے تو رہتا ہے میرے لال پڑا

۱۔ قائم نے لکھا ہے بعض لوگ یہ غزل تاباں سے منسوب کرتے ہیں۔ (مجموعہ نغز، ۱، ص ۱۰۶)

۲۔ یہ اشعار عمدہ منتخبہ اور مجموعہ نغز سے لیے گئے۔

۳۔ عمدہ منتخبہ، ص ۲۰۹

۴۔ طبقات شعراے ہند، ص ۱۸۶

۵۔ مجموعہ نغز، ۱، ص ۱۲۶

۶۔ ایضاً اور سخن شعرا، ص ۱۰۱

نپٹ ہی آج پریشاں ہے حال سنبل کا
چمن پہ آہ یہ کس زلف کا وبال پڑا

کیوں نہ ہوویں جان و دل سے ہم نثار آئینہ
عکس ہے مکھڑے کا تیرے ہم کنار آئینہ
روبرو ہوتے ہی مفتوں کر لیا اوس شوخ کو
دیکھیو ٹک غور سے جرأت تو مکار آئینہ

جوں برگ گل جھڑیں ہیں گلشن میں زیر گلبن
لخت جگر پڑے ہیں یوں آس پاس میرے
غیروں کا گر میں شکوہ یار و کروں عبث ہے
سو دشمنوں کا دشمن دل ہے یہ پاس میرے[1]

جینا، جینا بیگم

بہت کم تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ یہ مرزا بابر کی صاحبزادی اور جہاندار شاہ کی محل خاص تھیں[2]۔ ذکا اور قاسم نے اُن کے تلمذ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ البتہ ابوالفضل محمد عباس رفعت نے انھیں شاگرد سودا لکھا ہے[3]۔

۱۔ یہ اشعار مجموعہ نغز سے لیے گئے ہیں۔

۲۔ مجموعہ نغز، ۱، ص ۱۷۸

۳۔ تذکرہ ماہ درخشاں، ص ۱۳

کلام:[1]

یہ کس کی آتشِ غم نے جگر جلایا ہے
کہ تا فلک میرے شعلے نے سر اُٹھایا ہے

ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہے
کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہے

آیا نہ کبھی خواب میں بھی وصل میسّر
کیا جانیے کس ساعتِ بد آنکھ لگی تھی

نہ دل کو صبر نہ جی کو قرار رہتا ہے
تمھارے آنے کا نت انتظار رہتا ہے

یا الٰہی یہ کس سے کام پڑا
دل تڑپتا ہے صبح و شام پڑا

روٹھنے کا عبث بہانا تھا
مدعا تم کو یہاں نہ آنا تھا

۱۔ یہ اشعار مجموعۂ نغز اور تذکرہ ماہ درخشاں سے لیے گئے۔

حجامؔ، عنایت اللہ

ان کا عرف کلّو تھا[1]۔ قاسم غالباً واحد تذکرہ نگار ہیں۔ جنھوں نے لکھا ہے کہ "در مقطع ہر غزل پروَرش تخلص می کند[2]"۔ حالانکہ خود قاسمؔ نے تقریباً گیارہ مقطع نقل کیے ہیں جن میں حجامؔ تخلص ہے اور کوئی مقطع ایسا نہیں ہے جس میں "پروَرش" باندھا گیا ہو۔ غالباً انھیں غلط فہمی ہوئی۔ حجامؔ سہارن پور کے رہنے والے تھے[3]۔ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ میرحسنؔ لکھتے ہیں کہ "متصّل مدرسۂ غازی الدین خاں دکانِ سخن را گرم داشتہ[4]"۔ غالباً میر حسنؔ کا مطلب ہے کہ مدرسۂ غازی الدین کے قریب رہتے تھے۔ یہ حجام پیشہ تھے۔ لیکن بقول مصحفی دوسرے موتراشوں کی طرح یہ کبھی بازار میں گھومتے تھے اور نہ دکان پر بیٹھتے تھے۔ ہمیشہ خانہ نشین رہتے[5]۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے انھیں شاگردِ سوداؔ لکھا ہے۔ شاہ کمال نے سوداؔ سے ان کے تلمذ کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ لکھا ہے کہ میاں محمد قائم اور دوسرے شعرا کی صحبت میں تربیت پائی[6]۔

۱۔ عمدۂ منتخبہ، ص ۲۲۹ ــــ تذکرہ شورش (دو تذکرے)، ص ۲۱۷ ــــ عیار الشعرا (مائیکروفلم)، ص ۲۱۶

۲۔ مجموعۂ نغز، ۱، ص ۱۹۸

۳۔ تذکرہ کمال (قلمی)، ورق ۲۵۳ ب ــ گلشن بے خار، ص ۵۶

۴۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۵۰

۵۔ تذکرہ ہندی، ص ۷۷

۶۔ تذکرہ کمال (قلمی)، ورق ۲۵۳

ہم عصر تذکرہ نگار اُن کے مداح ہیں۔ مصحفی لکھتے ہیں: "چوں طبعش از ابتدا موزوں افتادہ بود باوجود کم علمی شعر ہندی را بخوبی سرانجام می دہد و معنی ہائے نازک تر از موئے می یابد، چنانکہ در اکثر مشاعرہ ہا مورد تحسین و آفرین یاراں بودہ ..... وضیع و شریف شاہجہاں آباد او را بسیار دوست می دارند[1]"

قاسم لکھتے ہیں "..... اما درویش نہاد صاحب شعور، بیشتر اوقات مشغول بہ حق می ماندہ و مثنوی مولوی معنوی علیہ الرحمۃ می خواند و مولہ سماع بود و وجد می فرمود[2]"

حجام مولانا محمد فخر الدین کے مرید تھے۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ حجام چھٹیوں کے دن یعنی سہ شنبہ اور جمعہ کو مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ان کے خط کی اصلاح اور خضاب لگاتے۔ مولانا کی صحبت کا اثر ہے کہ حجام مشائخانہ لباس پہنتے ہیں۔ اسی لیے اہل محلہ انھیں شاہ جی کہتے ہیں[3]

قدرت اللہ شوق نے لکھا ہے کہ "حجام مدت سے فرخ آباد میں مقیم ہیں" میری نظر سے کوئی اور تذکرہ نہیں گزرا جس میں ان کے قیام فرخ آباد کا ذکر ہو۔ اس کے برعکس مصحفی جو اُن سے آشنائی کے مدعی ہیں، لکھتے ہیں "ان کی عمر پینتیس سال سے اوپر ہوگی۔ چھ سال ہوئے شاہجہاں آباد میں وفات ہوئی[4]"

میں نے ایسا کوئی تذکرہ نہیں دیکھا جس میں ان کے صاحب دیوان ہونے کا ذکر ہو۔ لیکن قاسم نے جس انداز سے شعر پیش کیے ہیں۔ اُن سے

۱۔ تذکرۂ ہندی: ص ۷۷

۲۔ مجموعۂ نغز، ۱، ص ۱۹۷

۳۔ تذکرۂ ہندی، ص ۷۸

۴۔ ایضاً

اندازہ ہوتا ہے کہ دیوان سے انتخاب کیے گئے ہیں۔

کلام:

روز رخسار کے لیتا ہے مزے خوباں کے
بہتر اس سے کوئی حجام ہنر کیا ہوگا

ہر دم نظر آتے ہیں نئے یار تمھارے
ہم جی چکے گر ہیں یہی اطوار تمھارے
ہے جی میں تمنا کہ اون آنکھوں سے یہ پوچھوں
بچتے نہیں کس واسطے بیمار تمھارے
اک روز نصیبوں سے کہیں وہاں تئیں پہنچوں
پھر سر ہے مرا اور در و دیوار تمھارے
اوس کاوشِ مژگاں کا گلہ ہم سے عبث ہے
اے آنکھ! یہ بوئے ہوئے ہیں خار تمھارے
اوس شوخ کے کوچے میں نہ جایا کرو حجاّم
چھن جائیں گے اک دن کہیں ہتھیار تمھارے

حجاّم بڑا سخت حیاناک سے بالا
کچھ اور تو کیا بات جو وہ مونہہ سے نکالے
لگ چلیے جو اوس شوخ سے رستے میں تو اے والے
جھنجھلا کے یہ کہتا ہے کہ چل دور رذالے

کن سلوکوں سے ہم اُن کے پاس اے ہمدم گئے
وہ گئے ہم سے اور ان کے دل سے بس اب ہم گئے
ہے یہ زخمِ عشق اے حجام کب اچھا ہوا
واسطے ان کے عبث تم ڈھونڈنے مرہم گئے

فلک کے جور کے مارے ہوؤں سے یہ کوئی پوچھے
کہ ہو زیرِ زمیں بھی دکھ میں یا آرام کرتے ہو
رقیبوں پر میاں پڑتا ہے تب سو سو گھڑے پانی
بُلا حجام کو جس روز تم حمام کرتے ہو

بھول اوس کی گلی میں جا رہا تھا
کل مرنے میں میرے کیا رہا تھا[1]

حسنؔ، میر محمد حسن دہلوی

میرؔ نے اُن کا نام میر حسن لکھا ہے۔ انھیں نوکر پیشہ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اکثر میرے گھر پر مشاعرے میں تشریف لاتے ہیں۔[2] گردیزی نے ان کا پورا نام میر محمد حسن دہلوی لکھا ہے اور وہی دو مطلعے نقل کیے ہیں جو میرؔ نے نکات الشعرا میں دیے ہیں۔[3] عشقی اور فساخ نے بھی ان کا ذکر کیا ہے، مگر

۱۔ یہ اشعار مجموعۂ نغز، تذکرۂ ہندی اور عمدۂ منتخبہ سے لیے گئے ہیں۔

۲۔ نکات الشعرا، ص ۱۳۵

۳۔ تذکرہ ریختہ گویان، ص ۱۳۵

معلوم ہوتا ہے کہ بہت غیر معروف شخصیت ہیں۔ مجھے ان دو شعروں کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا۔

لگتا ہے آج مجکو یہ سارا جہاں خراب
شاید کہ مرگیا ہے کوئی خانماں خراب
قاتل اگر کہے کہ سسکتا ہی چھوڑ دیو
خنجر تو ایک دم کے لیے منہ نہ موڑ دیو[1]

راقم، بندرابن

اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کا وطن دہلی بتایا ہے۔ لیکن شیفتہ لکھتے ہیں بعضے انھیں متھرا کا باشندہ لکھتے ہیں اور بعضے دہلی کا بتاتے ہیں۔ لیکن ان کا نام دیکھ کر یہی انداز ہوتا ہے کہ متھرا کے ہوں گے کیونکہ وہاں نام اسی طرح رکھے جاتے ہیں[2]۔

شیفتہ نے تلمذ کے متعلق بھی لکھا ہے کہ کسی نے انھیں مرزا مظہر کا شاگرد بتایا ہے اور کوئی شاگردِ سودا لکھتا ہے[3]۔ عبدالغفور نسّاخ نے انھیں دونوں (یعنی مظہر و سودا) کا بتایا ہے[4]۔ لیکن کچھ تذکرہ نگار انھیں تلمیذِ سودا بتاتے ہیں[5]۔ اس

۱۔ نکات الشعرا، ص ۱۳۵

۲۔ گلشنِ بے خار، ص ۸۴۔ قائمؔ نے اُن کا وطن متھرا لکھا ہے۔ مخزنِ نکات، ص ۵۵

۳۔ گلشنِ بے خار، ص ۸۴

۴۔ سخن شعرا، ص ۱۷۹

۵۔ مثلاً چمنستانِ شعرا، ص ۵۱۲۔ تذکرہ گلزارِ ابراہیم مع تذکرۂ گلشنِ ہند، ص ۱۳۷۔ عمدۂ منتخبہ، ص ۲۹۹ مجموعۂ نغز، ۱، ص ۲۶۴۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۷۳ وغیرہ

سلسلے میں میر کی روایت ہے کہ مشق شعر مرزا رفیع سے کرتے ہیں۔ اس سے قبل فقیر (میر) سے بھی مشورہ کرتے تھے[1]۔ بقول قائم محرر پیشہ تھے۔ اسی رعایت سے انھوں نے اپنا تخلص راقم رکھا تھا[2]۔ میر حسن انھیں ذات کا کھتری بتاتے ہیں[3]۔ عشقی نے لکھا ہے کہ وہ بہت کوتاہ قد تھے[4]۔ میر حسن نے بھی یہی لکھا ہے کہ بسیار پست قد و بلند فکر ست[5]۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے اُن کی تعریف کی ہے۔ قائم لکھتے ہیں " قوتِ حافظہ کمال کی ہے۔ سو شعروں کا قصیدہ ایک بار سن کر یاد کر لیتے ہیں۔ اور اسے دہرانے میں تامل نہیں کرتے[6]۔ شورش لکھتے ہیں۔ بسیار خوش فکر و خوش گو است، مضمون را بآئین شائستہ می بندد۔ کلامش فصیح و بلیغ است[7]۔ مخمس کہنے پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ قائم، میر حسن اور عشقی نے اُن کی مخمس گوئی کی تعریف کی ہے[8]۔ صاحب دیوان تھے[9]۔

۱۔ نکات الشعرا، ص ۱۴۲

۲۔ مخزن نکات، ص ۵۵

۳۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۷۳

۴۔ تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص ۳۲۶

۵۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۷۳

۶۔ مخزن نکات، ص ص ۵۵ - ۵۶

۷۔ تذکرہ شورش (دو تذکرے) ص ۳۲۵

۸۔ مخزنِ نکات، ص ۵۶ ۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۷۳ ۔ تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص ۳۲۶

۹۔ عیار الشعرا (مائیکرو فلم)، ص ۱۷۰، اور سخن شعرا، ص ۱۷۹

کلام:

دل کنج قفس میں کر فریاد بہت رویا
ہنسنے کے تئیں گل کے کر یاد بہت رویا

ابرِ تر سے چشمِ گریاں کم نہیں
موجِ دریا ہے شکنج آستیں

قطعہ

مژگاں سے دل بچے تو ٹکڑے کرے ہے ابرو
یہ کہہ کے میں نیں اُس سے جب دل کی داد چاہی
کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہوے خالی
تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

قطعہ

اے باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض
مجکو قسم ہے چھیڑوں اگر برگ و بر کہیں
اتنا ہی چاہتا ہوں کہ میں اور عندلیب
آپس میں درد دل کہیں ٹک بیٹھ کر کہیں

پہنچا نہ آہ درد کو میرے کوئی طبیب
یارب عجب طرح کا کچھ آزار ہے مجھے

دیکھا نہ ہو جسے میں کوئی سرزمیں نہیں
پر تخمِ دل ہو سبز جہاں سو کہیں نہیں
سنتے تھے ہم جہان میں اہلِ کرم کا ہاتھ
آیا جو دید میں تو کم از آستیں نہیں

مری بدشرابیوں سے کریں توبہ میگساراں
رہے وہ عمل کہ ہووے سببِ نجات یاراں
سنا کن نے حال میرا کہ جوں ابر وہ نہ رویا
رکھے ہے مگر یہ قصہ اثرِ دعائے باراں

ہیچوں ہوں میں اُس پاس یہ دل نیم نگہ کو
اس پر بھی ستم ہے جو خریدار نہ ہووے

کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں[1]
کہنے کو ہے یہ بات کہ مقدور ہی نہیں
کہتا تھا کون یہ کہ خوشی ہے جہاں کے بیچ
اس بات کا تو یاں کہیں مذکور ہی نہیں

۱۔ اس مصرع پر میر حسن نے اعتراض کیا ہے کہ عین کے گرنے سے مصرع ناموزوں ہو جاتا ہے۔ اگر یہ مصرع اس طرح ہو تو اچھا ہے۔ "میرا تو کام کچھ تجھے منظور ہی نہیں"۔ تذکرہ شعرائے اُردو: ص ۷۳

سنتے ہیں ہم کہ ہوتی ہے جگ میں دوام صبح
ہو گی کبھی اے چرخ ہماری بھی شام صبح

معصیت میری بہت ہے کہ تیری بخشش بیش
اپنی رحمت پہ نظر کر مرے عصیاں کو نہ دیکھ

صیاد کب تو چھوڑے گا مجھ کو قفس سے آہ
کھٹکے ہے میرے دل میں بہت خار خار باغ

رونے میں اس قدر تو جگر اے جگر نہ کر
دیکھا نہ تو نے کچھ کہ دل و دیدہ کیا ہوئے

نامے کا مرے اس سے لے کر جواب پھرنا
پر واسطے خدا کے قاصد شتاب پھرنا
ایک وے بھی دن تھے یارب جو تھا ہمیں میسر
گلشن میں ساتھ اس کے پیتے شراب پھرنا

کہیے کیا دردِ دل بلبل گلوں سے
اُڑا دیتے ہیں اس کی بات ہنس کر
جو چاہے گوہر مقصود اے دل
صدف کی طرح تو پاسِ نفس کر

یاں تک قبول خاطر کیجے تری جفا کو
تا سب کہیں کہ راقم رحمت تری وفا کو

دیکھا میں رات جا کر احوالِ چشم راقم
برسات کی اندھیری پتلی کی تھی سیاہی

جو کہ مائل ہے تیغ ابرو کا
تشنہ لب ہے وہ اپنے لہو کا
تیرے اعضا میں تجھ کمر سے میاں
فرق ہرگز نہیں سرِ مو کا
راقم ہوتا نہیں وہ ہم آغوش
کیوں کے ہو دور درد پہلو کا

ہے زلف میں تیری جائے عاشق
زنجیر ہے اور پائے عاشق[1]

رضا، مرزا احسن رضا[2]

ان کا عرف میرزا جیون[3] تھا۔ والد کا نام مرزا جان تھا۔ بزرگ خوارزم

۱۔ یہ اشعار نکات الشعرا، مخزنِ نکات، مجموعہ نغز اور تذکرہ شعرائے اردو سے لیے گئے۔
۲۔ قاسم (مجموعۂ نغز، ۱، ۲۷۰) کریم الدین (طبقات شعرائے اردو، ص ۲۲۲) نے اُن کا نام مرزا محمد رضا لکھا ہے جو ٹھیک نہیں۔
۳۔ نساخ نے ان کا نام مرزا جیون لکھا ہے۔ سخن شعرا، ص ۱۸۵

سے ہندوستان آئے تھے[1]۔ شاہ کمال اُن سے ذاتی تعلقات کے مدعی تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔ رضا شاہ جہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد سے لکھنؤ میں مقیم تھے۔ صاحب دیوان تھے اور بہت خوش فکر، انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنا دیوان مجھے دیا تھا۔ جو موجود ہے۔ مشقِ سخن مرزا سودا سے کرتے تھے۔ مجھ سے بہت اتحاد و ربط تھا۔ بچپن سے سالہا سال اس زمانے تک لکھنؤ میں ملاقات رہتی تھی۔ ہم ایک ساتھ رہتے تھے۔ میں انھیں لکھنؤ چھوڑ کر آیا ہوں۔ خدا انھیں سلامت رکھے[2]۔ بعض تذکرہ نگار انھیں میر نظام الدین ممنونؔ کا شاگرد بتاتے ہیں[3]۔ سرور لکھتے ہیں کہ وہ پہلے میاں نصیر (غالباً شاہ نصیر) سے اصلاح لیتے تھے۔ بعد میں ممنونؔ کا تلمذ اختیار کر لیا[4]۔

کلام :

یہ یقیں ہے کہ اس کی موت آئی
جس کو ملتا ہے یار ہرجائی
ہجر کی رات کیوں کے گزرے گی
یہ تو ساتھ اپنے آفتیں لائیں

۱۔ عمدۂ منتخبہ (ص ۲۹۴) میں ان کے والد کا نام مرزا خان دیا گیا ہے۔ جو غالباً سہو کاتب ہے کیونکہ سخن شعرا (ص ۱۸۵) اور گلشنِ بے خار (ص ۸۶) میں مرزا جان دیا گیا ہے۔

۲۔ تذکرہ کمال (قلمی) ورق ۳۲۶

۳۔ گلشنِ بے خار، ص ۸۶ ۔ سخن شعرا، ص ۱۸۵

۴۔ عمدہ منتخبہ، ص ۲۹۴

کیا کیا نہ برق چمکے ہے ہر ہر شرار سے
نکلے ہیں شعلے ایسے دلِ داغ دار سے
انگلے ہے تیری چشم مرا دل، کروں ہوں نذر
دھمکائے کیوں ہے غمزہ خنجر گذار سے
دستِ جنوں قصور نہ کر یہ بھی ہیں گراں
کچھ رہ گئے ہیں میرے گریباں کے تار سے

دل میں حسرت رہ نہ جائے منہ دکھایا چاہیے
ہے وداع جان اپنی اب تو آیا چاہیے
بے طرح دل کو قلق ہے کوئی دم میں ہم چلے
دوستو بیٹھے ہو کیا یاں ان کو لایا چاہیے

ضعف سے ہم نہیں سنبھلتے ہیں
لب ہلانے میں دم نکلتے ہیں
غیر سے گرمِ اختلاط ہیں وہ
ہم یہ سنتے ہیں اور جلتے ہیں
خانۂ دل رہے نہ کیوں روشن
داغ جیسے چراغ جلتے ہیں
درد سے دل کے آہیں بھرتے ہیں
نہ تو جیتے ہیں ہم نہ مرتے ہیں

داغ دیں تازہ کیوں نہ لالہ رخاں
نت نیا غیرِ گل کترتے ہیں[1]

شرف، شیخ شرف الدین حسین

سرور نے انھیں لکھنؤ کا باشندہ لکھا ہے[2] لیکن شیفتہ[3] اور نساخ[4] انھیں دہلوی بتاتے ہیں۔ شیفتہ لکھتے ہیں قدم شریف کے راستے پر اُن کا گھر تھا اور دارو غگی کروڑان سے متعلق تھی[5]۔ لیکن شاہ کمال لکھتے ہیں کہ غلام حسین خاں کروڑہ کے رشتہ داروں میں تھے۔ لکھنؤ میں فقیر سے بہت ملاقات ہوتی تھی[6]۔ ممکن ہے یہ دہلی کے رہنے والے ہوں اور بعد میں لکھنؤ چلے گئے ہوں۔ قاسم ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ جوانے است خلیق وخوش گو، محبت منش، نیک خو، گو نہ از علم بہرہ ور وقدرے از چاشنی سخن باخبر اگر سلام و مرثیہ گوید، گاہے بہ تکلیف احباب رخشِ ہمت در میدانِ غزل گفتن پوید[7]۔ کمال اور نساخ نے انھیں شاگردِ سودا لکھا ہے۔

۱۔ یہ اشعار تذکرہ ہندی اور عمدہ منتخبہ سے لیے گئے۔

۲۔ عمدۂ منتخبہ، ص ۳۷۴

۳۔ گلشنِ بے خار، ص ۱۰۸

۴۔ سخن شعرا، ص ۲۴۵

۵۔ گلشنِ بے خار، ص ۱۰۸

۶۔ تذکرہ کمال (قلمی) ورق ۵۲۶ ب

۷۔ مجموعۂ نغز، ۱، ص ۳۴۱

کلام :

اب دن پھرے ہمارے یہ ہم پر عیاں ہوا
وہ مہ جبیں جو رات کو پھر مہرباں ہوا

ہمیں اس خاکساری پر بھی تو ناشاد مت کیجو
ہوائے ہجر سے ہم کو کبھی برباد مت کیجو

لوٹے چمن میں گل کے خزاں یوں بہار حیف
اور عندلیب جیتی رہے تو ہزار حیف

مانند مرغ قبلہ نما گرچہ مضطرب
پھرتا ہوں اپنے گھر میں پہ عزلت گزیدہ ہوں[1]

شیدا، میر فتح علی

یہ سید زادے تھے[2]۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے انھیں شمس آباد مئو کا بتایا ہے[3]۔ میر سوز نے انھیں متبنیٰ کر لیا تھا[4]۔ آصف الدولہ کے ہاں خاص سپاہیوں

۱۔ یہ اشعار عمدۂ منتخبہ، گلشنِ بے خار، مجموعۂ نغز، اور سخن شعرا سے لیے گئے۔

۲۔ مجموعۂ نغز، ۱، ص ۳۵۶

۳۔ گلزار ابراہیم، ص ۱۲۵۔ سخن شعرا، ص ۲۶۴۔ عمدۂ منتخبہ، ص ۳۷۲ وغیرہ

۴۔ حیدر بخش حیدری، گلشن ہند (فوٹو سٹیٹ مملوکہ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو) ص ۴۸

اور مصاحبوں میں شامل تھے۔ پانچ سو روپے تنخواہ ملتی تھی[1]۔ میر حسن اُن کے مداح ہیں۔ لکھتے ہیں: "جوانے بہ کمالِ اخلاق متواضع، مؤدب[2]۔" تذکرہ نگاروں نے ان کے کلام کی تعریف کی ہے۔ عشقی لکھتے ہیں: "کلامش از حالت یاس و سوز دردنی خالی نیست[3]۔" ابوالحسن امیر الدین لکھتے ہیں: "طبع موزوں و درومند دارد از کلامش بوے دل سوزی و شیدائی می آید[4]۔" قاسم لکھتے ہیں: "شعرش بہ غایت پختہ و باکیفیت است۔ دیوانش تا الیوم سہ ہزار بیت تخمیناً بر صفحہ روزگار ثبت افتادہ[5]۔" فدوی سے ادبی معرکہ ان ہی کا ہوا تھا۔ جس کی تفصیل ہجوگوئی کے تحت بیان کر دی گئی ہے۔

کلام:

کیا دل پر اپنے سختی ایّام کی کہوں میں
سمجھا تھا جس کو شیشہ وہ سنگ ہو کے نکلا

راہ طلب میں ماندا چل دو قدم ہوا یہ
گویا کہ میں ہزاروں فرسنگ ہو کے نکلا

رکھ دل کو مرے اے مرے صیّاد قفس میں
ٹھہرے ہے کوئی مرغ ہوا گیر سر دست

۱- مجموعۂ نغز، ۱، ص ۳۵۶ نیز ملاحظہ ہو عیار الشعرا (قلمی) ۱۲۶ ب

۲- تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۹۶

۳- تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص ۲۸

۴- تذکرہ مسرت افزا بحوالہ معاصر، حصہ ۷، ص ۱۱۵

۵- مجموعہ نغز، ۱، ص ۳۵۶

وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

میں تو ملوں گا ناصحا باتیں یہ تینوں جان کے
گو کہ عدو ہیں خم برو دل کے جگر کے جان کے[1]

عظیم، مرزا عظیم بیگ

میر حسن[2]، عشقی[3] اور علی ابراہیم خان خلیل[4] نے جس محمد عظیم عظیم کا ذکر کیا ہے۔ وہ غالباً یہی ہیں۔ قاسم اُن کے بارے میں لکھتے ہیں۔ کابلی الاصل تھے اور دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ بہت صاحب غیرت و عزت تھے۔ دوست نواز، دشمن گداز، مروت نہاد، فتوت بنیاد، محبت پرور، مودۃ گستر، اور ظریف مزاج تھے۔[5] مصحفی نے انھیں دہلی میں دیکھا تھا۔ انھوں نے لکھا ہے۔ "کہتے ہیں چند روز فرخ آباد میں فقیری اختیار کرلی تھی[6]۔ اب پھر دنیا دار ہوگئے ہیں۔ فقیر نے

۱۔ یہ اشعار مجموعۂ نغز اور تذکرہ شعرائے اُردو سے لیے گئے۔ آخری دو مطلعے جن غزلوں کے ہیں وہ غلطی سے کلیاتِ سودا میں شامل ہوگئی ہیں۔ اُن کے اصل مصنف شیدا ہی ہیں۔

۲۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۱۰۹

۳۔ تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص ۹۱
۴۔ گلزار ابراہیم، ص ۱۸۰
۵۔ مجموعہ نغز، ۲، ص ۱

۶۔ میر حسن نے محمد عظیم کے ترجمے میں لکھا ہے۔ "مدتے در فرخ آباد بہ لباسی درویشی بسر بردہ"۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ دونوں عظیم ایک ہی ہیں اور ان کا اصل نام مرزا عظیم بیگ ہے۔

انھیں شاہجہاں آباد میں دیکھا تھا۔ چیچک رو تھے۔ اکثر مشاعروں میں آتے اور صدرِ مجلس پہ بیٹھتے .... سپاہی پیشہ تھے[۱]۔" قاسم نے لکھا ہے کہ عظیم ابتدا میں حاتم سے اصلاح لیتے تھے۔ پھر کچھ عرصے کے لیے خواجہ میر درد کے شاگرد رہے آخر میں سودا کا تلمذ اختیار کیا[۲]۔ کچھ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ بہت برخود غلط آدمی تھے[۳]۔ لیکن اکثر تذکرہ نگاروں نے عظیم کے فن شاعری کی بھی بہت تعریف کی ہے۔ سرور لکھتے ہیں: "الحق کہ معانی باریک و مضامین نازک در اشعار مندرج می کرد۔ .... استادِ زبان آور و خوش فکر زمانِ خود بود، قصائد کہ در حمد و نعت و منقبت از طبع رسائے او رموزوں شدہ، پہلو بہ قصائد میرزا رفیع السودا می زند[۴]۔" قاسم ان کے بہت مداح ہیں۔ لکھتے ہیں: "شعرش پختگی تمام دارد در خیال بندی و نازک خیالی خیلے ہنر پردازی ہا بر روے کار آرد۔ دریں کار استوار ید طولیٰ داشت و بیشتر بہ معانی بندی ہمت می گماشت اکثر غزل در غزل بہ تلاش لفظ و معنی تا سہ چار غزل می گفت و صنائع بدائع بسیار بکار می برد زور طبعش از قصائد ریختہ طبع وقادش روشن می شود قصیدہ وے بے اغراق بہ قصیدہ سر آمد شعراے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا می ماند مختصر کلام دیوانے مختصر در نہایت جودۃ و پختگی بر صفحہ روزگار از و یادگار است[۵]۔"

۱۔ تذکرہ ہندی، ص ۱۴۹

۲۔ مجموعۂ نغز، ۲، ص ۲

۳۔ مثلاً تذکرہ ہندی، ص ص ۱۵۰۔۱۵۱ — گلشنِ بے خار، ص ۱۳۲ — عمدۂ منتخبہ، ص ۴۱۶ وغیرہ

۴۔ عمدۂ منتخبہ، ص ۴۱۶ وغیرہ

۵۔ مجموعۂ نغز، ۱، ص ص ۱-۲

یہی وہ عظیم بیگ ہیں جن کا انشاء اللہ خاں انشا سے ادبی معرکہ ہوا تھا جسکی تفصیل قاسم نے بیان کی ہے۔ مختصر روداد یہ ہے کہ ایک دفعہ مرزا عظیم بیگ (جو بہت بر خود غلط تھے) نے ایک غزل کہی اتفاق سے بحر رجز سے بحر رمل میں جا پڑے۔ عظیم اپنے دوست اور مخلص میر ماشاء اللہ (والد انشاء اللہ خاں) کے ہاں یہ غزل سنا رہے تھے۔ اتفاق سے انشاء اللہ خاں بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے خوب تعریف و تحسین کی۔ دوبارہ پڑھوایا اور غزل یاد کر لی۔ جب امین الدولہ معین الملک ناصر جنگ بہادر عرف مرزا میڈو کے مشاعرے میں عظیم غزل پڑھ رہے تھے تو اُن سے تقطیع کرنے کو کہا گیا۔ ظاہر ہے کہ بحر بدل گئی تھی۔ انشا کا داؤ چل گیا تھا۔ اب جواباً انھوں نے ایک مخمس پڑھی جو عظیم کی ہجو میں تھی۔ پہلا بند یہ تھا۔

گر تو مشاعرے میں صبا آج کل چلے
کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے
پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحر رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے

اس کے جواب میں عظیم نے بھی ایک مخمس کہی۔ جو قاسم نے پوری نقل کی ہے جس کا ایک بند یہ ہے۔

موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق
تبدیل بحر سے ہوئے بحر خوشی میں غرق
روشن ہے مثل مہر یہ از غرب تا بہ شرق
شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

عظیم کی حمایت میں قاسم نے بھی انشا کی ہجو کہی لیکن بقول قاسم یہ تو وہ مکّا تھا جو لڑائی کے بعد یاد آتا ہے۔ نساخ لکھتے ہیں کہ بارہ سو اکیس ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔[1]

کلام :

کل چشم خوں فشاں سے گلزار پیرہن تھا
دامن کا تھا جو تختہ یک تختۂ چمن تھا
کیجو عظیم کو بھی یارب غریقِ رحمت
آوارۂ جنوں سا ایک صاحبِ سخن تھا
اور معنی بند ایسا ہندی زباں کا صائب
ہندوستاں سے لے کر مشہور تا دکن تھا
ایک دن جو گھر سے نکلا خط شعاع آسا
بکھرا ہوا بدن پہ ہر تارِ پیرہن تھا
دیکھا جو دفن کرتے جوں شمع پہ ہو فانوس
تربت میں دور تن سے بالشت بھر کفن تھا

چوں شمع کب چھپے ہے مرے سوزِ جاں کی بات
سر کاٹو تو گلے سے ہو روشن زباں کی بات
بھر عمر تم نے سیدھی نہ اے مہرباں کی بات
جب کی نہ کی تو کی ہے سدا ہم سے یاں کی بات

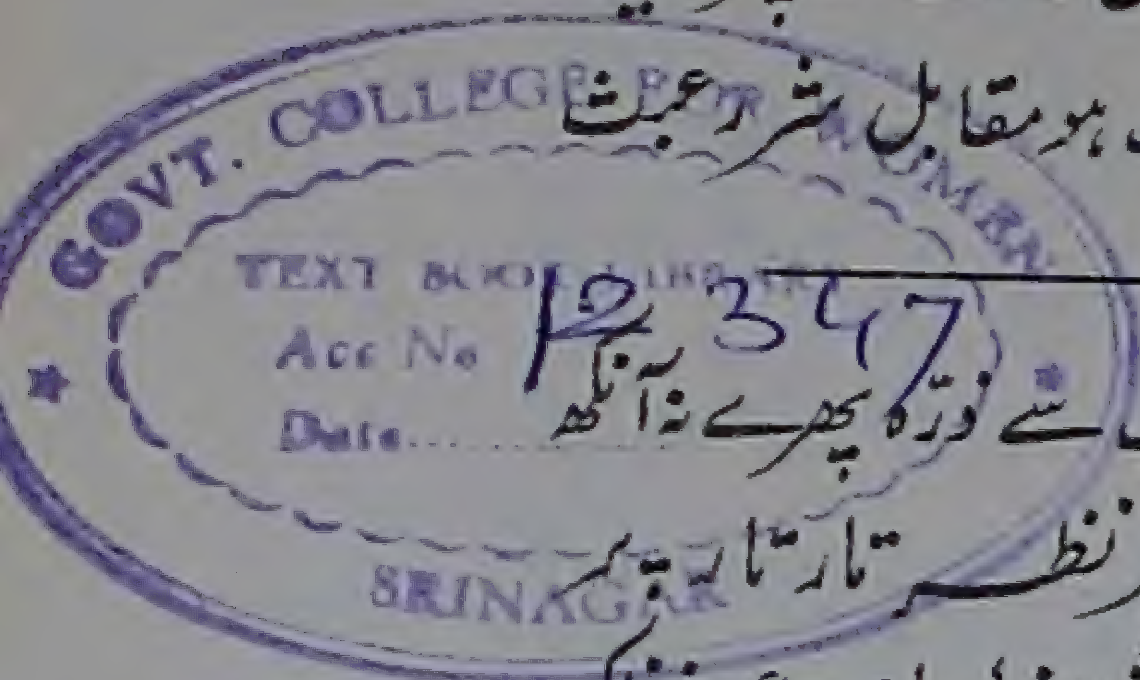
۱۔ سخن شعرا، ص ۳۳۳

ہر بات میں نرالی ہے کچھ تیرے ہاں کی بات
نکلی سو انھیں نہ کبھی تجھ سے ہاں کی بات
جوں تار ساز کب میں کہوں داستاں کی بات
نکلے ہے اوس کے ہاتھوں یہ میری زباں کی بات
پیدا کرے جو نام کوئی تو مٹے ہے کھوج
عنقا کے جی سے پوچھیے نام و نشاں کی بات
ہوں سینہ چاک و چشم تر از بسکہ جوں قلم
آتا ہے گریہ غیر کے سن کر بیاں کی بات
بیٹھا ہوں سر لیے تری تقریر پہ عظیم
جوں شمع سر کے ہاتھ ہے میری زباں کی بات

پلٹن چشم فرنگی زادہ دل پر باندھ کوٹ
نت صف مژگاں کے سنگینیں چلا کرتی ہے چوٹ
سر چڑھا جو رد نے تیرے شانہ کو ہٹ چھٹ کیا
ہے بجا جو شیخ لے ہے یہ تری داڑھی کھسوٹ
رس بھری آنکھیں تو مینوشوں کی ہوتی ہیں عظیم
چشم عاشق کا جو رس دیکھو تو ہے پانی کی پوٹ

جوہر کے ہوتے دیکھ تہی دست ہے چنار
یعنی ہے یاں کمال پہ رکھنی نظر عبث
کب سوز دل بجھے ہے نہ یہ چشم تر عبث
جوں شمع پا بہ گل مجھے رد رد نہ کر عبث

حیرت نے دی نہ فرصتِ نظارہ ایک پل
جوں آئینہ میں چشمِ سراپا ہوں پر عبث
جوں برق آ کے پاؤں نہ رکھا کہ پھر گیا
مجھ گرم رو کے مت ہو مقابل شرر عبث



جوں صبح چاک جیب سے ذرہ بھرے نہ آنکھ
یاں ہے بہ شکل مہر نظر تار تار پر
ابھرے ہے مثل شیشۂ ساعت عبث فلک
اتنا غرور کیجے نہ مشت غبار پر
فوارہ ساں بلند ہے جن کا کہ حوصلہ
دریا دلوں کو تنکے ہیں ماریں ہیں دھار پر

پاس سخن یہی ہے یہاں اوس کی شان پر
مانند خامہ دے جو سر اپنا زبان پر
باقی رہے گا ایک نہ قصہ جہان پر
آ گئے جو ہم بھی اپنی کبھو داستان پر
غم میں ترے جو یوں ہیں اوڑاے پھریں گے خاک
پہنچے گی کوئی دن میں زمین آسمان پر
چھاتی تو پر تھی اشک سے مانند آئینہ
افشا کیا نہ چشم نے راز نہان پر
لاکھوں ہی مردے یار نے یہاں تو دیئے جلا
عیسی بھی ڈال دھرے ہی رہے آسمان پر

پابوس کو بھی یوں کوئی بیٹھے ہے منہ پسار
رکھیو سمجھ کے شمع قدم شمع دان پر
تاثیر آہ کو خم پیری نہ ہو جو شرط
ہو منحصر نہ تیر کا لگنا کمان پر
گھر میں بھی اپنے آئینہ ساں منتظر ترا
حیراں کھڑا رہوں سدا آستان پر
نام آوری جہان میں ہے باعثِ کلنک
نازاں نہ جوں نگیں ہو تو نام و نشان پر
جوں شانہ سینہ چاک ہوں لیکن سوائے شکر
گزرا کبھی نہ شکوہ سر مو زبان پر
تقریر سرگزشت نہ پوچھو کہ خامہ وار
آتا ہے گریہ ہر سر حرف بیان پر

نگاہِ یار سے ہو مست یوں ہشیار بیٹھے ہیں
کہ جوں خورشید ننگے سر سرِ بازار بیٹھے ہیں
دکھاوے مے کے گو سو رنگ جوں قارورہ کیا حاصل
ہم اس مینائے گردوں پر تو مارے دھار بیٹھے ہیں
طلب پر بوسے کے زلفیں لگیں بل کھا کے یوں کہنے
ہم اکثر ایسی باتیں سن کے مونہہ پر مار بیٹھے ہیں
دماغ اب تو فلک پر ہے بتوں کا جو خدائی پر
بشکل ماہِ نو کھینچے ہوئے تلوار بیٹھے ہیں

جگہ کرتی ہے خاک رہ میان شیشۂ ساعت
دلوں میں گھر بنانے کو سرِ بازار بیٹھے ہیں
فلک غرّے سے ہے سرکش تو اپنا سر فرد کب ہے
اس اوندھی کھوپڑی پر مارے ہم بیزار بیٹھے ہیں[1]

فدا، لچھمی رام پنڈت

قاسم[2] نے ان کا نام لچھرام پنڈت اور شیفتہ[3] نے لچھمی رام اور ذکا[4]، سرور[5] اور نساخ[6] لچھمی رام لکھا ہے۔ قاسم ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ طویل عرصے تک دہلی میں مقیم رہے۔ کچھ دن ہوئے لکھنؤ چلے گئے ہیں۔ عبدالرحمٰن خاں قندھاری جو نواب آصف الدولہ کے ملازم ہیں۔ ان کے ہاں وکالت کے عہدہ پہ فائز ہیں اور بانس بریلی میں متعین ہیں۔ عمدگی سے زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔[7] ذکا ان کے بارے میں لکھتے ہیں "مردِ قابل و زیرک است[8]"

۱۔ یہ شعر مجموعۂ نغز سے لیے گئے۔
۲۔ مجموعۂ نغز، ۲، ص ۳۷
۳۔ گلشنِ بے خار، ص ۱۴۶
۴۔ عیار الشعرا (مائیکروفلم) ص ۵۷۸
۵۔ عمدۂ منتخبہ، ص ۴۸۸
۶۔ سخن شعرا، ص ۳۵۸
۷۔ مجموعۂ نغز ۲۰، ص ۱۴۶
۸۔ عیار الشعرا (مائیکروفلم) ص ۵۷۸

گزشتہ حسن کا اب تک نشان باقی ہے
نہوں فریفتہ کیونکر کہ آن باقی ہے
ہوا ہے قصۂ مجنوں اگرچہ شہر آشوب
ہمارے عشق کی بھی داستان باقی ہے
بہار حسن کی جاتی رہی اگر پیارے
تری بلا سے کہ یہ عزّ و شان باقی ہے
کہا جو اون سے کہ میں دل تو کر چکا ہوں فدا
یہ بولے ہنس کے ابھی تجھ میں جان باقی ہے

یک قطعۂ بہشت ہے روے زمین پر
کشمیر جس کی سیر کے قابل زمین ہے

قائمؔ، قیام الدین

قائمؔ اُردو کے اہم ترین شاعروں میں ہیں۔ اُن کے متعلق اُردو کے صاحبِ نظر اور دیدہ ور نقاد مولانا محمد حسین آزاد نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ "ان کا دیوان ہرگز میر و مرزا کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے۔ مگر کیا کیجیے کہ قبولِ عام اور کچھ شے ہے۔ شہرت نہ پائی[۱]"

قائمؔ پر ہندوستان اور پاکستان میں دو اسکالروں نے کام کیا ہے جو زیرِ طبع ہے۔ اُن کا دیوان ڈاکٹر خورشید الاسلام نے مرتب کر کے شائع

۱- آبِ حیات، ص ۱۵۶

کردیا ہے۔ چونکہ قائمؔ شاگردانِ سوداؔ میں ہیں۔ اس لیے صرف خانہ پُری کے لیے مختصر حالات لکھ رہا ہوں۔

قائمؔ نے مخزنِ نکات میں اپنا نام قیام الدین لکھا ہے[1] جبکہ اچھے خاصے تذکرہ نگار اُن کا نام محمد قائمؔ بتاتے ہیں[2] احمد علی خاں یکتاؔ لکھتے ہیں کہ ان کا اصل نام قیام الدین علی اور محمد قائمؔ عرف تھا[3] لیکن امتیاز علی خاں صاحب عرشی اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قائمؔ کے والد کا نام محمد ہاشم اور دادا کا محمد اکرم تھا۔ اس لیے قائمؔ کا نام محمد قائمؔ ہوگا اور قیام الدین ان کا لقب ہے۔ جس کسی نے انھیں قیام الدین علی لکھا ہے۔ وہ ان کے خاندان کے ناموں کی وضع سے واقف نہیں ہے[4]

قائمؔ چاندپور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ ہوش سنبھالتے ہی دہلی آ گئے[5] اور طویل عرصے تک یہیں رہے۔

۱۔ مخزنِ نکات، ص ۷۷۔ اصل نام پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہوں: قائمؔ چاندپوری، سعیدی، نگار (اگست ۱۹۲۸ء) ۔ حضرت قائمؔ چاندپوری، راز چاندپوری، زمانہ (جولائی ۱۹۲۹ء) اور قائمؔ چاندپوری، پنڈت پدم سنگھ شرما، مترجمہ مسعودہ حیات، نقوش (مئی ۱۹۶۱)

۲۔ تذکرہ مسرت افزا بحوالہ معاصر، ص ۱۷۱۔ نکات الشعرا، ص ۱۲۲۔ تذکرہ ریختہ گویان، ص ۱۲۳۔ چمنستانِ شعرا ص ۵۰۱۔ تذکرہ شورش (دو تذکرے) ص ۱۴۴۔ بعض تذکرہ نگاروں نے شیخ محمد قائمؔ لکھا ہے۔ مثلاً تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص ۱۴۵۔ گلزار ابراہیم، ص ۱۹۱ وغیرہ

۳۔ دستور الفصاحت، ص ۴۳۔ قاسم (مجموعہ نغز ۲، ص ۸۱)، سرور (عمدۂ منتخبہ، ص ۴۹۰) نے قیام الدین علی لکھا ہے۔

۴۔ دستور الفصاحت، ص ۴۴

۵۔ مخزنِ نکات، ص ۷۷

قاسم نے لکھا ہے آخر میں امروہہ کے قاضی مقرر ہو گئے تھے۔ تذکرہ شعرائے اُردو کی تالیف کے وقت قائمؔ سنبھل مراد آباد میں تھے۔ جیسا کہ میر حسن نے لکھا ہے۔ احمد یار خاں یکتا لکھتے ہیں کہ قائمؔ نے نواب محمد یار خاں اور پھر اُن کے لڑکے نواب احمد یار خاں کی رفاقت میں کافی زمانہ گزارا۔ مصحفی کی قائمؔ سے ملاقات نواب محمد یار خاں کے دربار میں ہوئی تھی۔ قائمؔ ہی کے توسط سے مصحفی کی نواب تک رسائی ہوئی تھی اور انھیں کی وجہ سے مصحفی نے قصیدہ پڑھا تھا اور نواب کی ملازمت حاصل کی تھی۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ عرصۂ قلیل میں ہم دونوں میں بہت ربط و اتحاد ہو گیا۔ قائمؔ کے پاس نواب کی غزلوں کے مسودے آتے تھے وہ قائمؔ مصحفی کو اصلاح کے لیے دے دیا کرتے تھے۔ کٹھیر کی آبادی برہم ہو گئی۔ وہ نواب رہے نہ دربار۔ قائمؔ نواب احمد یار خاں کے ملازم ہو کر رام پور آ گئے

قاسم نے لکھا ہے کہ وہ پہلے ہدایت اللہ ہدایتؔ کے شاگرد تھے۔ کسی بات پر بگڑی۔ ان سے تعلق ختم کر لیا اور ان کی شان میں ایک ہجویہ قطعہ کہا۔

شاعری کا اسے آیا ہے بہت سا غرّا[1]
جو یہ کہتا ہے وہ استادِ زماں سنتے ہو
امر ہو دے تو ہدایت کو کروں میں سیدھا
واں سے ارشاد ہوا یوں کہ میاں سنتے ہو
راست ہوتے ہیں کسی سے بھی کہیں کج طینت
تیر ہوتی ہے کہیں شاخِ کماں سنتے ہو

کچھ دن قائمؔ خواجہ میر دردؔ کے شاگرد رہے اور آخر میں مرزا محمد رفیع سوداؔ کا تلمذ اختیار کر لیا!

۱۔ مجموعہ نغز، ۲/۲، ص ص ۸۲۔۸۳

میرزا علی لطف[1]، شیفتہ[2]، امیر مینائی[3] اور حافظ احمد علی خاں شوق[4] نے اُن کا سالِ وفات ۱۲۱۰ھ لکھا ہے۔ لیکن جرأت نے ان کی جو تاریخ وفات کہی تھی۔ اس سے ۱۲۰۸ھ نکلتا ہے۔

جرأت نے کہی یہ رد کے تاریخ وفات، یکتائی کے ساتھ
قائمؔ بنیاد شعر ہندی نہ رہی، کیا کہیے اب آہ[5]

قربانؔ، میر جیون

غیر معروف شاعر تھے۔ بہت کم تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر کیا ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بیس سال کی عمر میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ غالباً میر حسن واحد تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے ان کے حالات قدرے تفصیل سے لکھے ہیں: "بیس سالہ نوجوان تھے۔ سپاہی پیشہ تھے۔ اس عمر میں بہت اچھے شعر کہتے تھے۔ ایک روز فیض آباد میں فرنگیوں کی فوج صف کشیدہ جا رہی تھی۔ یہ قسمت کا مارا اپنے ایک دوست کے ساتھ درمیان میں آگیا۔ اُن کتّوں نے اپنی عادت کے مطابق شور دغل کیا اور بُرا بھلا کہا۔ ہر چند بلائے ناگہانی میں گرفتار ان لوگوں (قربان اور اُن کے دوست) نے عجز و انکسار کیا معافی

۱۔ گلشنِ ہند، ص ۱۳۴

۲۔ گلشنِ بے خار، ص ۱۵۳

۳۔ امیر مینائی، انتخابِ یادگار، ص ۳۰۱

۴۔ حافظ احمد علی خاں شوق، تذکرہ کاملانِ رامپور، دہلی، ۱۹۲۹ء، ص ۳۲۶

۵۔ مخزن نکات، ص ۴

مانگی اور کہاکہ ہم نادانستہ اس جال میں پھنس گئے ہیں۔ راستہ دے دو لیکن ان مغروروں نے قطعی پروا نہ کی۔ اور گالیاں دیں۔ بہت ردّ و بدل کے بعد شرم و غیرت کی وجہ سے خود کو قسمت کے حوالے کر کے تلوار سنبھال لی۔ آخر ایک زخمی ہوا اور یہ نوجوان ان کافرانِ سنگ دل کے ہاتھوں شہید ہوا۔ آفریں ہے اس کی ہمت مردانہ پر کہ عزّت و آبرو پر اپنی جان قربان کر دی۔ خدا اس کو بخشے![1]

کریم الدین نے لکھا ہے کہ "یہ شاعر اس لڑائی میں جو انگریزوں سے فیض آباد میں ہوئی تھی دادِ شجاعت دے کر فوت ہوا۔"[2] لیکن میر حسن کا بیان زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

کلام :

یوں بندِ قبا کھُل گئے جو آن میں گل کے
کیا پھونک دیا تو نے صبا کان میں گل کے
کیا کچھ دلِ بلبل پہ کرے دیکھیے یہ عشق
سو چاک دیئے جس نے گریبان میں گل کے[3]

لطف، مرزا علی

یہ اردو شاعروں کے تذکرے گلشنِ ہند کے مولف ہیں۔ تذکرے میں

۱۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۳۵

۲۔ طبقات شعرائے ہند، ص ۱۶۰

۳۔ میر حسن (ص ۱۳۶) اور عشقی (دو تذکرے، ص ۱۵۷) نے یہی دو شعر دیے ہیں۔

اپنے حالات بہت مختصر بیان کیے ہیں۔ لکھتے ہیں: "..... اسم گرامی والد بزرگوار کا اس خاکسار کے کاظم بیگ خاں ہے۔ متوطن اسطرآباد (ایران) شجاعت بنیاد کے ہیں۔ ۱۱۵۴ھ گیارہ سو چون ہجری میں نادر شاہ کے ساتھ شاہجہاں آباد میں تشریف لائے اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے، کہ آپس میں معرفت ولایت کی تھی، مصدر عنایات بادشاہی ہوئے..... فارسی غزل کے کہنے میں حضرت کو ید طولیٰ تھا اور ہجری تخلص آپ کا تھا۔"[1]

سرور نے لکھا ہے کہ لطف دہلی میں پیدا ہوئے تھے[2]۔ شیفتہ بتاتے ہیں کہ ان کی نشوونما دہلی میں ہوئی تھی[3]۔

بعض تذکرہ نگاروں نے انھیں ساکن لکھنؤ لکھا ہے[4]۔ پتا نہیں وہ کب لکھنؤ پہنچے۔ عشقی کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ یہ لکھنؤ سے مرشد آباد گئے۔ وہاں کچھ دن رہ کر کلکتے گئے اور پھر لکھنؤ واپس آ گئے[5]۔ لیکن شیفتہ لکھتے ہیں کہ عظیم آباد کے نواح سے حیدر آباد گئے[6]۔

لطف نے گلشنِ ہند میں اپنے تلمذ کے بارے میں لکھا ہے: "اصلاح

۱۔ گلشنِ ہند، ص ص ۱۴۶-۱۴۷

۲۔ مجموعۂ منتخبہ، ص ۵۵۰

۳۔ گلشنِ بے خار، ص ۱۶۷

۴۔ مجموعۂ نغز، ۲، ص ۱۴۸؛ تذکرہ عشقی (دو تذکرے)، ص ۱۷۷؛ عیار الشعرا (مائیکرو فلم)، ص ۶۴۷

۵۔ تذکرہ عشقی (دو تذکرے)، ص ۱۷۷

۶۔ گلشنِ بے خار، ص ۱۶۷

فارسی کی اس ہیچمدان کو آپ (کاظم بیگ خاں والدِ لطف) ہی کی جناب سے ہے اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے[1]" لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انھیں مرزا رفیع سودا سے تلمذ تھا[2]

مصحفی انھیں شاگردِ سودا نہیں مانتے۔ انھوں نے لکھا ہے "مثنوی آبدار بہ سلکِ نظم کشیدۂ او حجت برقول مولف است و ازیں جہت خود بہ شاگردی مرزا متہم می کند[3]" شیفتہ نے انھیں شاگرد میر تقی میر لکھا ہے[4] جو ٹھیک نہیں ہے۔ مولوی عبدالغفور نساخ نے شیفتہ کے اس بیان کی تردید کی ہے[5]

امکان یہ ہے کہ مرزا علی لطف کو سودا سے تلمذ تھا۔ لیکن بعد میں اُن کی شاگردی سے وہ مُنکر ہو گئے۔

کلام: پاسِ ناموسِ محبت فرض ہے پروانہ وار
شمع ساں سوزِ شبِ ہجراں زباں پہ لائیں کیا

۱۔ گلشنِ ہند، ص ۱۴۷

۲۔ مجموعۂ نغز، ۲، ص ۱۴۸ — سخن شعرا، ص ۴۰۵ — تذکرۂ عشقی (دو تذکرے)، ص ۱۷۷ — عیار الشعرا (مائیکروفلم) ص ۶۴۷ — طبقاتِ سخن (بحوالہ یادگارِ شعرا، ص ۱۷۱) — انتخاب یادگار، ص ۲۲۸ - وغیرہ

۳۔ تذکرہ ہندی، ص ۲۰۱

۴۔ گلشنِ بے خار، ص ۱۶۷

۵۔ سخن شعرا، ص ۴۰۵

بلبل و گل میں وہ جوشش سرو قمری میں یہ ربط
گلستانِ دہر میں پھر دل کے تئیں الجھائیں کیا
غیر لبریز شکایت ہے مری جانب سے آج
سُن کے میرے قدرداں اب دیکھیے فرمائیں کیا
سنتے تھے طوفانِ نوح آنکھوں سے دیکھا وہ تو لطف
دیکھیے یہ چشمِ گریاں اور اب دکھلائیں کیا

چمن کو کل جو تری مے کشی کا دھیان رہا
ہر ایک پات کے کھڑکے پہ گل کا کان رہا
رہا جو زندہ شبِ تیرۂ فراق میں قیس
سیاہ خیمۂ لیلیٰ کا اس کو دھیان رہا
جو عمرِ خضر ہو شاید تو وصل ہوئے نصیب
یہ زندگی جو تھی اس میں تو امتحان رہا
نہ آنکھ بھر کے کبھو ڈر سے ہم تو دیکھ سکے
وہ سامنے بھی اگر اپنے ایک آن رہا

نہ کر اے بلبلِ دل سوختہ صیاد کا شکوا
کہ جاں بازوں کے دیں میں کفر ہے جلّاد کا شکوا
نہیں شیریں پہ کچھ موقوف یہ قسمت کی خوبی ہے
زبانِ تیشہ سے کوئی سنے فرہاد کا شکوا

یں اپنے سرو قامت سے ہی کیا شاکی تھا گلشن میں
تسلّی ہو گئی قمری سے سُن شمشاد کا شکوا
نہ تنہا میں ہی اپنی خانہ ویرانی کا شاکی ہوں
کرے ہے اک جہاں اُس خانماں آباد کا شکوا
ترے کانوں تلک بھی لطف کچھ آواز آتا ہے
ہے اک عالم کو تیرے نالہ و فریاد کا شکوا

ایک دن حالِ دلِ زار نہ دیکھا نہ سنا
سچ تو یہ تجھ سا بھی دلدار نہ دیکھا نہ سنا
دیکھ کل نبض مری رو کے لگا کہنے طبیب
کبھی میں نے تو یہ آزار نہ دیکھا نہ سنا
وہ مجھے تم نے دکھایا ہے کہ یعقوب نے جو
کبھی اے دیدۂ خونبار نہ دیکھا نہ سنا
لختِ دل کرتا ہے کیا کیا صفِ مژگاں پہ نمود
اس جواں سا بھی نمودار نہ دیکھا نہ سنا
چشم اور گوش زمانہ ہیں مُقر اس کے لطف
ثانیٔ حیدر کرار نہ دیکھا نہ سنا

ہے اس شدّت سے رنگینیٔ کوئے یار کا چرچا
کہ بھولا عندلیبوں کو گل و گلزار کا چرچا

ڈھکا رہ جائے اسرارِ محبت تو غنیمت ہے
ہوا ہے اب حکیموں میں مرے آزار کا چرچا
برنگِ پیکرِ تصویر رہتا ہوں سدا ساکت
ہے اس پر اُس کی محفل میں مری گفتار کا چرچا
ہمیں ہے یار کے چرچے سے یہ فرصت کہاں ہمدم
کہ اب دن رات بیٹھے کیجیے اغیار کا چرچا
بیانِ دردِ دل کس لطف سے کرتے ہزار افسوس
جو ہوتا بزم میں اس کی کبھی اشعار کا چرچا

زہے غفلت کہ ہم دنیا کو بزمِ عیش سمجھے تھے
کھلی چشمِ حقیقت بیں تو کامِ اژدھا نکلا
نہ کر اے لطفؔ ناحق رہروانِ دہر سے حجت
یہی رستہ تو کھا کر پھیر ہے، کعبہ کو جا نکلا

یاروں نے یہ تو کہیے کیا کیا سجھائیاں ہیں
بے وجہ کچھ نہیں یہ ہم سے رکھائیاں ہیں
میں کیا ہوں باختہ رنگ اُس شعلہ رو کے آگے
مہتاب کے بھی منہ پر چھٹتی ہوائیاں ہیں
اک جوئے شیر بدلے اے آفریں ہے فرہاد
کیا بے ستوں میں خون کی نہریں بہائیاں ہیں

کب غنچۂ دل اپنا واشد صبا ہو تجھ سے
گو سینکڑوں گلوں کی عقدہ کشائیاں ہیں
طاقت حباب ساں اک نظارہ کی ملی ہے
ان فرصتوں پہ ظالم یہ خود نمائیاں ہیں
کعبہ سے ہم نہ واقف نہ بتکدے سے آگاہ
یہاں آستانِ دل ہے اور جبہ سائیاں ہیں
اس قد کا سرو سے ذکر چھوٹا منہ اور بڑی بات
غنچے کے دل میں بے ڈھب باتیں سمائیاں ہیں
اے لطف اس غزل پر کہنا بقول سودا
یہ عاشقی نہیں ہے زور آزمائیاں ہیں

تم ہو بزمِ عیش ہے واں اور صحبت داریاں
ہم ہیں کنجِ غم میں یہاں اور جان سے بیزاریاں
تم کو سیرِ باغ و گلگشتِ چمن کا واں ہے شوق
یاں بدن پر ہیں ہجومِ داغ سے گل کاریاں
دھیان ہے آرائشِ زلفِ پریشاں کا تمھیں،
یاد ہیں حالِ پریشاں کی مرے کچھ خواریاں
تم صفائے ساعد و بازو دکھاتے ہو وہاں
ہم پہ یہاں موئے بدن کرتے ہیں نشتر زاریاں
تم نے دکھلائی وہاں پیٹ اور چوٹی کی پھبن
یاں مری چھاتی پہ ہیں کالے نے لہریں ماریاں

نیک و بد دونوں سے یہاں ہم نے تو آنکھیں موند لیں
تم وہاں چتون کی دکھلاتے ہو جادوکاریاں
یہاں برنگِ پیکرِ تصویر ہم خاموش ہیں
گفتگو کی تم دکھاتے ہو وہاں طراریاں
قہقہے تم مارتے ہو وہاں بآوازِ بلند
دشمنوں سے یہاں چھپا کر ہم ہیں کرتے زاریاں
ہر مریضِ غم کی جاں بخشی کا ہے تم کو دھیاں
کھنچ گئیں یاں طولِ شدت سے مری بیماریاں
اضطراب دل سے بے پردہ ہوا یاں رازِ عشق
سوجھتی ہیں وہاں تمھیں ہر بات میں تہ داریاں
کس کس سے بات کیجے بھولتے اک دم نہیں
اُن بھلاوؤں سے وہ باتوں میں تری عیاریاں

کیوں دل پہ مرے جادو اُن آنکھوں کا نہ ٹھن جائے
جس پر کہ پڑے آنکھ سو دیوانہ سا بن جائے
پلکیں وہ نکیلیں کہ نظر جب پڑے ان پر
سینہ میں یہ عالم ہو کلیجہ کا کہ چھن جائے
بے چین بہت لطف کی ہے کل سے طبیعت
اللہ کرے آج وہ روٹھا ہوا من جائے

سب کنارہ گیر اپنے اور بیگانے ہوئے
اب کی فصلِ گل میں ہم بے طرح دیوانے ہوئے
شہر میں پایا نہ تیرے جور نے ٹھہرا کہ اب
گھر بہ گھر ظالم مرے مذکور افسانے ہوئے
بزم میں آیا جو شب وہ گل رُخ خوں شمع سے
بلبلوں کی طرح جی دینے کو پروانے ہوئے
سنتے ہیں، کی محتسب نے بیعتِ دستِ سبو
مژدہ ہے نوشاں کہ پھر آباد میخانے ہوئے
تو تو کس کا آشنا ہے ہاں مگر کہنے کو ہم
آشنا ہو تجھ سے اک عالم سے بیگانے ہوئے

ماہر و فخر، میر فخر الدین

سرور اور نساخ نے لکھا ہے کہ یہ اشرف علی خاں فغاں کے صاحبزادے تھے۔ ان دونوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ اشرف علی خاں وہ بزرگ ہیں جن کے تذکرے پر سودا اور فاخر مکیں کا ادبی معرکہ ہوا تھا۔ ماہر کا فغاں سے کوئی تعلق نہیں۔ قاسم لکھتے ہیں کہ ابتدا میں یہ فخر تخلص کرتے تھے[۳]۔ مصحفی اُن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مدتوں ماہر نے مرزا رفیع سودا کے دیوان کی

۱۔ عمدہ منتخبہ، ص ۱۰۷
۲۔ سخن شعرا، ص ۴۰۷۔ ذکا نے بھی اُن کے والد کا نام اشرف علی خاں فغاں لکھا ہے۔ عیار الشعرا (مائیکرو فلم)، ص ۶۵۱
۳۔ مجموعۂ نغز، ۲، ص ۱۵۳

کتابت کی ہے۔ چونکہ بزرگوں کی صحبت کا فیض ضائع نہیں ہوتا۔ خود بھی کچھ اشعار کہہ کر مرزا کی نظر سے گزارے ہیں۔ اسی لیے اکثر اوقات خود کو مصاحبان و مشیران مرزا سودا میں شمار کرتے ہیں اور فخریہ کہتے ہیں کہ میں ہر وقت سودا کے ساتھ رہتا تھا![1] مصحفی ماہر سے خوش نہیں ہیں۔ انھوں نے تذکرے میں ان کے کلام کے بارے میں رائے دیتے ہوئے لکھا ہے: "طرفہ تر این کہ باوصف آگاہیٔ فن اگر کلامش نگاہ کنی خالی از سخافت نیست، دریں جا ایں مثل بسیار بہ موقع بہ یاد آمدہ کہ دورانِ باخبر در حضور و نزدیکانِ بے بصر دور"[2] ماہر نے سودا کی وفات پر قطعۂ تاریخ لکھا تھا۔ جو اُن کے لوحِ قبر پر کندہ تھا۔ مصحفی نے اس تاریخ کی بھی مذمت کی ہے۔[3] قاسم لکھتے ہیں کہ مرزا رفیع سودا نے سفارش کر کے انھیں نواب شجاع الدولہ کے ہاں ساٹھ روپے ماہوار پر ملازم رکھوایا تھا۔ آج کل بھی لکھنؤ میں سکونت پذیر ہیں۔[4] ان کے دیوان کا قلمی نسخہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے پاس ہے اور بقول قاضی عبدالودود "اس پر دیوان ہوس لکھا ہے اور مقطعوں میں بھی یہی تخلص ہے۔ ہوس اور ماہر ہم وزن نہیں اس لیے مقطعوں میں تبدیل تخلص کے لیے خاص محنت کرنا پڑی ہوگی۔ قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ کام کسی اور شخص نے کیا ہے۔ یہ پتا نہیں کہ اس کا سبب کیا ہے۔"[5]

۱۔ تذکرہ ہندی، ص ۲۲۶

۲۔ ایضاً، ص ص ۲۲۶، ۲۲۷

۳۔ ایضاً، ص ۱۲۶

۴۔ مجموعۂ نغز، ۲، ص ۱۵۲

۵۔ اردو ادب (اکتوبر ۱۹۵۰ء) ص ۱۰۸

کلام :

جو اوس کے در پہ بیٹھے ہیں سمجھتے ہیں وہ در کس کا
ہوے جو اوس کے آوارے وہ کہتے ہیں کہ گھر کس کا
ملی اتنی نہ فرصت بھی کہ اُوٹھ کر مانگتے پانی
ہوا تیرِ نگہ یوں آہ دل میں کارگر کس کا

ہوا اُڑ پڑ سکے جانے کا اس کے گھر کس کا
فرشتہ پَر نہ جہاں مارے وہاں گذر کس کا

جلا ہے سینے میں دل شمع وار ساری رات
رہا ہے آنکھوں سے اشکوں کا تار ساری رات
ہمارے سائے سے چونکے ہے وہ بُتِ وحشی
لیے ہے غیر سے جا ہم کنار ساری رات

ہمیں خیر خواہ اپنا جانو نہ جانو
کہیں کے بھلائی کی مانو نہ مانو
ہوا کام ماہر کا تیرِ نگہ سے
کمانِ ابرو کو اپنی تانو نہ تانو

مونہہ نہ موڑے گا یہ عاصی گر یہی منظور ہے
لیجیے سنگِ جفا اور شیشۂ دل پھوڑیئے

ہوا اس زلف کا کیوں مبتلا دل
بلا سے گر بلا میں پڑ گیا دل[1]

مجذوبؔ ، غلام حیدر

ان کے حالات سوداؔ کے سوانح کے تحت بیان کر دیئے گئے۔ یہاں صرف اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

کلام :

چاہوں مدد کسی سے نہ اغیار کے لیے
میں بھی تو یار کم نہیں دو چار کے لیے
ہے دردِ سر ہی بلبلِ آزاد کی صفیر
موزوں ہے نالہ مرغِ گرفتار کے لیے
طوبیٰ کے نیچے بیٹھ کے روؤں گا زار زار
جنّت میں تیرے سایۂ دیوار کے لیے
مجذوبؔ بہرِ سبحہ ہے منت بھی شیخ سے
پھر برہمن سے عجز ہے زنّار کے لیے

رکھیے لگائے اس کو گر بس چلے ہمیشہ
دینے پہ دل کے کیجے آ رے بلے ہمیشہ

۱۔ یہ اشعار مجموعہ نغز۔ تذکرہ ہندی اور سخن شعرا سے لیے گئے۔

آتے ملے دلے ہو گھر سے کسی کے اس دم
پھیرا کیے چھری ہو میرے گلے ہمیشہ
مجذوب ان دنوں میں پھر روگ کچھ دبایا
رہتے تھے پیشتر تو اچھے بھلے ہمیشہ

چشم دوری میں تری یار یہ گریاں تھی رات
تھی شب ہجر مرے سر پہ کہ طوفاں تھی رات
ناز اختر کو مرے تھا فلکِ ہفتم پر
زلفِ سرکش جو تری تابع فرماں تھی رات
کسی دشمن پہ خدا دن وہ نہ ڈالے جوں کل
سر پہ مجذوب کے اے گبر و مسلماں تھی رات

عداوت سے تمھاری کچھ اگر ہووے تو میں جانوں
بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں
تمھارا ہم سے جو عہدِ وفا ہے اوس کو تم جانو
مرے پیماں میں کچھ نوع دگر ہووے تو میں جانوں
نہ اندیشہ کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی
تم اپنی زلف کو کھولو سحر ہووے تو میں جانوں

قاصد جو بتاتا ہے تو محبوب کی باتیں
باور نہیں آتی ہیں اس اسلوب کی باتیں

تجھ عشق میں رسوا میں ہوا یار جہاں میں
کیا کیا نہ سنی ہم نے بد و خوب کی باتیں

چمن میں حسن سے جب وہ گُلِ اندام لے آیا
اُدھر غنچہ صراحی اور ادھر گُل جام لے آیا
طپش سے مہر کی جب جل گئی ایک خلق کوچہ میں
مہ نو وقتِ شام اوس کو بہ پشتِ بام لے آیا
عجب قیمت ہے اپنے دل کی بازارِ محبت میں
جو کوئی صبح اوس کو لے گیا تو شام لے آیا
گئے تھے ہم ترے کو   سے ارادہ کر نہ آنے کا
گریباں کھینچ کر لیکن وفا کا نام لے آیا
میں کافر ہوں گا مجذوب اب کے شیخ کی ضد سے
بتوں کے پاس سے قاصد اگر پیغام لے آیا

بد کہنے کو کسی کے معیوب جانتے ہیں
اپنے تئیں کو یارو ہم خوب جانتے ہیں
قاصد ہزار ڈھب سے باتیں بناوے یارو
ہم تو زباں کی اوس کی اسلوب جانتے ہیں
خاطر میں کون لاوے میرا سخن کہ مجکو
سودا کا شن کے بیٹا مجذوب جانتے ہیں

بتاں قربانیِ عشاق کی تمہید کرتے ہیں
رنگا مہندی کو ہاتھوں میں یہ ظالم عید کرتے ہیں
طبیعت اس قدر بادی انھوں کی ہے کہ جب دیکھو
وضو کی شیخ جیو بیٹھے ہوئے تجدید کرتے ہیں

جور و جفا پہ یار کی دل مت نگاہ کر
اپنی طرف سے ہووے جہاں تک نباہ کر
نام و نشاں رہا نہ جہاں میں تو کیا ہوا
مثلِ نگیں تو منہ کو نہ اپنے سیاہ کر

آوے کبھی مسیحا میرے بالیں پہ تو کیا ہو
بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو
مجذوب ترے عجز و تکبر سے ہوں نالاں
بندہ ہو کبھی بیٹھے ہے تو گاہ خدا ہو

اے میر سمجھیو مت مجذوب کو اوروں سا
ہے وہ خلفِ سودا اور اہلِ ہنر بھی ہے[1]

محب، شیخ ولی اللہ

اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ یہ دہلی کے رہنے

۱۔ اشعار طبقات الشعرا (قلمی) مجموعۂ نغز اور تذکرۂ ہندی سے لیے گئے۔

والے تھے۔[1] مگر خود محب کا ایک شعر ہے۔

محب ہندوستاں زادوں کی گویائی کو کیا پہنچے
سخن کہنے میں ہو جس کا وطن سرہند انبالہ[2]

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ محب انبالہ کے رہنے والے تھے اور غالباً بچپن میں دہلی آ گئے۔ خوب چند ذکا لکھتے ہیں کہ شاہ افضل خدا نما معروف و مشہور بزرگ تھے۔ محب ان کی اولاد میں ہیں۔[3] یہ دہلی سے نکل کر فرخ آباد پہنچے۔ وہاں کچھ عرصے نواب مہرباں خاں رند کے ساتھ رہے۔[4] اور پھر لکھنؤ آ گئے۔ جہاں مرزا محمد سلیمان شکوہ کے دربار سے متوسل ہو گئے۔[5] بقول مصحفی یہیں "مرضِ مزمن ناسور پا" میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ مصحفی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے انتقال کو دو سال ہوئے۔ تذکرۂ ہندی ۱۲۰۹ھ کو پایۂ اختتام کو پہنچا۔ جس کا مطلب ہے کہ لگ بھگ ۱۲۰۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ کریم الدین نے بھی ان کا سنہ وفات ۱۲۰۷ھ ہی لکھا ہے۔[6] پیر جلیل میں مدفون ہوئے۔[7]

۱۔ تذکرۂ ہندی، ص ۲۲۱ — عمدۂ منتخبہ، ص ۶۷۳ — سخن شعرا، ص ۴۱۵ - وغیرہ

۲۔ محب، حکیم سید احمد اللہ قادری، زمانہ (جولائی ۱۹۲۹ء)، ص ۳۰

۳۔ عیار الشعرا (مائیکرو فلم)، ص ۶۶۷ اور مجموعۂ نغز، ۲، ص ۱۶۴

۴۔ تذکرہ عشقی (دو تذکرے)، ص ۲۳۵ اور تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۵۱

۵۔ تذکرۂ ہندی، ص ۲۲۱

۶۔ طبقات شعرائے ہند، ص ۳۱۱

۷۔ تذکرۂ ہندی، ص ۲۲۱

کلام :

شاید کہ لکھا یوں تھا تقدیر الٰہی میں
عاشق کی رہے کشتی امواجِ تباہی میں
یوں دل کے سویدا میں روشن ہے تری صورت
جوں چشمۂ حیواں کا ہے نور سیاہی میں
ہے مشربِ رنداں میں بالفعل تو مے رائج
اس امر کو زاہد نے سمجھا ہے مناہی میں
معراج گدائی کا ہوتا نہیں کم ہرگز
پستی و بلندی ہے یاں افسرِ شاہی میں
دریا میں حباب آسا کیا مظہرِ وحدت ہے
جو غرق سراپا ہے اسرارِ الٰہی میں
ہر برگ گل لالہ اک مظہرِ خونی ہے
سینہ کے محبّ تیرے داغوں کی گواہی میں

مے جو گلگونوں کے شیشہ میں بھری رہتی ہے
چشم مستوں میں عجب جلوہ گری رہتی ہے
نالہ بلبل ہے چمن زار ہے دل داغوں سے
آہ تا صبح نسیمِ سحری رہتی ہے
لب و چشم اپنے، ہیں ایک عالم خشکی و تری
عشق کی سلطنتِ بحر و بری رہتی ہے

اشک باری سے غم و درد کی کھیتی باڑی
لہلہی سی نظر آتی ہے ہری رہتی ہے
بے نشاں زخم سے اُس تیر نگہ کے دل سے
درد رہتا ہے نہ پیکاں نہ سری رہتی ہے
دل کو لے ڈوبتی کیونکر نہ نظر آئے محبؔ
کشتیِ چشم تو پانی سے بھری رہتی ہے

ہزار صاحبِ تدبیر ہو تو کیا حاصل
موافق اس سے نہ تقدیر ہو تو کیا حاصل
ملے سے عاشق و معشوق کی بڑی ہے قدر
جدا کمان سے گر تیر ہو تو کیا حاصل
نہ حرف ہو نہ حکایت خموش مجلس عیش
بہ شکل صفحۂ تصویر ہو تو کیا حاصل
جہاں کو پائے قناعت سے اے محبؔ کر سیر
جو دستِ حرص گلو گیر ہو تو کیا حاصل

ریختہ کے ملک کا سوداؔ کو بخشا تو نے راج
اس نگر میں کون ایسا ناظم و ناثر ہوا

جس طرف تشنۂ دیدار ترے جا نکلے
ادھر آنکھوں سے بہاتے ہوئے دریا نکلے

یار آیا نہ کہا ضعف سے میں اتنا بھی
خیریت صاحبِ من آج کدھر آ نکلے

قافلہ پہلی ہی منزل سے دیا ہم نے چھوڑ
سفرِ ملکِ عدم کو تنِ تنہا نکلے

جی جو بے چین ہے کوچہ ہی ترا دیکھ آئے
کیا کریں ایک گھڑی دل وہیں بہلا نکلے

ہم چمن میں گئے تھے سیر کو گل دیکھتے ہی
یاد آیا جو وہ گل باغ سے گل کھا نکلے

اُس بت نے گلابی جو اٹھا منہ سے لگائی
شیشہ میں عجب آن سے جھمکی تھی خدائی

عالم میں نشہ کے شبِ مہتاب میں تیرے
خورشید سے مکھڑے نے طلسمات دکھائی

مارا ہے اُسے چھوڑ ترے تیر نگہ نے
جس ساتھ میاں تونے ذرا آنکھ لڑائی

گو غیر کے ملنے کی قسم کھاتے ہو پیارے
چھپتی نہیں وہ بات جو ہو دل سے بنائی

واللہ ہمیں عشق کی بھولی ہوئی سب چال
کافر تری رفتار نے پھر یاد دلائی

ہر دم تو بھرا شیشہ جھکاتا ہے نشہ میں
ڈرتا ہوں کہ تیری نہ موڑک جائے کلائی

آئینہ نمد پوش ہوا عشق میں تیرے
چار ابروؤں کی لے کے فقیرانہ صفائی
ہم جھوٹ کہیں تو نہ ہو دیدار خدا کا
ہے روزِ قیامت تری اک شب کی خدائی
عاشق کو محبؔ سلطنت ہر دو جہاں ہے
گر یار کے کوچہ کی میسر ہو گدائی

چشمِ پر آب میں ہے جلوہ قدِ دل جو کا
دید کرتا ہوں عجب سروِ کنارِ جو کا
شبِ فرقت میں جو اٹھتی ہیں جگر سے آہیں
اک جہاں مجکو نظر آئے ہے عالم ہو کا
ہاتھ تب عشق کے میں سنگِ گراں کے ڈالا
روزِ فرہاد کے جب تول لیا بازو کا
باندھنوں پر یہ نیا باندھنوں باندھا ہی محبؔ
شوخ نے چیرہ جو سر پر ہے سجا سالو کا

عظیم اور انشا کے ادبی معرکے میں محبؔ نے عظیم کا ساتھ دیا تھا۔ انھوں نے ایک غزل کہی جس میں اس ادبی معرکے کا ذکر ہے۔ ہوا یوں کہ انشا نے بادشاہ کو اس پورے گروہ کے خلاف یہ کہہ کر بھڑکا دیا کہ مشاعرے میں فلاں فلاں آپ کی غزل پر قہقہہ مار کر ہنس رہے تھے اور غالباً انشا نے بادشاہ سے درخواست کی تھی کہ وہ اس ادبی معرکے میں انشا کا ساتھ

ذیل۔ اب وہ غزل ملاحظہ ہو۔

سرسبز خط فرماں رہے تحریر کے آگے
ہو لال زباں واں مری تقریر کے آگے
دل ہے سونگہ تیرے کہ ہے تیر کے آگے
سر ہے جو خمیدہ دم شمشیر کے آگے
تدبیر پڑی ٹھوکریں کھاتی رہی پیچھے
یاں حضرت انساں تری تقدیر کے آگے
ہوتا ہے ہمیں محو خدائی کا بھی آداب
جا نکلے ہیں جب اس بتِ بے پیر کے آگے
شیطاں جسے کہتے وہ اے شیخ مزوّر
پیچھے ہی رہے ہے تری تزویر کے آگے
کیا معنی ہے آئینہ نہ پانی ہو بہ صد رنگ
اس بوقلموں شوخ کی تصویر کے آگے
کس طرح نہ ہو سلسلا زنجیر کا برپا
دیوانوں سے اس زلفِ گرہ گیر کے آگے
مبحث میں پکے چاہیے تضیہ شعرا کا
اس فن کے کسی صاحبِ توقیر کے آگے
ہے نقص جو شاعر ہوئے فریادی وداد ی
اکبر کے حضور اور جہانگیر کے آگے

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ مجموعۂ نغز، ۱، ص ص ۸۲-۸۶

نیزے پہ ہدف کر کے رکھیں ہم سر حاسد
اور تیر قلم اپنے کے سر تیر کے آگے
ہو رستم میداں سخن کے بھی ہمارا
یک مصرع سو مصرع شمشیر کے آگے
جو عرض مطالب کرے مقصد ہی کو پہنچے
با صدق محبّ حضرت شبیر کے آگے[1]

معین، شیخ محمد معین الدین

سرور نے باشندہ الہ آباد لکھا ہے[2]۔ جو درست نہیں۔ یہ بدایوں کے رہنے والے تھے۔ البتہ الہ آباد میں کافی دن رہے تھے[3]۔ شورش نے لکھا ہے کہ الہ آباد میں جو بادشاہ کے لیے باغ تیار ہوا تھا اور "رونق افزا" جس کا نام رکھا گیا تھا معین نے اس باغ کی مدح کی تھی۔ اسی مدح کے وسیلے سے انھیں سرکارِ عالی میں ملازمت مل گئی۔ اس قصیدے کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

اے فلک تیرے ستاروں میں کہاں ایسی بہار
باغِ حضرت میں جو کچھ جلوۂ داؤدی ہے[4] (کذا)

۱۔ یہ اشعار زمانہ جولائی ۱۹۲۹ء، مجموعۂ نغز اور تذکرۂ ہندی سے لیے گئے۔

۲۔ عمدۂ منتخبہ، ص ۸۶۰

۳۔ تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص ۲۳۱ ۔ گلزارِ ابراہیم، ص ۲۳۵ اور گلشن سخن (قلمی) ورق ۹۲ ب

۴۔ تذکرہ شورش (دو تذکرے) ص ۲۳۰

الہ آباد سے یہ لکھنؤ آ گئے تھے[1] قاسم نے لکھا ہے کہ مدت سے عظیم آباد میں ہیں[2] میری نظر سے کوئی اور تذکرہ نہیں گزرا جس میں ان کے قیام عظیم آباد کا ذکر ہو۔ البتہ میر حسن نے لکھا ہے کہ آج کل خیر آباد میں ہیں[3]

میر حسن ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "اکثر اپنے معاصر شاعروں سے جھگڑتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مجھ فقیر کے شعر پر بے جا اعتراض کیا۔ ہر چند سمجھایا نہ سمجھے۔ مرزا رفیع کی سند دی۔ نہیں مانے۔ کہنے لگے میرے پاس مرزا کے دیوان کا صحیح نسخہ ہے۔ اُس میں تو اس طرح نہیں ہے۔ غرض جس جگہ ایسا لفظ پاتے ہیں۔ استاد کے دیوان کو اپنی مرضی کے مطابق درست کر لیتے ہیں[4]" اس سب کے باوجود میر حسن نے ان کے کلام کی بہت تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں۔ لیکن اس تمام خود آرائی اور خود پسندی کے باوجود ان جیسا صاحب طبع کوئی نہیں ہے۔ مثنوی، قصیدہ اور ہجو خوب کہتے ہیں"[5] سرور انھیں "بسیار شیریں کلام" لکھتے ہیں[6]

۱۔ خلیل نے لکھا ہے اس وقت کہ ۱۱۹۶ھ ہے معیّن لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ گلزار ابراہیم، ص ۲۳۵

۲۔ مجموعۂ نغز، ۲، ص ۲۰۱

۳۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۱۶۵

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔ عمدۂ منتخبہ، ص ۶۸۰

کلام :

اے بادِ صبا باغ میں مت جائیو تڑکے
سوتا ہے وہ گل بات مبادا کہیں کھڑکے
جوں پشم کی تختی اگر اوس راحتِ جاں کو
چھاتی سے لگا رکھیے تو دل کاہے کو دھڑکے
آتے ہی نہیں گر کے سوئے چشم پھر آنسو
اس گھر سے مگر روٹھ کے نکلے ہیں یہ لڑکے
قمری ہے فدا باغ میں شمشاد کی دھج پر
ہم صدقے ہیں اے سروِ رواں تیری اکڑ کے
قصہ ہی کرو مختصر اب جانے دو یارو
کیا لینا ہے تم کو مرے قاتل سے جھگڑ کے
سر رشتہ رہِ عشق کا ہرگز نہ کروں گم
سو ٹکڑے اگر سبحہ نمط ہوں مرے دھڑ کے
اے ابرِ بہاری شبِ ہجراں میں خبردار
دامن ترا اس آہ کے شعلے سے نہ بھڑکے
ہوں میں وہ دوانا کہ بہار آنے سے پہلے
زنجیر میں رکھتا ہے مجھے مجکو جکڑ کے

دیں جگہ تیری جفا کو دلِ صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا تجھ بتِ بے باک میں ہم
نقشِ پا کی نمط اے راحتِ جانِ عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

لختِ دل نہیں ہے جو لے نکلے ہے نت قاصد اشک
پرزے حال اپنے کے بھیجے ہیں تجھے ڈاک میں ہم
خوش ہم عریانی سے اپنی ہیں بہ رنگ بوئے گل
نکلے جاتے ہیں ٹھہرتے نہیں پوشاک میں ہم
پھرے نالوں سے نہ راتوں کو معیّن دن اپنے
آہ کب تک رہیں گے گردشِ افلاک میں ہم

غیر تجھ دستِ ستم سے گو پھریں بھاگے ہوئے
ہم تو ہیں جیوں سایہ قدموں سے ترے لاگے ہوئے
بھر رہی ہے نیند آنکھوں میں چھپاتے ہو عبث
ٹک ادھر تو دیکھنا دو رات کے جاگے ہوئے

رباعی

جب سے تجھ ساتھ دل لگایا ہم نے
کیا کیا اندوہ و غم اٹھایا ہم نے
تقصیر نہیں ہے اس میں تیری باللہ
جیسا کہ کیا تھا ویسا ہی پایا ہم نے

دیگر

دل کے ہاتھوں ہمارا جینا معلوم
خوں پیتے ہیں اب تو مے کا پینا معلوم

گر جیب پھٹا ہو تو رفو ہو ناصح
یہ چاک جگر ہے اس کا سینا معلوم[1]

ممتاز، حافظ فضل علی

دہلی کے شیخ زادوں میں سے تھے۔[2] بقول میر حسن حافظِ قرآن تھے۔[3] قدرت اللہ شوق کے آنولے میں اُن سے ذاتی تعلقات رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ دکن جاتے ہوئے رہزنوں کے ہاتھوں شہادت پائی۔[4] میر حسن ان کے بارے میں لکھتے ہیں "شاعرِ دردمند وگداز ..... سررشتۂ طرزِ کلامش استوار وگل فکرِ بیانش رشکِ لالہ زار، سخنش شاعرانہ وطرزش استادانہ[5]" شوق لکھتے ہیں "طبع سلیم وجولاں داشت، رسائی بحرش از مذاق سخنش پیدا واستعداد قابلیتش از صفحاے گفتگویش ظاہر وہویدا۔[6]"

ممتاز کا قلمی دیوان سالار جنگ لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ یہاں اس سے انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ یہ اشعار تذکرہ شعراے اُردو، مجموعۂ نغز، تذکرہ ہندی اور تذکرہ شورش سے لیے گئے۔

۲۔ تذکرہ عشقی (دو تذکرے)، ص ۱۸۹

۳۔ تذکرہ شعراے اُردو، ص ۱۶۰

۴۔ طبقات الشعرا (قلمی)، ورق ۱۰۵ ب

۵۔ تذکرہ شعراے اُردو، ص ۱۶۰

۶۔ طبقات الشعرا (قلمی)، ورق ۱۰۵ ب

یاد نہیں عمر بھی یا خواب تھا بے ہوشی کا
ناگہاں شکر بجا لاؤں فراموشی کا
لختِ دل مونہہ سے نکلتے تھے ابھی بات کے ساتھ
پوچھ مت راز صبا غنچے کی خاموشی کا
کان میں گل کے صبا کہتی رہی راز اور ہم
آہ پائے نہ مزہ عمر میں سرگوشی کا

ڈھونڈے ہے قدر مرتبہ جس کے کمال کا
پہونچے کب اوس کو حوصلہ میرے خیال کا
جب سے نظر پڑا ہے ترا حسنِ بانمک
کچھ پوچھ مت بیاں دلِ شوریدہ حال کا
دنیا کے بیچ وہ بھی کوئی آدمی ہے یار
اندیشہ ہوے جس کو نہ اپنے ہی مال کا
نیکی بھی وہ زیادہ نہ چاہے بدی تو کیا
جس شخص کو ملا ہو مزا اعتدال کا

رؤں میں کس لیے رنجش سے پیار میں کیا تھا
میں اب خزاں کو جو رؤں بہار میں کیا تھا
جفائے یار نے کس طرح کردیا مایوس
اور اپنے خاطرِ امیدوار میں کیا تھا
تیرے ہی واسطے آئے عدم سے ہم یہاں تک
وگرنہ ہستیٔ ناپائیدار میں کیا تھا

دشمن نہ ہو دیدہ تو ہمارا
پامال نہ کر لہو ہمارا
رسوا ہوئے اتنے ہم کہ صد شکر
مذکور ہے کو بہ کو ہمارا
اے نالہ نہ ہو بلند خاموش
بھڑکے نہ وہ شعلہ خو ہمارا

پوچھے اگر تیرے سے کوئی کیونکر اوٹھے گا حشر
اپنی جگہ سے اُوٹھ کے تو اس کو بتا کہ اس طرح

ہے یار کے لیے ہمیں اغیار سے غرض
ہوتی ہے جیسے گل کے سبب خار سے غرض
کیا جانیے کدھر ہے ترا بدگماں خیال
مجھ کو تو ہے فقط ترے دیدار سے غرض
ممتاز سب کو اپنے ہی مطلب سے یہاں ہی کام
مقصد نہ دشمنی سے ہے نہ پیار سے غرض

عشق میں تیرے سجن اپنے ہمیں کام سے کام
نہ ہمیں کفر سے مطلب ہے نہ اسلام سے کام

فرصت کا جو وقت پائیں گے
احوال تیرا سنائیں گے

اے ساقی برنگ جام و شیشہ
رو رو کے تجھے ہنسائیں گے
لادیں گے اور لاکھ مضموں
پھر ایسی غزل بنائیں گے
قائم رکھنا وفا کا ممتاز
جیتے جی تو کر دکھائیں گے

تیری نگہ سے زلفِ سیہ کے نقاب میں
بجلی چمک کے رہ گئی پیارے سحاب میں

اوٹھایا جب سجن مکھ سے نقاب آہستہ آہستہ
لگا بادل میں چھپنے آفتاب آہستہ آہستہ
تو شاید سیر کر آیا کہ موںہہ پہ اہلِ گلشن کے
چھڑکتی ہی رہی شبنم گلاب آہستہ آہستہ
مری کم اضطراری پہ خفا مت ہو جیو پیارے
نیا ہوں سیکھتا ہوں اضطراب آہستہ آہستہ

برسات میں جب تو ہو آرام کی بارش ہے
گر تو نہ نظر آوے کیا کام کی بارش ہے
دلدار سے اب اپنے اوقات یکے ہے یوں
یک بوسہ اگر چاہیں دشنام کی بارش ہے

ہمارے جی میں جو کچھ ہے سو یار کیا جانے
وہ حالتِ دلِ بے اختیار کیا جانے
نہ پوچھیو دلِ عاشق سیتی رموزِ نشاط
یہ بلبلِ قفسی ہے بہار کیا جانے

ابھی تلک میری آنکھوں سے اشک جاری ہے
تمھارے خنجرِ مژگاں کی آبداری ہے
بہ شکل آئینہ ہے آنکھ اوس کی چشم براہ
کسو کی نرگسِ شہلا کو انتظاری ہے
اکیلے جینا بھی اے خضر کچھ رکھے ہے مزہ
یہ زندگی ہے تری یا نفس شماری ہے

موسمِ عیش ہے جوانی ہے
یہی کچھ لطفِ زندگانی ہے
مجھ کو پوچھو تو دوست کا ملنا
یہی شادی ہے شادمانی ہے
مجھ سے تو پوچھتا ہے ہنس ہنس کر
کیوں تیرا رنگ زعفرانی ہے
حالِ دل تیرے روبرو کہنا
جانِ من یہ بھی اک کہانی ہے

شمیمِ گل جو قفس تک نسیم لائی ہے
کوئی خبر دے مجھے کیا بہار آئی ہے
تجھے نگاہِ مروت اگر نہیں تو نہ ہو
ہمیں تو مدِ نظر پاسِ آشنائی ہے
ہم آگے ہاتھ پساریں ترے معاذ اللہ
ہمارے پاس دعا مانگنا گدائی ہے
پہونچ سکے نہ کسو دل تلک تو کیا ممتاز
اگرچہ تا بفلک آہ کی رسائی ہے

کیا میرا عشق ہے بہانہ ہے
ناصحو یہ عجب زمانہ ہے
اپنے عاشق سے تو برا مت مان
اوس کی کیا بات وہ دیوانہ ہے
غم کو فرہاد و عیش کو پرویز
یہ خدائی کا کارخانہ ہے

اے بُت تجھے ہم اپنا کریں رام تو ہی
تجھ سے نکالیں دل کا اگر کام تو سہی
دکھلاویں جز رقیبوں کو غربت وطن کے بیچ
ہم دشمنوں کی صبح کریں شام تو سہی
شاہی سے لے کے تا بخدائی کائنات
جو دل کہے سو کر دیں سر انجام تو سہی

نالاں، میر احمد علی

دہلی کے رہنے والے تھے۔ عظیم آباد چلے گئے تھے[1] صاحب دیوان شاعر تھے[2] لیکن خلیق لکھتے ہیں کہ نالاں خود کو شاگردانِ سودا میں شمار کرتے ہیں۔ میں نے مرشد آباد میں انھیں دیکھا۔ بالکل استعداد نہیں رکھتے تھے[3]

کلام:

غیر سے کیا امید کیا شکوا
اپنا اپنا ہی دل اگر نہ ہوا

یہ میری آستیں جل جاے ہے پونچھوں ہوں جب آنسو
اثر رکھتا ہے میرے اشک کا یہ آب آتش کا

اگرچہ حسن لاثانی سجن مہتاب رکھتا ہے
ولے ہو روبرو تیرے کہاں یہ تاب رکھتا ہے

حسرتِ دل کے سوا یاں سے نہ لے جاویں گے
ایک دن دست تہی ہم بھی چلے جاویں گے
شب کو مے نوش مرا کیفی ہو بولا نالاں
گو نشے میں ہیں پر اب گھر کو چلے جاویں گے

۱۔ تذکرۂ شورش (دو تذکرے)، ص ۲۷۶

۲۔ تذکرۂ عشقی (دو تذکرے)، ص ۲۷۷

۳۔ گلزار ابراہیم، ص ۲۴۴

میں کہا ہنس کے کہ کیا سچ ہی سدھاروگے اب
مسکرا کر وہ لگا کہنے سبلے جاویں گے

دلِ سوزاں کو یاد و یوں نہاں رکھتا ہوں پہلو میں
کہ اخگر جیسے خاکستر میں کوئی ڈھانپ رکھتا ہے[1]

نثار، منشی سدا سکھ

بشاش نے ان کے بارے میں لکھا ہے: "...... خلف سیتل پرشاد، باشندہ دہلی، قوم کائستھ، مقیم الہ آباد، شاگردِ سودا صاحب دواوین اردو و فارسی و بھاکا و مثنوی گزلے ایک، واسوخت بھی کہا ہے[2]۔" بہت غیر معروف شاعر ہیں۔ اکثر تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔

کلام :

کیا سنگار رجھانے کو کس کے تم نے چشم
کہ بال بال دُرِ اشک جو پروئیں ہیں

ہمارا ہی دل جب ہمارا نہیں ہے
تو شکوہ ہمیں کچھ تمہارا نہیں ہے[3]

۱۔ یہ اشعار تذکرہ شورش اور تذکرہ عشقی سے لیے گئے۔

۲۔ دیبی پرشاد بشاش، آثار شعرائے ہنود، دہلی، ۱۸۸۵ء، ص ۱۳۱

۳۔ یہ اشعار سخن شعرا اور تذکرہ عشقی سے لیے گئے۔

نظیر

ان کے نام کا پتا نہیں چل سکا۔ بہت غیر معروف شاعر تھے۔ قاسم نے لکھا ہے کہ محمد آباد بنارس کے رہنے والے تھے۔[1] شیفتہ لکھتے ہیں۔ نظیر ایک شخص کا تخلص ہے جو خود کو شاگردِ سودا بتاتا ہے۔[2]

کلام:

جب ترے کوچے سے ہم اُوٹھ کے چلے جاتے ہیں
شعلۂ آہ کی گرمی سے جلے جاتے ہیں

تاریک نظر دیکھے تجھے اے مہ تاباں
رہتا ہے سدا مہر درخشاں ہمہ تن چشم

وحشت، میر ابوالحسن

اشپرنگر نے قائم اور علی ابراہیم کے حوالے سے لکھا ہے: "...ساکن مینو متصل دہلی، تیر انداز خاں کے پوتے اور سودا کے شاگرد تھے۔ ۱۱۶۸ھ سے پیشتر یہ انتقال کر چکے تھے۔[3]" قائم نے لکھا ہے کہ کچھ عرصہ ہوا ان کا انتقال ہو چکا۔[4] علی ابراہیم نے انھیں تیر انداز خاں کا پوتا اور شاگردِ سودا بتایا ہے۔[5]

۱۔ مجموعہ نغز، ۲، ص ۲۰۸

۲۔ گلشن بے خار، ص ۲۳۲

۳۔ یادگارِ شعرا، ص ۲۱۴

۴۔ مخزنِ نکات، ص ۶۱

۵۔ گلزار ابراہیم، ص ۲۵۲

مطبوعہ نسخوں میں ان کے وطن کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ پتا نہیں اشپرنگر کو کہاں سے ملی۔ ممکن ہے اس کے پیشِ نظر ان تذکروں کے ایسے قلمی نسخے رہے ہوں جن میں وحشت کے وطن کا ذکر کیا گیا ہو۔ عشقی لکھتے ہیں۔ "جوانے اہلبیت شعار، سپاہی پیشہ" عشقی نے لکھا ہے کہ میر غلام حسن کے تذکرے اور گلزار ابراہیم سے یہ معلوم ہوا کہ محمد حسن حسنؔ اور ابوالحسن وحشت ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ میر تقی میر نے ان کا ذکر میر حسن حسنؔ کے نام سے کیا ہے۔ ممکن ہے ابوالحسن کا لقب محمد حسن بھی ہو اور وحشت و حسنؔ دونوں تخلص کرتے ہوں۲

کلام :

میں تو شروع نزع سے کی تھی تجھے خبر
پہنچا تو اس گھڑی کہ مرا کام ہو چکا

گہ گریۂ شب، گاہ میں آہِ سحری ہوں
جو کہیے سو ہوں پر گرہِ بے اثری ہوں
جس پاس میں جاتا ہوں سو منہ پھیرے ہی مجھ سے
گویا کہ میں گردِ قدمِ رہ گذری ہوں

قاتل اگر کہے کہ سسکتا ہی چھوڑ یو
خنجر تو ایک دم کے لیے منہ نہ موڑیو

۱۔ تذکرۂ عشقی (دو تذکرے)، ص ۳۰۹

۲۔ ایضاً، ص ۳۰۹

شیشہ نہیں جو مول لیا دیں گے پھر اُسے
پیارے یہ دل ہے اس کو سمجھ کر کے توڑیو

کروں گا اس دوانے دل کی میں تدبیر آنکھوں سے
لگی ہے بہنے موجِ اشک کی زنجیر آنکھوں سے
مثالِ عکسِ آئینہ نکل جاتا ہے جی میرا
جب ہی (کذا) ٹک دور ہوتے ہی تری تصویر آنکھوں سے

کہیں یہ جھوٹ دیکھا ہے تجھے جب میں بلاتا ہوں
صریحاً تو چلا جائے مجھے کہتا ہے آتا ہوں

نسترن ہے گل ہے سوسن ہے گل اور نگ ہے
اے بہارِ باغ بے رنگی یہ کیا کیا رنگ ہے

بید مجنوں کی طرح جتنی بڑھی گھٹتی ہے
شجرِ عمر کی بالیدگی معکوسی ہے[۱]

ہاشمی، میر ہاشم علی

مصحفی نے ان کا نام میر ہاشمی لکھا ہے جو غالباً سہو کاتب ہے۔ لکھنؤ کے

۱۔ یہ اشعار مخزنِ نکات سے لیے گئے۔

رہنے والے تھے۔ مصحفی لکھتے ہیں۔ میں نے انھیں لکھنؤ میں دیکھا ہے۔ ان کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ہو گی[1]۔

کلام :

مرا سو بار اُس تک نامۂ پُر آرزو پہنچا
پہ اُودھر سے جوابِ صاف پہنچا جب کبھو پہنچا
کیا افشا تمھیں نے رازِ عشق اے دیدۂ گریاں
بگوشِ خلق ورنہ کس طرح بے گفتگو پہنچا
دماغ آشفتہ ہوتا ہے صبا نکہت سے سنبل کی
مشامِ آرزو میں تو کسی کا کل کی بو پہنچا
ابھی چھوٹا ہے موجِ رشک کی زنجیر سے قمری
نہ پھر گوشِ دلِ دیوانہ تک آوازِ ہو پہنچا
یہ دعوے سب کے باطل محکمہ میں ہاشمی ہوں گے
اگر حاکم تلک وہ شوخ باردے نکو پہنچا

آہ و نالہ کے دو مصرع جو کہے ہیں موزوں
صاحبِ درد اُسے شعرِ فغانی سمجھا
وہ برہمن بچہ افسوس کہ اے ہم نفساں
قصۂ درد مرا رام کہانی سمجھا

۱۔ تذکرۂ ہندی، ص ۲۷۰

کچھ کفر و دیں میں شاید رشتہ ہوا برہمن
تسبیح شیخ کی، جو زنار درمیاں ہے
غیرت یہ چاہتی ہے ہم آئینہ کو توڑیں
پر کیا کریں کہ روے دلدار درمیاں ہے[1]

کچھ تذکرہ نگاروں نے میر حسن، صغیر علی مروّت اور گنا بیگم منتظر کو بھی شاگردانِ سودا میں شمار کیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کو سودا سے تلمذ نہیں تھا۔ یہ محض بعض تذکرہ نگاروں کی غلط فہمی ہے۔

۱۔ یہ اشعار مجموعۂ نغز، سخن شعرا اور تذکرۂ ہندی سے لیے گئے۔

حاصلِ سخن

مرزا محمد رفیع سودا نے جب ہوش سنبھالا تو مغل حکومت کی شکست و ریخت ہو رہی تھی۔ مرہٹے، جاٹ، سکھ، روہیلے اور انگریز اس عظیم الشان عمارت کی بنیادیں ہلا رہے تھے۔ ان میں سے ابتدائی تین طاقتیں خود مغلوں کی سیاسی اور اقتصادی پالیسی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں۔ مغل حکومت کے جاہ و حشم کا دار و مدار اس کثیر دولت پر تھا جو لگان کی صورت میں حاصل ہوتی تھی۔ جاگیردار زیادہ سے زیادہ لگان وصول کرنے کے لیے کاشتکاروں پر ظلم کرتے تھے۔ ظلم و تشدّد سے تنگ آ کر یہ کاشتکار بغاوت کرتے۔ خود اکبر کے عہد سے بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ عہدِ اورنگ زیب میں بغاوتیں کثرت سے ہونے لگیں اور اب یہ پہلے سے کہیں زیادہ منظم تھیں۔ مرہٹے، جاٹ اور سکھ ایسے زمیندار اور کاشتکار ہیں جنھوں نے مغل حکومت کے خلاف منظم بغاوتیں کیں۔ روہیلوں اور انگریزوں نے صرف مغلوں کے سیاسی انتشار اور فوجی کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔

دہلی پر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ قلعے کے خزانے خالی ہو گئے۔ امرا و روسا بھوکے مرنے لگے اس بے بسی اور لاچاری نے لوگوں کو فرار پر مجبور کر دیا۔ کچھ لوگ عیش و عشرت

میں ڈوب گئے اور کچھ نے خانقاہوں میں پناہ لی۔ سودا ایک ذہین اور حساس شاعر تھے۔ خود ان کے سر سے بارہا موجِ خوں گزری تھی۔ انھوں نے خود قتل و غارت گری کے بھیانک مناظر دیکھے تھے۔ انھیں حکمراں طبقے کی بے زری کا پورا پورا احساس تھا۔ اُن کے شہر آشوب اُس عہد کے سیاسی و سماجی انتشار کی سچی تصویریں ہیں۔ اٹھارویں صدی پہ کام کرنے والے مورخین کے لیے ان شہر آشوبوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سودا کے آبا و اجداد کابل سے ہندوستان آئے تھے مگر یہ درست نہیں۔ ان کا وطنِ اصلی بخارا تھا جیسا کہ باغِ معانی میں نقش علی نے لکھا ہے۔ مرزا کے خاندانی حالات کا زیادہ پتا نہیں چل سکا۔ قیام الدین قائمؔ نے مخزنِ نکات میں ان کے چچا کا ذکر کیا ہے لیکن نام نہیں بتایا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے سوداؔ کو "پسرِ دخترِ نعمت خانِ عالی" لکھا ہے شاہ کمال نے لکھا ہے کہ سوداؔ کی والدہ عالیؔ کی بہن تھیں۔ یہ بیانات درست نہیں۔ امکان صرف یہ ہے کہ سودا کی والدہ خاندانِ عالیؔ سے ہوں۔ یعنی سودا کا عالی سے دُور کا رشتہ ہو۔ عنایت خاں راسخؔ نے "ذکرِ مغنیانِ ہندوستان بہشت نشان" میں مرشد قلی خاں کو سوداؔ کا نانا بتایا ہے۔ ممکن ہے راسخؔ کا بیان درست ہو۔ سوداؔ کے والد مرزا شفیع کے بارے میں قیاس ہے کہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ قائمؔ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ پیشۂ تجارت میں مشہور تھے۔

محمد حسین آزادؔ نے سوداؔ کا سنِ ولادت ۱۱۲۵ھ لکھا ہے اور غالباً بعد کے تذکرہ نگاروں نے ان ہی کی تقلید میں ۱۱۲۵ھ لکھا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ ۱۱۰۸ھ میں پیدا ہوئے جس پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ سوداؔ کم عمر تھے

جب ان کے والد کا انتقال ہوا۔ اور بقولِ قائم سودا کو جو کچھ ترکہ ملا تھا انھوں نے بہت جلد دوستوں میں اُڑا دیا۔

سودا کی اولاد میں غلام حیدر مجذوب کا نام ملتا ہے جنھیں بعض تذکرہ نگاروں نے ان کا حقیقی بیٹا اور بعض نے متبنیٰ لکھا ہے۔ قیاس یہی ہے کہ وہ حقیقی بیٹے تھے۔ خوب چند ذکا نے سلیمان نامی ایک شاعر کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سودا کے متبنیٰ تھے۔ محمد حسین آزاد مدعی ہیں کہ لکھنؤ میں ان کی ملاقات سودا کے نواسے سے ہوئی تھی۔

سودا نے ۱۱۴۰ھ اور ۱۱۵۰ھ کے درمیان ریختہ گوئی کا آغاز کیا اور ۱۱۵۴ھ کے لگ بھگ نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ شعر گوئی کی ابتدا انھوں نے فارسی سے کی تھی مگر بہت جلد ریختہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

تذکرہ نگاروں نے سودا کے چار استادوں کا ذکر کیا ہے۔ سلیمان قلی خاں وداد، نظام الدین احمد صانع، شاہ حاتم اور خانِ آرزو۔ ہمارا خیال ہے کہ سودا کو خانِ آرزو سے باقاعدہ تلمذ نہیں تھا۔ البتہ ان کی صحبت سے ضرور فیض اٹھایا تھا۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سودا کو ملک الشعرا کا خطاب ملا تھا۔ کچھ لکھتے ہیں کہ شاہ عالم نے دیا تھا۔ کچھ کا خیال ہے کہ نواب آصف الدولہ سے ملا تھا۔ اور کچھ کا بیان ہے کہ شیخ علی حزیں کی عنایت تھی۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ سودا کو کسی نے یہ خطاب نہیں دیا تھا۔ میر نے سب سے پہلی بار نکات الشعرا میں لکھا ہے کہ "سودا ملک الشعرائی کے لائق ہیں" بعد کے تذکرہ نگاروں نے انھیں ملک الشعرا ہی بنا دیا۔

سودا بہت مہذب، بااخلاق، شگفتہ مزاج، زندہ دل اور یار باش تھے۔ اس سلسلے میں بعض معاصر تذکرہ نگاروں نے ان کی بہت تعریف کی ہے

تذکروں میں کچھ لطیفے بھی ان سے منسوب کیے گئے ہیں۔

سودا علم موسیقی میں بھی ماہر تھے۔ عشقی لکھتے ہیں: "سودا ...... در علم موسیقی وستار نوازی دستگاہے معقولے داشت"۔ مصحفی کا بیان ہے کہ بہ سبب آگاہی علم موسیقی مرثیہ وسلام کہ گفتہ بر سوز نہادن آں نیز قادر"۔ انھیں کتے پالنے کا بھی شوق تھا۔ میر نے اسی سلسلے میں ان کی ہجو کہی تھی جس کا جواب کلیاتِ سودا میں موجود ہے۔

دہلی کی تباہی و بربادی سے اہلِ ہنر ترکِ وطن پہ مجبور ہو گئے۔ اکثر اہلِ فن دکن، فرخ آباد، اودھ اور دوسرے مقامات پہ چلے گئے جہاں متاعِ فن کی قدر ہو سکتی تھی۔ خانِ آرزو، عارف علی خاں عاجز، قیام الدین قائم، احسن اللہ خاں بیان، محمد فقیہہ صاحب دردمند، ہدایت اللہ ہدایت قلندر بخش جرات، مصحفی، میر، منت، ہیبت قلی خاں حسرت وغیرہ وہ شاعر ہیں جنھیں حالات سے مجبور ہو کر دہلی چھوڑنی پڑی۔

سودا لگ بھگ ۱۱۷۴ھ میں دہلی سے نکل کر عماد الملک کے پاس متھرا پہنچ گئے۔ ۱۱۷۴ھ اور ۱۱۷۶ھ کے درمیانی زمانے میں عماد الملک کے ساتھ فرخ آباد آ گئے جہاں نواب مہرباں خاں رند کے دربار سے متوسل ہو گئے۔ ۱۱۸۵ھ میں فرخ آباد کے نواب احمد خاں بنگش کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے مہرباں خاں رند کے حالات خراب ہو گئے اور سودا کو مجبوراً فیض آباد آنا پڑا۔ یہاں نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں معقول تنخواہ پہ ملازم ہو گئے۔ نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد آصف الدولہ مسند نشین ہوئے اور سودا آصف الدولہ کے دربار سے متوسل ہو گئے۔ جب آصف الدولہ نے فیض آباد کو خیر باد کہہ کر لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا تو سودا بھی لکھنؤ آ گئے۔ مرزا علی لطف

نے لکھا ہے کہ آصف الدولہ نے سودا کے لیے چھ ہزار سالیانہ کی جاگیر مقرر کر دی تھی۔ یہ درست نہیں۔ نواب شجاع الدولہ نے ان کے دو سو روپے ماہوار مقرر کیے تھے۔ آصف الدولہ نے بھی یہی تنخواہ برقرار رکھی۔ بعض قصیدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا کو تنخواہ وقت پر نہیں ملتی تھی اور انھیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

ایک دن سودا نے آم زیادہ کھا لیے تھے جس سے ان کی وفات ہو گئی۔ شاہ محمد حمزہ نے تاریخ وفات ماہ جمادی الثانی ۱۱۹۵ھ لکھی ہے۔

سودا ایک عظیم شاعر تھے لیکن عظیم غزل گو نہیں۔ اگر ان کی متاعِ فن غزل اور صرف غزل ہی ہوتی تو اُن کا شمار اپنے دور کے دوسرے درجے کے شاعروں میں ہوتا۔ ان کی شہرت و مقبولیت اور شاعرانہ عظمت کی اصل بنیاد قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی کے ساتھ ساتھ اس حقیقت پر بھی ہے کہ ان کے کلیات میں تقریباً جملہ اصنافِ سخن کے کامیاب نمونے موجود ہیں۔

صفِ اول کے غزل گو نہ ہونے کے باوجود انھوں نے غزل کو بہت کچھ دیا ہے اور غزل میں خارجیت، زورِ بیان اور نشاط آمیز لب و لہجہ انھیں کی دین ہے۔ سودا کا مزاج اور ذہن اُس غزل کو راس نہیں آسکتا تھا جس کی بنیاد داخلیت پر ہوتی تھی۔ ان کی شوخی چنچل اور طرارے بھرتی ہوئی یہ رنگِ طبیعت اس دردمندی، سوز و گداز اور برشتگی و ختگی کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی تھی جو غزل کی خصوصیات ہیں۔ اُن کے ہاں جذبات کی وہ صداقت و معصومیت، خلوص، خود سپردگی اور دردمندی نہیں ہے جو لب و لہجے میں نرمی و گھلاوٹ اور انداز بیان میں سادگی و بے تکلفی پیدا کر کے شعر کو تیر و نشتر بنا دیتی ہے۔

اُردو قصیدہ نگاری کے سودا امام ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سودا کے قصائد عرفی، خاقانی اور انوری کے پہلو بہ پہلو ہیں۔ اور بعض کا خیال ہے کہ سودا اکثر میدانوں میں فارسی قصیدہ گو شعرا سے آگے نکل گئے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ قصائد سودا اُردو نظم کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں۔ سودا الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے اور وہ ہر لفظ کے مزاج اور اس کے استعمال سے بخوبی واقف ہیں۔ طرح طرح کی تشبیہات اور استعارات کے سہارے ایک ہی بات کو سو انداز سے کہہ سکتے ہیں۔ مشکل اور سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دینا ان کا ہی کام ہے۔ بعد کے قصیدہ نگار سودا سے متاثر ہیں اور اکثر شعرا نے ان کی زمینوں میں قصیدے کہے ہیں۔

قصیدے کی طرح فن ہجوگوئی میں بھی سودا کی حیثیت امام اور خاتم کی ہے۔ وہ اس فن کو جس بلندی پر پہنچا گئے تھے۔ اس سے آگے اور کوئی نہ جا سکا۔ سودا کی ہجوؤں میں نہ صرف اس عہد کی معاشرت، تہذیب، سیاسی اور سماجی حالات کی جھلکیاں ملتی ہیں بلکہ ایسا بھی کافی مواد حاصل ہوتا ہے جس سے سودا کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان ہجوؤں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سودا کن اخلاقی قدروں پر ایمان رکھتے تھے۔ سودا کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ وہ جب کسی منظر کو دیکھتے ہیں تو پہلی ہی نظر میں، ان کا ذہن منظر کی معمولی سے معمولی تفصیل کو محفوظ کر لیتا ہے۔ اسی لیے جب وہ اس منظر کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالتے ہیں تو کوئی گوشہ تشنہ رہنے نہیں پاتا۔ اصل منظر میں جو کمی رہ جاتی ہے، سودا اُسے اپنے زورِ تخیل سے پورا کر دیتے ہیں جو مصوری اور شاعری کا حسین ترین امتزاج ہے۔

سودا نے ایک واسوخت، مرثیے، مثنویاں اور شہر آشوب بھی کہے ہیں۔ جن پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

اشعارِ سوداؔ کا انگریزی ترجمہ

جان گلکرسٹ کو سوداؔ سے بہت عقیدت تھی۔ اُس نے لکھا ہے کہ میں نے اُردو کلیاتِ سوداؔ سے سیکھی ہے۔ گلکرسٹ نے اپنی کتاب ہندوستانی زبان کی گرائمر، مطبوعہ کرونیکل پریس، کلکتہ، ۱۷۹۶ء (انگریزی) کے سرورق پر سوداؔ کے یہ اشعار دیے ہیں۔

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعوے نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
میں حضرتِ سوداؔ کو سُنا بولتے یارو
اللہ ہی اللہ کہ کیا نظم و بیاں ہے

اسی کتاب میں اُردو شاعروں کے بہت سے اشعار مثال کے طور پر دیے گئے ہیں پہلے یہ اشعار رومن رسم خط میں لکھے گئے ہیں اور پھر ان کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اشعار سوداؔ کے ہیں۔ میں نے یہاں پہلے اُردو اشعار اور پھر اُن کا ترجمہ ترتیب دیا ہے۔ اُردو شعر یا بند کا جو نمبر ہے وہی اس کے ترجمے کا ہے۔

A

GRAMMAR,

OF THE

HINDOOSTANEE LANGUAGE,

OR PART THIRD

OF

VOLUME FIRST,

OF A SYSTEM OF

HINDOOSTANEE PHILOLOGY.

By JOHN GILCHRIST.

اب سامنی میری جو کوئی پیر و جوان هی	*Ub samne mere jo koee peer o juwan hy*
دعوی نکری یه کہ میری موںہہ میں زبان هی	*Dowa na kure yih ki mere moon’h men zuban hy*
میں حضرت سودا کو سنا بولتی یارو	*Myn huzrut i Souda ko soona bolte yaro*
الله ہی الله کہ کیا نظم و بیان هی	*Ullah hee Ullah ki kya nuzm o byan hy.*

هر جا کہ سهوی و خطائی واقع شود ذیل کرم

بپوشند و قلم اصلاح بر ان جاری دارند

" Wherever there shall occur an Omission or Error, cover it with the Mantle of Generosity,
" And hold the Pen of Correction running over it."

DR. BALFOUR'S HERKERN.

CALCUTTA:

PRINTED AT THE CHRONICLE PRESS.

M DCC XC VI.

گلکرسٹ کی ایک کتاب کا سرورق

ہجو حکیم غوث

۱- ہوکے کسلمند جو وہ بے حیا / اپنے تئیں آپ کرے ہے دوا
مردہ شو و مولوی تابوت گر / گھیرتے ہیں آن کے سب اس کا گھر
دیں ہیں دہائی وہ بصد قیل و قال / ان میں سے ہر ایک کرے ہے سوال
اپنی دوا آپ تو ظالم نہ کر / ہم بے کسوں کی بھی طرف نظر کر
خوب جو کرتا ہے تو اپنی دوا / اور کوئی آپ سا مجھ کو بتا
روزی سے خاطر ہو مری تاکہ جمع / بھیجوں تری گور پہ گل اور شمع

۲- اُن نے کہا تو نے نہ اے زشت رو / دیکھا صدیدی کو نہ قانون کو
ساتھ حکیموں کے تو اے بے تمیز / بخشتی ہے ڈیڑھ روپے کی کنیز
اِس میں کہا ایک نے شوخی کی راہ / سنتے ہی مانا نہیں ان کا کہا
بی بی تیری پردے میں در یہ ادھر / لقوہ و فالج سے ہو کیونکر خبر
سمجھیو ٹک لوٹنے کی ہے یہ جا / کہتا ہے پھر آپ بھی ہاں اور کیا
سنتے ہی اس حرف کے کھا پیچ و تاب / تھوک کے ڈاڑھی پہ کیا یہ خضاب
لا تو صدیدی کو تو، اے میرے پوت / کھول تو قانون کو لے بھڑوے اُوت
بات کا اپنی تو، مجھے دے نشاں / میں بھی تو دیکھوں ہے یہ اُس میں کہاں
لقوہ و فالج ہو جسے یا صرع / دیجیے اُس کے تئیں ماء القرع
پھر تو یہ جس وقت بڑھی آگے بات / اُن نے جڑی دھول اُسے اُن نے لات
اُن نے قلمدان سے کی اُس پہ چوٹ / اُن نے لیا ڈاڑھی کو اُس کی کھسوٹ
چوٹی غرض اس کی ہوئی اس کے ہاتھ / کُھسے پگڑ لوٹ گئی وہ بھی ساتھ

زور جب آپس میں دھما دھم ہوئے — مار کٹائی سیتی بے دم ہوئے
دوڑ کر لوگوں نے چھڑایا انھیں — منت و زاری سے اُٹھایا انھیں
کرنے لگے وے جو تھے معقول ہیں — اُس کے تئیں لعن اُسے آفریں
تھا غرض اس نقل سے یہ مدعا — تاکہ ثواب اس کی نہ کھاوے دوا
اپنے لیے گور نہ تو آپ کھود — سُن تو لیا ایسا ہے یہ بیٹی چود

۳۔ سوداؔ سے کہا میں کہ ترے شہرے کو سنکر
دیکھا جو تجھے آکے تو اے بے سر و پا ہیچ
بولا کہ تجھے یاد ہے وہ مصرعۂ بیدلؔ
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

۴۔ مصرع کو یقیں تیرے سوداؔ نے سُنا تھا کل — روتا ہے وہ تب سے ہی ہمسے ہے گویا بادل
ہے رعد نمن نالاں بجلی کی طرح بے کل — پھر پھر کے وہ پڑھتا ہی ہاتھوں کے تئیں مل مل
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے

۵۔ اس جینے سے بہتر ہے اب موت پہ دل دھریے — جل بجھیے کہیں جا کر یا ڈوب کہیں مریے
کس طور کے تئیں راتیں کسطرح سے دن بھریے — کچھ بن نہیں آتی ہے حیران ہوں کیا کریے
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے

۶۔ کم ہے ناصر علی سے نعمت خاں — ادس سے مشہور تر ہے اس کا خیال
۷۔ موٹے جامے کا مجھ کو ذوق نہیں — چھوٹے چیرے کا دل میں شوق نہیں

۸- ظالم نہ میں کہا تھا کہ اس خوں سے درگزر
سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

۹- سنو اے لڑکو ہو نہ راہ سے گم
اس نصیحت کو گوش وجاں سے تم

۱۰- باپ کے گھر کی چاٹ کر چٹنی
کرو گذران یار: تم اپنی

۱۱- کس کس طرح سے دیکھیں اس باغ کی فضائیں
کدھر گئے وہ ساقی، وے ابر، وے ہوائیں

۱۲- لب و لہجہ تیرا سا کسکو ہے خوبانِ عالم میں
یہ غلط العام ہے جگ میں کہ سب مصری کی ہیں ڈلیاں

۱۳- تبسم یوں نمایاں ہے مسّی آلودہ ہونٹوں سے
نہو ابر سیہ میں اس طرح بجلی کی اچپلیاں

۱۴- قاضیوں کی بزم میں مت ہو جا کے شعر خواں
شاعروں پاس آپ کو کہتے ہو نحو صرف داں

۱۵- سالہا ہم نے صنم نالۂ شبگیر کیا
آہ ایک روز تیرے دل میں نہ تاثیر کیا

۱۶- نہ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے کام
مدعا ساقی سے اپنے ہمیں اور جام سے کام

۱۷- ذکر میرا جا کے تو کرتا ہے غیروں کے حضور
اب تلک یہ لب نہیں شکوے سے تیرے آشنا

۱۸- لازم نہیں ہے پیارے اتنا غرور کرنا
مجھ ناتواں کی حالت سنکر سرور کرنا

۱۹- احوال سے تمھارے واقف میں ہو رہا ہوں
کیا فائدہ ہے شیخی میرے حضور کرنا

۲۰- مذکور جانے بھی دو ہم دل طپیدگاں کا
احوال کچھ نہ پوچھو آفت رسیدگاں کا

۲۱- کیا کروں گا لے کے واعظ ہاتھ سے حوروں کے جام
میں ہوں ساغر کش کسی کی نرگس مخمور کا

۲۲- گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

۲۳- ہستی سے عدم تک نفسے چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

۲۴- ساقِ سیمیں کو تیری دیکھ کے گوری گوری
شرم سے شمع ہوئی جاتی ہے تھوری تھوری

۲۵- سریرِ سلطنت سے آستانۂ یار بہتر تھا
ہمیں ظلِ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

۲۶- موجِ نسیم آج ہے آلودہ گرد سے
دل خاک ہو گیا ہے کسی بے قرار کا

۲۷- سودا شرابِ عشق نہ کہتے تھے ہم نہ پی
کھینچا نہ تو نے دردِ سر اس کے خمار کا

۲۸- سودا چمنِ دہر سے یہ چشم نہ رکھیو
وہ گل نظر آوے کہ جسے خار نہ ہووے

۲۹- اب خدا حافظ ہے سودا کا مجھے آتا ہی رحم — ایک تو تھا ہی دیوانہ تس پہ آتی ہے بہار

۳۰- میں نے کہا کہ شیخ جی تم بیاہ مت رچاؤ
نوّے برس کی عمر تمھاری ہے باز آؤ
کہنے کو دوستوں کے بھی خاطر میں اپنے لاؤ
ایسے لگو گے جورو کے تم وقت داؤ جاؤ
گویا کہ اپنی پوتی کھلاتے ہیں شیخ جی

گاتی تھیں بیٹھی ڈومنیاں گرد یہ سہاگ
دولھا نمک بھرا ہے کہ جوں لوبیے کا ساگ
دلھن شتاب آکے پہونچ گھر سے اپنے بھاگ
نوشہ سگھڑ ہے لگے سسر کے گھر کو آگ؟
سر کو تو تال و سر سے ہلاتے ہیں شیخ جی

اے اچپلی دلھن تری شوخی ہے یہ زبوں
تو نے ہمارے شیخ کو کیا کیا کیا فسوں
یاں تک ہے تیری شرم سے جوگی یہ سرنگوں
مالن کہے ہے بار خدایا میں کیا کروں
تختوں سے سر کا سہرا بندھاتے ہیں شیخ جی

۳۱- معاش اہلِ چمن جائے رشک ہی سودا — کہ زندگی کا انھوں نے مزا اتمام لیا
کسی کا ان میں نہ محسود ہے نہ والی ردم — حسد کسی کو نہ اس پر کہ جس نے شام لیا
کہیں نہ واسطے منصب کے ہیں یہ مجرائی — سلام کر کے کسی سے نہ لاکھ دام لیا
کبھو نہ اُن کو میں دیکھا تلاش خدمت میں — کبھی نہ نکر تردد سے کوئی کام لیا

ادھر شروع کیا صبح نغمہ بلبل نے ادھر بہار سے ہر ایک گل نے جام لیا

۳۲۔ بلبل چمن میں کس کی ہیں یہ بد شرابیاں ٹوٹی پڑی ہیں غنچوں کی ساری گلابیاں
تجھ مکھ پہ تا نثار کرے، مہر و ماہ کی لبریز سیم و زر سے ہیں دونوں کی کابیاں
صیاد کہہ تو کن نے کبوتر کو دام میں سکھلائیاں ہیں دل کی مرے اضطرابیاں
فرہاد و قیس وں گئے سودا کا ہی یہ حال کیا کیا کیاں ہیں عشق میں خانہ خرابیاں

۳۳۔ ساون کے بادلوں کی طرح جل بھرے ہوئے
یہ وے نین ہیں جن سیتی جنگل ہرے ہوئے
اے دل یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوجِ اشک
لختِ جگر کی لاش کو آگے دھرے ہوئے
پلکیں تری کہاں نہ صف آرا ہوئیں کہ واں
افواج قاہرہ کے نہ نیزے کھڑے ہوئے
آنکھوں کو تیری کیونکہ میں باندھوں کہ یہ غزال
جاتے ہیں میرے دل کی زراعت چرے ہوئے
بوندوں کی جمدھروں سے یہ لڑتے ہیں اک دگر
لڑکے مجھ آنسوؤں کے نپٹ منگرے ہوئے
خالی خمیں کر اُٹھ گئے اس بزم سے حریف
بیٹھے ہیں ایک شیشۂ دل ہم بھرے ہوئے
نزدیک اپنے رہنے سے مت کر ہمیں تو منع
ہیں لاکھ کوس جب ترے دل سے پرے ہوئے

انصاف اپنا سو نہیے کس کو بجز خدا
منصف جو بولتے ہیں تو تجھ سے ڈرے ہوئے
مجلس میں چھوکروں کی جو حجرے سے شیخ جی
آویں تو پھر خدا نے کہا مسخرے ہوئے
سوداؔ نکل نہ گھر سے کہ اب تجھ کو ڈھونڈھتے
لڑکے کھڑے ہیں پتھروں سے جھولی بھرے ہوئے

۳۴۔ ساقی ہماری توبہ تجھ پر ہے کیوں گوارا
منت نہیں تو ظالم ترغیب یا اشارا
اک بار ہی جُھکا دے ساقی کہ فصلِ گل کو
عرصہ کہاں کہ دے تو ساغر ہمیں دوبارا

۳۵۔ غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں
جلوہ گر یار مرا، ورنہ کہاں ہے کہ نہیں
۳۶۔ مہر ہر ذرّہ میں مجھ کو تو نظر آتا ہے
تم بھی ٹک دیکھو کہ صاحبِ نظراں ہے کہ نہیں
۳۷۔ دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں
۳۸۔ پاسِ ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل
ورنہ یاں کونسا اندازِ فغاں ہے کہ نہیں
۳۹۔ آگے شمشیر تمھاری کے بھلا یہ گردن
مُو سے باریک ترا اے خوش گماں ہے کہ نہیں

۴۰۔ جرم ہے اس کی جفا کا کہ وفا کی تقصیر
کوئی تو بولو میاں منہ میں زباں ہے کہ نہیں

۴۱۔ پوچھا سودا سے میں اک روز کہ اے آوارہ
تیرے رہنے کا معین بھی مکاں ہے کہ نہیں

۴۲۔ یک بہ یک ہو کے بر آشفتہ لگا یوں کہنے
کچھ تجھے عقل سے بہرہ بھی میاں ہے کہ نہیں

۴۳۔ دیکھا میں قصر فریدوں کے در اوپر اک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

۴۴۔ کم بولنا ادا ہے ہر چند پر نہ اتنا
مند جائے چشم عاشق تو بھی وہ لب نہ کھولے

۴۵۔ جیوں غنچہ تو چمن میں بند قبا جو کھولے
پھر گل سے اے پیارے بلبل کبھو نہ بولے

۴۶ آویگا وہ چمن میں تڑکے ہی مے کشی کو
شبنم سے کہہ دے بلبل پیالے گلوں کے دھولے

۴۷۔ باغِ جہاں میں آکر کچھ ہم نے پھل نہ پایا
ایک دل ملا کہ جس میں ہیں سینکڑوں پھپھولے

۴۸۔ اتنا جو جاؤں جاؤں کرتے ہو تو سدھارو
اس دل پہ کل جو ہوگی سو آج ہی وہ ہولے

۵۰۔ چشمِ پُر آب ہدل میں جیوں آئینہ حبابی
رک رک کے پڑ گئے ہیں چھاتی میں سب پھپھولے

۵۱۔ کون ایسا اب کہے یہ سودا گلی میں وسکی
آ تجھ کو لے چلیں ہم دل کھول کر تو رولے

۵۲۔ باتیں کدھر گئیں وہ تیری بھولی بھالیاں
دل لے کے بولتا ہے جو تو اب یہ بولیاں

۵۳۔ ہر بات ہے لطیفہ و ہر یک سخن ہے رمز
ہر آن ہے کنایہ و ہر دم ٹھٹھولیاں

۵۴۔ حیرت نے اس کو بند نہ کرنے دی پھر کبھو
انکھیاں جس آرسی نے تیرے مونہہ پہ کھولیاں

۵۵۔ اندام گل پہ ہو نہ قبا اس مزے سے چاک
جیوں خوش بھبوں کے تن پہ مسکتی ہیں چولیاں

۵۶۔ کن نے کیا خرام چمن میں کہ اب صبا
لاتی ہے بوے ناز سے بھر بھر کے جھولیاں

۵۷۔ ساقی پہنچ شتاب کہ تجھ بن اس ابر سے
پڑتے نہیں تگرگ برستی ہیں گولیاں

۵۸۔ کیا چاہیئے تجھے سر انگشت بر حنا
جس بے گنہ کے خون میں چاہیں ڈبولیاں

۵۹۔ جیوں برف ہو گئے ہیں خنک اب بتانِ ہند
نسبت انھوں کے گرم ہیں کابل کی لولیاں

۶۰۔ سودا کے دل سے صاف نہ رہتی تھی زلفِ یار
شانے نے بیچ پڑ کے گرہیں اوس کی کھولیاں

۶۱۔ لے دیدۂ تر جدھر گئے ہم
ڈبرے جو تھے خشک بھر گئے ہم

۶۲۔ میں اور عندلیب ازل سے ہیں بے نصیب
مجھ پر ترا ستم ہے نت اوپر جفائے گل

۶۳۔ چین دینے کا نہیں زیرِ زمیں بھی نالا
سوتوں کی نیند میں کرنے کو خلل جاؤں گا

۶۴۔ تقدیر کے لکھے کو امکان نہیں دھونا
تقصیر نہیں دل کی میں فرض کیا ہونا

۶۵۔ قطرۂ اشک ہوں پیارے میرے نظارے سے
کیوں خفا ہوتے ہو پل مارتے ڈھل جاؤں گا

۶۶۔ عشق کے بیمار کی تشخیص میں ہو لاعلاج
بھول سب قانونِ حکمت بوعلی بھی رو گیا

۶۷۔ دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

۶۸۔ سودا کبھی بہار میں وضع زمانہ دیکھ
اے وائے وائے بلبل او ہائے ہائے گل

۶۹۔ کیا کروں گا میں تو سلامت رہ
تیرے دروانے کا ہوں خاک نشیں

۷۰۔ سودا یہ کرے گا نت اسقدر کا رونا
عالم کو اے دیوانے مت ساتھ لے ڈبونا

۷۱۔ لٹی مے اوٹھ گیا ساقی میرا نہیں پر یو پیمانہ
الٰہی کس طرح دیکھوں میں ان انکھیوں سے میخانہ (؟)

۷۲۔ بنا ہی اوٹھ گئی یارو غزل کے خوب کہنے کی
گیا مضمون دنیا سے رہا سودا سو دیوانہ

۷۳۔ اے بادِ صبا تو دمِ صبح کے تڑکے
سوتا ہو وہ گل رو تو کہیں بات نہ کھڑکے

۷۴۔ نہ بچے طائرِ مضمون نظر انداز میرا
فکرِ عالی کی ہے شاہیں میری راہ نوال

۷۵۔ کشش خلق اوس کا غرض کام ہے
مرگ و قضا مفت میں بدنام ہے

TRANSLATION OF

SOUDA'S VERSES

By

J.B. GILCHRSIT

Jamal Printing Press Jama Masjid, Delhi-6.

SOUDA'S SATIRE ON DOCTOR GHOUS

1. When the blockhead gets sick, he administers medicines to his self, and then all the undertakers, pall-bearers and mourners, surround his house, where they lament with many exclamations, and every one among them supplicates thus ; "Take not thy self, O barbarian, thy own physick, but have some mercy on us, poor wretches ; however if thou still persist in swallowing your own drugs, first recommend me says each, to any other person, like your worship, that my mind may be easy about my daily bread, and I shall then furnish thy grave with tapers and flowers."

2. He (the doctor) replied, thou hast neither, O hag, seen the Sudeedee, nor the Qanoon, and canst thou impudent worthess slave argue with physicians ; on which, one who listening, did not regard the doctors speech, and wittily observed : Thy mistress concealed within, and he without, how can he know anything of having a palsy or convulsions, consider a little, is not this a good joke, on which his worship (Ghous) also said, yes it is to be sure. The woman hearing this remark, and being enraged, spit on his beard and thus addressed him—well bring thou the Sudeedee now my Cock, come open the Qanoon Cuckoldy wight, and give me a proof of your own doctrine, as I wish to see where this is written in it, that you must prescribe pompion juice for the palsy, convulsions, or epilepsy ; after this when the altercation encreased, he gave her a slap, and she kicked him, he hit her a blow with the standish, and she toused his beard, in short her tail got twisted in his fist, and she seizing his cods, tumbled also on the ground, where they had a rare scramble among themselves, and being breathless with beating each other, the bystanders running up, separated and lifted them with much entreaty. Those who judged rightly, cursed him, and praised her. In fact the intention of this story is, that thou mayest not take his medicines, nor thou thyself dig thy own grave, now you have learned what a caitiff he is."

3. I thus addressed Souda : having heard of thy renown I came, O wight, but saw nothing. On which he said, Dost thou recollect that verse of Bedil, "The universe is full of my fame though I be nobody."

4. Souda heard thy verse repeated yesterday, Yaqeen, and weeps ever since as a surcharged cloud that dissolves in streams : He at one time is murmuring like the distant thunder, and at another more restless than its volatile messenger, wringing his hands, he again and again repeats "what made you cherish this passion, O my soul ! but, alas ! how can (or shall) I (or one) reason with a distracted mind."

5. It will be better for me resolutely to embrace death, than to lead such a life, let me depart and perish in the flames, or drown myself somewhere ; for how shall I pass the cheerless night, or where can I spend my lonely days ; Alas ! What must I distracted do, when there is no end of my woes Oh my soul, what hast thou done ? but why do I reason with a frantic mind ?

6. Is Neamut Khan inferior to Nasir ulee ? the fancy ? of the former is more famous than the latter's.

7. I have no desire for a coarse robe, nor feel any inclination to a small turband.

8. Did I not bid thee refrain, O ! tyrant, from this murder, it is the assassination of Souda, and never can be concealed.

9/10. Hear me, O ! children, depart not from virtue, but listen to this cousel with an attentive ear, and always be contented, O ! my friends, with whatever the board your father affords.

11. Ah ! how shall we enjoy the flower beds of this garden, where are now the cup bearers, the vernal clouds, and the zephyrs of spring.

12/13. Who among the beauties of the universe, have a mouth and words like thine? It must be an errour of the vulgar, that in this world any others can be sweet as chrystals of sugar. A smile has more lustre on thy lips, obscured with misee than the flashes of lightning have in a sable cloud.

14. When you go into an assembly of qazees you pretend to be a judge of poetry, and in a circle of poets you call your self a grammarian.

15. For years, O my beloved ! have I wasted the nights with my plaints ; but alas ! without ever once exciting thy compassion.

16. We esteem not Paganism, nor do we venerate the Faith ; but we adore our beloved, while a flowing bowl is the alter for us, (and our libations).

17. Thou talkest of me when in the presence of strangers, though this lip knows not how to complain of thee.

18/19. It is not becoming, O my beloved, to affect such pride ; or when you hear the distress of wretched me, to rejoice. I am perfectly accquainted with your condition ; for what purpose then assume air in my presence (or before me).

20. Forbear even the mention of us lovers, and ask not an account of the forlorn.

21. What shall I do, O preacher, with a bowl from the damsels of Paradise, who am here intoxicated with the wanton eye of any one.

22. You throw flowers and fruits even to others ; do plunderer of the garden, then fling a few also this way.

23. There are but a few moments between existence and annihilation ; where then is there so expeditious a journey as our passage from this world ?

24. When the candle beholds thy very fair polished limbs, it gradually burns with shame away.

25. My lover's threshold was better to me than an imperial throne and his humble roof more desireable than the shade of the royal eagle.

26. Since you do thus this repeat, I am going, I shall go, pray depart, and let that betide me today which must happen to morrow.

27. O Souda ! did we not say, do not drink the winc of desire ; and hast thou not at last experience the anguish after such intoxication.

28. Cherish not the hope, O ! Souda, in this terrestrial abode, that a rose will ever blossom here without producing a thorn.

29. May God preserve Souda, I really pity him ; He was distracted enough before, and now season of love is again approaching.

SOUDA'S SATIRE ON SHEKH JEE

30. I said, Reverend sage meddle not with marriage, but refrain now that you are ninety years of age, and mind the counsel of friends ; lest when dallying with a wife, you seem to be dandling your own grand daughter—The female musicians sat in a circle singing this nuptial song. "The Bridegroom is leep, but sedative as the leaves of purslane, come with speed, O bride, and leave thy former home, a busband is the proper man, and you may now make a bonfire of his father-in-law's house ; see the old gentleman himself even nods approbation to the chorus." Ah ! wanton bride, thy pranks art baneful indeed, for thou hast enchanted, and abashed our master to stoop on the bench so much, that gardener's wife exclaims, Good Lord ! what can I do, when his worship inclines to make the boardsagah ifdrsloranhead.

PART OF A HINDOOSTANEE ODE FROM SOUDA

31. Souda, observe the garden's" state ;
What gifts the flowry people bless !
Each earthly sweet, allowed by fate,
In full perfection they possess.

To them, ambition, is unknown :
No heart corroding envy bears ;
The King of Room or Syrias throne,
In them excites no jealous cares.

Never did guileful flattery's bate
For these, disgraceful honor's gain :
Ne'er did the homage of the great
For these, unearth wealth obtain

Ne'er did they creep from man to man,
And beg for slavery's galling yoke ;
Ne'er did the deep-concerted plan
In them the pangs of doubt provoke.

But, hark ! the birds their wild notes sing,
To greet at morn this happy tribe :
While they with goblets, hail the spring,
And freely, purest juice unlike.

(Translated by H.H)

32. O ! Philomel whose drunken frolicks have polluted the garden, and left the capsules of the rose buds thus deflowered and torn.-that the sun and moon may devote their offering to thy charms ; lo ! they both revolve as untensils resplendent with silver and gold-Say ! O ! flower, who hath taught the captive dove the emotions of my bosom ? Furhad and Qys perished so, and such is Souda's condition now-Alas, what devastation hath not love produced !

33. These eyes of mine are surcharged with streams, like the clouds of the rains, with which the wilds

are cloathed in their deepest green. O ! my soul, what contest is this to which an ocean of bring tears stained with slaughtered hearts seems advancing apace ?

Thy eye brows, my beloved, never were marshalled for a battle, without displaying the parts of conquering armies. Why not arrest the rays of those destructive orbs, that like wanton fawns crop the tender buds of my dearest hopes ? These pearly drops are contending with each other to issue forth to the fight but, alas ! the damsels are not at all dismayed at the sight of my feeble tears. Though my rivals have drained the goblets, and are with-drawn from the banquet, still I with a tender and over-flowing heart remain ; do not therefore forbid my enjoying thy company, since being estranged by their affection, I am virtually a myraid of miles away. From whom except God can I expect justice, when the judges who decide are themselves smitten by thee ? Should a hermit from his cell intrude on the assemly of the fair, he would surely become a laughing stock there : leave not thy house O ! lunatic, for at present the youth of the village are waiting with their pockets full of stones in expectations of thee.

34. How O ! cup bearer my vows of sobriety be agreeable to thee ? Though much solicitation was not expected on thy part, still, why not wheedle me back, ah ! heedless youth to the banquet ! come drain the generous bowl, my boy, at once, for alas ! the vernal season lasts not long enough, to keep me to the cup a second time.

FREELY TRANSLATED

35. I often wonder, whether the radiant object of my adoration smiles upon others or not, yet where is the spot that God is not there ?

36. You glorious orb to me appears in every beem : do you also, O ye enlightened ! pray behold if this be really so or not.

37. I am wandering about with the fragments of a broken heart in my hand ; say o doctors, if there be any balm for the cementing them or not ?

38. Songstress of the night, I also feel the mild influence of divine love, were it other wise, what degree o noisy praise is there that my voice could not reach.

39. Before thy falchion, this neck of mine indeed is more slender than the finest hair : is it so or not O ye daughters of geniune devotion !

40. Is the justice of Providence to blame or is it the fault of my way-ward fate ? do let some people say here, if a tongue be in their head or not.

41. I one day asked of Suoda, O wanderer ! hast thou any fixed residence on earth ?

42. All at once becoming enraged, he began to say silly body, is there one atom of sense in thy posses-, sion or not ?

43. I have long since with my mind's eye espied a weary wight at the palace gate even of the mighty Fureedon, who knocking, rears out" is there any one here or not".

CLOSELY TRANSLATED

35. In my foolish imagination I conceived another possessed not the radiant object of my love-else where is he not ?

36. The sun of the universe in every atom shines to my perception ; look ye enlightened, for a moment

and see if he be there or not.

37. A broken heart, I wandering carry within my bosom' ! have you a cure for this, ye skilful in art ? or have you not ?

38. O nightingale ! I feel the reverence the due to love, else what is thy cause of lamentation that I have not ?

39. Before the sword divine, this little neck is smaller than a hair-say, angel, is it not ?

40. Say, is my love to blame ? or my hard fate ? tell me who can, is there a tongue to speak or not ?

41. I one day enquired of Suoda the pilgrim "hast thou a fixed dwelling place or not ?"

42. Empassioned at the question, abruptly answered- "hast thou one particle of reason, friend, or not ?"

43. "Behold ! at the palace gate of the (late) monarch Fureedon, a man calls aloud-is any one here or not ?"

PARAPHRASE

35. What else, I oftimes pensive ween, can various creeds and tenets mean, whence flow the ordent pray'r, but that of mooslim, pagan, jew, must, as the christian's, each be true : for god is everywhere.

36. Thus in one circle we divine, the radii from its bounding line, concentric still unite ; so from the wide extended round of all religions, will be found one only lord of light.

37. Yon solar orb in every ray shines forth the glorious god of day, oft with refracted beam ; on shifting clouds does he retire ? or can they quench his awful fire ? sdeak, sages ! do I dream ?

38. With broken heart and wounded soul, I wandering search from pole to pole, for balm to heel my woes : still not one doctor can I find, like death, to cure my tortur'd mind O come and bring repose.

39. Sweet bird of eve, thy plaintive note could never drown my louder throat, if rev'rence due to love did not silence my moans and sighs, and me turn these streaming eyes, to the great God above.

40. Before whose dreedful sword, this neck is like the cobweb's finest wreck, that floats upon the air, look, angels ! tell me ay or nay, ye surely can the truth display, and will the whole declare.

41. That providence is just I own, though fortune sternly on me flown ; the fault perhaps is mine ; come cherubs ! teach the soothing plan of calm content to wayward man, and let me not repine.

42. Once I the pilgrim Souda spied, and then in earnest to him cried, "hast thou no fix'd retreat ?" enraged, responsive, thus he spoke, "sure, silly friend, you only joke, ? "or never heard of fate.

43. With reasons eye here take a glance-"through time and space's vast expanse," (nor blink it with a tear) "at one, by Cesar's palace doors," Who knocking there incessant roars, "is any body here ?"

44. To speak little is becoming, but still never to this degree, that when a lover's eyes are closing, even than not to open thy mouth.

45. Like the rose, dearest maid, If thou wantonly show ;
Each charm which those blushes betray,
To thy bosom, from flowers wont the nightingale go ;
And there, his fond heart give away.

46. At the dawn see ! my fair her sweet banquet renew,–
Hark ! Philomel sings from the grove ;
"Fly ye zephyrs and wash with the purest of dew,
"You blossoming cups for my love."

47. Not a grape can I find in this vineyard below,
With one drop of celestial wine.
Nay the heart which I have, is so soured with woe.
I wish it had never mine.

48. Why thus peevishly threat, "fare you well, I go hence"
My fairest-at once disappear ;
The morn's wretchedness now, is less fel-suspence, (illegible)
Whose train, are hope, passion and (illegible)

49. That meek silence becomes thee we dare not deny,
Yet still may the Fair sympathise ;
Surely none of the sex, can muse, sullen, stand by
Her lover, when closing his eyes.

50. Wo is me ! What dire anguish this bosom assails ?
Dry fountains : - With tears flow amain,
Ere my heart like those orbs tossed on waves before gales,
Bursts hapless a bubble of pain.

51. Has not Souda one friend that will kindly enjoin,
"Go with thy goddess to night,
"And wash every sorrow away, as her shrine,
"With floods thou will shed in her sight,

52. Where are thy kind innocent expressions now, that having captivated my heart, thou talkest to me thus ? -All thy words are gibes, and every sentence is raillery.

53. Not a moment without sarcasm, and each breath has become a taunting joke.

54. Admiration hath not yet allowed the mirrar to sleep, that opened it's eyes on thy countenance.

55. The capsule of the flower doth not burst with such charms as when the garment of the fair gives way.

56. Who hath been walking in the garden, that now the zephyrs come over-loaded with the perfumes of blandishment.

57. Come quickly, my beloved, for without thee the clouds are not discharging hail, but bullets.

58. Why shouldst thou die the tips of thy fingers with hina, while thy can be dipped in the blood of victims (to thy love).

59. The damsels of India have become as cold as ice, and are rivalled in affection by the maids of Kabool.

60. The tresses of my love were not in cancord with Souda, till the comb interposing unravelled their (prejudices) contortions.

PARAPHRASE OF THE ABOVE VERSES

52. Was thy innocent prattle divested of art ?
That formerly ravish'd my ear,
With the view of insidiously stealing this heart ;
Ah ! Whence these harsh words I now hear ?

53. Why thus constantly poison whate'er you express,
With scoffs, gibes, and taunting, unkind ?
Can satire or wit on a lover's distress,
Become a benevolent mind?

54. Since the morn I beheld thee so lovely and gay,
These eyes have been strangers to sleep ;
All the night for my fairest I ravingly pray,
Whole days, can do nothing but weep.

55. Not a bud where the lily just peers do I see,
So charms its admirer above ;
As the muslin receding can fascinate me,
To gaze on thy snow balls of love.

56. When Aurora from Phoebus comes tripping it by,
Her shape, breath ambrosial, and air,
Are so much my dear nymph's, I distractedly cry,
Whence ! Whither ! thus early my fair ?

57. Though you clouds burst with peals we have nothing to fear
Since the skies will relenting avert,
While such innocence, beauty and goodness, are near,
Each shaft but thy own from my heart.

58. If kind nature, not art, lilies, roses, can grace,
With pencil and colours divine,
Shall paint sacrilegiously beauties defaces,
Each bloom sees with envy in thine.

59. How Ye damsels of Hind prove more frigid and cool,
Than hills cover'd over with snow,
As our genial warm plains, while the maids, of Kabool,
With love amid icicles glow—

60. Are those locks not intended to rivet thy chain !
Fly Souda ! inchantment is there !
What comb hath the power to release thee again ?
From jetty fell ringlets of hair.

61. Where ever I carried these gushing eyes of mine,
I filled the puddles that were drying up, with my tears.

62. I and the nightingale are from the first unfortunate, thy frown is ever on me, and over her is the roses' thorn.

63. My plaints think not of giving me rest even in the grave, where I shall probably go to disturb the sleep of thousand.

64. It is impossible to wash out the decrees of fate, my heart is not to blame, and I must submit to whatever may happen to me.

65. Why my mistress be offended at my admiration of thee, I am but a solitary tear, that in the twinkling of an eye, must trickle away.

66. In the definition of a love-sick patient's complaint, Avicenna himself being baffled, and forgetting the whole rules of art (or his own institutes of physic) departed weeping.

67. Hell I can bear, O Moonkir and Nukee, (the two sepulchral catechists) but I have not patience for question and answer (examination).

68. Souda may well say, behold the worlds condition !
even in spring the nightingale sings, oh alas ! alas !
and the rosebud sighs ah ! wo is me !

69. What shall I do with such things ? be there preserved, and I remain the humble dust of thy threshould.

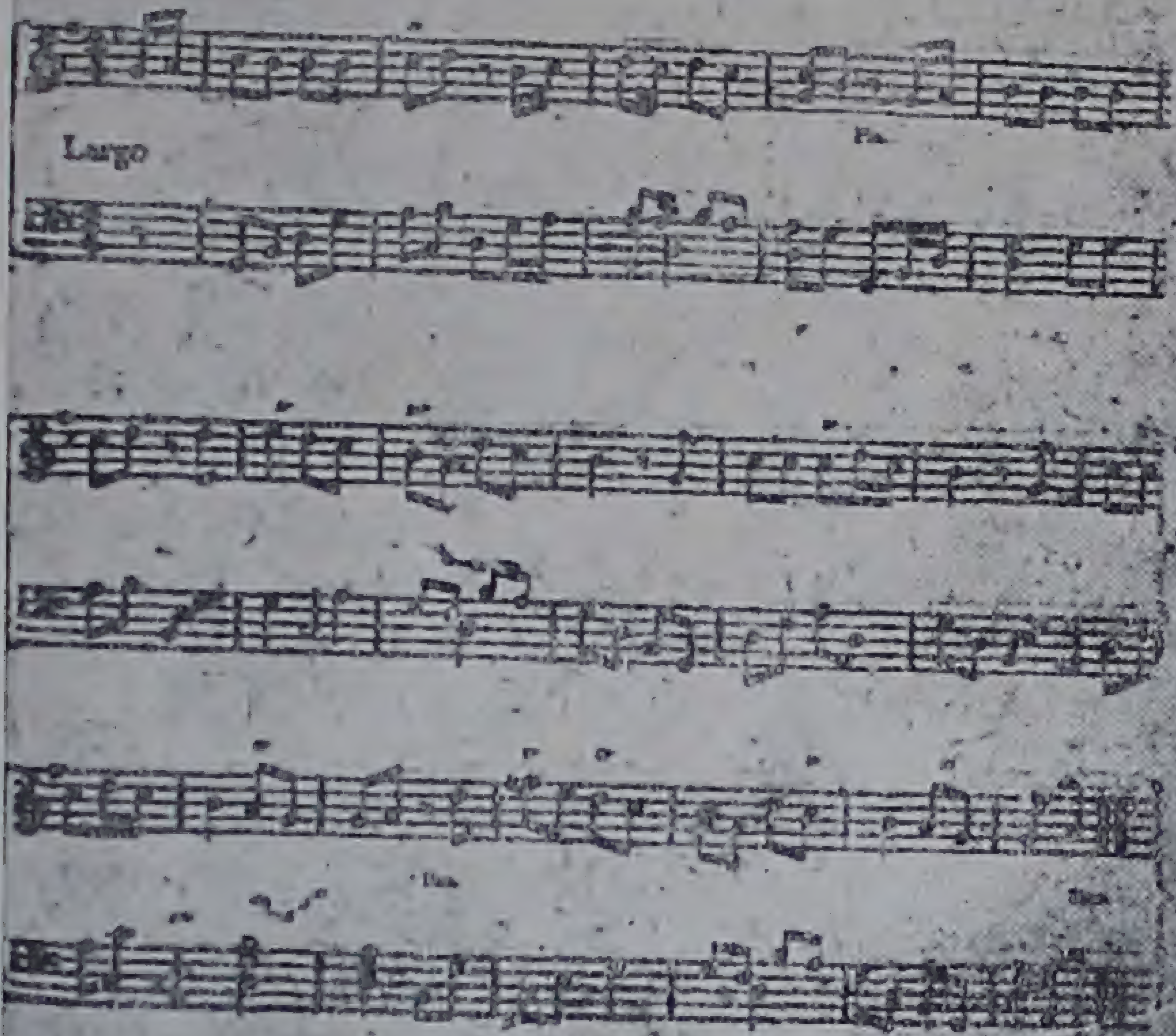
70. What will this constant weeping of your's come to, Souda ? Deluge not the world with thy tears, O mad man !

71-72. The wind is exhausted, the cup-bearer fled, and my glass is not full ; O heavens, how can I behold the banquet room with these eyes ; the source of elegant composition is dried up, fancy has forsaken the world, and Souda the lunatic alone remains'.

73. Go thou gentle breath of the morning, at the earliest dawn of the day, and if my fair one be asleep, let not a leaf rustle (to disturb her).

74. The muses daring wing when invoked, cannot escape me, as the soaring falcon of my brilliant fancy is the guide thereof.

75. In short the slaughter of mankind is his employment, so that fate and death are falsely accused.



سودا کی کہی ہوئی تضمین کی طرز جو گلکرسٹ نے اپنی کتاب "دی اورنٹیل لنگوسٹ" میں دی ہے۔

کتابیات

مائیکروفلم اور فوٹوسٹیٹ

۱۔ آزردہ، مفتی صدرالدین، تذکرہ آزردہ (فوٹوسٹیٹ) مملوکۂ ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو۔

۲۔ حیدر بخش حیدری، گلشن ہند (فوٹوسٹیٹ) مملوکہ ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو۔

۳۔ ذکا، خوب چند، عیارالشعرا (مائیکروفلم) دلّی یونی ورسٹی لائبریری۔

۴۔ سودا، مرزا محمد رفیع سودا، کلیات سودا "نسخۂ رچرڈ جونسن" (مائیکروفلم) دلّی یونی ورسٹی لائبریری

۵۔ سوز، محمد میر، دیوانِ میر سوز (مائیکروفلم) دلّی یونی ورسٹی لائبریری۔

۶۔ شورش عظیم آبادی، تذکرہ شورش (مائیکروفلم) دلّی یونی ورسٹی لائبریری۔

۷۔ عشقی عظیم آبادی، تذکرہ عشقی (مائیکروفلم) دلّی یونی ورسٹی لائبریری

۸۔ مبتلا، غلام محی الدین، طبقات سخن (مائیکروفلم) خدابخش لائبریری۔ پٹنہ۔

۹۔ بھیم سین، دلکشا (مائیکروفلم) ہسٹری ڈیپارٹمنٹ۔ دہلی یونی ورسٹی۔ دہلی۔

قلمی (فارسی)

۱۰۔ ابوالحسن امیرالدین، (امراللہ الہ آبادی) تذکرہ مسرت افزا۔ خدابخش لائبریری پٹنہ

۱۱۔ ابوالحسن امیرالدین (امراللہ الہ آبادی) تذکرہ مسرت افزا، بحوالہ معاصر حصہ ۶۔

۱۲۔ احمد علی سندیلوی، مخزن الغرائب، رضا لائبریری، رام پور۔
۱۳۔ احمد علی سندیلوی، مخزن الغرائب، دار المصنفین، اعظم گڑھ
۱۴۔ حیرت، قیام الدین، مقالات الشعرا، رضا لائبریری، رام پور۔
۱۵۔ ذکا، خوب چند، عیار الشعرا، انجمن ترقی اُردو۔ علی گڑھ۔
۱۶۔ راسخ، عنایت خاں، ذکر مغنیانِ ہندوستان بہشت نشان، خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔ بحوالہ معاصر حصہ ۶
۱۷۔ سلطان علی حسینی صفوی، معدن السعادت، جلد ۴، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ۔
۱۸۔ سید ولی اللہ فرخ آبادی، تاریخ فرخ آباد، رضا لائبریری۔ رام پور۔
۱۹۔ حمزہ مارہروی، شاہ محمد، فص الکلمات، رضا لائبریری۔ رام پور۔
۲۰۔ شاکر خاں پانی پتی، تذکرہ شاکر خاں، بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔
۲۱۔ شفیق، لچھمی نرائن، گل رعنا، آصفیہ لائبریری، حیدر آباد۔
۲۲۔ شوق رام پوری، مولوی قدرت اللہ، طبقات الشعرا۔ رضا لائبریری۔ رام پور۔
۲۳۔ شوق رام پوری، مولوی قدرت اللہ، طبقات الشعرا، آصفیہ لائبریری۔ حیدر آباد۔
۲۴۔ عبدالقادر چیف رام پوری، روزنامچہ، رضا لائبریری، رام پور
۲۵۔ عاشق عظیم آبادی، حسین قلی خاں، نشترِ عشق، رضا لائبریری۔ رام پور۔
۲۶۔ فتوت، عنایت اللہ، ریاض حسنی، سنٹرل ریکارڈ آفس۔ حیدر آباد۔
۲۷۔ کمال، شاہ کمال الدین، مجمع الانتخاب، انجمن ترقی اُردو، علی گڑھ۔

۲۸- کمال، شاہ کمال الدین۔ مجمع الانتخاب، سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد
۲۹- مبتلا، مردان علی خاں، گلشنِ سخن، رضا لائبریری۔ رام پور
۳۰- واصف، محمد مہدی، معدن الجواہر، آصفیہ لائبریری۔ حیدر آباد۔
۳۱- وامق، میر بہادر علی، قصر اللطائف، رضا لائبریری، رام پور بحوالہ نقوش ۱۹۵۸ء
۳۲- نقش علی، باغ معانی، خدا بخش لائبریری۔ پٹنہ

اردو (قلمی)

۳۳- بیاں، احسن اللہ خاں، دیوانِ بیاں، آصفیہ لائبریری۔ حیدر آباد۔
۳۴- بیاں، احسن اللہ خاں، دیوان بیاں، سالار جنگ میوزم۔ حیدر آباد۔
۳۵- حاتم، شاہ ظہور الدین، دیوان زادہ حاتم، آزاد لائبریری۔ علی گڑھ۔
۳۶- حاتم، شاہ ظہور الدین، دیوان زادہ حاتم، رضا لائبریری، رام پور
۳۷- حسن، میر حسن، دیوان میر حسن، رضا لائبریری، رام پور
۳۸- خلیق انجم، مرزا مظہر جانجاناں (تحقیقی مقالہ) دلی یونی ورسٹی لائبریری۔
۳۹- ضیغم، محمد عبد اللہ، یادگارِ ضیغم، ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد۔
۴۰- رند، مہرباں خاں، دیوانِ رند، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ۔
۴۱- سودا، مرزا محمد رفیع، کلیاتِ سودا، (حبیب سکشن) آزاد لائبریری۔ علی گڑھ۔
۴۲- سودا، مرزا محمد رفیع، کلیاتِ سودا، ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد۔
۴۳- سودا، مرزا محمد رفیع، قصائدِ سودا، آصفیہ لائبریری۔ حیدر آباد۔
۴۴- سودا، مرزا محمد رفیع، کلیاتِ سودا، خدا بخش لائبریری، پٹنہ بحوالہ نوائے ادب جولائی ۱۹۶۱ء (نسخہ خدا بخش)
۴۵- سودا، مرزا محمد رفیع، کلیات سودا، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، بحوالہ نوائے ادب

جولائی ۱۹۶۱ء (نسخۂ نراین)

۴۶- سوز، شاہ محمد میر، دیوانِ سوز، ۱۱۵۵ د ۹۱ھ انجمن ترقی اردو- علی گڑھ
س ۴۲ د س
ن ۱

۴۷- سوز، شاہ محمد میر، دیوانِ سوز، ۱۱۵۵ د ۹۱ھ انجمن ترقی اردو- علی گڑھ-
س ۴۲ د س
ن ۲

۴۸- سوز، شاہ محمد میر، دیوانِ سوز ۱۱۵۵ د ۹۱ھ انجمن ترقی اردو- علی گڑھ-
س ۴۲ د س
ن ۳

۴۹- مہدی علی خاں، تاریخِ لطیف، رضا لائبریری- رام پور-
۵۰- ناصر لکھنوی، سعادت خاں، تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، لکھنو یونی ورسٹی لائبریری
۵۱- ناصر لکھنوی، سعادت خاں، تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، آزاد لائبریری۔ علی گڑھ۔
۵۲- مولف نامعلوم، قصہ حقیقت بر آمدن نادر شاہ بہ شاہجہاں آباد- رضا لائبریری رام پور-

فارسی (مطبوعہ)

۵۳- ابوالفضل، اکبر نامہ، مرتبہ عبدالرحیم، جلد سوم، ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال کلکتہ، ۱۸۸۶ء

۵۴- آزاد بلگرامی، میر غلام علی، سرو آزاد، مطبع دخانی رفاہِ عام، لاہور، ۱۹۵۹ء
۵۵- آزاد بلگرامی، میر غلام علی، خزانۂ عامرہ، مطبع نول کشور لکھنو، ۱۸۷۱ء
۵۶- انشا، انشاء اللہ خاں، دریائے لطافت، انجمن ترقی اردو- اورنگ آباد- ۱۹۱۶ء
۵۷- تمنا اورنگ آبادی، اسد یار خاں، گل عجائب، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو- اورنگ آباد- ۱۹۳۶ء

۵۸- ٹارنس، سر ہنری، تاریخ نادری، ناقص الاول (نذیریہ لائبریری- دہلی)

۵۹۔ جگ ناتھ پرشاد، گلزار سخن، نول کشور، لکھنؤ ۱۳۲۶ھ
۶۰۔ حسن، میر حسن، تذکرہ شعرائے اُردو، مرتبہ مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شیروانی، انجمن ترقی اُردو۔ دہلی، ۱۹۴۰ء
۶۱۔ حمید اورنگ آبادی، خواجہ خاں، گلشن گفتار، مرتبہ سید محمد، سلسلۂ مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ، ۱۳۳۹ف
۶۲۔ حمید الدین خاں، نبیجۂ عالم گیری، احکام عالم گیری، مرتبہ جادو ناتھ سرکار، ایم سی۔ سرکار اینڈ سنز، کلکتہ، ۱۹۱۲ء
۶۳۔ خلیل، علی ابراہیم خاں، گلزار ابراہیم، مرتبہ سید محی الدین قادری زور، مطبع مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔ ۱۹۳۴ء
۶۴۔ خوش گو، بندرابن داس، تذکرہ خوش گو، مرتبہ سید شاہ محمد عطاء الرحمن عطا کاکوی، سلسلہ انتشارات ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ، ۱۹۵۹ء
۶۵۔ درگاہ قلی خاں (نواب ذوالقدر) مرقع دہلی، تاج پریس۔ حیدر آباد۔
۶۶۔ دولت یار جنگ نصر اللہ داستانِ ترک تازانِ ہند، جلد اول و دوم، مطبع دت پرشاد، بمبئی، ۱۳۱۰ھ
۶۷۔ سرور، میر محمد خاں بہادر، عمدۂ منتخبہ، مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔ ۱۹۶۱ء
۶۸۔ شاہ غلام علی، مقاماتِ مظہری، مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۳۰۹ھ
۶۹۔ شاہ نواز خاں (نواب صمصام الدولہ)، مآثر الامرا، مرتبہ مولوی عبد الرحیم، جلد اول ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ، ۱۸۹۱ء
۷۰۔ شفیق، لچھمی نراین، چمنستان شعرا، مرتبہ عبد الحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد ۱۹۲۸ء۔

۷۱۔ شورش عظیم آبادی، تذکرہ شورش، (دو تذکرے) مرتبہ کلیم الدین احمد (دو جلدیں) لیبل لیتھو پریس۔ پٹنہ، پہلی جلد ۱۹۵۹ء دوسری جلد ۱۹۶۳ء

۷۲۔ شیفتہ، نواب مصطفیٰ خاں، گلشنِ بے خار، مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۸۷۴ء

۷۳۔ صدیق حسن خاں، شمع انجمن، یسر المطابع شاہجہانی، بھوپال، ۱۲۹۳ھ

۷۴۔ عبد القادر بدایونی، منتخب التواریخ، جلد دوم، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ، ۱۸۶۴ء

۷۵۔ علی احمد خاں، مراتِ احمدی، مرتبہ سید نواب علی، جلد اول، اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ، بڑودہ، ۱۹۲۸ء

۷۶۔ عشقی عظیم آبادی، تذکرہ عشقی، دو تذکرے، مرتبہ کلیم الدین احمد (دو جلدیں) لیبل لیتھو پریس، پٹنہ، پہلی جلد ۱۹۵۹ء، دوسری جلد ۱۹۶۳ء

۷۷۔ غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، جلد دوم و سوم، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۹۷ء

۷۸۔ فتح علی حسینی گردیزی (سید) تذکرہ ریختہ گویان، مرتبہ مولوی عبد الحق، انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء

۷۹۔ فراقی، کنور پریم کشور، وقائع عالم شاہی، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، کتب خانہ، رام پور، ۱۹۴۹ء

۸۰۔ قائم، شیخ محمد قیام الدین، مخزنِ نکات، مرتبہ مولوی عبد الحق، انجمن ترقی اُردو۔ اورنگ آباد، ۱۹۲۹ء

۸۱۔ قاسم، حکیم قدرت اللہ، مجموعہ نغز، مرتبہ محمود شیرانی، سلسلۂ نشریاتِ کلیہ پنجاب، لاہور، ۱۹۳۳ء

۸۲۔ کنور درگا پرشاد، بوستان اودھ، احمد پریس لکھنؤ، ۱۸۹۲ء

۸۳۔ محمد کاظم (منشی)، عالم گیر نامہ، مرتبہ مولوی خادم حسین و مولوی عبد الحی، ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال، کلکتہ، ۱۸۶۸ء

۸۴۔ محمد ساقی مستعد خاں، مآثر عالم گیری، مرتبہ آغا احمد علی، ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال، کلکتہ، ۱۸۷۱ء

۸۵۔ محمد ہاشم خافی خاں، منتخب اللباب، مرتبہ مولوی کبیر الدین احمد، ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال، کلکتہ، ۱۸۷۴ء

۸۶۔ مصحفی، غلام ہمدانی، عقدِ ثریا، مرتبہ مولانا عبد الحق، انجمن ترقی اردو۔ دہلی ۱۹۳۴ء

۸۷۔ مصحفی، غلام ہمدانی، عقدِ ثریا، مرتبہ عبد الحق، انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد ۱۹۳۴ء

۸۸۔ میر، میر تقی، نکات الشعرا، مرتبہ عبد الحق، انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء

۸۹۔ میر، میر تقی، ذکرِ میر، مرتبہ مولوی عبد الحق، انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۲۸ء

۹۰۔ نعیم اللہ بہرائچی، معمولاتِ مظہریہ، مطبع نظامی، کانپور، ۱۲۷۵ھ

۹۱۔ ہندی، بھگوان داس، سفینۂ ہندی، مرتبہ محمد عطاء الرحمن عطا کاکوی، ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ، ۱۹۵۸ء

۹۲۔ یکتا، حکیم احد علی خاں، دستور الفصاحت، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، سلسلہ مطبوعات کتاب خانہ ریاست رام پور، ۱۹۴۳ء

اُردو (مطبوعہ)

۹۳۔ اثر، سید امداد امام، کاشف الحقائق، جلد دوم، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۵۶ء

۹۴۔ آثر کاکوری، عبد الرفیع علوی، نیرنگ سودا، لالہ رام نرائن لعل بک سیلر
الہ آباد، ۱۹۳۵ء
۹۵۔ آثر لکھنوی، مرزا جعفر علی خاں، انیس کی مرثیہ نگاری، دانش محل، لکھنؤ،
۱۹۵۱ء
۹۶۔ احمد علی خاں شوق (حافظ) تذکرہ کاملان رام پور، ہمدرد پریس دہلی۔ ۱۹۲۹ء
۹۷۔ ادیب، سید مسعود حسن رضوی، روحِ انیس، کتاب نگر، دین دیال روڈ۔
لکھنو، ۱۹۵۶ء
۹۸۔ آرزو، مختار الدین احمد (مرتب) احوالِ غالب، انجمن ترقی اُردو،
علی گڑھ، ۱۹۵۲ء
۹۹۔ آزاد، محمد حسین، آبِ حیات، رفاہ عام سٹیم پریس، لاہور، بارہشتم، ۱۹۱۳ء
۱۰۰۔ اسلم پرویز، انشا اللہ خاں انشا مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۶۱ء
۱۰۱۔ اشپرنگر، یادگارِ شعرا، مترجمہ طفیل احمد، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، ۱۹۴۳ء
۱۰۲۔ امیر مینائی، مفتی امیر احمد، انتخاب یادگار، رام پور، ۱۲۹۰ھ
۱۰۳۔ بشاش، دیبی پرشاد، آثار شعرائے ہنود، مطبع رضوی، ۱۸۸۵ء
۱۰۴۔ بے خبر، پنڈت برج کشن کول، بہارِ گلشنِ کشمیر، جلد اول، انڈین پریس
لمیٹڈ، الہ آباد، ۱۹۳۱ء
۱۰۵۔ تنہا، محمد یحییٰ، مرآۃ شعرا، عالم گیر الیکٹرک پریس، لاہور۔
۱۰۶۔ ثابت رضوی، حیات دبیر، مطبع سیوک سٹیم پریس، لاہور، ۱۹۱۳ء
۱۰۷۔ جرأت، شیخ قلندر بخش، کلیاتِ جرأت، مطبع کارنامہ لکھنو، ۱۸۸۳ء
۱۰۸۔ جان شیکسپئر، منتخباتِ ہندی، جلد دوم، لندن، ۱۸۲۵ء
۱۰۹۔ جلال الدین جعفری، تاریخِ قصائد اُردو، مطبع انوار احمدی، الہ آباد۔

۱۱۰- حالی، الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ تنویر احمد علوی، مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ۔
۱۱۱- خواجہ احمد فاروقی، میر تقی میر، حیات اور شاعری، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ ۱۹۵۷ء
۱۱۲- رام بابو سکسینہ، تاریخِ ادب اردو، مترجمہ مرزا محمد عسکری، راجہ رام کمار پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۲ء
۱۱۳- رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکاتِ اردو، ہندوستانی اکیڈمی، الٰہ آباد
۱۱۴- رفعت، ابوالفضل محمد عباس، تذکرہ ماہِ درخشاں، مطبع شاہجہانی، ۱۸۹۲ء
۱۱۵- رنگین، سعادت یار خاں، مجالسِ رنگین، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب، نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۲۹ء
۱۱۶- زور، سید محی الدین قادری، سرگزشتِ حاتم، ادارۂ ادبیاتِ اردو، ۱۹۴۴ء
۱۱۷- سری رام (لالہ) خم خانۂ جاوید، جلد چہارم، ہمدرد پریس، دہلی، ۱۹۲۶ء
۱۱۸- سلام سندیلوی، رباعیاتِ اردو، نسیم بکڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۳ء
۱۱۹- سودا، مرزا محمد رفیع، کلیات سودا، مرتبہ میر عبدالرحمٰن آہی، مطبع مصطفائی دہلی، ۱۲۷۲ھ
۱۲۰- سودا، مرزا محمد رفیع، کلیات سودا، مطبع نول کشور، کانپور، ۱۹۱۶ء
۱۲۱- سودا، مرزا محمد رفیع، کلیات سودا، مرتبہ عبدالباری آسی، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۳۲ء
۱۲۲- سید عبداللہ، بحث و نظر، مکتبۂ اردو، لاہور، ۱۹۵۲ء
۱۲۳- سید عبداللہ، نقدِ میر، جہانگیر بکڈپو، دہلی۔
۱۲۴- سید عبدالحی (حکیم)، گلِ رعنا، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۳۴۰ھ

۱۲۵۔ شاہ ولی اللہ، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ و مترجمہ خلیق احمد نظامی، سلسلۂ تصانیف مشائخ، دلی۔ ۱۹۵۰ء

۱۲۶۔ شبلی نعمانی، موازنۂ انیس و دبیر، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور۔

۱۲۷۔ شبلی نعمانی، شعرالعجم، جلد پنجم، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۲۴ء

شوق، احمد علی خاں :۔ دیکھیے احمد علی خاں

۱۲۸۔ شیخ چاند، سودا، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء

۱۲۹۔ صابر علی خاں، سعادت یار خاں رنگین، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۶ء

۱۳۰۔ عبدالرزاق قریشی، مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام، ادبی پبلشرز، بمبئی ۱۹۶۱ء

۱۳۱۔ عبدالسلام ندوی، شعرالہند، (جلد اول)، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۴۹ء

۱۳۲۔ غالب، اسداللہ خاں، خطوطِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، کتاب منزل، لاہور۔

۱۳۳۔ فائز دہلوی، نواب صدرالدین خاں، فائز دہلوی اور اُس کا دیوان، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب، انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۶ء

۱۳۴۔ فراق، ناصر نذیر، میخانۂ درد، جید برقی پریس، دہلی، ۱۳۴۴ھ

۱۳۵۔ فراق گورکھپوری، اندازے، ادارۂ انیس اُردو، الہ آباد، ۱۹۵۹ء

۱۳۶۔ قائم، قیام الدین، دیوانِ قائم، مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام، جمال پریس، دہلی، ۱۹۶۳ء

۱۳۷۔ قاضی عبدالودود، عیارستان، سلسلۂ مطبوعاتِ ادارہ تحقیقاتِ اُردو، پٹنہ، ۱۹۵۷ء

۱۳۸۔ کیفی، پنڈت برجموہن دتاتریہ، کیفیہ، انجمن ترقی اُردو، دہلی، ۱۹۴۲ء

١٣٩- کیفی چریاکوٹی، محمد مبین، جواہر سخن، جلد دوم، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، ١٩٣٥ء

١٤٠- گارساں دتاسی، تاریخ ادبیات، (فرانسیسی) جلد سوم، بحوالہ معاصر حصہ ٢

١٤١- لطف، مرزا علی، گلشنِ ہند، مرتبہ مولوی شبلی اور مولوی عبدالحق، رفاہِ عام سٹیم پریس، لاہور، ١٩٠٦ء

١٤٢- محمد ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، سلسلۂ مطبوعات مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، ١٩٤٤ء

١٤٣- محمد عتیق صدیقی، گلکرسٹ اور اس کا عہد، انجمن ترقی اُردو، علی گڑھ، ١٩٦٢ء

١٤٤- مظہر، مرزا مظہر جانجاناں، مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط، مترجمہ و مرتبہ خلیق انجم، مکتبہ برہان، دہلی، ١٩٦٢ء

١٤٥- میر تقی میر، کلیاتِ میر، مرتبہ عبدالباری آسی، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ١٩٤٠ء

١٤٦- میر، میر تقی، میر کی آپ بیتی، مترجمہ نثار احمد فاروقی، مکتبہ برہان، دہلی، ١٩٥٧ء

١٤٧- نجم الغنی، بحر الفصاحت، نول کشور، لکھنؤ، ١٩٢٦ء

١٤٨- نجم الغنی، تاریخ اودھ، نول کشور، لکھنؤ، ١٩١٩ء پہلی تین جلدیں

١٤٩- نساخ، مولوی عبدالغفور، گنجِ تواریخ، مطبع نول کشور، ١٨٧٥ء

١٥٠- نساخ، مولوی عبدالغفور، سخنِ شعرا، نول کشور، ١٢٩١ھ

١٥١- نورالحسن ہاشمی، دلّی کا دبستان شاعری، انجمن ترقی اُردو، ہند۔

١٥٢- یقین، انعام اللہ خاں، دیوانِ یقین، مرتبہ فرحت اللہ بیگ، مطبع مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، ١٩٣٠ء

اُردو رسالے

١٥٣- اُردو ادب، علی گڑھ، اکتوبر ١٩٥٠ء

۱۵۴- اُردوے معلیٰ، غالب نمبر، دہلی یونی ورسٹی دہلی، ۱۹۶۰ء
۱۵۵- اورنٹیل کالج میگزین، لاہور، نومبر ۱۹۴۳ء
۱۵۶- دلّی کالج میگزین، دلّی نمبر
۱۵۷- سب رس، حیدرآباد، نومبر ۱۹۶۰ء
۱۵۸- سویرا، لاہور، خاص نمبر، ۲۹
۱۵۹- علی گڑھ میگزین، طنز و ظرافت نمبر، ۱۹۵۳ء
۱۶۰- معاصر حصہ ۱
۱۶۱- معاصر حصہ ۲
۱۶۲- معاصر حصہ ۱۵
۱۶۳- معاصر حصہ ۱۸
۱۶۴- معاصر جولائی، ۱۹
۱۶۵- معارف، اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۵۲ء
۱۶۶- مجلّہ عثمانیہ، دکنی ادب نمبر، ۱۹۶۳ء
۱۶۷- نقوش، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۸ء
۱۶۸- نقوش، لاہور، مئی ۱۹۶۱ء
۱۶۹- نقوش، لاہور، دسمبر ۱۹۶۱ء
۱۷۰- نقوش، لاہور، طنز و مزاح نمبر
۱۷۱- نگار، لکھنؤ، اگست ۱۹۲۸ء
۱۷۲- نگار، لکھنؤ، جنوری فروری ۱۹۵۷ء
۱۷۳- نواے ادب، بمبئی، جنوری ۱۹۵۲ء
۱۷۴- نواے ادب، بمبئی، اپریل ۱۹۵۶ء

۱۷۵- نیا دور، لکھنؤ، نومبر ۱۹۶۱ء

۱۷۶- ہماری زبان، علی گڑھ، یکم مارچ ۱۹۵۹ء

۱۷۷- ہماری زبان، علی گڑھ، ۸ مارچ ۱۹۵۹ء

179. Bal Krishan, Commercial Relation Between India and England. George Routledge & Sons, Ltd. London, 1924.

180. Bernier F., Travels in the Mogul Empire, tr. A. Constable, 2 Ed., London, 1916.

181. Fraser James, History of Nadir Shah. 2 Ed., A Miller London, 1742.

182. Gilchrist J., The Stranger's Infallible East India Guide, London, 1820.

183. Gilchrist J., Grammer of the Hindoostanee Language, Etc, Chronicle Press, Calcutta 1796.

184. Gilchrist J., The Oriental Linguist, Chronicle Press, Calcutta, 1798.

185. Irfan Habib, The Agrarian System of Mughal India (1556-1707) Deptt. of History, Aligarh Muslim University, 1963.

186. Kalinker Datt, Survey of India's Social Life and Economic Condition in the 18th Century, Firma K.L. Mukhpadhyay, Calcutta, 1961.

187. Majumdar R.C., An Advanee History of India, MacMillan & Co. Ltd. London, 1960.

188. Manrique, F.S., Travels, 1629-43. tr. C.E. Luard, Vol. II, Hakluyt Society London, 1927.

189. Manucci N. Storia Do Mogor, Vol. II, tr. W. Irvine, John Murray, Albemarle Street, London, 1907.

190. Ralph Fitch, Narrative, ed. J.H. Ryley, Ralph Fitch, England's Pioneer to India and Burma, London, 1899.

191. Sarkar, J.N., Fall of Mughal Empire, Vol. I, M.C. Sarkar & Sons, Calcutta.

192. Sarkar, J.N., Studies in Aurangzib's Reign, M.C. Sarkar & Sons Ltd. Calcutta, 1933.

193. Satish Chandra, Parties & Politics at the Mughal Court, Deptt. of History, Aligarh Muslim University, 1959.

194. Shelvankar K.S., The Problem of India, Penguin Books Limited, Newyork, 1940.

195. Thompson E. and G.T. Garratt, Rise and Fulfilment of British Rule In India, Central Book Depot, Allahabad, 1962.

196. Williams M., Sanskrit-English Dictionary Clarendon Press, 1899.

१९७. धीरेन्द्र वर्मा, हिन्दी साहित्य कोश, बनारस, १९५८ ।

१९८. रामधन शर्मा, कूटकाव्य, दिल्ली, १९६३ ।

१९९. कृष्णलाल हन्स, निमाड़ी और उसका साहित्य, इलाहाबाद, १९६० ।

اشاریہ

(ن)